

وَمَا أَرْثِيكَ مِنَ الْعَالَمِ لَا تَالِيكَ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مَعْرِفَةُ مَذْهَبِ سُنَنِ

www.KitaboSunnat.com



مولانا ظفر علی خاں



معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

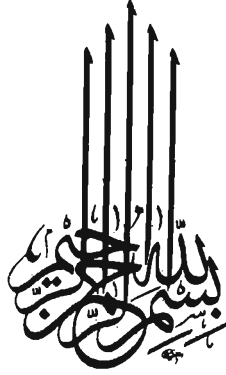
ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com



وَمَا أَرْفَعُ رَجُلًا مِّنَ الْعَالَمِ إِلَّا أَقْبَلْتُ لَهُ

مَعْرَكَةُ مَذْهَبِ سَائِسَ

يَعْنِي

دَاكُطْرَجَانِ وَلِيْمِ دَرِيَسِرِ اِيْمِ اِيْلِ اِيْلِ دِي

كِي

شَرُّهُ آفَاقِ تَصْنِيفِ

A HISTORY OF

THE CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE

كَأَرْدُو تَرْجَمِه

از

مولانا ظفر علی خاں

ناشرانِ قادیان کتب

نورانی شریعت اردو بازار لاہور

الفیصل

AI-FAISAL NASHRAN

Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore, Pakistan

Phone : 7230777 Fax : 09242-7231387

http: www.alfaisalpublishers.com

e.mail: alfaisal_pk@hotmail.com



تمہ 2004ء

مرفیسل نے

تعریف پر نہ زست چھپوا کر شائع کی۔

قیمت -/300 روپے

انتساب

عالی جناب نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی
 خاں صاحب مرحوم و مغفور جن کا نام مسلمانان ہند کی علمی
 تاریخ میں آبِ زر سے لکھا جا چکا ہے سب سے پہلے
 شخص تھے جن کی تحریک پر میں نے آج سے پندرہ سال
 پہلے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ اس لئے میں
 اس کتاب کو جو اب نظر ثانی کے بعد حواشی کے ساتھ
 مکمل ہو کر شائع ہوتی ہے عالی جناب ممدوح کی پاک یاد
 کے ساتھ نسبت دینے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

ظفر علی خاں

حرفے چند

ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر (۱۸۱۱-۱۸۸۲) کی تصنیف

A History of the Conflict between Religion and Science.

ایک معرکہ آلا کتاب ہے۔ یہ ایک لحاظ سے یورپ کی ذہنی ترقی کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳-۱۹۵۶) نے نواب محسن الملک (۱۸۳۷-۱۹۰۷) کی خواہش پر ۱۸۹۵ء میں اس کا باعہاورہ اردو ترجمہ کیا۔ نظر ثانی کے بعد ۱۹۱۰ء میں انجمن اُردو حیدرآباد دکن نے رفاہ عام سٹیم پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔

پنجاب یونیورسٹی نے اس کامیاب ترجمے پر مولانا ظفر علی خان کو پانچ سو روپے کا انعام دیا۔ مولانا حالی کے مطابق معرکہ مذہب و سائنس کی نسبت بلحاظ ترجمہ کی خوبی کے جو کچھ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے وہ مبالغے سے بالکل پاک ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے ڈریپر کی بعض آراء سے اختلاف کرتے ہوئے اور بعض مسائل کی اپنے نقطہ نظر سے وضاحت کرتے ہوئے حواشی بھی لکھے ہیں۔ مولانا شبلی کے بقول اس وقت وہ مترجم نہیں بلکہ اچھے خاصے تند مزاج مولوی نظر آتے ہیں۔

یہ کتاب ایک عرصہ سے نایاب تھی۔ اس کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر ہم نے اسے از سر نو کمپوز کروا کر اہل علم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ پہلی اشاعت میں حواشی صفحہ کے ساتھ ساتھ تھے لیکن موجودہ اشاعت میں انہیں ابواب کے آخر میں دیا گیا ہے۔

محمد رفیع

معرکہ مذہب و سائنس

فہرست مضامین

| | |
|----|---|
| 17 | مقدمہ کتاب از مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے |
| 77 | حیات ڈاکٹر ذریعہ از مترجم |
| 86 | ویباچہ مصنف |

پہلا باب

سائنس کی ابتدا

95

یونانیوں کی مذہبی حالت چوتھی صدی قبل مسیح میں، سلطنت ایران پر حملہ آور ہو کر وہ قدرت کے نئے نئے مناظر دیکھتے ہیں اور نئے نئے مذاہب سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ مقدونی فوج کشی سے فن حرب، فن انجینئری اور سائنس کو جو تحریک پہنچی ہے اسکندریہ میں ایک دارالعلم کے قیام کا باعث ہوتی ہے۔ یہی دارالعلم جس میں تجربہ، مشاہدہ اور مہندسانہ تنقید کے ذریعہ سے علوم و فنون کی ترقی کے وسائل اختیار کئے جاتے ہیں سائنس یعنی علوم و فنون کا سرچشمہ قرار پاتا ہے۔

دوسرا باب

عیسائیت کی ابتدا

132

شاہی اقتدارات حاصل کرنے کے بعد اس کی قلبِ ماہیت۔ اس کا تعلق سائنس کے ساتھ۔ روم کی جمہوری حکومت کی مذہبی حالت۔ جمہوریت کے مبدل بہ حکومتِ مغلضی ہونے سے لوگوں کا میلانِ توحید کی طرف ہو جاتا ہے۔ سلطنتِ روم میں مذہبِ عیسوی کی اشاعت۔ عیسائیت کو حکومت جس طریقہ سے ہاتھ آتی ہے اس کے سیاسی مقصدیات۔ بت اور بت پرستی کے باہمی اتحاد کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ عیسائیت کے عقاید اور رسوم سے متعلق ٹرلین کا بیان۔ فلسفین کی حکومتِ عملی کا محرب اثر۔ عیسائیت کا اتحادِ حکمران جماعت کے ساتھ۔ عیسائیت اور سائنس کا تعلق باہمی۔ کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی اور تحصیلِ فلسفہ کی ممانعت۔ آگسٹائن کے فلسفہ اور پادریوں کے علوم کی حقیقت۔ کتب مقدس کو سائنس کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔

تیسرا باب

نزاعِ مذہب و سائنس دربارہٴ مسئلہ توحید۔

166

پہلی یعنی جنوبی اصلاح

اہل مصر اصرار کرتے ہیں کہ مریم عذرا کی پرستش کو رواج عام دیا جائے۔ قسطنطنیہ کا صریح نذران کی مخالفت کرتا ہے لیکن انجام کار بوجہ اس رسوم کے جو مصریوں کو دربارِ قیصر میں حاصل ہے وہ دستور کو جلا وطن کرا دیتے ہیں اور دستور کے پیرو منتشر ہو جاتے ہیں۔

اصلاحِ جنوبی (یعنی اسلام) کا آغاز۔ حملہ ایران۔ اس کے اخلاقی نتائج۔

اصلاحِ عرب۔ حضرت عمرؓ غزوہٴ غزوہٴ فرقہ کے راہبوں سے ملتے ہیں۔ اور ان کے اصول اختیار کر کے ان اصول پر اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ مریم عذرا کی پرستش۔ مسئلہ تثلیث اور اسی عقیدے سے جو توحیدِ باری سے توافق نہیں رکھتا وہ ابا کرتے ہیں۔ عرب کی بت پرستی کو بہ جبر مٹا دیتے ہیں اور دولتِ روم پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ صلعم کے جانشین شام، مصر، ایشیائے کوچک، شمالی افریقہ اور

ہسپانیہ کو مسخر اور فرانس پر حملہ کرتے ہیں۔

اس کشمکش سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وحدت واجب الوجود کا اصول دولت روما کے اکثر حصہ میں رائج ہو جاتا ہے۔ سائنس از سر نو زندہ ہوتا ہے اور مسیحی دنیا کے بہت سے مشہور مراکز حکومت مثلاً "اسکندریہ" کا رتھج یہاں تک کہ بیت المقدس تک عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔

چوتھا باب

جنوب میں سائنس کا احیاء

214

نسطوریوں اور یہودیوں کے اثر کی وجہ سے عرب اکتساب علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ قضا و قدر اور سرنوشت ازلی کے متعلق ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور کائنات کی ہیئت ترکیبی کا ان کو صحیح صحیح علم ہو جاتا ہے۔ وہ زمین کی جسامت اور شکل کی تحقیق کرتے ہیں۔ ان کے خلفاء عظیم الشان کتب خانوں کی بنا ڈالتے ہیں۔ علوم و فنون کے ہر شعبہ کی سرپرستی کرتے ہیں اور رصد گاہیں قائم کرتے ہیں۔ وہ فن ریاضی کو ترقی دیتے ہیں۔ الجبرا ایجاد کرتے ہیں اور فن ہندسہ و مثلث پر بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ فنون ریاضی و ہیئت کے متعلق قدیم یونانی تصانیف کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں اور ان کا عربی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ ارسطو کے طریقہ استقرائے تام پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ بہت سے دارالعلم قائم کرتے ہیں اور نسطوریوں کی مدد سے موجودہ وضع کے مدارس کھولتے ہیں۔ عربی سیاق و اعداد اور فن حساب کو رواج دیتے ہیں اور ستاروں کی فہرستیں مرتب کر کے ان کے نام رکھتے ہیں۔ موجودہ فنون ہیئت و کیمیا و طبیعیات کی بنیاد رکھتے ہیں اور فلاحیت و صنعت و حرفت کو بہت کچھ ترقی دیتے ہیں۔

پانچواں باب

نزاع مذہب و سائنس دربارہ ماہیت روح۔

230

مسئلہ انفصال و انجذاب

روح کی ماہیت کے متعلق قدیم اہل یورپ کے خیالات۔ یعنی روح جسم کے مشابہ

ہے۔ اہل مشرق کے فلسفیانہ خیالات۔ ہندو مذہب اور بدھ مذہب مسئلہ انفصال و انجذاب کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی مذہب ارسطو کا بھی ہے جس کی تقلید پیروانِ فلسفہ اسکندریہ اور بعد میں یہودی اور عرب کرتے ہیں۔ یہی مسئلہ ارسطو کی تصانیف میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کا تعلق مسئلہ بقا و تناسب قوت کے ساتھ جسم اور روح کے آغاز و انجام کی باہمی مماثلت۔ روح انسانی کا قیاس روح حیوانی پر۔ فلسفہ ابن رشد جو انہیں واقعات پر مبنی ہے۔ اسپین اور سسلی ہوتا ہوا مسیحی دنیا میں پہنچتا ہے۔

فلسفہ ابن رشد کے استیصال کی تاریخ۔ اسلام کا اس سے ابا کرتا۔ یہودیوں کے مذہبی طبقہ کی مخالفت۔ پاپائے روما کا اس فلسفہ کے مٹا دینے پر کمر باندھنا۔ ”انکویریشن“۔ (محکمہ احتساب مذہبی) کا اسپین میں قائم ہونا۔ اس محکمہ کے وحشیانہ مظالم اور ان کے نتائج۔ یہودیوں اور عربوں کا اخراج۔ یورپ میں فلسفہ ابن رشد کی پامالی۔ ”وینٹن کونسل“ کا فیصلہ۔

چھٹا باب

263 نزاع مذہب و سائنس دربارہ ماہیت عالم

ماہیت عالم کی نسبت مذہبی خیال یعنی زمین چٹائی ہے۔ بہشت اور دوزخ۔ اہل سائنس کا خیال یعنی زمین گول ہے۔ زمین کی جسامت کی دریافت۔ نظام شمسی میں اس کا درجہ اور نظام شمسی کے دوسرے اعضا کے ساتھ اس کے تعلقات۔ کولبس۔ ڈی گاما اور میکیلن کے تین بڑے بحری سفر۔ سیاحت گرد زمین۔ ایک درجہ کی پیمائش اور راقص ساعت کے ذریعہ سے کریمت زمین کی تعیین۔

کوپرنیکس کے انکشافات۔ دورین کی ایجاد۔ گلیلو۔ ”انکویریشن“ کے اجلاس میں حاضر کیا جاتا ہے۔ اس کی سزایابی۔ سائنس کی فتح کلیسا پر۔

جسامت نظام شمسی کی تحقیق کی کوشش۔ سیارہ زہرہ کے مرور منطقتہ البروج کی بنا پر آفتاب کے زاویہ اختلاف منظر کی تعیین۔ کہ زمین اور انسان کی بیچ میرزی۔

خیالات دربارہ جسامت کائنات۔ زوایائے اختلاف۔ مناظر کواکب۔ برونیہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی آباد دنیائیں موجود ہیں۔ محکمہ ”انکویریشن“ اسے گرفتار کر کے قتل کر دیتا ہے۔

ساتواں باب

294

نزاع دربارہ عمر زمین

بائبل کی رو سے زمین کی عمر صرف چھ ہزار سال ہوتا اور اس کا ایک ہفتہ کی مدت میں بنایا جاتا۔ پادریوں کے علم التاریخ کا انبیاء سلف کی عمروں پر مبنی ہوتا۔ بائبل کے مختلف نسخوں میں مختلف تخمینوں کی وجہ سے تناقض۔

قصہ طوفان نوح۔ روئے زمین کا ازسرنو آباد ہوتا۔ مینارہ بابل۔ اختلاف السنہ۔ انسان کی قدیمی زبان۔

کیسینی کا یہ اکتشاف کہ سیارہ مشتری سطح الارضین ہے۔ نیوٹن کا یہ اکتشاف کہ کرہ ارض سطح الارضین ہے۔ اس اکتشاف سے اس نتیجہ کا استخراج کہ زمین نے حرکات و خیل کے سانچے میں ڈھل کر موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ اجار آبی کی طبقات الارضی تحقیقات سے اس نتیجہ کی تصدیق۔ آثار اجسام ذمی الاعضاء سے اس نتیجہ کی مزید توثیق۔ زمین کی عمر کا اندازہ کرنے میں مدت ہائے مدید کے تسلیم کرنے کی ضرورت۔ مسئلہ پیدائش کی جگہ مسئلہ ارتقاء لے لیتا ہے۔ اکتشافات دربارہ قدامت انسان۔

کائنات کے پیمانہ زمان و مکان کا غیر محدود ہوتا۔ زمین کی عمر کی بحث میں افراط و تفریط سے احتراز۔

آٹھواں باب

314

نزاع دربارہ معیار حق

فلسفہ قدیمہ کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کے پاس احقاق حق کا کوئی ذریعہ نہیں۔ قدیم مسیحیوں میں عقائد کے اختلافات۔ کلیسائی کونسلیں ان اختلافات کے مٹانے کی بے سود کوشش کرتی ہیں۔ حجت معجزہ و حجت ابتلا کی ترویج۔

پیائے روم طریقہ اعتراف سری کو جاری کرتا ہے۔ محکمہ احتساب عقائد کو اپنا آلہ اقتدار بناتا ہے۔ اور اختلافات عقائد کے رفع کرنے کے لئے وحیائے مظالم پر اتر آتا ہے۔

قیصر مسیحین کے مجتہد القوانین کی دریافت اور قانون دینہ کے نشوونما کا اثر نوعیت و ماہیت شہادت پر۔ قانون شہادت میں درایت کی شان نمودار ہونے لگتی ہے۔

”اصلاح کثیر“ کی بدولت ہر انسان کو اپنی عقل اور سمجھ کے لحاظ سے رائے قائم

کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ کلیسائے رومن کیتھولک دعویٰ کرتا ہے کہ حق و صدق کا معیار خود کلیسا ہے۔ فہرست کتب محرمہ کے اجرا سے وہ کتابوں کے مطالعہ کی ممانعت کرتا ہے اور حکم امتناعی کی خلاف ورزی کرنے والوں کا قلع و قمع سینٹ برتھالومیو کے قتل عام کے سے ذرائع سے کرتا ہے۔

پرائسٹنٹ مذہب تورات کو معیار حق تسلیم کرتا ہے۔ تورات کی موثوقیت پر نظر انتقاد ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محرف ہے۔ سائنس کی رو سے معیار حق انکشافات فطرت ہیں۔ پرائسٹنٹ کے نزدیک یہ معیار کتب مقدسہ میں موجود ہے اور رومن کیتھولک کی رائے میں پیائے معصوم اس کا مورد و مہبط ہے۔

نواں باب

342 نزاع دربارہ انتظام عالم

انتظام عالم کے تصور کی دو حیثیتیں ہیں۔ اول بذریعہ توفیق ربانی دوم بذریعہ قانون۔ شق اول کا تعلق پیشوایان مذہب سے۔ شق ثانی کی ترویج کا مختصر بیان۔ کھلو وہ قوانین دریافت کرتا ہے جو نظام شمسی پر مبنی ہیں۔ پیائے روم اس کی تصانیف کی تکفیر کرتا ہے۔ ڈاونی فلسفہ حرکات و جیل کی بنا ڈالتا ہے۔ گلیلیو علم تحریک الاجرام کے اصول قوانین دریافت کرتا ہے۔ نیوٹن اجرام سماوی کی حرکات کو ان قوانین کے جز اطلاق میں لا کر ثابت کرتا ہے کہ نظام شمسی کی عنان نظم و نسق مہندسانہ جبر کے ہاتھ میں ہے۔ ہرشل ثابت کرتا ہے کہ کل کائنات اسی قانون کی تابع فرمان ہے۔ مسئلہ نسبتہ النجوم۔ اس پر متالین کے اعتراضات۔ اس امر کا ثبوت کہ ترکیب ارضی و نشوونمائے سلسلہ نباتی و حیوانی تابع قانون ہے۔ نباتات و حیوانات کا ظہور بذریعہ پیدائش نہیں ہوا بلکہ بذریعہ ارتقا ہوا ہے۔ حکومت قانون کا ثبوت انسانی جماعتوں کے تاریخی حالات اور نیز افراد انسانی سے بہم پہنچتا ہے۔ اصلاح یافتہ کلیساؤں میں سے بعض اس خیال کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ تسلیم کر لیتے ہیں۔

150 دسواں باب

371 لاطینی مسیحیت اور تمدنِ جدید کا تعلق

ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ تک لاطینی مسیحیت نے یورپ کے عقل و ادراک پر قبضہ کئے رکھا جس کے نتائج کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی ہے۔ ان نتائج نے جو شکل اختیار کی رہ اصلاح کینسہ کے وقت شررودا کی حالت اور خاگی و عمرانی زندگی میں یورپ کی حالت سے ظاہر ہوتی ہے۔ اقوام یورپ کے کندھوں پر دہری حکومت کا جوا رکھا ہوا تھا یعنی ایک طرف انہیں حکام دینی کی متابعت کرنی پڑتی تھی۔ دوسری طرف حکام دینی کی۔ اہل یورپ جہالت، اوہام پرستی اور تکالیف مدنیہ میں جلتا تھے۔ رومن کیتھولک مذہب کی ناکامیابی کی وجہ۔ پاپائیت کی سیاسی تاریخ۔ دینی و روحانی حکومت سے ترقی کر کے یہ مطلق العنان شخصی حکومت کی شکل میں بدل گئی۔ کردنیالوں کی انجمن اور کیوریا کی کارروائی۔ پاپائی خزانہ کے لئے بیش قرار محاصل کی ضرورت بد اخلاقی کی محرک ہوتی ہے۔

جو فائدے یورپ کو کیتھولک عہد حکومت میں پہنچے ان میں حکومت کے منشا کو کچھ دخل نہ تھا بلکہ وہ محض اتفاقی یا ضمنی تھے۔ عام نتیجہ یہ ہے کہ پاپائیت کا سیاسی اثر موجودہ زمانہ کے تمدن کے حق میں مضر تھا۔

گیارہواں باب

403 سائنس کا تعلق تمدنِ جدیدہ کے ساتھ

سائنس کے عام اثرات کی مثال تاریخ امریکہ سے۔ سائنس کا یورپ میں داخل ہونا۔ اسلامی اسپین سے چل کر سائنس کا گزر شمالی اٹلی میں ہوا۔ جہاں بوجہ اس کے کہ پاپائیت کا مستقر ایونیاں میں منتقل ہو گیا تھا اس نے خاطر خواہ نشوونما پائی۔ چھاپہ۔ بحری اسفار اور اصلاح کینسہ کا اثر۔ اطالوی مجالس علمی کا قیام۔ سائنس کا عقلی اثر۔ اس نے یورپ میں ادراک کی طرز و روش بدل ڈالی۔ لندن کی رائل سوسائٹی اور دوسری علمی مجلسوں کے کارناموں سے اس کی تصدیق و توضیح۔ سائنس کا اقتصادی اثر ان بیشمار ایجادات متعلقہ فنِ جرئیت و فنِ طبیعیات سے ظاہر

ہوتا ہے جو چودھویں صدی کے آغاز سے کی گئی ہیں۔ ان ایجادات کا اثر صحت بدنی اور خانگی زندگی اور نیز فنون رزم و بزم پر۔

اس سوال کا جواب کہ سائنس نے بنی نوع انسان کو کیا نفع پہنچایا ہے۔ صفحہ

بارہواں باب

441

خطرہ کی آمد آمد

مذہب کے جٹائے خطرہ ہونے کی قریب الوقوع علامات۔ کلیسائے روما جو نصرانیت کا رکن رکین ہے ان علامات کو پہچان کر آنے والے خطرہ سے مقابلہ کرنے کی تیاری کرتا ہے۔ پاپائے پائس تاسع مجلس عمومیہ مسیحیہ منعقد کرتا ہے۔ مختلف دول یورپ کے تعلقات پاپائیت کے ساتھ۔ کلیسا کے تعلقات سائنس کے ساتھ حسب تصریح مندرجہ مکتوب عمومی و تلخیص پاپائیت۔

وٹیکن کونسل کے فتوے عصمتِ پاپا کے متعلق اور نیز دربارہ سائنس۔ کونسل کے فاصلہ کا خلاصہ۔ حکومتِ پروشیا اور پاپائیت کی مٹ بھیڑ۔ یہ مقابلہ تفوق اور غلبہ کے حصول کے لئے دراصل سلطنت اور کلیسا کا مقابلہ ہے۔ یورپ میں دو عملی حکومت کا اثر۔ وٹیکن کونسل کا اعلان اس امر کے متعلق کہ پاپائیت سائنس کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ رومن کیتھولک مذہب کی تحکمانہ ساخت۔ خدا۔ الہام ایمان اور عقل کے متعلق اس کی تعریفات۔ اس کا سب و شتم۔ تمدن جدید پر اس کی لے دے۔

جماعت اتحاد انجیلیہ فرقہ پرائسٹنٹ اور اس کے فیصلہ جات۔

سابق الذکر فیصلہ جات و فتاویٰ پر ایک عام نظر۔ مسئلہ زیر بحث کی موجودہ و آئندہ

صورت۔

مقدمہ

کتابِ معرکہ مذہب و سائنس

رقم زن جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے (علیگ)
سیکرٹری انجمن اردو حیدر آباد دکن

-----|-----

جن لوگوں نے فردوسی کی زندہ کتاب شاہنامہ کو پڑھا ہے انہیں جنگِ سراب و رستم کی دلکش داستان یاد ہوگی۔ شاعر نے اس رزم کو اس خوبی اور لطف اور فصاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور تخیل میں وہ شان پیدا کی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ دونوں آمادہ جنگ و پیکار ہیں لیکن ایک دوسرے سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے تو یہ ہولناک سانحہ اور یہ پرالم ٹریجڈی واقع نہ ہوتی۔

اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ لطف و فصاحت کے ساتھ امریکہ کے نامور فاضل ڈاکٹر ڈریپر نے مذہب و سائنس کی رزم دکھائی ہے۔ مصنف کا زور قلم اور تبحر شاعر کے تخیل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس مضمون پر بحث کرنے میں فاضل مصنف نے دنیا کے تمام علوم اور مذاہب اور انسانی فطرت پر ایسی غائر اور وسیع نظر ڈالی ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ کتاب ختم ہو جاتی ہے لیکن جنگ ختم نہیں ہوتی۔ پڑھنے والا سوچتا ہے کہ کیا یہ جنگ یونہی ٹھنی رہے گی؟ کیا انسان ہمیشہ اسی دھکڑ پکڑ اور دگدا میں رہے گا؟ کیا وہ یونہی اندھیرے میں ٹانک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ اور نور ہدایت کبھی بھی نہ پہنچے گا؟ رستم و سراب کے حال سے تین شخص واقف تھے ایک سراب کا ماموں زندہ رزم جسے اس کی ماں نے اسی

غرض سے ساتھ کر دیا تھا۔ دوسرا بھیر۔ تیسرا کیاوس۔ لیکن افسوس کہ تینوں ہدایت سے باز رہے۔ پہلا درحقیقت نیک نیت ہے اور اسی کام کے لئے تیار ہے لیکن قبل اس کے کہ کچھ کئے رستم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ دوسرا طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہو گیا اور اس نے جان بوجھ کر اس راز کو چھپایا۔ تیسرے نے محض نفسانیت سے کام لیا۔ اسی طرح کی تین قومیں مذہب و علم کی مصالحت میں بھی کھنڈت ڈالنے والی ہیں یعنی جہالت مخالفت حق اور نفسانیت لیکن توہمات اور نفسانیت ایک دن مٹ کر رہے گی۔ حق کا بول بالا ہو گا۔ دونوں مخالف ایک دوسرے کو جانیں اور پہچانیں گے۔ ظلمت کا پردہ درمیان سے اٹھ جائے گا۔ دوستی دشمنی سے رنج راحت سے۔ اور ٹریجڈی کاڈری سے مبدل ہو جائے گی۔ اور انسان کی کشش اور ابھن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکر اسے ہم آگے بیان کریں گے۔

-----۲-----

بچے کو دیکھو اس کی ساری حرکات حیوانی اور اضطراری ہیں۔ اس کا ہاتھ پاؤں مادہ۔ غوں غاں کرتا۔ ڈر سے سسم جانا۔ پیار کرنے سے ہمک کر آنا۔ ماں کی محبت۔ غیروں سے وحشت غرض یہ وہ زمانہ ہے جب کہ حیوانی قوی کا غلبہ ہوتا ہے اور دماغی قوی اذنی حالت میں ہوتے ہیں۔ جب بڑا ہو کر سیانا ہو جاتا ہے تو احساس اور خواہش کا زور شروع ہوتا ہے۔ اور اعلیٰ دماغی قوی کے نشوونما سے نظام جسمانی کی قوت دھیمی پڑ جاتی ہے۔ احساس کی قوت بڑھ جاتی ہے اور حسی غدود اعصابی ساخت اور توسیع میں ترقی ہونے لگتی ہے۔ یہ حالت جوانی دیوانی کی ہے۔ جب شباب کامل ہو جاتا ہے تو تمیز حیوانی۔ احساس اور خواہشات عقل کی تابع ہو جاتی ہیں اور دماغی قوی اپنا رنگ دکھاتے ہیں۔

لہذا انسان کی نشوونما کی تین صورتیں ہوئیں۔ حیوانی۔ احساسی اور عقلی۔

قوة الحيوانية کے ذریعہ سے انسان اپنے جسم میں قوت جذب کرتا ہے۔ اور پھر اسے اپنے افعال۔ جذبات و خیالات اور ارادے میں صرف کرتا ہے۔ مثلاً ”جسمانی ورزش یعنی اعصابی حرکت سے بھوک لگتی ہے۔ سخت رنج و الم یا غصہ یا دیگر جذبات کی وجہ سے آدمی نڈھال ہو کر کام سے رہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ حیات قائم رکھنے کے لئے ہمیں غذا کی ایسی ہی ضرورت ہوتی ہے جیسے انجن کو ایندھن کی۔ یہی ایندھن یا غذا عضلات یا اعصابی ریشہ میں بدل جاتی ہے۔ جب ہماری قوت صرف ہوتی ہے تو ہمارا اندرونی انجن حساب پورا

کرنے کے لیے اہدھن طلب کرتا ہے۔ اگر غذا نہ پہنچے گی تو حساب میں فرق آجائے گا۔ اور ضعف اس قدر بڑھ جائے گا کہ رشتہ حیات ٹوٹ جائے گا۔

قوة الجویہ قوت جمع کر لینے کے بعد اسے حیوانی حسی یا عقلی حصے میں صرف کر سکتی ہے۔ تمام حیوانات سوائے انسان کے اس قوت کو اپنی نشوونما اور اس کے انتقال سے بچنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان میں جو تھوڑی بہت عقل ہوتی ہے وہ غذا کی تلاش، گھر کی ساخت اور زوج کی جستجو میں کام آتی ہے۔ انسان اس قوت کو جو وہ غذا سے حاصل کرتا ہے، اپنے جسمانی حصے کی تکمیل پر صرف کر سکتا ہے۔ اور چاہے تو دماغی تکمیل میں ایک گنوار کو دیکھو اس کی زندگی بہت کچھ جانوروں سے ملتی جلتی ہے۔ وہ بہت بڑی مقدار قوت کی حاصل کرتا ہے اور اسے وہ نغضات، گوشت اور خون کے بنانے میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کا صرف یہ مقصد ہے کہ اپنی زندگی کو قائم رکھے اور اپنی نسل کو بڑھائے۔ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ وہ اس قوت کو دماغ کی طرف رجوع کر دیتی ہے اور وہ یہ خون کی ہر تمام سطح پر پہنچاتی ہے۔ جس سے خاستری رنگ کے عروقی مادہ میں اکسید پیدا ہوتا ہے اور یہ تغیر خیال کے پیدا ہونے کی علامت ہے۔ دن میں جو کمی ہو جاتی ہے رات میں نیند اس کی تلافی کر دیتی ہے اور دماغی ذرات میں اضافہ اور دماغی تلفیت گہری ہو جاتی ہے۔ اور اکسید کے لیے زیادہ گنجائش نکل آتی ہے۔ جس طرح بہت سی چیزیں خون کو بناتی اور برساتی ہیں اسی طرح وہ بعض چیزوں کو بطور فضلے کے خارج بھی کرتا رہتا ہے جو پیشاب پینے وغیرہ کے ذریعہ سے نکل جاتی ہیں لیکن جس قدر قوت کہ جذب کی جاتی ہے وہ سب کی سب پیشاب وغیرہ کی راستہ سے خارج نہیں ہو جاتی۔ بلکہ دماغی ورزش سے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ دماغ میں رہتے ہیں۔ اور ان خیالات کو دماغ میں قائم رکھنے کے لیے بہت سا حصہ قوت کا صرف ہوتا ہے یہ قوت اس طرح مستثمر رہتی ہے۔

صرف غذا کے ذریعہ سے ہی قوت دماغ میں داخل نہیں ہوتی بلکہ ہر حس کے ذریعہ سے کچھ نہ کچھ قوت پہنچتی رہتی ہے اور ہر عضلہ قوت کا توازن قائم رکھتا ہے۔ باصرہ، سامعہ، ذائقہ حرکت کی مختلف صورتیں ہیں۔ جس طرح برف آس پاس کی اشیاء سے ایک متوازن حرارت کی جذب کر لیتی ہے۔ یہ حرارت قوت کی ایک صورت ہے۔ اور جب برف پانی کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے تو یہ قوت اس میں مستتر رہتی ہے۔ پانی جب بخار کی صورت اختیار کرتا ہے تو زیادہ قوت جذب کرتا ہے۔ اس طرح انجماد، سیلان اور تبخیر قوت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح روشنی ایک قسم کی قوت ہے۔ جو روشن جسم کے

اجزائے صغیر کی کپکپاتی ہوئی حرکت پر مشتمل ہے۔ اس کی لہریں آنکھ کی پتلی میں پہنچتی ہیں اور پیچھے کی طرف ریٹنا (شبکہ) پر جا کر گرتی ہیں۔ اور اپنی حرکت دماغی اعصاب تک پہنچاتی ہیں، جہاں وہ روشنی کے علم سے خیال کو پیدا کرتی ہیں۔ آواز بھی ہوا کی حرکت ہے۔ جب ہم اپنی انگلی سے ستار کے تار پر ضرب لگاتے ہیں تو ہوا میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور اس کی لہریں کان تک پہنچتی ہیں جو وہاں سے ڈرم (جوف طبل) میں تموج پیدا کرتی ہوئی اعصاب باصرہ میں جا گونجتی ہیں اور وہاں وہ موسیقی کے خیال سے مبدل ہو جاتی ہیں۔

غرض یہ کہ اعصابی فعل قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہم اس صدمے کی قوت کو جو سرخی کی شعاعوں سے مشبکہ پر لگ کر دماغ پر پہنچتی ہے بتا سکتے ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قوت کہاں صرف ہوتی ہے۔ لہذا وہاں پہنچ کر یہ مستتر رہتی ہے۔ جس طرح کہ سورج کی قوت کوٹکے کی تہوں میں مستتر ہوتی ہے۔ اور اس وقت صرف ہوتی ہے جب وہ جلتا ہے اسی طرح سرخ روشنی کی موجوں کے صدمے سے جو قوت پیدا ہوتی ہے وہ دماغ میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں جا کر خیال میں مبدل ہو جاتی ہے۔ اور حالت منقطع میں رہتی ہے۔

جہاں ادراک نہیں ہوتا وہاں کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ مادر زاو اندھے کے دماغ میں سرخی کا کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دیکھنے کے اعصاب میں وہ قوت نہیں پہنچتی جس سے سرخی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ نفی سے نفی پیدا ہوتی ہے۔ اور عام خیال اور عالم مادی دونوں میں یہ حالت کیساں ہے۔

پس جس چیز کو ہم نے دیکھا سنا سونگھا یا چکھا نہیں اس کی نسبت ہم خیال بھی قائم نہیں کر سکتے۔

عالم خیال یا دواشتوں کے مجموعے یا اس کے صرف کا نام ہے۔ یہ یادداشتیں اور اکات کے آثار باقیہ ہیں۔ اگر خیال صرف نہ کیا جائے تو وہ باقی رہے گا۔ مثلاً فرض کرو حسن کا خیال ہے۔ جب ایک مصور کوئی تصویر بنا رہا ہے اور اس خیال کو کام میں لانا چاہتا ہے تو یہ مستتر قوت اس کے دماغ میں سے فوراً نکل آتی ہے۔

جانور کا فعل اضطرابی ہوتا ہے۔ جسے تمیز حیوانی کہتے ہیں وہ احساس ظاہری کے تابع ہوتی ہے تعقل سے اسے کچھ علاقہ نہیں۔ انسان میں احساس کا اثر اعصاب دماغی تک جاتا ہے جہاں خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ خیال شاملِ مسل رہتا ہے۔ ادراک عقل کا دروازہ ہے۔ احساس علم ہے بیرونی اشیاء کا جو جسمانی اثر سے حاصل ہوتا ہے۔ ادراک میں یہ

اعصابی اثر ایک مرحلہ اور طے کرتا ہے اور بوجہ اس توافق کے جو دماغ اور بیرونی دنیا میں ہے یہ ذہنی صورت اختیار کرتا ہے اور عقلی یا دماغی مظہر بن جاتا ہے۔ بعض اوقات آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچتی ہیں مگر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس لیے کہ ہماری توجہ دوسری طرف ہے۔ یا بعض اوقات ہم آوازیں سنتے یا کتاب پڑھتے ہیں۔ مگر تھوڑی دیر تک سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن جو نئی کہ رکاوٹ رفع ہو جاتی ہے۔ احساس دماغی اعصاب تک پہنچ جاتا ہے اکساد واقع ہوتا ہے اور ان الفاظ کے مطابق جو ہمارے کان تک پہنچتے تھے خیال کی صورت قائم ہو جاتی ہے۔

وہ اعصاب دماغی احساس سے متاثر ہوتے ہیں مقام جذبات لطیف انسانی ہیں۔ انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ خیال کو جذبات لطیف کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہے مثلاً "میں نے ایک شے دیکھی۔ اس کا ادراک خطرے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خوف کے جذبہ کو تحریک ہوئی دل سکڑنا اور دم گھٹنا شروع ہوا۔

انسان میں دماغ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ عقل کا دارالخلافہ ہے اور اسی کی وجہ سے انسان و حیوان اور شائستہ اور غیر شائستہ انسانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ شائستہ اور مذہب اقوام کے لوگوں میں دماغ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ یہ نسبت حبشیوں یا اور جنگلی لوگوں کے بھیل یا گویڈ کی زندگی جن کا انحصار اس کے جسم کی چستی اور چالاکی پر ہے اس لیے اس کی قوت حیوانیہ بہ نسبت دماغ کے جسم پر زیادہ صرف ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے ایک مذہب اور تعلیم یافتہ قوم کے افراد کا انحصار زندگی عقل پر ہے اور اس لیے اس کی قوت الحیوانیہ دماغ کو بڑھاتی اور جسم کو کمزور کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عضلات کی ورزش سے جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری قوت الحیوانیہ کی توجہ زیادہ عضلاتی ریشوں کے بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تعلیم سے فہم تیز ہو جاتا ہے۔ یعنی قوت الحیوانیہ دماغی مادہ کی پرورش میں لگ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر ہم اپنی قوت عضلاتی ورزش میں صرف کرتے ہیں اسی قدر عقلی فعل کمزور ہو جاتا ہے اور جس قدر دماغی کام پر زور دیا جاتا ہے اسی قدر عضلاتی قوت ضعیف ہو جاتی ہے۔

دماغ کی فضیلت کے تو سب قائل ہیں۔ لیکن جذبات انسانی کچھ ایسے قابل وقعت نہیں سمجھے جاتے حالانکہ یہ بھی بڑی چیز ہیں۔ لہذا اب ہم ان کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جذبات عقلی تحریک کے بہت بڑے محرک ہیں۔ ہم ان کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ بعض چیزیں ہم ایسی دیکھتے ہیں یا بعض آوازیں ہم ایسی سنتے ہیں جو ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے جذبات ہماری عقل کو ابھارتے ہیں کہ ایسا ڈھنگ نکال کہ ان خوشگوار اثرات کا پھر اعادہ ہو سکے لیکن بخلاف اس کے جب ہم بعض چیزیں ایسی دیکھتے ہیں یا بعض آوازیں ایسی سنتے ہیں کہ وہ ہمیں ناگوار گزرتی ہیں تو ہمارے جذبات عقل کو ایسے ڈھنگ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کا نام نہ آنے پائے۔

مطالعہ میں اگر لطف نہ آئے تو انسان کی دماغی ترقی کا خاتمہ ہو جائے۔ بال بچوں عزیزوں اور دوستوں سے محبت نہ ہو تو نہ کوئی خاندان ہو نہ لطف محبت ہو۔ شکل رنگ اور آواز کے تناسب سے اگر خوشی نہ ہو تو فنون لطیفہ بھی نہ ہوں۔ یہ سب جذبات کا کھیل ہے۔

جذبات درحقیقت عقلی اور دماغی حرکت کا سرچشمہ ہیں اور ان کی نشوونما انسان کی بہبود اور ترقی کے لیے ایسی ہی ضروری ہے جیسے قوائے عقلی کی نشوونما۔ خیالات اور جذبات کا تعلق ایسا گہرا ہے کہ وہ عموماً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان میں ان بن ہو جاتی ہے۔ مثلاً خواہش کا رجحان ایک خاص طرف ہے۔ مگر عقل کستی ہے کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں۔ اور یہی ہٹائے محاصرت ہوتی ہے۔

جذبات کا اثر جسم پر بہت بڑا ہوتا ہے۔ زیادہ غصہ کرنے سے دل کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مارے شرم کے تمام سطح جسم پر خون دوڑ جاتا ہے۔ شدید جذبات کے اثر سے دماغی ریشوں میں بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے اور دماغی امراض سے عقل میں فتنہ آجاتا ہے۔ ایک خبیث بدباطن کے چہرے کو دیکھنے کیسی پھٹکار برستی ہے بخلاف اس کے ایک نیک نفس زندہ دل کے چہرے کو ملاحظہ کیجئے جیسے پھول کھلا ہو۔

اسی طرح جسمانی حالت کا اثر جذبات اور جذبات کے ذریعہ سے دماغ پر پڑتا ہے۔ بیمار آدمی کیسے چڑچڑے اور غصہ ور ہو جاتے ہیں۔ قوی آدمی کے جذبات بھی قوی ہوتے ہیں اور ضعیف کے ضعیف۔ جب طبیعت نڈھال ہوتی ہے تو خواہشیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں۔ غرض جذبات اور عقل دماغ کی دو حالتیں ہیں ایک زنانہ ہے دوسری مردانہ۔ اگر صرف عقل ہی کی نشوونما اور ترقی زیادہ ہوگی تو جذبات محدود اور کمزور ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر عقل کی طرف سے غفلت کی گئی اور جذبات کی پرورش زیادہ ہوئی تو انسان ذکی الحس اور ہر دل عزیز اور کم عقل ہو جاتا ہے۔

جذبات کا کام عقل کو تحریک دینا اور عقل کا کام جذبات کو اعتدال پر لانا ہے۔ وہ ایک

دوسرے کی امداد کے لیے ہیں نہ کہ زائل کرنے کے لیے عقل انسان میں تشخص اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور جذباتی مدنیّت اور انس بحیثیت عقل کے وہ ایک اور اکیلا ہے۔ اور بحیثیت جذبات کے وہ منہمک اوروں کے ایک ہے۔ پرزور عقل و دماغ کا آدمی اپنے اپنے جس سے بھاگتا اور صحبت سے نفرت کرتا ہے۔ اور تنہائی میں خوش رہتا ہے۔ لیکن پرزور جذبات والے آدمی کے لیے تنہائی موت ہے۔ وہ دوسروں میں ایسا کھل مل جاتا ہے کہ اس میں سے رفتہ رفتہ رنگ تشخص غائب ہو جاتا ہے۔ اور خیالات کو باقاعدہ ترتیب دینے کی قوت نہیں رہتی۔ پرزور عقل و دماغ کا آدمی خود مختار اور آزاد رہتا ہے اور سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں رہتا۔ جہاں عقل ہی عقل ہوتی ہے۔ اور جذبات نہیں ہوتے وہاں صرف اپنی حفاظت اور اپنا ہی خیال ہوتا ہے جو خود غرضی تک پہنچ جاتا ہے۔ جذبات اس میں صرف اپنی ایک ذات تک ضعیف رکھتے بلکہ دوسروں کی طرف بھی مائل کر دیتے ہیں اور دوسرے انسانوں اور اشیائے قدرت سے محبت ہوتی ہے اوروں کے درد کو ہم اپنا درد سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ سے دماغی قوی اور علوم و فنون میں ترقی ہوتی ہے۔

عقل اور جذبات میں اتحاد پیدا کرنا۔ ظاہر اور باطن میں موافقت قائم رکھنا۔ ایک دوسرے کو حد اعتدال سے نہ بڑھنے دینا جسم کے افعال کو عقل و جذبات کے زیر حکومت رکھنا مذہب کا کام ہے۔

فلسفہ و منطق اور علوم نظری عقل کو بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں۔ تمدن، پالیٹکس اور اتحاد مقاصد انسانی و قومی جذبات کو فروغ دیتے ہیں لیکن مذہب کا حق یہ ہے کہ وہ عقل و جذبات کو ساتھ ساتھ اور برابر بڑھائے۔ باہم اعتدال قائم رکھے۔ اور قوت حیوانی کو دماغی اور احساسی حصہ جسم کی پرورش اور نشوونما میں یکساں صرف کرے۔

-----۳-----

حیات کے دو مقصد ہیں ایک ذاتی ترقی دوسرا افزائش نسل۔ قوت کے انجذاب کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اندفاع بھی کیا جائے اور اس غرض سے کہ وہ مادہ اور قوت کا انجذاب اور اندفاع کر سکے حیات کے لیے ضروری ہے کہ اس میں معرفت طبعی ہو۔ جہاں ساخت اعضاء اُن کے درجہ کی ہے وہاں یہ کم ہوتی ہے۔ اور

جہاں ساخت پیچیدہ ہوتی وہاں زیادہ ہوتی ہے۔

بقول لب نثر کے حیاتِ حجرات میں سوتی ہے۔ پھولوں میں خواب دیکھتی ہے اور انسان میں جاگتی ہے۔

اس معرفتِ طبعی میں ارادہ ہونا چاہئے زندہ رہنے، بڑھنے اور نسل کے بڑھانے کا۔ نیز طبعی تمیز ہونی چاہئے جس کے ذریعہ سے وہ سمجھے کہ کیونکہ زندہ رہنا بڑھنا اور نسل بڑھانی چاہئے۔ بغیر اس تمیز کے ترقیِ حیات کے لیے مناسب اور غیر مناسب اشیاء کا انتخاب کرنا ممکن ہے۔ اور بغیر اس ارادہ کے کہ زندہ رہنا چاہئے اس علم سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

تمیزِ طبعی افزائش اور نشوونما کا پیمانہ ہے۔ اس کا تعلق ہر وجود کی ضروریات سے اس طور پر ہے کہ حیات کے ان دو مقاصد کے لیے کافی ہو۔ کیونکہ اگر یہ تعلق اس طرح قائم نہ ہو تو ممکن ہے کہ اس کی قوت ایسی شے کے حاصل کرنے میں صرف ہو جائے جو حاصل نہیں ہو سکتی اور قوت کی تولید ضائع اور بیکار ہو جائے۔ پودے کو نشوونما کے لئے روشنی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ پودا کسی اندھیرے اور گرم حجرے میں لگا دیا جائے تو جو قوت اس نے زمین سے حاصل کی ہے وہ اس شے کے حصول کی کوشش میں صرف ہو جائے گی جو وہاں نہیں مل سکتی۔ جب یہ قوت اس کوشش میں صرف ہو جائے گی تو وہ مرجھانا شروع ہو گا اور مر جائے گا۔

پودے کی نشوونما کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ پانچ چھ ہیں۔ وہ اسے کچھ تو اس زمین سے حاصل ہو جاتی ہیں جس میں وہ لگا ہوا ہے اور کچھ ہوا اور روشنی سے۔ حیوانی زندگی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ ایک جگہ نہیں۔ بلکہ دور پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان کے جمع کرنے لیے اسے حرکت کی ضرورت ہے۔ لہذا وہ اسے دی گئی ہے۔

حیوانات کو ایک اور محرک شے عطا ہوتی ہے جو پودوں میں نہیں۔ یعنی خوشی کا احساس یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ایسا فعل کرتا ہے جو اس کی کامل نشوونما کا باعث ہوتا ہے اور ایک احساسِ تکلیف کا ہے جو اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس سے ایسا فعل صادر ہو جو اس کی ترقی کو روکے۔ اگر اسے تکلیف محسوس نہ ہو تو وہ کھانے کی بھی کوشش نہ کرے گا اور اس طرح اس کی حیات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جو اس ارادہ کو اکساتے اور تمیزِ طبعی کو سبق دیتے ہیں۔ لیکن نہ وہ ایک دوسرے سے مقدم ہیں اور نہ ایک دوسرے کا پیدا کرنے والا ہے۔ چھوٹا پرندہ انڈے کے اندر نہ صرف

خیال کرتا ہے بلکہ اس سے فعل بھی صادر ہوتا ہے کیونکہ وہ نکلنے کے لئے خول توڑتا ہے۔ اور باہر نکلتے ہی دانہ چننے کے لئے چوچ کھولتا ہے۔ قید کی حس نے اس کے ارادے کو ابھارا جس سے اس کے عضلات حرکت میں آئے اور خول ٹوٹ گیا۔ لیکن یہ تمیز طبعی کا کام تھا۔ تجربہ سے کچھ علاقہ نہیں۔ کیونکہ اس سے پیشتر وہ کونے ایسے جس توڑ کر باہر نکلا تھا۔ اسی تمیز نے اس کی چوچ کھلوائی۔ یہ ننھا سا جانور زندہ ہے اور زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے اسے زندگی دی گئی ہے اور زندگی کے ساتھ زندگی کی محبت بھی عطا ہوئی ہے۔ چھوٹا بچہ دنیا میں ارادے تمیز طبعی اور احساسات کے ساتھ آتا ہے۔ زندہ رہنا اس کے لیے لطف ہے۔ خواہش اس کا پہلا احساس ہے۔ اس خواہش کا پورا ہونا اس کی پہلی خوشی ہے۔ خواہش کا پورا نہ ہونا اس کی پہلی تکلیف ہے اور اس کی طلب اس کی پہلی کوشش ہے۔ کس تجربہ نے اسے یہ بتایا ہے کہ منہ اور گلے کے ذریعے دودھ کا پینا اس کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ یہ تمیز طبعی ہے جس نے اسے اس فعل پر آمادہ کیا۔ جس سے اس کی بھوک کا احساس رفع ہوا۔

حیوانات کو خوشی اور تکلیف کے ایسے احساسات ہوتے ہیں جو اس کی حیوانی نشوونما کا باعث ہوتے ہیں۔ ہر چیز جو حیوان کے ارد گرد پائی جاتی ہے جہاں تک کہ اس کی ذاتی نشوونما یا اس کی نسل کی افزائش کا تعلق ہے یا تو اسے خوشی دیتی ہے یا تکلیف۔

نظام اعصابی ایک بڑا قوی آلہ قوت پہنچانے کا ہے۔ تاہم جسم پر حسی اعصاب پھیلے ہوئے ہیں اور یہ سب اعصابی مرکز سے پھوٹتے ہیں جس میں باریک باریک اعصابی جڑیں ہوتی ہیں اور آپس میں خوب ملی ہوتی ہیں سب سے بیرونی عصب جو اثر حاصل کرتا ہے وہ اسے دماغ تک پہنچاتی ہیں۔ اور وہاں یہ اثرات یا خیالات جمع رہتے ہیں اور ان خیالات پر سے افعال سرزد ہوتے ہیں۔ دوسرے حیوانات خیالات سے کام نہیں کرتے ہیں سوائے اس حالت کے جب وہ ان دو مقاصد کے مفید ہوں۔ یعنی ذاتی فلاح اور افزائش نسل۔

انسان اور بھی کئی باتوں میں دوسرے حیوانات سے مختلف ہے۔ دوسرے حیوانات کو جو گرمی سردی محسوس کر سکتے ہیں۔ فطرت نے لباس اور پناہ دے رکھی ہے۔ مثلاً "ان کے بال یا پر یا خول ہوتے ہیں یا زمین کے اندر کھوؤں اور غاروں میں رہتے ہیں۔ جہاں گرمی سردی کا گزر نہیں۔ لیکن جسم انسان کی اعصابی سطح بہ نسبت دوسرے حیوانات کے احساس کرنے میں بہت تیز ہے اور تاہم وہ دنیا میں بے بال و پر کے بیچ منگا آتا ہے لہذا اسے مصنوعی لباس کی ضرورت ہوئی لیکن لباس کے تیار کرنے کے لئے اسے ایسی قوت عطا کی گئی

ہے جو دیگر حیوانات کی تمیز طبعی سے اعلیٰ ہے۔

اسی طرح عقل انسان کی حیوانی فطرت کے لیے ضروری ہے۔ ہر حیوان کو ایسی قوت عطا ہوئی ہے جو اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اور یہ قوت اس ضرورت کی مناسبت سے ہوتی ہے۔

بھیر مادہ اور قوت کو غذا سے اپنے میں جذب کرتی ہے اور وہ قوت اون کی شکل میں مادہ کو پیدا کرتی ہے۔ انسان میں یہی مادہ اور قوت ایک دوسری صورت اختیار کرتا ہے اور دماغ پیدا کرتا ہے۔ جو اسے مصنوعی طور سے سردی سے بچانے میں مدد دیتا ہے۔

اگر ہم انسان کی قوتوں پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ان کی وسعت محض شہوانی زندگی تک نہیں بلکہ اس سے پرے تک پہنچتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک جنگلی انسان کی خواہش اپنی حفاظت تک محدود ہو۔ مگر کثرت سے اقوام انسانی ایسی ہیں جن کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ان کی آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے دماغ میں وہ روشنی پہنچتی ہے جو ہماری زندگی کے اس حصے کو منور کرتی ہے جسے حیوانی یا مادی زندگی سے کچھ تعلق نہیں، ہمیں رتوں کے تناسب۔ حسن صورت اور آوازوں کی موزونیت میں خاص لطف آتا ہے۔ حیوانی زندگی کو ان کی مطلق ضرورت نہیں۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اس میں حیوانی احساس کے علاوہ ایک، اور احساس بھی ہے جسے روحانی کہنا چاہئے۔ کیونکہ اگر ہم اسے نہیں مانتے تو ایک خاص سلسلہ فطرتی تمیزوں۔ احساسات اور قوت ارادی کا محض بیکار جاتا ہے۔ انسان ایسی شیاؤں سے بے حد مسرت اور لطف حاصل کرتا ہے۔ جنہیں اس کے حیوانی احساس سے کچھ تعلق نہیں۔ آسمان پر خوشنما اور خوش رنگ دھنک کو دیکھ کر کتے یا گھوڑے کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ انسان اس سے لطف اٹھاتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دیکھنے سے اس کی روحانی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ جو اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے یہاں تک کہ بچے بھی اس لطف کا اظہار کرتے ہیں۔ لوری یا گانا سننے سے انہیں مزہ ملتا ہے۔ خوبصورت پھول دیکھنے سے وہ بھی اسی طرح خوش ہوتے ہیں۔

انسان کی ساخت میں حصہ اسفل میں حیوانی آلات ہیں اور حصہ اعلیٰ میں روحانی آلات۔ حصہ اسفل کو ہاضمہ اور توالا سے متعلق ہے۔ اور حصہ اعلیٰ قوت حاصل کرنے کا آلہ ہے۔ جسے حصہ اسفل توالد و تناسل میں صرف کر دیتا ہے۔ حصہ اعلیٰ میں دماغ یعنی مقام عقل ہے۔ قوت حیوانی ارادے کے زور سے ہر طرف پہنچ سکتی ہے۔ جذبات گویا اس طرح واقع ہیں کہ ذرا سی ٹھیس سے فطرت حیوانی یا فطرت روحانی کی طرف ہل سکتے

ہیں۔

وحشی اقوام میں قوت حیات شہوانی زندگی میں صرف ہوتی ہے اور دماغ بیکار رہتا ہے لیکن تعلیم یافتہ اقوام میں قوت حیات زیادہ تر دماغ کی طرف مائل ہوتی ہے اور شہوانی زندگی کمزور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سخت دماغی محنت سے اعصابی ریشے زیادہ بیکار ہوتے ہیں اور ان کی درستگی کے لئے دوسرا اعصابی مادہ صرف ہوتا ہے۔ اور وہ ذات جو توالد و تناسل کے لئے ضروری ہیں بننے بند ہو جاتے ہیں۔ لہذا جس قدر دماغی محنت کی جائے گی اسی مناسبت سے وہ توالد و تناسل کے مزاحم ہو گی۔ کیونکہ دماغی محنت میں وہ تمام قوت صرف ہو جاتی ہے جو بصورت دیگر ان ذرات کے بنانے میں صرف ہوتی جو توالد و تناسل کا باعث ہوتے ہیں۔

جب توجہ فطرت حیوانی کی طرف ہوتی ہے اور جذبات و عقل کو اس کے تابع کر دیا جاتا ہے تو دماغ صرف اسی قدر کام دیتا ہے جیسے دوسرے حیوانات میں تمیز طبعی اس وقت وہ مسرت جو حصول علم و ورزش عقل، احساس حسن و غیرہ سے ہو سکتی ہے۔ زائل ہو جاتی ہے۔ بخلاف اس کے جب عقل پر مجبور دیا جاتا ہے تو رنج و راحت کا وہ احساس جو ان چیزوں سے حاصل ہوتا ہے۔ جو حیوانی فطرت سے بہت پرے ہیں تیز ہو جاتا ہے۔ اور فطرت حیوانی کمزور ہو جاتی ہے۔

رنج و راحت کا ادراک کیا ہے؟ یہ درحقیقت قوت کی تحلیل کا نام ہے چنانچہ دوسرے حیوانات کی زندگی دیکھو کہ انسان کو جن چیزوں سے لطف آتا یا صدمہ ہوتا ہے اسے نہیں ہوتا۔ ایک گنوار کو عمدہ تصویر یا خوشخط کتاب دکھاؤ اسے کچھ لطف نہ آئے گا۔ کیونکہ اس کے دماغ میں کوئی شے اسے گرفت یا تحلیل کرنے والی نہیں ہے۔ اس کی حالت صاف شیشے کی چادر کی سی ہے جس میں شعائیں آئیں اور نکل گئیں۔

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مادی قوت ہے ایک روحانی قوت بھی ہے اور روحانی توالد و تناسل کا سلسلہ عالم خیال میں جاری ہے مگر اس طرح نہیں جیسے ہم عالم مادی میں پاتے ہیں۔

پانسو برس ہوئے ایک بڑے دانشمند نے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کے خیالات ننھے ننھے بچ تھے جو ڈال دیئے گئے۔ میں نے اس کتاب کو کھولا اور پڑھا۔ ان بیجوں نے میرے دماغ میں جڑ پکڑی۔ بڑے ہوئے اور پھولے پھلے۔ میں نے ان خیالات کو بات چیت یا تحریر کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچایا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی خیالات وہی باتیں وہی

تخلیل نسل" بعد نسل پیدا ہوا اور بڑھا اور زمانہ کی مناسبت سے اس میں تغیر تبدیل بھی ہوتا رہا۔ گویا یہ سب ان اصلی خیالات کی زندہ اولاد ہیں جو اس وقت وجود میں آئے تھے جب تاریخ کا نام و نشان بھی تھا۔

قطع نظر اس قیاس کے ہم مادی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ قوت میں کیسی کیسی بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً "قوت ہی کے تغیر و تبدیل سے روشنی و حرارت اور برق جیسی مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دماغ میں بھی تغیر و تبدیل سے قوت افعال ارادہ اور اک اور خیالات و جذبات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حیوانی زندگی میں رنج و راحت سے قوت کی تحلیل کا پتہ لگتا ہے اور ہم اس قوت کا اندازہ جو بڑھتی اور نشوونما پاتی ہے اس قوت سے کر سکتے ہیں جو جذب یا داخل ہوئی تھی روحانی زندگی میں بھی رنج و راحت قوت کی تحلیل کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو قوت کہ جذب ہوئی ہے وہ خیالات کے سلسلہ سے نشوونما پاتی ہے۔

مقصد حیات جس کے کارکن رنج و راحت ہیں حیوان کی نشوونما اور اس کی نسل کی افزائش ہے۔ روحانی احساس کا مقصد روحانی زندگی کی نشوونما ہے۔ جسم میں قوت، کا انجذاب ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اندفاع ہوتا ہے۔ اب جو باقی رہی اس سے نشوونما ہوتی ہے۔ حیاتی کے ذریعہ سے روحانی زندگی بڑھ سکتی اور نشوونما پا سکتی ہے۔ ہر درخت اور حیوان کی نشوونما کی ایک حد ہے۔ تو روحانی زندگی کی حد کیا ہے؟

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں ایسی مسرتوں کا احساس ہوتا ہے جنہیں مادی فلاح سے کچھ تعلق نہیں تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہم میں کوئی ایسی قوت ہے جو ہمیں کسی خاص سمت لئے جا رہی ہے۔ وہ سمت کیا ہے؟

دنیا نے اس کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کی غایت تمدنی اور پولیٹیکل ترقی ہے اور اسی پر اسے ساری ہمت اور قوت صرف کر دینی چاہئے اس خیال کی بنا پر بنی نوع انسان کل ایک ہیں جن کا مقصد موجودہ کی تکمیل اور آئندہ کا کمال ہے۔ گزشتہ تجربہ اور علم سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانہ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اور آئندہ زمانہ موجودہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہو گا۔ غرض تمام توجہ اور خیال انسان کی آئندہ ترقی پر ہونا چاہئے۔ اور نیکی اور برائی اس میں ہے کہ جس سے عام بنی نوع انسان کی بہبودی یا مضرت مقصود ہو۔

لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ عقلی ترقی جسمانی انحطاط کا باعث ہوتی ہے۔ نوجوانوں میں ترقی کرتی جائے اس میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو وحشی اقوام

میں نہیں پائی جاتیں۔ ایک وحشی قوم کے بدتر اور ضعیف اور مریض افراد بچپن ہی میں مر جاتے ہیں۔ مذہب ممالک میں امراض اور جسمانی نقائص بڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ کیونکہ سائنس ان خرابیوں کی حفاظت کرتا انہیں پھیلاتا اور آئندہ نسلوں تک پہنچاتا ہے۔ وحشی اقوام میں ازروئے انتخاب فطرت ضعیف اور مریض خود بخود مر جاتے ہیں۔ مذہب اقوام میں اس قانون پر عمل نہیں ہونے پاتا۔ اور اس لیے قوم میں انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔

سب سے اونے جان داروں میں سب سے زیادہ افزائش نسل ہوتی ہے۔ بعض چھوٹے جان دار ایسے پائے گئے ہیں کہ چند گھنٹوں میں اس قدر بچے پیدا کر دیتے ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں بلوغ تک پہنچنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے اور بچے بھی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح جن جانوروں میں عقل کا درجہ بڑا ہے ان میں اولاد بھی کم ہوتی ہے۔ انسان میں بھی یہی قاعدہ جاری ہے۔ غریب لوگ جنہیں جسمانی ورزش زیادہ کرنی پڑتی ہے اور عقل سے کام کم لینا پڑتا ہے۔ ان کے کثرت سے بچے ہوتے ہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جنہیں دماغی محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے ان کے اولاد کم ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے تمدنی ترقی تقسیم کار میں ہے۔ خیر متدن حالت میں جو کام ایک شخص کرتا تھا۔ وہ اب بیس شخص کرتے ہیں۔ پہلے ایک ہی شخص لوہار، بڑھئی، درزی، موچی، معمار ہوتا تھا۔ تھوڑی ترقی کے بعد لوہار کا کام ایک کرنے لگا۔ بڑھئی کا دوسرا۔ درزی کا تیسرا۔ موچی کا چوتھا۔ معمار کا پانچواں۔ اسی طرح ایک ایک پیشہ ایک ایک شخص کو مل گیا۔ اب جو اور ترقی ہوئی تو ایک ہی پیشے کی کئی شاخیں ہو گئیں۔ اور ہر شاخ کا کام علیحدہ علیحدہ شخص کرنے لگا۔ اور روز بروز کام کی تقسیم کو ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص بولتا جاتا ہے۔ دوسرا لکھتا ہے۔ تیسرا صاف کرتا ہے۔ چوتھا اسے صحیح کرتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ہی شخص کا کام ہے۔ کیا درحقیقت یہ تقسیم کار ترقی کی علامت ہے۔

انسان یہاں کچھ ایسے بکھیروں اور مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہے کہ اس کی خوشی کا دارو ہمارے زیادہ تر اس کی ذات پر ہے۔ اسے یہ خیال ہرگز تسلی نہیں دے سکتا کہ آئندہ دو ہزار یا تین ہزار سال کے بعد انسان کی تکلیفیں رفع ہو جائیں گی۔ اس خیال سے اس کی تکلیف یا درد میں تخفیف نہیں ہو سکتی۔ دوسرے ایک ایسی قوم میں جو اعلیٰ درجہ کی مذہب نہیں خوشی کا مقدار بہت زیادہ ہے۔ بہ نسبت ایک ایسی قوم کے جو بہت زیادہ ترقی یافتہ اور

مذہب ہے۔ ایک گنوار یا کھیت کے مزدور کو دیکھو کیسا خوش اور مگن ہے۔ بر خلاف اس کے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں جاؤ مثلاً "لندن پیرس۔ ہنگاگو۔ نیویارک میں جو چشم و چراغ عالم کھلاتے ہیں۔ وہاں امرا خوشی کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں طرح طرح کی کوشش کرتے ہیں، دولت صرف کرتے ہیں لیکن پھر بھی خوش نہیں رہ سکتے اور غریب ہیں کہ قصر و دولت و افلاس میں پڑے ہیں۔ لہذا محض تمدنی و پولیٹیکل ترقی اور محض یہ خیال کہ آئندہ کسی بعید زمانے میں یہ تکلیف اور رکاوٹیں رفع ہو جائیں گی انسان کے دل کو تسلی نہیں دے سکتا۔

اب دوسرا جواب مذہبی عقیدہ میں ہے۔ مذہبی خیال میں حیوانی فطرت کو دخل نہیں۔ ذاتی یا انفرادی مقصد انسان کو زیادہ تحریک دیتا اور ابھارتا ہے۔ بہ نسبت ایک ایسے مقصد کے جس کا تعلق عام بہبودی سے ہو۔ اور انسان میں ایک ایسی خواہش موجود ہے۔ اس میں کچھ شبہ ہو نہیں سکتا۔ عام بہبودی یا ایثار کا خیال ذاتی بہبودی کے خیال کو روک دے گا۔ اور تمدنی اور سیاسی ترقی کی طرف لے جائے گا۔ انفرادی بہبودی کا خیال انفرادی ترقی کا باعث ہو گا۔ ان قوی اور امتیازات کا وجود ہر انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرتے ہیں قطعی ہے۔ دوسرے حیوانات اس وقت تک نہ کوئی خیال سوچتے ہیں اور نہ کسی خیال کو اپنی خواہش کا مصداق قرار دیتے ہیں جب تک کہ وہ ان کی ذاتی نشوونما یا ترقی کا باعث نہ ہو۔ گھوڑا کبھی گوشت کھانے کا خیال نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کی ذاتی نشوونما کے لئے ضروری نہیں پس وہ چیز جس کی طرف انسان کی دماغی اور جذباتی فطرت دوڑتی ہے ان کا بھی ضرور کوئی وجود ہے۔ تمیز طبعی ایک قسم کی خواہش ہے جو ہمارے وجود کے قانون کا اتباع کرتی ہے۔ اور ہر قانون کا مقصد مخلوق کی خوشی اور تکمیل ہے۔

انسان کی مذہبی تمیز کا سراغ لگانا اس کی بہبودی کے قانون کا سراغ لگانا ہے۔ جب مذہبی تمیز ہم میں نمودار ہوتی ہے تو وہ ہماری روحانی فطرت کی آواز ہے جو اس غذا کو طلب کرتی ہے جو اس کی حیات و تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ جب کبھی مذہبی تمیز ہمیں غلطی کی طرف لے جاتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مذہبی تمیز غلط ہے بلکہ یہ بات ہے کہ اس نے اسی قسم کی دوسری تمیزوں کو دبا دیا ہے۔ مثلاً "ہر طریقہ گورنمنٹ صحیح اصول پر قائم ہوتا ہے لیکن جب وہ دوسرے صحیح اصولوں کو پامال کر دیتا ہے تو اس طریقہ گورنمنٹ میں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مذہب میں غلطی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب وہ مجموعہ توہمات ہو جاتا ہے تو اس کے نظام میں خرابی واقع ہو جاتی ہے کسی ایک صداقت میں مبالغہ

کیا جاتا ہے اور اسے آسمان پر چڑھا دیا جاتا ہے اور دوسری صداقتوں سے بالکل روگردانی اختیار کر لی جاتی ہے۔ اس وقت مذہب کو زوال شروع ہوتا ہے۔

انسان میں دو طبی تمیزیں ایسی ہیں جن کا اثر انسان کی تمدنی زندگی پر بہت بڑا ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ہر واقعہ کے سبب دریافت کرنے کی چونپ ہے۔ دوسرے منتہائے کمال کا تصور۔ اب ہم ان دونوں پر الگ الگ غور کریں گے۔

انسان کے دماغ پر وہ دو قسم کے اثرات پڑتے ہیں۔ ایک بیرونی اشیاء کا اثر حواس کے ذریعہ سے یعنی حس ایک ذریعہ ہے جس سے بیرونی اشیاء اور دماغ میں تعلق قائم ہوتا ہے اگر کسی میں کوئی حس نہیں تو اس حس کی وجہ سے جو خیال قائم ہوتا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک مادرِ زانو اندھے کو سرخی کا کوئی خیال نہیں ہو سکتا۔

دوسرے اندرونی اثرات جو دماغ خود اپنے تعلق سے جس سے انسان کی شخصیت قائم ہے حاصل کرتا ہے۔ یہ مسرت۔ غصہ۔ اور خواہش کے ادراک ہیں۔

یہ ادراکات مفرد اور غیر منقسم ہیں اور تعریف کی حدود میں نہیں آ سکتے گویا معرفت طبیعی کے انتہائی سالمات ہیں جن کے ملنے اور ترکیب پانے سے بے شمار مختلف صورتیں قائم ہوتی رہتی ہیں۔ انہیں ادراکات پر بعض ایسے ابتدائی عقائد کی بنیاد ہے جو بہت عام ہیں اور انسان بہت ابتدا میں انہیں حاصل کرتا ہے۔

علت و معلول کا عقیدہ بھی اسی قسم کا ہے۔ تمیز طبیعی انسان کو علت و معلول کی تلاش پر ابھارتی ہے۔ کیونکہ اس کی صداقت کا اسے پورا یقین ہے۔ بغیر اس کے دنیا کی ترقی ناممکن ہے۔ اور دنیا محض اتفاقی نتائج کا مجموعہ نظر آئے گی۔ اور حکمت و سائنس اور علم و اخلاق کا مطالعہ بیکار ہو گا۔

علت کے معنی کیا ہیں؟ جس کی وجہ سے کوئی شے وجود میں آتی ہے علت اونے کہلاتی ہے۔ اور بعد ازاں جو اس میں تغیر و تبدل کرتی ہے اسے علت ثانیہ کہتے ہیں۔ اگر کوئی جسم جو حرکت میں ہے کسی دوسرے جسم سے جو ساکن ہے ٹکرائے اور اسے حرکت دے تو اس کی علت ثانیہ پہلے جسم کی قوت محرکہ ہے لیکن ساتھ ہی خیال اس طرف بھی جاتا ہے کہ پہلے جسم کی حرکت کی بھی کوئی علت ہے۔ علل ثانیہ ایک سلسلہ علل کا ہے جو علت اونے پر جا کر ختم ہوتا ہے اور انسان فطرتاً "علل ثانیہ کے سلسلہ میں اس مصدر حرکت کو ٹھوکتا ہے۔ جو خود بخود پیدا ہوئی اور جسے وہ علت ادنی کہتا ہے۔

علت کا خیال مفرد نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک تو خیال وجود کا ہے اور دوسرے اس

تعلق کا جو عدم سے وجود میں آتا ہے۔ صرف وجود کا ہونا علت کے خیال کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ اس کے متعلق یہ تصور ممکن نہیں ہے کہ وہ سلسلہ علت و معلول سے بالکل الگ ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شے ہے تو اگرچہ ہم صحیح طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان سے کیا مطلب ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہم اسے پورے طور سے سمجھ لیتے ہیں۔ اب اگر ہم ان تمام اشیاء کو جو نہیں ہیں الگ کر دیں۔ نیز ہم یہ فرض کر لیں کہ کوئی اور ایسی شے نہیں ہے۔ جو ان کے پیدا کرنے والی ہو یا ان کے پیدا کرنے میں اس نے حصہ لیا ہو۔ تو عدم سے وجود میں آنے کی حالت ہمارے لئے بالکل ناقابل تصور ہوگی ہم دیکھتے ہیں کہ عدم سے وجود میں آنے کی حالت کا خیال بالکل ناممکن ہے۔

جو عدم کی حالت سے وجود میں آتا ہے تو اسے اس حالت کے پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی شے کی ضرورت ہے جو اس سے بالکل الگ ہو۔ یہ انسان کا ابتدائی عقیدہ ہے۔ جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ جو فلسفی سلسلہ علت و معلول سے انکار کرتے ہیں وہ بھی اپنی زندگی میں ہر وقت اور ہر آن اسی پر عمل کرتے ہیں۔

کیا یہ عقیدہ قابل اعتماد ہے یا محض دھوکا ہے؟

اگر یہ دھوکا ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان علت کا خیال اس واقعہ سے متعلق کرتا ہی۔ جو دوسرے واقعہ سے وقت میں مطابق یا اس سے قبل ہے۔ چاند کی تبدیلی اور موج کی مد ایک ہی وقت میں پائی گئی۔ انسان نے چاند کی تبدیلی کو موج کی مد کا باعث قرار دیا لیکن یہ کیوں نہیں خیال کیا کہ چاند کی کمی بیشی موج کی مد و جزر کی تابع ہے۔

ایک کے بعد دوسرے واقعہ کا ہونا ہمیشہ یکساں پایا گیا ہے۔ اس میں بھی تغیر و تبدل نہیں پایا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ یکسانی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور تاہم علت کا خیال ان میں سے کسی پر عائد نہیں کیا گیا۔ دن رات کے بعد آتا ہے مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ رات دن کی علت یا سبب ہے۔

علت و معلول کا نتیجہ تجربہ سے اور پختہ ہو جاتا ہے۔ تجربہ یقین کا معلم ہے جس طرح احساس تمیز طبعی حیوانی کا۔ اگر تجربہ نہ ہوتا تو ہم کبھی نہ سمجھتے کہ کسی علت کا ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ وجود کے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ قوت کا خیال بھی ہو۔ قوت کا تصور ہو سکتا ہے لیکن یہ ہم نہیں جان سکتے کہ کوئی چیز حقیقت میں ویسی ہے۔ اس طرح قوت خیال تو ہم میں ہے مگر مشاہدہ نہیں کر سکتے۔

علت و معلول کا عقیدہ نہ صرف ہماری نشوونما بلکہ ہماری اعلیٰ ہستی کی ترقی کے لئے

بھی ضروری ہے حیوان کو علت کا کوئی خیال نہیں وہ صرف علل ثانیہ کو دیکھتا ہے۔ کو تجربہ سے بندوق دیکھ کر ڈرنے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس نالی میں سے گولی نکلی تو مجھے چوٹ لگے گی یا میں مری جاؤں گا۔ لیکن وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور اس لیے حیوان کبھی بارود کی ترکیب نہ معلوم کر سکے گا۔ اگر یہ دھوکا ہوتا تو تعجب ہے کہ کیوں لاکھوں آدمیوں کے تجربہ نے اسے غلط ثابت نہ کر دیا؟ اور پھر کیوں انسان اس کی وجہ سے وحشت و جمالت سے نکل کر تہذیب و شائستگی تک پہنچ گیا۔ جس شوق و ذوق سے انسان اسباب کے دریافت کی تحقیق کرے گا، اسی قدر اسے ترقی ہوگی۔ حیوان جو علل ثانیہ تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ اسی حالت میں ہے۔

ادنے سے ادنے دماغ بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں قوت ہے اور اس قوت کا مقام ارادہ ہے اور ہمیں سے انسان کے تمام افعال صادر ہوتے ہیں۔ گو انسان ارادے کی تمام حرکات پر غور نہ کرے لیکن وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ہر قدم اسی پر منحصر ہے۔ جہاں ارادہ رکا ہم چلنے سے رک جاتے ہیں۔ انسان کا خیال ہے کہ وہ اپنے ارادے میں مختار ہے اور اس کے تمام افعال اس مختار قوت پر مبنی ہیں اس کا یہ خیال کہ اس کے افعال ارادی بعید اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ سخت منطقی دلائل سے پیدا کرتا ہے اور ایک مدت کی مشق کے بعد اپنے آپ کو اس خیال کے تابع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

عالم مادی میں انسان ایسی اشیاء میں تغیرات دیکھتا ہے جو عقل سے عاری ہیں۔ وہ ایسی حرکات دیکھتا ہے جس کا باعث وہ نہیں ہے اور ایسے نتائج دیکھتا ہے جن میں اس کا دخل نہیں ہے۔ اس لئے وہ ایک ایسی قوت کے وجود کے اقرار کرنے پر مجبور ہے۔ جس پر اسے کوئی قدرت نہیں۔ جو اس سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور جو اس سے زیادہ قوی ہے۔

انسان میں قوائے دماغی مادہ پر عمل کرتے ہیں۔ جہاں مادہ بلا توسط انسان حرکت میں آتا ہے انسان اس کے سبب دریافت کرنے کی ٹوہ میں رہتا ہے اور اسے وہ ایک ایسی قوت میں معلوم کرنے کی توقع رکھتا ہے جو اس سے باہر ہے اور اسی قسم کی ہے جیسی اس میں ہے۔ ایک ادنے عقل یا غیر صحیح مشاہدہ چھوٹے چھوٹے اسباب (علل) میں پھنس کے رہ جائے گا۔ لیکن جوں جوں عقل روشن اور وسیع ہوتی ہے مشاہدہ زیادہ قوی اور تیز ہوتا ہے سمجھ قریبی اور درمیانی سلسلہ اسباب سے ہوتے ہوئے خود را سرچشمہ حرکت تک پہنچ جاتی ہے۔

باصرف ایسی حس ہے جو قدرت نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو عطا کی ہے۔ لیکن سب میں ایک سی قوت بصارت نہیں ہوتی۔ صحیح طور سے دیکھنا آنکھ کی قوت یا خوبی پر منحصر

نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ یہی حالت چشم بصیرت کی ہے۔ بعض معلومات کے ذریعہ سے علل کو زیادہ تیزی اور خوبی سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اونے اسباب یا علل کے خول سے نکل کر قوت اونے کے مغز تک پہنچنا تربیت یا تعلیم یافتہ عقل کا کام ہے۔

انسان معلوم سے غیر معلوم کو دریافت کرتا ہے۔ اس لئے اس نے جو اس قوت کو جو نیچر میں پائی جاتی ہے اپنی قوت ارادہ کی مثل سمجھا تو اس کا ایسا سمجھنا جائز ہے۔ جب اس نے ایسے معلومات دیکھے جن کی علل کو وہ نہیں بتا سکا تو انہیں ایک ایسی قوت معتد سے منسوب کرنا جو مادہ کے اندر اور باہر ہے بالکل جائز ہے۔ یہی خدا کے خیال کی اصل ہے۔ اب خواہ خدا بہت سے ہوں۔ اور درختوں، دریاؤں، پہاڑوں، بادلوں اور ہواؤں میں ہوں خواہ ایک علت اعلیٰ ہو جو کائنات کا خالق قائم رکھنے والا ہے۔

اس مسئلہ میں بنی نوع انسان کے عام اتفاق کو گزشتہ زمانے کے امام کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اکثر اقوام ایک ہی صغریٰ کبریٰ سے ایک ہی نتیجہ پر پہنچی ہیں۔ امام انسان کی ذات اور اصول و علت و معلول کی صداقت کے یقین میں ہے اور یہ امام ہر ذی عقل پر ہوتا ہے۔

اب ہم انسان کی دوسری تمیز طبعی پر توجہ کرتے ہیں جو انسان کو مستہائے کمال کی طرف لے جاتی ہے۔

حجرات و نباتات و حیوانات سب میں قوت انتخاب پائی جاتی ہے۔ ہر شے دوسری اشیاء میں سے اسی سے ملتی یا اسے جذب کرتی ہے جو اس کے لئے مفید ہے۔ حجرات اور معدنیات کو دیکھا جائے تو وہ اپنے ارد و گرد کی اشیاء میں سے وہی چیزیں اسی قدر اپنے میں لیتی ہیں جو ان میں مل سکتی اور ان کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔ ادویہ کی کیمیائی ترکیب کو دیکھیے۔ ہر دوا دوسری سے گھل مل نہیں جاتی۔ اسی طرح نباتات کا حال ہے۔ پودا زمین سے ہوا اور دوسری اشیاء سے وہی اجزاء اور اسی قدر حصہ جذب کرتا ہے جو اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ یہی حال دیگر حیوانات اور انسان کا ہے۔ لیکن انسان میں دو حصے ہیں مادی اور غیر مادی۔ کبھی تو وہ ان چیزوں کو انتخاب کرتا ہے جو اس کی مادی خوشی اور نشوونما کے لئے مفید ہوں۔ اور کبھی وہ اشیاء جو قوائے حصہ غیر مادی کی نشوونما اور مسرت کے لئے ضروری ہیں۔ اور چونکہ اس میں یہ دو حصے پائے جاتے ہیں اس لئے اس کی قوت انتخاب ڈانواں ڈول رہتی ہے۔ کبھی تو وہ ان چیزوں کی طرف لے جاتا ہے۔ جو مادی خوشی کو بڑھاتی ہیں۔ اور کبھی ان اشیاء کی طرف جو اس کی غیر مادی مسرت میں اضافہ کرتی ہیں۔ غرض

انسان ان دو کشتوں کے درمیان واقع ہے۔ جدھر زیادہ زور ہوتا ہے اوھر ہی کھچ جاتا ہے۔ ایک طعمہ مچھلیاں دو ککٹش آپس میں ہے۔

انسان میں یہ تخائف عجیب و غریب ہے۔ حیوانی زندگی کا مقصد خاص اور محدود ہے لہذا تمام تمیزات حیوانی اس مقصد کے پورا کرنے میں کوشش کرتی ہیں۔ لیکن اس میں جو دوسری قوت ہے وہ اسے بعض اوقات اس دائرہ سے نکال کر ایک دوسرے عالم میں لے جاتی ہے۔ جہاں اس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوتا ہے۔

جس طرح تمیزات طبعی مادی زندگی کی فلاح کے لئے انتخاب کرتی ہیں اسی طرح اور اک غیر مادی حصہ کی فلاح میں بذریعہ انتخاب مدد دیتا ہے۔ اور یہ انتخاب ایک تمیز کرتی ہے۔ جو روحانی زندگی کی فلاح کا خیال رکھتی ہے۔

یہ انتخاب اس طرح سے ہوتا ہے کہ چشم بصیرت کے سامنے بہت سی اشیا یا احساسات آتے ہیں۔ اور ان میں وہ اشیا انتخاب کی جاتی ہیں جنیں تجربہ اور تمیز طبعی اعلیٰ خیال کرتی ہے تخیل پھر ان سب کو ملاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ باعث مسرت ہیں۔ اور اس مجموعہ سے ایک منتہائے کمال قائم کرتا ہے جو جذبات کے سامنے پیش ہوتا ہے اور پھر انہیں اس طرح متوجہ کر کے ارادے کو اس کے حصول کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

دیگر حیوانات میں تخیل بہت اونے درجہ میں ہوتا ہے۔ وہ صرف ان کے سامنے حیوانی خوشی یا خطرہ کو پیش کرتا ہے اور انہیں دونوں کے حالات میں ذرا سا تغیر کر کے ان کی مختلف صورتیں ان کو دکھاتا ہے۔ لیکن انسان کی حالت بالکل مختلف ہے۔ اگر وہ بھی شہوانی زندگی تک محدود رہتا تو اس کی بھی یہی حالت ہوتی۔ حافظہ سمجھ کے سامنے حقیقی واقعات پیش کرتا ہے لیکن تخیل اس سے کہیں آگے نکل جاتا اور نتائج تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو ایک حد تک حواس کی قائم مقام ہو سکتی ہے۔ اور چاہے تو سامعہ اور باصرہ کا کام دے سکتی ہے۔ اور اس کی مدد سے غیر مادی حصہ اپنی سماعت اور اجازت کو بلا قید مکان و زمان ان غیر مادی صورت تک پہنچا سکتا ہے جنہیں یہ خیالی وجود میں ظاہر کرتا ہے۔ اس پر زور قوت کو نہ کوئی محدود کر سکتا ہے نہ کوئی روک سکتا ہے۔ یہ حقیقت اور واقعیت کے سامنے اڑتی ہوئی جاتی ہے اور ہاتھ میں اس کے مشعل ہوتی ہے جس سے راستے پر روشنی پڑتی جاتی ہے اور ارادہ اس کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے۔ تخیل امید پیدا کرتا ہے لیکن اسے سیر نہیں کرتا۔ یہ تحقیق پر ابھارتا اور قیاس کو تیز کرتا ہے۔ لیکن اپنی پرواز سے نیچے نہیں گرتا۔ اور دوسرے حیوانات میں بھی یہ قوت ہوتی تو وہ کچھ کے کچھ ہو جاتے۔ لیکن

چونکہ وہ کسی منتہا کا خیال نہیں کر سکتے لہذا اپنی حالت پر قائم ہیں۔

انسان میں یہ عجیب بات ہے کہ کسی خواہش کے پورا ہونے پر وہ چپکا نہیں بیٹھتا بلکہ اور آگے اور آگے بڑھتا ہے۔ واہمہ اس کے سامنے منتہائے کمال کی ایک تصویر کھینچ دیتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے کوشش کرتا چلا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ ایک انسان یا ایک قوم کا منتہا وہی نہ ہو جو دوسرے انسان یا دوسری قوم کا ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ وہ متضاد ہوں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ جزوی ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیلان ایک ایسے کمال کی طرف ہے جو ان سب کو ایک کر سکتا ہے۔ مثلاً "ایک شخص سرخ رنگ کو بہت پسند کرتا ہے۔ دوسرا نیلے کو تیسرا زرد کو۔ ہر ایک ایک جزو کی طرف مائل ہے اور اس کمال کا ایک رخ دیکھتا ہے۔ جو ان تینوں کو ملا کر ایک ایسی خوبصورت شے پیدا کر سکتا ہے جو قوس قزح کے حسن سے کم نہ ہو۔

منتہائے کمال خواہ وہ عقل کا ہو یا حسن کا، نیکی کا ہو یا عدل کا ہمیشہ انسان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ اس کے خیال علت و معلول نے اس کی سمجھ یا عقل کو علت انتہائی کی راہ بھٹائی ہے جسے وہ خدا کہتا ہے۔ اور اس علت انتہائی میں وہ اپنے تمام اور اکالت کمال کو جمع کرتا ہے اور اس طرح خدا کو قوی و قادر علیم و بصیر اور کمال عدل و خیر و حسن سمجھتا ہے۔

کیا تخیل دھوکا ہی دھوکا ہے؟ کیا عدل و حسن و خیر کی حس جو ہم میں پائی جاتی ہے وہ کچھ بھی نہیں؟

اگر ایسا ہوتا تو انسان کی قسمت بہت بری ہوتی۔ اسے اس کا پختہ یقین ہے کہ جس طرح اس کا جسم بڑھتا اور نشوونما پاتا ہے اسی طرح اس میں ایک روح ہے جو نشوونما پاتی اور ترقی کرتی ہے اور تجربہ سے اسے اس بات کا یقین حاصل ہوا ہے کہ ترقی کے ہر مرحلہ پر اس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوا ہے۔ اگر انسان کے سامنے کوئی منتہائے کمال نہ ہوتا تو نہ یہ شاعر ہوتے نہ مصور ہوتے نہ مفتی۔

انسان کو فطرتاً "دو ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ایک علم کی، دوسری محبت کی۔ علم کا تعلق عقل سے ہے اور محبت کا جذبات سے۔ عقل چاہتی ہے کہ سب میری تابع ہوں اور میرے اشارے پر چلیں۔ جذبات کہتے ہیں کہ ہم سب کو دبا کر رکھیں اور من مانی حکومت کریں۔ مذہب کا تعلق ان دونوں سے ہے۔ وہ عقل سے جذبات کی روک تھام کا کام لیتا ہے اور جذبات سے عقل کے ہوش درست کرتا ہے۔

مذہب کیا ہے؟ مذہب درحقیقت ایک خیال کا اظہار ہے۔ انسان ایک علتِ اعلیٰ کا خیال کرتا ہے۔ جذبات کی ہدایت اور قوت انتخاب کی مدد سے وہ ایک مستہائے خیال کا تصور کرتا ہے اور یہ مستہائے خیال اس کی محبت و پرستش کا مرکز بن جاتا ہے۔

جہاں عقل اور جذبات میں اتحاد و اعتدال نہیں رکھا گیا وہ مذہب نہیں بلکہ ایک قسم کا فلسفہ یا اور کچھ ہے۔

جو مذہب محض استدلالی اور قیاسی ہے وہ کوئی مذہب نہیں وہ فلسفہ ہے اور جس میں صرف جذبات ہی جذبات ہیں وہ اکثر توہمات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ مذہبی جذبات کو جب حد سے بڑھا دیا جاتا ہے تو یا تو پیچیدہ اسرار ہوتے ہیں یا ایک ناوابج خوف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں معر ہیں۔ ایک کو بڑھا کر دوسرے کو گھٹانا ٹھیک نہیں۔ دلی جذبات کی عقل سے روک تھام کی جانی چاہئے اور عقلی پرواز کی اصلاح جذبات سے۔ علتِ اعلیٰ کی تلاش میں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک وحدانیت یعنی ایک خدا کی پرستش دوسرے کئی خداؤں کی پرستش۔ سامی قوموں نے ایک قوت کو مانا جو تمام مطلوات کی علت ہے۔ اور آریا قوم نے ان قوموں کو الوہیت کا درجہ دیا۔ جن کا ظہور نیچر میں ہوتا ہے۔ بعض نے اس جھگڑے کو ہار کے چھوڑ دیا اور دنیاوی بکھیڑوں میں پڑ گئے۔

-----۵-----

مذہب انسان کی گھٹی میں بلکہ اس کی فطرت میں ہے۔ جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو نہیں توڑ سکتا اسی طرح وہ مذہب کو جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے چھوڑ نہیں سکتا۔ شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔ نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہیں گی۔ جدوجہد قائم رہے گی۔ اس کے محدود حالات اس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے۔ لیکن آخر مذہب کی ہو گی۔ تحقیق میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا لیکن قدیم مذہب کسی نہ کسی صورت میں اس کے اندر ضرور رہے گا۔ ممکن ہے کہ سائنس نیچر کے متعلق نئے خیالات پیدا کرے اور خدا کے متعلق پرانے خیالات کو بدل دے۔ لیکن وہ عقیدہ جو ان مٹ ہے خدا کے متعلق نیا خیال پیدا کرے گا کیونکہ سائنس کا قابو یہاں نہیں چل سکتا۔ وہ اسے نہیں جانتا۔ یہ اس کی حدود سے باہر ہے۔ مذہب کی حالت نفس کی سی ہے۔ ہر فروت ہو کر وہ اپنے گھونسلے میں آگ لگاتا ہے۔ مگر انہیں شعلوں میں

سے پھر زندگی پاتا ہے۔ جس طرح انسان کی گزشتہ نسلوں نے نئی نئی تبدیلیاں پیدا کیں اور بہت سے رنگ بدلے مگر اپنا پرانا مذہب خواہ وہ کیسی ہی بے ڈھنگی صورت میں تھا نئی نسلوں کے سپرد کیا جو پھر نئے رنگ میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح ہمارا زمانہ اس میں اور صفائی پیدا کرتا ہے اسے اور اعلیٰ کرے گا اور آئندہ نسلوں کے حوالہ کر جائے گا۔ قرن در قرن اور صدی در صدی یہ کام یونہی جاری رہے گا حتیٰ کہ کسی بعید زمانے میں وہ وقت آئے گا کہ سائنس اور مذہب کا تحائف جاتا رہے گا اور نیچر اور انسانی فطرت کا علم کی معرفت پر فتی ہو جائے گا۔

اب ہم انسان کی تاریخ پر ابتدا سے نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا مذہب ابتدائے آفریش سے اس میں ودیعت ہے یا نہیں۔

ایک انگریز لڑکے ایک جاہل مسلمان، ایک معمولی ہندو یا افریقہ کے کسی وحشی یا کسی مذہب کے عالم یا فقیہ سے پوچھے کہ مذہب کیا ہے اور پھر ان کے جوابات کو غور سے دیکھئے تو سب کی تہ میں ایک ہی بات نظر آئے گی یعنی کسی ایک ذات کی پرستش خواہ وہ کسی صورت اور کسی ڈھنگ سے ہو۔ مسٹر میکڈانڈ جو مدت تک افریقہ کی وحشی اقوام میں رہے ہیں اپنی کتاب افریکینا میں لکھتے ہیں کہ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ ”کوئی شے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور جسے وہ روح کہتے ہیں۔ اور موت کے بعد وہ روح جسم کو چھوڑ دیتی ہے۔“ اس میں کچھ شک نہیں جیسا کہ ہر رٹ اپنر اور دیگر فلسفیوں اور محققوں نے ثابت کیا ہے کہ انسان بھوت پریت یا سایہ سے خدا تک پہنچا ہے۔ اگرچہ اس کا ابتدائی خیال خوف کی وجہ سے اسے اپنے سایہ یا دوستوں اور بزرگوں کی موت یا خواب دیکھنے سے ہوا ہے اور زندگی کے درمیانی مرحلوں میں اس نے پتھروں۔ درختوں جانوروں اور دیگر مظاہر قدرت کے سامنے سر جھکایا ہے لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اس سے باطل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کرایا؟ وہ کیا تھا جس نے اس کا سر پر زور پتے دریاؤں یا سربلٹک پہاڑوں کے سامنے جھکایا؟ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ ڈر ہے۔ ڈر تھا تو بھاگ جاتے چھپ جاتے۔ لیکن بجائے اس کے انہوں نے ایک ایسی قوت کو مانا جو سب سے قوی اور ابدی اور ازلٰی ہے۔ موت سے ڈر تھا تو مرنے سے ڈرتے رہتے لیکن کیوں انہیں روح کا خیال پیدا ہوا؟ اور اس سے پھر وہ اور آگے پہنچے۔ یہ خیال ان کے بچوں تک میں پایا گیا ہے جو الگ رکھے گئے جنہیں کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی۔ اور نہ صرف بچوں میں بلکہ ہرے گوشتوں نے بھی بلا امداد غیرے صرف اپنے خیال اور اپنے تجربہ

سے یہاں تک رسائی کی ہے اور ان میں خدا کا خیال اور روح و جسم کا امتیاز پایا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات انسان میں فطرتاً موجود ہے اور ابتدائے آفرینش سے چلی آ رہی ہے۔

یہ کہنا کہ انسان کو خوف سے یہ خیال پیدا ہوا اور خدا کا خیال سایہ بھوت پریت سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ دیگر مظاہر قدرت کی پرستش سے ایک خدا تک پہنچا لہذا خدا کا خیال بے بنیاد ہے صحیح نہیں۔ کیونکہ مختلف مرحلے طے کر کے کسی شے تک پہنچنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ شے بے اصل ہے۔ دنیا کے تمام اعلیٰ خیال فلسفہ اور سائنس کے تمام اصول ایجادات و اختراعات کو اگر بنظر غور دیکھا جائے اور ان کی تحقیق کی جائے تو ان کی اصل انہیں وحشیوں تک پہنچے گی جہاں سے ہم نے خدا کے خیال کا سراغ لگایا ہے۔ یہ چیزیں انسان کو ارثاً "ملی ہیں۔ اور اسی طرح ایک سے دوسرے کو پہنچتی رہیں گی۔

-----۶-----

علمائے طبیعیات و بعض دیگر فلاسفہ حال و قدیم کا دعوے ہے کہ صرف استقرا ہی علم کی مستحکم بنیاد ہے۔ مگر استقرا کیا ہے؟ تجربہ کے ذریعہ سے نتائج تک پہنچنا۔ لیکن ہمیں کیا حق اس امر کے ماننے کا ہے کہ چونکہ ایک ہی سے حالات میں پانچ ہزار یا دس ہزار سال سے برابر ایک ہی چیز واقع ہوتی آئی ہے تو آئندہ بھی انہیں حالات میں وہی واقع ہو گا۔ یہ ماننا کہ لاکھوں کروڑوں پدموں آدمی مرتے آئے ہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہم بھی مر جائیں گے۔ اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ نیچر میں اصول یکسانی عالمگیر طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کے اصول ہمیشہ یکساں رہتے ہیں ان میں خلل نہیں آتا۔ یہ ہمیں کیونکر معلوم ہوا؟ تجربہ سے تو گویا یہ استدلال یوں قائم ہو گا۔

ہم کیوں کسی عام یا خاص اصول یا صداقت کو مانتے ہیں؟

بوجہ تجربہ کے!

تجربہ پر ہمارا یقین کیوں ہے؟

اس لئے کہ نیچر ہمیشہ ایک ہی نقش قدم پر چلتی ہے اور اس کے اصول میں یکسانی پائی جاتی ہے!

یہ ہم کس لئے مانتے ہیں کہ اصول نیچر میں یکسانی پائی جاتی ہے؟

بوجہ تجربہ کے!

تجربہ پر ہمیں کیوں یقین ہے؟

اس لئے کہ نیچر میں اصول یکسانی پایا جاتا ہے۔

اسی طرح استدلال کرتے جائیے اور پھر پھر کے وہی وجوہ آتی جائیں گی۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اور شے بھی ہے کہ جس پر انتہائی حالت میں تمام انسانی علوم کا دارومدار ہے۔ وہ شے سب سے نیچی تہ میں ہے اور وہ تمیز فطری ہے۔ بین کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس شے کی مشابہت جو ہمارے تجربہ میں آچکی ہے اس شے سے جو تجربہ میں نہیں آئی ہماری نیچر (طبیعت) کے قانون پر مبنی ہے اور وہ قانون اس خیال کے زور سے حاصل ہوا جبکہ تجربہ نے ابھی اسے ثابت نہیں کیا تھا۔

لہذا جس طرح مذہب کا خیال طبعی ہے سائنس بھی اس سے نہیں بچ سکتا کیونکہ آخری بنیاد اس کی بھی تمیز فطری پر ہے جو تجربہ سے مقدم ہے۔

صرف ایک قوت ہے جو بلا واسطہ مجھے دی گئی ہے اور جس کا مجھے علم ہے وہ قوت ارادی ہے۔ باقی جتنی قوتیں ہیں وہ بالواسطہ ہیں اور منطقی استدلال سے دریافت ہوتی ہیں۔ میری قوت ارادی دوسری قوتوں کے دریافت کرنے والی ہے۔ ہر ایک استدلال کسی ایسی قوت یا قوتوں کے متعلق کیا جاتا ہے جو کائنات میں عمل کر رہی ہیں۔ اصل مسئلہ جس سے دوسرے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور جس پر ان کے یقینی ہونے کا دارومدار ہے وہ یہ ہے کہ میں عمل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں۔^۳

مجھے اپنی ہستی کے متعلق کسی منطقی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی معرفت طبعی ہے جو تمام یقینوں سے بالا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں وہی ہوں جو مختلف حالات اور مختلف اوقات میں سے گزر چکا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں خیال کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کر رہا ہوں۔ یہ تمام امور معرفت طبعی سے متعلق ہیں۔ میں اپنی ہستی کا ثبوت اپنے خیالات یا ارادے سے پیدا نہیں کرتا۔ ڈیکارٹ کا یہ کہنا کہ میں خیال کرتا ہوں لہذا میں ہوں۔ اس منطق سے باہر ہے۔ کیونکہ جب میں خیال نہیں کرتا اس وقت بھی تو میں ہوں۔ میں ہوں اس لئے کہ میں ہوں۔ یہ شبہ کرنا کہ آیا میں خیال کر رہا ہوں یا نہیں ارادہ کر رہا ہوں یا نہیں کوئی عقلی دلیل نہیں بلکہ بے عقلی کی بات ہے۔ یہ فلسفہ نہیں بلکہ حق ہے۔ میری ہستی کا کوئی ثبوت میری معرفت طبعی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ معرفت طبعی میری عقلی اور اخلاقی فطرت کے لئے کافی نہیں تو دنیا کا کوئی منطقی استدلال کوئی دلیل کافی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے شکوک کرنے سے عقل کو بے دست و پا کرنا ہے اور یہی شکوک ہیں جو روح کے متعلق کئے جاتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ ہم میں کوئی شے غیر مادی نہیں۔ ہمارا اولین اور یقینی علم وہ ہے جو حواس کی رپورٹ

سے قبل ہے اور حواس کے تابع نہیں۔ لیکن جب حواس کی رپورٹ وصول ہوتی ہے تو عقل اس کی خبر دیتی ہے۔ حواس اور عقل مل کر اور ایک ہی وقت میں کام کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مادیں کہیں کہ یہ عقل مادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا جبکہ یہی نہیں معلوم کہ مادہ کیا ہے؟

یہ یقینی امر ہے کہ میں ہوں اور جب میں اپنی ہستی کا خود باعث نہیں تو پھر میں کیسے یہاں آیا؟ یہ کہنا کافی نہیں کہ میرے پہلے اور اسباب تھے اور ان سے پہلے اور ان سے پہلے اور۔ ان کے بعد آیا جو میرا سبب نہیں تو میں بے سبب ہوں۔ مگر تمام نوع انسان ایسی ہی ہے۔ تمام ہستی تمام کائنات ایسی ہی ہے یعنی یا تو تمام ہستی اور کائنات ایسے ماسبق اسباب کے بعد ظہور میں آئی جن میں قوت تخلیق نہیں یا خود اپنا سبب آپ ہے۔ میں اپنی ہستی کے متعلق اس سے زیادہ خیال نہیں کر سکتا کہ میں ہوں میں خیال کرتا ہوں میں ارادہ کرتا ہوں۔ میں اپنے گرد اوروں میں بھی انہیں تین چیزوں کو پاتا ہوں۔ لیکن میں ان میں سے کوئی یا سب مل بھی میرے یہاں ہونے کا سبب نہیں ہو سکتیں۔ میں یقیناً غیر فانی ہوں۔ میں بے سبب نہیں ہوں نہ اپنا آپ سبب ہوں۔ لہذا میرا سبب کوئی اور ہے۔ جو ان سب سے بالا ہے۔ سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

ہم جو کارگاہ عالم میں مختلف قوتیں دیکھتے ہیں اور جن کا ہمیں اس قدر یقین ہے کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ ہم عقل اور خیال سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہم حواس سے ان کا یقین نہیں کر سکتے آخر ان کا اصلی علم ہمیں کیونکر ہو سکتا ہے؟ صرف ایک طریقہ ہے۔ اپنی قوت ارادہ سے یا ہم اپنے میں ایک قوت دیکھتے ہیں اور اس سے ان قوتوں کو سمجھتے اندازہ کرتے اور یقین کرتے ہیں۔ اور یہ تمام قوتیں ظہور میں اس قوت ارادی کا جو خدا میں ہے جس سے ہماری ہستی ہمارا ارادہ اور ہماری زندگی ہے۔



عالم میں ہر آن تغیر ہے۔ ہر شے بدلتا ہے اور بدلنے پر مجبور ہے۔ اسی قانون سے عالم کو رونق اور ترقی ہوتی ہے۔ انسان بھی اس کا تابع ہے۔ اس میں بھی ہر لمحہ اور ہر آن تغیر رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سات سال بعد وہ سر سے لے کر پاؤں تک بالکل نیا ہو جاتا ہے۔ اور ایک ذرہ بھی پہلے کا نہیں رہتا۔ لیکن باوجود اس کے وہ پھر وہی ہے اور سمجھتا ہے۔ کہ میں وہی ہوں اور باوجود اس کے وہ غور کرتا اور خیال کرتا ہے۔ ہر عضو کے فعل سے اس

عصبو میں تحلیل واقع ہوتی ہے اور اس تحلیل کے ساتھ ترکیب بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ مادہ کے کون سے سالمہ (جزو و مقراطیسی) میں مسلسل غور و فکر ہے۔ اس میں جو ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے یا اس میں جو آتا ہے؟ کیا آکسیجن یا ہیڈروجن کا سالمہ معرفت طبعی (کاشنس) حاصل کرتے ہی چل دیتا ہے؟ اور کیا آنے والا (جزو مقراطیسی) آتے ہی معرفت طبعی حاصل کر لیتا ہے؟ ضرور کوئی شے مستقل ہونی چاہئے جس میں یہ معرفت ہے اور جو غور و فکر کرتی ہے اور جس کا ان مسالمت کی مسلسل آمدورفت پر عمل ہے اور اوراک جس کا آلہ ہے۔ اور جو غیر مادی ہے۔ اور جو روح کھلاتی ہے۔ تمام حیات اس معرفت کے حاصل کرنے سے قبل صرف حرکت اور تبدیل ہوتے ہیں۔ لیکن ہم اس معرفت کو دماغ کے ذرات میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ ہم اعصاب اور دیگر مادی ریشوں سے خاص خاص احساسات منسوب کر سکتے ہیں۔ مگر ان اعصاب اور ریشوں سے معرفت طبعی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ الگ مستقل شے ہے اور یہی ہے جو ہمیں اپنی ہستی کی خبر دیتی ہے اور غیر فانی ہے۔ علاوہ اس کے دماغ کے مختلف حصوں کے مختلف کام ہیں۔ جس طرح مختلف اعصاب کے کام مختلف ہیں لہذا اس معرفت طبعی کا یکساں حالت پر رہنا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اعصاب اور دماغی اعضا اوراک کے تابع اور کارکن ہوں جو سب کا صدر نشین ہے اور سب پر حاوی ہے۔ علم فریٹالوجی (علم کا سر) جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مادیت اور دھرمیت کی طرف مائل کرتا ہے اس پر اگر اس پہلو سے نظر ڈالی جائے تو وہ ہماری اعانت کرے گا۔

مشہور سائنس دان مسٹر پراکٹر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص جو تھوڑی دیر کے لئے بوجہ ضرب کے بیہوش ہو جاتا ہے اور اس میں معرفت طبعی نہیں رہتی تو وہ ہوش میں آکر یہ سوال کرتا ہے کہ وہ غور کرنے والی شے وہ روح کہاں تھی؟ اور یہ خیال خواہ مخواہ اس کے دل میں آتا ہے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے مر گیا تھا۔ تھوڑی سی ضرب سے ایک آدمی بیہوش ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ زور سے لگے تو مر جاتا ہے۔ کیا اس وقت بھی اس میں معرفت طبعی نہیں رہتی؟ اگر ایسا ہے تو کب اور کس طرح وہ معرفت طبعی (کاشنس) حاصل کرتا ہے؟ تھوڑی سی ضرب سے وہ بیہوش ہو کر پھر ہوش میں آجاتا ہے۔ زیادہ ضرب لگنے سے تمام دماغی نظام بگڑ جاتا ہے اور حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ سائنس اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ فی الحال یہ طس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس سے بڑھ کر میں ایک ایسے شخص کی شہادت پیش کرتا ہوں جسے سرتاج ملائے سائنس کہا جاتا ہے اور جو عین اسی زمانہ میں جبکہ ڈارون اپنی مشہور آفاق کتاب (آرگن)

آف ہی ٹیز لکھ رہا تھا۔ اپنی ذاتی تحقیقات سے انہیں مانگ پر پہنچا جو ڈارون نے قائم کئے تھے اور جب اس نے اپنا رسالہ ڈارون کے پاس راکھ سو سائی میں پڑھنے کے لئے بھیجا تو ڈارون تنگ رہ گیا۔ وہ اپنی ایک کتاب میں روحانی قوت اور علم پر بحث کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ”ہمیں کبھی واقعات سے صرف اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ انسانی علم کی ترقی کی تمام تاریخ اور خصوصاً ”وہ علم ہے جسے ہم روحانی کہتے ہیں۔ یہ یقین دلاتا ہے کہ جب کبھی اہل سائنس یا کسی زمانہ کے عام معلمین نے ایسے واقعات سے جو بہت سے اوسط درجہ کے ایماندار اور ذہین محققین نے خود دیکھے اور بیان کئے ہیں محض اس وجہ سے انکار کر دیا ہے کہ یہ ممکن نہیں یا وہ قانون قدرت کے خلاف ہیں تو یہ منکرین ہمیشہ غلطی پر غلبت ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس فاضل عصر نے خود اس بارے میں بڑی بڑی تحقیقاتیں کیں اور بعد کامل غور اور چھان بین کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بیشک روحانی قوت موجود ہے اور جو مظاہر روحانی طرح طرح سے ظہور میں آتے ہیں بالکل صحیح ہیں۔ اور نہ صرف اس نے بلکہ مشہور و معروف ڈاکٹر نوبل سرجان فوربس اور ڈاکٹر کارنیز اور دیگر علما نے بعد تحقیق کے اس اصلیت کو تسلیم کیا۔ فاضل موصوف کا خیال ہے کہ وہ بڑے لوگ جنہوں نے اس کا انکار کیا غلطی پر تھے اور اگرچہ علمائے سائنس ان شادتوں کی پروا نہیں کرتے اور ہنسی اڑاتے ہیں لیکن اس امر کا پورا پورا یقین ہے کہ اسی صدی میں تمام منصف مزاج تعلیم یافتہ لوگوں کو ان باتوں کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اسی فاضل نے اس کمیشن کا بھی مفصل حال لکھا ہے جو اس امر کی تحقیق کے لئے بیٹھا تھا اور جسے تسلیم کرنا پڑا تھا کہ روحانی قوت بے شک ایک ایسی قوت ہے جو مادہ سے الگ اور بالا ہے۔ اس کمیشن کے ممبر تمام مشہور سائنس دان تھے۔



انسان جو اپنے تئیں اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سارا عالم یہ ساری کائنات میرے ہی لئے ہے۔ جس نے اپنی بے باط سے زیادہ قدم مارا ہے اور اسرار عالم کے دریافت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا وہ اگر اپنی آس پاس کی اشیاء پر غور سے نظر ڈالے تو ہر چیز نئی اور پر اسرار معلوم ہوگی اور ایک ذرے تک کی حقیقت سے وہ اپنے آپ کو ایسا ہی بے خبر پائے گا جیسے اس کائنات کی حقیقت ہے۔ جب ہم اس کہ پر نظر ڈالتے ہیں جس پر ہم آباد ہیں تو بے شک یہ بہت وسیع نظر آتا ہے اور اس قدم وسیع کہ باوجود اس

ترقی اور تحقیقات کے ابھی تک ہم اس کے علم پر حاوی نہیں ہوئے لیکن نظام شمسی کے مقابلہ میں یہ بہت ہی چھوٹا ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کے اور نظام موجود ہیں اور یہ عالم سیارگان کے مقابلے میں ایک نقطہ کے برابر ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات کے سامنے اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ اس طرح وقت پر نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ زمین کی نشوونما میں جو وقت صرف ہوا وہ بے انتہا زیادہ ہے۔ اس وقت سے جو ایک درخت کے بڑھنے سے اور بننے میں صرف ہوا۔ لیکن اگر اس وقت کا مقابلہ نظام شمسی کے زمانہ نشوونما سے کیا جائے تو بہت ہی لمبے اور بمقابلہ عالم سیارگان ایک لمحہ کے برابر ہے اور ابدالاباد کے مقابلہ میں بیچ۔ زمین کی ساخت کو دیکھ کر بہت سے ایسے ثبوت ملتے ہیں جن سے اس کی گزشتہ حالت پر ایک گونہ صحیح رائے قائم ہو سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں یہ بے انتہا گرم تھی۔ اور مختلف زمینوں کے سرو ہونے کے متعلق جو تجربے اور تحقیقات کی گئی ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس آتشیں مزاج کرہ کے ٹھنڈا کرنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس لگے ہوں گے۔ جب نظام شمسی کے ایک بہت چھوٹے کرہ کی حالت درست ہونے میں اس قدر عرصہ دراز لگا تو خیال کرنا چاہئے کہ ان کروں کے لئے جو اس سے سیکنزوں درجے بڑے ہیں کس قدر عرصہ درکار ہوا ہو گا۔ جب انسان یہ سوچتا ہے کہ سورج سے بھی بڑے سیارے موجود ہیں اور نظام شمسی جیسے دوسرے نظام بھی ہیں اور اس سے پرے اور نظام ہیں اور اس کے آگے اور ان کے بعد اور اور یہ سلسلہ نامتناہی یونہی چلا جاتا ہے تو خلائے بیست کا خیال حد و ہم سے گزر جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ زمانہ کا خیال کرتا ہے ایک اونے اور حقیر کرے کے درست ہونے میں لاکھوں کروڑوں برس لگ گئے ہیں تو اس کل نظام اور دیگر نظامات میں کتنا وقت صرف ہوا ہو گا تو انسان مارے حیرت کے حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ عجیب و غریب حیرت انگیز کارخانہ کس ترتیب اور قاعدہ سے برابر چل رہا ہے اور تمام نظامات ایک ہی اصول پر حرکت کر رہے ہیں اور کیا مجال کہ اپنی حد سے تجاوز کریں تو اس حکیم مطلق کی حکمت و قوت کی عظمت عقل و دہم میں نہیں سما سکتی جو اس کارخانہ کا چلانے والا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک سائنس دان یہ کہے کہ یہ سب وہم ہے۔ کائنات میں سوائے مادہ اور سالمات کی حرکت اور کشش کے کچھ نہیں ہے۔ تمام عالم اور آسمانی خلا میں مادہ ہی مادہ منتشر ہے جس کی ابتدائی حالت ٹھوس ذرات کی ہے جو مختلف جسامت کے ہیں جن کی آپس کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس میں گاس نکلتی ہے۔ جو نیولا (ضبابہ) کی شکل پکڑ لیتی ہے۔ یہ ضبابہ نظام شمسی کے احاطہ کشش کے اندر آکر سورج کی مدور راہ میں داخل ہو

جاتے ہیں۔ اگر بعض ان میں سے ہمارے کہہ کے پاس سے گزرتے اور اس میں داخل ہوتے ہیں تو رگڑ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور ان سے شباب پیدا ہوتے ہیں جو اکثر زمین پر گرتے ہیں۔ یہی اجسام بے انتہا اصلی سیارے اور شمس ہیں۔ ان کی ترکیب انہیں عناصر سے ہوتی ہے جو منجمد ہو کر بڑے بڑے ثوابت کو بناتے ہیں۔ ان شاہوں سے جو بعض اوقات ہماری زمین پر گرتے ہیں ہمیں اس مادہ کا نمونہ ملتا ہے جو تمام خلائے عالم سیارگان میں منتشر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ بے انتہا اور کثیر شہابی مادہ جس کی وسعت خیال سے باہر ہے کہاں سے آیا؟ اس کی حالت ماضی کیا تھی؟ یہ مادہ جو ابتدا میں بالکل سادہ اور اجزائے لاتبیرے کی حالت میں تھا۔ اس صورت میں کیسے آگیا جسے ہم عناصر سے تعبیر کرتے ہیں؟ اگر ہماری رسائی ابتدائی جزا کے عالم تک ہو بھی جائے تو بھی یہ مشکل حل نہیں ہوتی۔ کیونکہ پھر ہمیں ان قوتوں کی اصلیت پر غور کرنا ہو جن کے زور سے یہ اجزائے لاتبیر مادے اور عوالم کی صورت میں ہویدا ہوئے اس سادہ سے سادہ قوت میں کہاں سے اتصال پیدا ہوا؟ یہ کیمیائی قوتیں کدھر سے آئیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ پراسرار قوت تشعشع کہاں سے آئی جو غیر محدود اور غیر متبدل اور تمام عالم کی رونق کی اصل ہے؟ ان مسائل سے بھی بڑھ کر اہم اور لائیکل مسائل ابھر رہے ہیں۔ کپکپاہٹ پیدا کرتی ہیں اور جو حرارت۔ روشنی الکٹریٹی کی مختلف صورتوں میں تمام تبدیل ہوتی۔ حرکات سالمات اور مادہ کی ان بے انتہا تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہیں جو حیات کی نشوونما کا اصل باعث ہیں؟ ان تمام سوالات کا کوئی قطعی جواب نہیں اور غالباً نہ کبھی ہو۔

قدیم سے قدیم نظریہ مادہ سے لے کر جدید سے جدید نظریہ پر غور کرو۔ ہر ایک میں یہی لائیکل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور کوئی اس کائنات کی علت العلل کے قریب نہیں پہنچتا۔ اور زیادہ سے زیادہ بقول ہررٹ سپنر تمام مظاہر میں ایک نامعلوم اور ناقابل دریافت قوت کے ظہور کا ادراک ہوتا ہے یا جیسا کہ اسی علامہ دہرنے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل لکھا تھا ”ہستی کی یہ خالی صورت جسے خیال نے ہر طرف اپنی بساط کے موافق تحقیق کیا ہے اور پھر اس سے پرے جہاں وہم و خیال کے پر جلتے ہیں۔ جب اس معلوم کا اس نامعلوم اور غیر معقن وسعت سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو خیال کی یہ ساری تحقیقی بیچ و بے حقیقت ہو جاتی ہے۔ یہ خیال اور پھر اس خلائے بسیط کا خیال جس کے مقابلے میں ہمارے بے انتہا ظلمات کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایسا ہے کہ اس کے ذکر کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کچھ عرصے سے یہ طبعی ادراک کہ یہ غیر محدود خلا بغیر کسی اصل اور سبب کے موجود ہے اور موجود رہے گا۔ میرے دل میں ایسا خیال پیدا کرتا ہے کہ اس کے سامنے میں سما جاتا ہوں۔

مادین کا یہ خیال ہے کہ مادہ ہی سب کچھ ہے اور مظاہر عالم کی مسمتی سلجھانے کے لئے کافی ہے۔ روحانی یا الہی اثر سب فسانہ ہے۔ ویمافر۔ طس سے لے کر اس وقت تک اس کے ماننے والے موجود ہیں اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے اس مذہب کو اور بھی قوی کر دیا ہے۔ ہر زمانہ میں تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فلاسفر اور علمائے علوم طبیعیات کو اس کا شوق رہا ہے کہ کوئی نظریہ ایسا قائم کریں کہ جس سے تمام اشیا اور مظاہر کی کنہ دریافت ہو جائے اور اس خیال نے لوگوں کو مادیت کی طرف مائل کیا ہے۔ کیمیادی تحلیل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادہ خواہ کسی صورت میں ہو اور کیسے ہی مختلف حالات اختیار کر لے وہ نہ تو فنا ہو سکتا ہے اور نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ پھر علم کیمیا کی رو سے ایسے مرکبات ترتیب دیئے گئے جو اب تک بغیر قوت حیوانیہ کے دشوار سمجھے جاتے تھے اور آخر بڑھتے بڑھتے اول مادہ کے متعلق نظریہ اجزائے ویمافرطیسی قائم ہوا اور سب سے آخر نظریہ اجزائے لا-تھری۔ ان سب تحقیقوں اور نظریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان دہریت اور مادیت کی طرف ڈھلتا ہوا چلا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر عالم کا باعث ہے؟ اور کیا اس کے ساتھ کوئی اور شے ایسی نہیں ہے جو اس سے مختلف ہے۔

اب ہمیں تحقیق یہ کرنا ہے کہ جب ہم کسی مظہر کو دیکھتے ہیں تو مادہ کا اس میں کہاں تک دخل ہوتا ہے اور ان کا کیا باہمی تعلق ہے؟ دوسرے اگر کوئی مظہر ایسا ہے جو مادے سے بالکل آزاد ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ مادہ اس کا باعث نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ اگر ہم کسی مظہر کو بغیر مادے کے نہیں پاتے تو کیا صرف مادہ ہی اس کا کافی اور وائی باعث ہے؟ فرض کرو کوئی مظہر معلوم ہے۔ اس کے ہم چند اسباب قرار دیتے ہیں لیکن یہ یقین نہیں کہ آیا یہ اس کے لئے کافی باعث ہیں یا نہیں۔ تو ہم ان اسباب کے نتائج پر غور کریں گے۔ اگر یہ نتائج پورے اترے تو ہم سمجھیں گے وہ اسباب کافی ہیں اور اگر نہیں تو ہم اس شے کو تلاش کریں گے جو ان نتائج کا تکملہ کرتی ہے جو اب تک سب نامعلوم تھا۔ مثلاً ”جب سیارہ یوریس دریافت ہوا۔ تو بعض مندسوں نے یہ دیکھا کہ جس طور پر وہ سورج کے گرد گردش کرتا ہے اور جو دائرہ وہ بناتا ہے اس کے لئے صرف سورج کی اور بعض اور چھوٹے سیاروں کی کشش جو یوریس سے چھوٹے ہیں اور اس کے اور سورج کے درمیان واقع ہیں اس گردش اور دائرہ کی کافی باعث نہیں۔ اگر صرف یہ کشش ہوتی تو وہ ایسا دائرہ نہ بناتا بلکہ اس کی صورت اور ہوتی۔“

ان مندسوں نے محض ریاضی اور ہندسہ کے زور سے یہ قیاس قائم کیا کہ ہو نہ ہو فلاں مقام کا کوئی ستارہ یوری نس سے پرے واقع ہے جس کی کشش کا اثر اس پر پڑتا ہے۔ چنانچہ بعد میں اس مقام پر دور بین کے ذریعہ سے وہ سیارہ دریافت ہوا جسے اب نیپچون کہتے ہیں۔ اسی طور پر اس عالم کو لیتے ہیں اور مادہ کو جہاں تک اس کا دخل اور صفات و اثرات ہیں پورے طور آزادی دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا وہ اس کا کافی باعث ہے یا کوئی اور شے بھی ہے جو اس کا مکملہ کرتی ہے اور مادہ سے خارج ہے؟ پس اگر کوئی ایسی شے ہے تو یہ نتیجہ نکالیں گے کہ مادہ اس عالم کا کافی باعث نہیں ہے کہ اور اس کے بعد ہم مادہ کی حقیقت پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا وہ بذات خود قائم اور کافی ہے۔

مظاہر کائنات میں جن پر ہم بحث کریں گے ان کی تقسیم سرسری طور پر یہ ہوگی۔
۱۔ قوت : جو حرکت، اتصال اجزائے لاتبخبرے اور کشش کیماوی سے ظاہر ہوتی ہے

۲۔ حیات : حیوانی یا نباتی۔

۳۔ قوت : مدرکہ۔

۴۔ ادراک طبعی (کاشس نس)۔

۵۔ جذبات اخلاقی مثلاً "محبت رحم وغیرہ۔"

ہماری سب سے اول تحقیق یہ ہے کہ کیا ہم کسی ایسے مظہر یا مظاہر کو بھی دیکھتے ہیں جو مادہ سے اس قدر الگ ہوں کہ مادہ ان کا باعث نہ ہو یا باعث جزوی ہو؟ قوت اور حیات کے متعلق ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم انہیں سوائے مادہ کی تحقیق کے کسی اور طرح نہیں جانتے اب رہی قوت مدرکہ اس کے متعلق مختلف خیال ہیں۔ بعض کا یہ مذہب ہے کہ وہ مادہ سے آزاد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ دماغ کا نتیجہ ہے۔ اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ نظام اعصابی قوت مدرکہ کا آلہ ہے اور وہ اس طور پر کہ تمام افعال ادراکی کا تعلق اس نظام کی ساخت اجزائے لاتبخبرے کی حرکت سے ہے۔ اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات رہ جاتی ہے کہ آیا وہ اس کا باعث کافی ہے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ قوت بلا شرکت مادہ ہمیں کس نظر نہیں آتی۔

مگر اس میں شک نہیں کہ ادراک طبعی (کاشس نس) یعنی خالص قوت مدرکہ کا قوت مدرکہ پر غور کرنے کا فعل مادہ سے بالکل بے تعلق ہے۔ اور بلاشبہ وہ جذبات جن میں غرض کا مطلق لگاؤ نہیں ہوتا مثلاً "محبت یا رحم بھی مادی تعلقات سے بری معلوم ہوتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں مادہ سے کچھ واسطہ نہیں۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ادراک طبعی (کاشس نس) کو ان دیگر ادراکی افعال

سے الگ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جن کا تعلق دماغ کے تقضرات اجزائے لاتبیجزے سے ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے جذبات سے ہمارے جسم اور دماغ پر کس قدر اثر پڑتا ہے مثلاً "دفتا" سر میں درد ہوتا۔ چہرہ کا سرخ ہو جانا۔ نبض اور سانس کا تیز ہو چلنا۔ تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم مادہ کی شرکت سے بری نہیں ہو سکتے اور اسی اعتراف سے مادین کی بن آتی ہے۔ کیونکہ مظاہر عالم کہیں بلا تعلق مادہ نہیں پائے جاتے۔ اس کا لگاؤ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ ضرور نہیں کہ صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر کا باعث کافی و دانی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے تو کون سی شے ہے جو اس کا کھلمہ کرتی ہے۔

شائد یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن بہر حال یہ یاد کرنا چاہئے کہ مادہ کے وجود کی شہادت سوائے قوت مدرکہ کی اطلاع کے اور کوئی نہیں ہے۔ یعنی مادہ کا وجود خود قوت مدرکہ کا نتیجہ ہے جو وہ بعض واقعات سے اخذ کرتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف حواس کا یقین کرنا چاہیے اور قوت مدرکہ کے نتائج کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ مادہ جس سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق قوت مدرکہ سے ہے جو اس کے واقعات سے نتیجہ نکالتی ہے۔ اس امر کو مشہور فلسفی بشپ بارکلی نے نہایت خوبی کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ میں یہاں اس فلسفہ کو بالتفصیل بیان نہیں کرتا بلکہ اسی قدر اشارہ پر کفایت کرتا ہوں۔

مادہ کی تین حالتیں ہیں جو قدیم سے اب تک تسلیم کی گئی ہیں ٹھوس جیسے برف سیال جیسے پانی اور دھانی جیسے آئسین یا ہائیڈروجن۔ بعض اہل سائنس نے ایک اور حالت بھی اضافہ کی ہے جو گیس سے بھی زیادہ لطیف ہے اور وہ شعاعی کہلاتی ہے۔

مادہ کی نسبت یہ خیال کیا گیا ہے کہ وہ اجزائے لاتبیجزے سے بنا ہے۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے اجسام ہیں جن میں مادہ کے تمام خواص موجود ہیں اور ان کے باہمی تعلق کو قوت اجزائے لاتبیجزے کہتے ہیں۔ اور ہر جزو دمقراطیسی کسی نہ کسی کیمیادی عنصر کے ایک یا ایک سے زائد اجزائے لاتبیجزے سے بنا ہے اور ان مختلف عناصر کے دمقراطیسی میں جو تناسب پایا جاتا ہے وہ کیمیادی اتصال کے قوانین کی رو سے عمل میں آتا ہے۔

یہ اجزائے لاتبیجزے اور اجزائے دمقراطیسی کیا ہیں؟ انسان کی آنکھ نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا ہے اور ان کے وجود کا علم ہمیں اسی طرح استدلال اور قیاس سے حاصل ہوا ہے جیسے روح کا ہے۔ جزو لاتبیجزے میں چند خواص و صفات مانی گئی ہیں۔

اول قوت اتصال یا کشش اجزائے لاتبیجزے۔ یہ وہ قوت ہے جو ہر شے کو جو جزو

لا تینجرے سے بڑی ہے مجتمع رکھتی ہے۔ یہ قوت ٹھوس حالت میں زیادہ۔ حالت سیال میں کم اور حالت دغالی میں بالکل نہیں ہوتی۔

دوم یہ خیال کیا گیا ہے کہ ہر جزو لاتیجزے ایک انتعاشی حرکت سے بے چین رہتا ہے اور وہ اس حرکت کے مختلف نتائج سے مادہ کی ٹھوس سیال دغالی اور شعاعی حالتوں میں فرق پیدا ہوتے ہیں۔

سوم۔ ہر جزو لاتیجزے میں نہ صرف بیرونی حرکت ہوتی ہے بلکہ ایک حرکت اندرونی بھی ہوتی ہے۔ بیرونی حرکت کل جسم یا نظام کی ہے اور اندرونی حرکت ایک حصہ جزو لاتیجزے کی دوسرے حصے پر ہے۔ مگر اس حرکت سے اس کی اجتماعی حالت زائل نہیں ہوتی یعنی یہ نہیں ہے کہ اس کا ہر حصہ الگ ہو جائے۔ اس حرکت میں کپکپاہٹ پائی جاتی ہے۔ چہارم ہر شے کے اجزائے تیجزے ایک ہی جسامت کے خیال کئے گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایک شے کا ہر حصہ ایک سا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک گیس کی دو قسمیں پیدا کرنا جو مختلف اجسام کے اجزائے لاتیجزے سے بنی ہوں ناممکن ہے۔ اس سے مفصل ذیل نتائج نکلتے ہیں :

۱۔ ایک شے کا اجزائے لاتیجزے بالکل ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ مگر وہ دوسری اشیاء کے اجزاء سے مختلف ہوتے ہیں۔

۲۔ مختلف اشیاء کے اجزائے لاتیجزے جسامت میں مختلف ہوتے ہیں اور ان میں کامل تدریجی ترقی نہیں ہوتی۔

۳۔ ایک شے کے اجزائے لاتیجزے اپنی اندرونی حرکت میں توافق رکھتے ہیں اور اس لئے اس روشنی میں بھی جو ان سے نکلتی ہے۔

۴۔ کسی جزو لاتیجزے میں کسی عمل سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

مادہ کی صحیح تعریف کرنا نہایت مشکل ہے اور نہ طبیعیات کی کسی کتاب سے اس تعریف کا پتہ لگتا ہے۔ لیکن نظریہ اجزائے لاتیجزے کا (جو مادہ کے متعلق جدید نظریہ ہے) صحیح بیان مختصر طور پر کر دیا گیا ہے۔ اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور ان میں سے ایک جزو لاتیجزے لیتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے چھوٹا جزو مادہ ہے جس میں تمام صفات و خواص مادہ کے موجود ہیں۔ یا تو وہ سادہ یعنی مفرد ہے جیسے آکسیجن کا جزو لاتیجزے یا مرکب جیسے پانی کا جس میں دو اجزائے دمقراطیمی ہائیڈروجن کے ہیں اور ایک آکسیجن کا۔ اس صورت میں جزو دمقراطیمی ایک مرکب شے ہے کیونکہ ازروئے علم کیمیا اس زمین پر تخمیناً

ستر اشیاء ایسی ہیں جو مفرد یا سادہ حالت میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں دوسرے سے ترکیب پانے کی (بشرطیکہ وہ ترتیب پا سکے) مختلف مقدار کا لحاظ ہوتا ہے۔ وہ بعض کو بعض شرائط پر اپنے ساتھ ملاتی ہے اور بعض کو رد کر دیتی ہے۔ غرض ہر ایک دوسرے سے بوجہ کیمیائی کشش و اندفاع الگ اور مختلف ہے۔ ہم نے اجزائے لاتبجزے اور اجزائے دمعتراطیسی دونوں کو دیکھ لیا۔ ان میں کائنات کی ساخت کا اصل مسالا نہیں پایا جاتا بلکہ ساتھ ستر اشیاء ایسی ہیں۔ جو اپنی صفات کے لحاظ سے الگ الگ ہیں اور جن کی ترکیب سے بیشمار ایسا مواد تیار ہو سکتا ہے جو اجزائے لاتبجزے کے گدام کے لائق ہے۔ جزو لاتبجزے کیمیائی ساخت کے لحاظ سے اکثر مرکب ہوتا ہے۔ لیکن وہ طبیعیات کی رو سے بھی مرکب ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس میں ایک اندرونی حرکت بھی ہوتی ہے یعنی اس کے ایک حصہ کی حرکت دوسرے حصے پر جس سے کہ آس پاس کے ایٹر میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور یہ حرکت مختلف قسم کے اجزائے لاتبجزے میں مختلف ہوتی ہے۔ لہذا اجزائے لاتبجزے اصل مسالا نہیں ہیں بلکہ بذات خود ایک کامل اور عجیب شے بنائی گئی ہے۔ جسے آنکھ نے نہیں دیکھا بلکہ قیاس نے سوچ کر نکالا ہے۔

اب ایک طرف تو ہم اجزائے لاتبجزے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف سادہ اور مفرد عناصر جن سے اجزائے لاتبجزے بنے ہیں۔ لیکن کہیں اصل مسالا جو تمام اشیاء کی اصل ہے نہیں ملا، مگر باوجود اس کے ہر طرف ہر انتظام و تربیت عقل و حکمت کی بین شادتیں دیکھتے ہیں بلکہ ہر ہر قدم پر وہ اور قوی ہوتی جاتی ہیں۔

یہ ہے وہ مادہ جسے علوم طبیعیات و کیمیا کے تمام مظاہر کا باعث بتاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طبعی اجزائے لاتبجزے سے وہ صفات منسوب کرتا ہے۔ جن کا موجود ہونا تو وہ پاتا ہے لیکن اجزائے لاتبجزے میں نہیں کیونکہ اس نے اسے کبھی نہیں دیکھا بلکہ بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا ہے اور اس لئے اس کا خیال ہے کہ یہ صفات اجزائے لاتبجزے ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک عالم علم کیمیا اجزائے دمعتراطیسی سے وہ صفات منسوب کرتا ہے جن کا ہونا تو اسے معلوم ہے لیکن اجزائے دمعتراطیسی میں نہیں۔ کیونکہ اس نے کبھی ایک جزو لا دمعتراطیسی کا تجربہ نہیں کیا بلکہ انہیں بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا۔ وہ ہائیڈروجن کے جزو دمعتراطیسی میں آکسیجن سے دو اور ایک کی نسبت سے ملنے کی قوت دیکھتا ہے جسے وہ درحقیقت ہائیڈروجن کے بڑے بڑے مجموعوں میں پاتا ہے۔ طبیعیات و کیمیا کے واقعات اجزائے لاتبجزے اور اجزائے دمعتراطیسی میں ادا ہوتے۔

ہیں اور اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دمقراطیسی ازروے تعریف کافی سبب ہیں ان نتائج کے جن سے کہ درحقیقت یہ اسباب استخراج کئے گئے تھے۔

ان کے علاوہ دوسرے علوم بھی ہیں جو واقعات سے بحث کرتے ہیں۔ لیکن وہ اصطلاحات اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دمقراطیسی میں ادا ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس لئے وہ اس نظریہ پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ نظریہ بھی ان واقعات پر جن سے وہ بحث کرتا ہے کچھ روشنی ڈالتا ہے یا نہیں۔

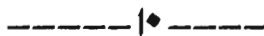
کیا نظریہ اجزائے لاتیجزے اس اہم اور عظیم واقعہ یعنی حیات پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے؟ جدید تحقیق کی رو سے یہ ثابت ہوا ہے کہ حیات کو خواہ نباتی ہو یا حیوانی کتد الاولے پروٹوپلازم سے ایسا گرا تعلق ہے کہ بغیر اس کے وہ کیس نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ کتد الاولے کے کیماوی اجزاء بخوبی معلوم ہیں اور انسان انہیں اپنے ہاتھ سے ایک جگہ جمع کر سکتا ہے لیکن نہ تو کتد الاولے پیدا کر سکتا ہے اور نہ حیات جب تک کہ پہلے سے حیات موجود نہ ہو۔ اگر ہم ان صفات کو لیں جو ازروائے جدید سائنس اجزائے لاتیجزے میں پائی جاتی ہیں اور ان کو ہزار ملائیں ہزار الٹ پلٹ کریں کبھی حیات تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ کشش اجزائے لاتیجزے کی حرکت مدا می اور ان اجزا کی کپکپاتی ہوئی حرکت، یہ سب مل کر بھی اس نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے جسے حیات کہتے ہیں اور جو خیال کی اصل بنا اور ساخت کائنات کی جزو اعظم ہے۔ سائنس نے جہاں تک تجربہ کیا ہے یہ امر با تحقیق ثابت ہوا ہے کہ محض مردہ مادہ سے کوئی زندہ شے نہیں پیدا ہو سکتی۔

جب حیات صرف اجزائے لاتیجزے یا مردہ مادہ سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ تو پھر قوت مدرکہ تو کہاں ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اکثر اہل سائنس کا یہ قیاس ہے کہ قوت مدرکہ مادہ کا نتیجہ ہے لیکن اب تک کسی نے یہ ثابت نہیں کیا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ جب قوت مدرکہ کا یہ حال ہے تو کاشس نس یعنی معرفت طبعی تو اس سے بھی کیس پرے ہے۔ کیونکہ معرفت طبعی کے معنی ہیں قوت مدرکہ کا اپنے باطن پر غور کرنا۔ اور یہ اجزائے دمقراطیسی کے ترتیب دیئے ملانے اور الٹ پلٹ کرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ایثار و محبت و ہمدردی کے جذبات ہیں۔

ممکن ہے کہ مادبین میں سے کوئی یہ کہے۔ کہ یہ سب کچھ سہی لیکن سائنس ترقی پذیر ہے۔ اور جوں جوں اسے ترقی ہو گی مادہ کی تعریف میں وسعت ہوتی جائے گی یہاں تک کہ کسی روز وہ ان تمام مظاہر کو بیان کر سکے گا جو اس وقت مافوق فطرت معلوم ہوتے ہیں۔

اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر مادہ کی تعریف میں وسعت ہو جائے گی تو اس کے ساتھ ہی یہ دلیل بھی کہ خود مادہ اس امر کی شہادت ہے کہ قوت مدرکہ اس سے قبل موجود تھی اور زیادہ قوی ہو جائے گی۔ جس قدر اجزائے لاتبجزے کی تحقیق میں زیادہ تہہ کے اندر جاؤ گئے، اسی قدر اجزائے لاتبجزے کے پیدا کرنے کے لئے قوت مدرکہ کی زیادہ ضرورت معلوم ہوگی۔ اگر نباتات اجزائے لاتبجزے کا نتیجہ ہیں تو اجزائے لاتبجزے کے وجود کے لئے بے شک قوت مدرکہ کی ضرورت ہوئی ہوگی۔ غرض اس مشکل کو جس طرح چاہو حل کرنے کی کوشش کرو ایک چیز ایسی ماننی پڑے گی جو مادہ نہیں ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہم اس چیز کو مادہ سے الگ نہیں پاتے۔ کیونکہ جس عالم کا ہمیں تجربہ ہے اس میں یہ سنگت ضروری ہے۔ لیکن یہ تجربہ محض یک طرفہ ہے۔ کائنات میں اور خود ہم میں اس امر کے اشارات اور شہادتیں موجود ہیں کہ یہ شے جو مادہ نہیں ہے عقل اور قوت مدرکہ سے تعلق رکھتی ہے اور اسے اپنے ساتھی مادہ پر فضیلت ہے۔

یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ روح جسم کی قید سے الگ ہو کر بھی قائم رہ سکتی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ مادہ کا جو نظریہ اجزائے لاتبجزے اور اجزائے معرطیسی کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے وہ خود ایک ایسے خالق اور منتظم قوت مدرکہ کی شہادت دیتا ہے جس کی ہمتی اس سے قبل ہے اور اس سے افضل ہے۔



نظام کائنات پر نظر ڈالنے اور اپنے باطن پر غور کرنے سے ہم یہاں تک پہنچے ہیں کہ کوئی ایسی شے ضرور ہے کہ مادہ سے بالا ہے جسے ہم روح کہتے ہیں اور کوئی ایسی قوت ابھی اور ہے جو اس سے بھی بالا اور افضل ہے۔ اور ساری کائنات پر حاوی اور ساری ہے۔ مذہب کی اصل میں سے پیدا ہوتی ہے جس سے سائنس بے خبر ہے اور اس بے خبری میں اس پر حملہ کرتا اور مضحکہ اڑاتا ہے۔ پچھلی صدی میں جب کہ سائنس کی ترقی معراج کمال پر نظر آتی تھی۔ اکثر مذہب پر حملہ کرتا، اس کی ہنسی اڑاتا اور اس سے نفرت اور حقارت ظاہر کرنا اہل سائنس و فلاسفہ و حکما اور اکثر بڑے بڑے مصنفین کا عام دستور ہو گیا تھا اور اب یہ دستور رفتہ رفتہ فیشن ہو گیا۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا اور اب بھی اکثر سمجھا جاتا ہے کہ مذہب بڑھیوں کی کہانی اور بچوں کا کھیل ہے۔ یا ایک بیچا ہے جس کا ڈر زمانہ طفلی سے بیٹھا

ہوا ہے۔ یا بھوت پریت کا سایہ ہے جو اب تک اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ سائنس کے پرزور اور بیجا حلوں اور اس کی حیرت انگیز ترقی سے یہ یقین ہو چلا تھا کہ مذہب کوئی دن کا سمان ہے۔ دنیا پر اب حکومت سائنس کی ہوگی وہ ان پیچیدہ مسائل اور گتھیوں کو سلجھائے گا جو اب تک لائیکل سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن خود اسی کے زور نے اسے کمزور کر دیا۔ اور وہ نشہ جس سے اہل سائنس مخمور تھے اترنے لگا اور باوجود حیرت انگیز ترقی اور عروج کے معلوم ہوا کہ وہ بے بس ہے اور اپنی حد سے آگے نہیں چل سکتا۔ انگر سال اور بریڈا جیسے اعدائے مذہب بے وقعت ہوتے جاتے ہیں اور اس کی ہفوات پر کچھ توجہ نہیں کی جاتی۔ فرقہ ایک نائٹک (لاوریہ) کے بانی پروفیسر ہکسلی کے پرزور دلائل میں اب وہ قوت نہیں رہی اور ان کے پیرو بھی دھیمے پڑ چکے ہیں۔ وہ نظام جو ابتدا سے انسان کے ساتھ ہے جو انسان بڑھا وہ بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا۔ اس نے دنیا میں بڑے بڑے تغیرات اور عظیم الشان انقلابات پیدا کئے اور اس کی ترقی میں پیش پیش رہا۔ اور یہ اب بھی انسان کی معاشرت اور تمدن کے پہلو اور پرورش پر نظر آتا ہے۔ اس کی حکومت انسان کے دل پر اب بھی ویسی ہے جیسی پہلی تھی اور آئندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ اہل سائنس نے اس کی طرف سے نہ صرف بے توجہی کی بلکہ حقارت کا اظہار کیا۔ بجائے اس کہ وہ اس متمم بالشان اور عجیب و غریب نظام پر جس کی قوت ابتدا سے اب تک برابر چلی آرہی ہے اور جس کی حکومت سے باوجود انکار کے بھی انسان نہیں بچ سکتا غور کرتے اور دوسرے پہلو سے نظر ڈالتے انہوں نے سائنس کے بھرے میں اس سے منہ موڑ لیا۔ صرف ایک پہلو دیکھ کر سمجھ لیا کہ دوسری طرف کچھ نہیں۔ حالانکہ اگر مذہب کے پہلو سے انسانی ترقی پر نظر ڈالی جاتی تو منظر زیادہ وسیع اور کامل ہو جاتا۔ لیکن یہ اہل سائنس کی کوتاہ نظری ہے کہ انہوں نے انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن کا انحصار محض سائنس پر رکھا۔ حیات کی ہر حرکت اور روش کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہیں۔ جب کوئی چیز دنیا میں اتفاق سے نہیں آئی۔ تو کیا مذہب جنہیں انسان کی تاریخ و معاشرت میں اس قدر دخل تصرف اور قوت ہے مکمل اور لغو ہیں؟ کیا انہیں انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن میں کچھ بھی دخل نہیں؟ یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جس پر اہل سائنس اور فلسفہ کو غور کرنا چاہئے تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی تنگ نظری اور ہٹ نے انہیں کبھی اس طرف متوجہ نہ کیا۔ سائنس کی نظر ہمیشہ مذہب کی طرف سے پھری رہی۔ اور ابتدا سے جو اس نے مذہب کی مخالفت میں کمر باندھی تو اب تک وہی مخالفت چلی آتی ہے لیکن کبھی اس نے یہ غور نہ

کیا کہ آخر یہ مخالفت کیوں ہے۔ بلکہ بجائے تحقیق کے جو اس کا شیوہ ہے اس نے جلتی آگ میں اور تیل ڈالا۔

ہم دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انسان ابتدا سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے اور ایک ذینہ سے دوسرے ذینہ پر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور جب ہم اس ترقی پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو یہ ایک ایسی عجیب و غریب اور عظیم الشان حقیقت نظر آتی ہے کہ خود انسانی خیال بھی اس کے سامنے جھک کے رہ جاتا ہے۔ سب سے اول اسے حیوانات اور وحشی جانوروں سے سابقہ پڑا۔ اور ان پر غالب آکر وہ آگے بڑھا اور رفتہ رفتہ برابر ترقی کرتا رہا مگر اس رستہ میں اسے بڑی بڑی مصیبتیں اور افتنیں جھیلی پڑیں۔ بڑی بڑی ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا ہوا اور اب تک ترقی کے میدان میں اسے وہی ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ اور اسے اپنے بنی نوع کے ساتھ ہر دفعہ اور ہر لحظہ وہی لڑائی لڑنی پڑتی ہے جو وہ اب تک لڑتا آیا ہے۔ یہی لڑائی مقابلہ منافہ اور جدوجہد ترقی اور تہذیب و تمدن کی جان ہے۔ ہر شے جس میں حیات ہے اور تمام امور اور خیالات میں جن کا حیات سے تعلق ہے یہی جدوجہد پائی جاتی ہے۔ تمام افعال و حرکات میں تمام ارادوں اور نیتوں میں۔ اندرونی اور بیرونی زندگی میں ہماری زندگی کے اعلیٰ اور نازک موقعوں پر ہمارا بڑا فٹا یہ ہوتا ہے کہ کامیابی حاصل کریں اور ناکامی سے بچیں۔ ہماری ساری طاقت اور دانش مندی اس میں صرف ہوتی ہے۔

انسان اور دیگر تمام حیوانات میں ایک خاص فرق ہے اور وہ یہ کہ انسان میں دو ایسی خصوصیتیں جمع ہیں جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں اور اس لئے اس کا ارتقا دوسرے حیوانات کے ارتقا سے مختلف ہے۔ ایک تو عقل ہے اور اس ترقی میں اس کا بڑا حصہ ہے لیکن انسان کو دو باتیں سکھاتی ہے ایک تو یہ کہ اس کا ذاتی فائدہ سب سے ضروری اور سب سے مقدم ہے دوسرے موجودہ وقت بڑی چیز ہے ہمارا سارا فائدہ اسی سے وابستہ ہے اور اسی میں ہونا چاہیے۔ دوسری خصوصیت انسان میں مدنیت کی ہے یعنی وہ قابلیت کے اثر سے وہ اپنے بنی نوع سے مل جل کر جماعتوں میں رہ کر کام کرتا ہے۔ یہ دو خصوصیتیں ایک دوسرے کی مخالف ہیں اور آپس میں ان کی مصالحت ممکن نہیں معلوم ہوتی۔ عقل کا کام تفروغ افعال اور فنا ہے۔ تمدن کی ترقی کے لیے ایثار اور سوسائٹی کے فائدہ کو اپنے فوائد پر مقدم سمجھنا اپنے اغراض و فوائد کو دوسروں کے لئے اور خصوصاً ان نسلوں کے لئے جو اب تک وجود میں نہیں آئیں، قربانی کرنا ہے۔ یہ ایثار و قربانی سائنس اور عقل نہیں سکھا

سکتی۔ اس کی ہدایت عقل اور سائنس سے بالا ہے اور یہ ہدایت مذہب سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے انسانی تمدن و ترقی مذہب پر مبنی ہے۔ ارتقا کا مقصد جدوجہد اور قربانی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ صرف مذہب میں پایا جاتا ہے جس کی ہدایت عقل سے بالا ہے عقل اس کی مخالف ہے۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ عقل مذہب کے تابع رہ کر جدوجہد کرے۔ ورنہ اگر وہ غالب آجائے گی تو شیرازہ نظام تمدن بکھر جائے گا۔ ارتقائے عالم میں افراد سوسائٹی کے لئے قربان کر دیئے جاتے ہیں۔ عقل افراد کو اپنے فوائد کے لئے سعی کرنا سکھاتی ہے اور انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ مذہب ہمیں ذاتی اور شخصی قربانی اور ایثار سکھاتا ہے۔ نہ صرف ان لوگوں کی خاطر جو ہمارے آس پاس زندہ موجود ہیں بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی جو آئندہ زمانے میں آئیں گے اور ابھی وجود میں بھی نہیں آئے۔ حالانکہ یہ امر ذاتی فوائد کے خلاف ہے۔ غرض انسانی تمدن میں دو مخالف رجحانات کی نشوونما ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہے جس میں افراد کو سوسائٹی کے تابع ہونا پڑتا ہے اور دوسرا رجحان منقلب ہے جسے اس اتباع میں جس میں اس کا مطلق فائدہ نہیں بلکہ زیادہ تر ایسے لوگوں کا فائدہ ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئے تامل اور عذر ہے۔ لیکن ترقی وہی قوم کر سکتی ہے۔ جس میں دوسرا رجحان پہلے رجحان کے تابع ہے۔ مگر اس اتباع کے لئے عقل یا سائنس کی ستاب میں کوئی فتویٰ نہیں ملتا۔ اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں کہ وہ کس قدر ناپائدار اور کس قدر بے بنیاد ہے تو عقل صرف ایک فرض پر بہت زیادہ زور دیتی ہے جس کے سامنے باقی خیالات پیچ ہیں۔ اس کی ہدایت یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عمر کے ان چند لمحوں کو کام میں لایا جائے اور حتی الوسعی ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ انسان تکلیف سے بچنے راحت حاصل کرے اور یہ چند دم جو ہمیں مستعار ملے ہیں آرام سے بسر ہو جائیں۔ اور اسی خیال سے انسان دولت کماتا ہے شہرت اور قوت حاصل کرتا ہے اور طرح طرح کے ایسے کام کرتا ہے جن سے عیش و راحت اور لطف نصیب ہو۔ اگر یہ رجحان بے روک ٹوک ترقی کرتا رہے تو انسانی حرمتی رک جائے۔ اس لئے اسے ایک دوسرے رجحان کے تابع ہونا پڑتا ہے جس کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں اصل ترقی ہوئی وہاں اخلاقی اور مذہبی رجحان غالب رہا اور عقل اس کے تابع رہی۔ عقل بے شک ہماری رہبر و رہنما ہے لیکن اس کا احاطہ محدود اور اس کی نظر تنگ ہے۔ اور اس لئے ضرور ہے ایک ایسی ہدایت کی جو اس سے آگے ہمیں لے جائے۔ اور یہ کہی مذہب سے پوری ہوتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ جو لوگ مذہبی اور اخلاقی نظام کے بالکل قائل نہیں وہ باوجود اس کے نیک نیت اور

مخیر اور نیک چلن ہوتے ہیں۔ لیکن یہ امر ماننے یا نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے۔ انسانی تمدن یا انسانی ترقی چند اشخاص یا ایک آدمہ نسل کا کام نہیں ہے۔ قرون اور نسلوں کی جدوجہد کے بعد حالت درست ہوتی ہے۔ جو شخص کسی اصول اخلاق و مذہب کا قائل نہیں ہے وہ بھی اسی سلسلہ تمدن کی پیداوار ہے۔ اس کی نشست و برخاست بات چیت۔ طرز خیال غرض کل حرکات و افعال اسی سانچے میں ڈھلے ہیں اور اسی سوسائٹی سے ارثاً "تعلیماً" سبباً "ملے" ہیں۔ وہ ہزار زبان سے انکار کیا کرے مگر جو روش و رجحان طبیعت اس میں پیدا ہو گیا ہے وہ اسے زائل نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اور بات بات میں اسی نظام اخلاق و مذہب کا تابع ہے جس سے وہ انکار کرتا اور جس کی وہ تضحیک کرتا ہے۔

یونان کی عقلی ترقی دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ اور بڑے بڑے اپنی آراء کی رائے ہے کہ باوجود زمانہ موجودہ کی حیرت انگیز ترقی کے ہم ابھی تک اس درجہ کو نہیں پہنچے اور ہم اب بھی سقراط افلاطون و ارسطو و فیذاں جیسے لوگ پیدا نہیں کر سکتے۔ لیکن باوجود اس زبردست عقلی ترقی کے وہ ایسا نیست و نابود ہوا کہ گویا کبھی پتا ہی نہیں تھا۔ یہ اس لئے کہ اس ترقی میں عقل غالب آگئی تھی اور اخلاقی و مذہبی اصول تابع عقل کر دیئے گئے تھے۔ اسی بد اخلاقی اور بدنہی نے روما کو تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن یہودی اور ہندو باوجودیکہ وہ صدیوں سے محکوم اور نظام میں اب تک باقی ہیں اور ان میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے۔ روما و یونان کے زوال کی تائیدیں پڑھنے سے حیرت و حیرت ہوتی ہے اور یہ بہت بڑا سبق ہے ان اقوام کے لئے جو دنیا میں برہمن اور ترقی کرنا چاہتی ہیں۔

انسان کی طبیعت ایسی واقعی ہوئی ہے کہ یہ ایک حالت پر قانع نہیں رہتا۔ ایک چیز کے حاصل ہونے پر دوسری اور دوسری سے ترقی کی طرف لپکتا ہے۔ جب بھوک مٹی تو کمانے کی تلاش ہوئی رہتا رہتا جب رات بھر کے لئے مٹی تو بھوک ایک طرف رہ گئی کھانے کا مدار ذائقہ پر انحصار۔ اور اس لحاظ سے اس لئے وہ ترکیبیں اور نوآوری پیدا کیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ کپڑا بدن کی حفاظت اور راحت کے لئے تھا اس لئے وہ زیبائش و آرائش بنا لیا۔ وہ حقیر جھوپڑا جو سر پہنپانے کے لئے بنایا تھا وہ ایک شاندار محل بن گیا ہے۔ جس میں تمام سامان آرائش و حسن ہیں۔ اسی طرح اس نے دولت حکومت قوت حاصل کرنے کی کوشش کی اور جوں جوں اس کے دل کا دماغ حاصل ہوتا گیا اس کی ہوس

اور بڑھتی گئی۔ اور اس کے خیال کی جولانی میں اور وسعت ہوتی گئی۔ اور ہر شے میں نئی نئی نزاکتیں اور لطافتیں پیدا ہوتی گئیں اور ان میں ایسا محو ہوا کہ بالآخر یہی اس کے زوال کا باعث ہو گئیں۔ اصل یہ ہے کہ انسانی ترقی باطن سے شروع ہوتی ہے۔ اور انسانی منزل بھی باطن ہی کی طرف سے ہوا ہے۔ جو لوگ جسمانی آرام اور مادی راحتوں میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی کو اصل ترقی سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ درجہ اسفل میں رہتے ہیں اور کبھی درجہ اعلیٰ کو نہیں پہنچتے جو ہمیشہ باطن کی ترقی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ جسم عارضی اور فانی ہے اور اس کے ساتھ اس کی ساری خواہشیں اور راحتیں اس کی ساری حکومت اور قوت بھی فنا ہونے والی ہے۔ جسم کے چھوڑنے کے بعد روح رہ جائے گی اور وہ ہمیشہ رہے گی جس نے اپنی انسانیت اور خود غرضی کو دبا کر انوار کو ترجیح نہیں دی۔ جس نے اس ہدایت کے نور سے جو مذہب کے ذریعہ سے ہوتی ہے اپنے آپ کو منور نہیں کیا اور اپنے باطن اور روح کی سنائی کی طرف توجہ نہیں کی تو اس کی روح عالم ارواح میں بھی اودنے حالت میں رہے گی۔ ڈارون کا اصول ارتقا صرف جسم اور اس کے علائق تک ہے جب جسم کا خاتمہ ہو گیا تو اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس اصول کے ماننے والوں کو اور ذرا دوسری طرف بھی توجہ کرنی چاہئے اور اصل ترقی ہے اور جس کا سلسلہ ابدلاباد تک رہنے والا ہے۔ جسم کو چھوڑنے کے بعد روح جس حالت میں یہاں تھی اسی حالت میں عالم ارواح میں پہنچتی ہے۔ اگر وہ یہاں اودنے حالت میں تھی تو وہاں اودنے حالت میں رہ کر پھر ترقی کرے گی اور یہاں کی جسمانی خواہشات عالم ارواح کی تکلیف کا باعث ہوں گی۔ اگر اس نے یہاں ترقی کی ہے تو ترقی یافتہ حالت میں پہنچے گی اور وہاں سے ترقی کر کے اپنے اسے اعلیٰ دوسرے عالم ارواح میں جائے گی اور اسی طرح ترقی کر کے اس سے بھی اعلیٰ عوالم میں پہنچے گی۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیونکہ اس طرح سیاروں کے نظام لاتعداد ہوں گے ہیں اسی طرح نظامات روحانی بھی یہ عدد بیشمار ہیں۔ یہ بنی اصل اور صحیح اصول ارتقا جس کا سلسلہ نامتناہی ہے اور سوال ہے۔ اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے خیالات کو چھوڑ کر درجہ اسفل سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرے جس کی ہدایت انہیں مذہب کرتا ہے۔

-----||-----

مرض سائنس انسان کا کامل تعلق کائنات سے اس لئے فنا ہر نہیں کر سکتا جیسا کہ

مذہب کرتا ہے۔ کیونکہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ اس کی رسائی صرف مادی اشیاء تک ہے۔ لیکن مذہب کی حکومت بہت وسیع ہے۔ وہ مادی اور غیر مادی دونوں مملکتوں پر حاوی ہے اور اس کے اصول دور دور تک پہنچتے ہیں۔ جہاں سائنس کے پر جلتے ہیں۔ مذہب نہ صرف ان فرائض کو ادا کرتا ہے جو متعلق انسان کے نفس سے ہیں یا جو دوسروں سے متعلق ہیں۔ بلکہ وہ ان فرائض کا بھی خیال رکھتا ہے جو ان لوگوں کے متعلق ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئے تو نہ صرف یہی بلکہ وہ اس عالم سے بھی متعلق ہے جہاں ہمیں اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد جانا ہے سائنس انسان کی روح اور روحانی عالم اور عقیدے کا انکار کیا کرے کیونکہ وہ کوئی نظر ہے۔ لیکن اس کے انکار سے کسی شے کی ہستی زائل نہیں ہو سکتی۔ اہل سائنس اپنے بھورے برابر علم پر اس قدر نازاں اور مغرور ہیں کہ جو بات ان کے علم میں نہیں اس سے وہ جھٹ انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اور چند قانون قدرت جو انہیں معلوم ہوئے ہیں ان پر اس قدر بھروسہ ہے کہ جو بات ذرا ان کے خلاف نظر آئے فوراً کہہ بیٹھتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے یہ خلاف قانون قدرت ہے۔ گویا یہ کائنات کے تمام قوانین قدرت پر حاوی ہیں۔ جو ذرا ہوشیار ہیں انہوں نے ایک دوسری ترکیب نکالی ہے ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم نہیں جانتے یا ہمیں اس کا علم نہیں لیکن یہ جواب خود ان سائنسینک ہے۔ سائنس جستجو تلاش اور تحقیق سکھاتا ہے تحقیق سے اعراض کرنا سائنس کی ذات کے خلاف ہے۔ لیکن اہل سائنس کی یہی ہمیشہ کی عادت رہی ہے۔ جو امور ان کی تحقیق اور ان کی حدود سے باہر ہیں ان کے تو منکر ہی ہیں لیکن سائنسینک تحقیقات کو بھی انہوں نے ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر ڈرپیر نے اپنی کتاب میں اہل مذاہب پر تو جابجا طعن و تشنیع کی ہے کہ انہوں نے سائنس کی مخالفت کی لیکن انہیں یہ بھی ضرور معلوم ہو گا کہ خود اہل سائنس نے تمام سائنسینک تحقیقات کی ابتداء میں کس قدر مخالفت کی ہے۔ اور جب کبھی اور جہاں سائنس میں کوئی نئی دریافت یا تحقیقات ہوئی تو سب سے اول اس کی مخالفت میں اہل سائنس آستینیں چڑھا کر آئے۔ کوپر نیکس، گلی لیو اور ہاروے کے نام سے کون واقف نہیں، انہوں نے سائنس میں ایسے ایسے انکشافات کئے جو تاقیامت یادگار رہیں گے۔ لیکن ان کی مخالفت سب سے اول نہایت شدد کے ساتھ ان کے ہم عصر اہل سائنس نے کی جب نینمن فرسٹنگلن نے رائل سوسائٹی کے سامنے براۓ کی بحث کی تو تمام اہل سائنس نے اسے بے وقعت بنایا اور رسالہ فلاسو فیکل ٹرنیز ایکشن نے اس

مضمون کو درج کرنے سے انکار کیا۔ حالانکہ وہی چیز آج کل کس قدر مفید اور کار آمد ثابت ہوئی ہے اور اس کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ جب بیگ نے روشنی کے نظری انتعاشیہ کے عجیب و غریب ثبوت پیش کئے تو سائنس دانوں نے اس کی خوب ہنسی اڑائی۔ سر تھمری ڈیوی نے جب یہ خیال ظاہر کیا کہ لندن میں گیس کی روشنی ہو سکتی ہے تو اہل سائنس نے اسی کا مضحکہ اڑایا۔ اسٹیون نے جب یہ تجویز کی کہ لور پول اور مانچسٹر کے ریلوے روڈ پر انجن گاڑی چلائی جائے تو اس کے وقت کے بڑے بڑے اہل سائنس نے شہادت میں بیان کیا کہ یہ ناممکن ہے کہ اس کی رفتار بارہ میل فی گھنٹہ بھی ہو سکے۔ جب نامور اور مشہور منجم ارے گو نے برقی ٹیلی گراف کے متعلق بحث کرنی چاہی تو فریج اکاڈمی آف سائنس نے اس کی خوب ہنسی اڑائی اور اسے بحث نہ کرنے دی۔ یہ چند عام اور معمولی نظیر پیش کی گئی ہیں درہ سائنس کی ہر شاخ کے متعلق سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ جب کسی نے کوئی نئی تحقیقات کی تو سب سے اول اہل سائنس نے اس کی مخالفت کی۔ جب سائنس کے متعلق اہل سائنس کا یہ حال ہے تو روحانیات کے متعلق وہ جس قدر شد و مد کے ساتھ مخالفت کریں کم ہے لیکن وہ امور جن کی وہ مخالفت کرتے ہیں اور جن کے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں ایک روز مسلم ہو جائیں گے اور انہیں اپنی مخالفت پر خود افسوس کرنا پڑے گا۔ کیونکہ انہوں نے دیدہ و دانستہ اپنے ہاتھوں اپنے علم کو محدود رکھا۔ اہل سائنس اہل مذہب کو تعصب کا الزام دیتے ہیں لیکن ان کی ضد اور ان کے انکار کا تعصب ان سے کچھ کم نہیں۔ ان کے ذرا سے علم نے انہیں اندھا کر دیا ہے۔ تحقیق و تجسس جس پر انہیں ناز ہے وہ صرف ایک نہایت تنگ دائرہ تک محدود رکھتے ہیں۔ اس کے آگے دیکھنے سے وہ صاف انکار کرتے ہیں اور محض تعصب کی وجہ سے اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کرنا نہیں چاہتے لیکن وہ وقت آتا ہے جب انہیں مجبوراً اس خول کو توڑ کر باہر نکلنا پڑے گا۔

غرض اگر ہم روح کی ہستی اور اس کی قوت سے جس کے متعلق بے انتہا واقعات اور بہت قوی دلائل موجود ہیں انکار کر دیں اور مذہب کو جس کے اصول کی زیادہ تر بنیاد اسی پر ہے انسانی تمدن سے خارج کر دیں تو انسان کی زندگی محض بے سود و بیکار اور تہہ پر گت و شمر رہ جاتی ہے۔ اگر انسان صرف اسی مادی دنیا کو اور اس چند روزہ زندگی کو اپنا منہا سمجھ لے تو کیا ان انسانی تمناؤں کے لئے جو اس کے دل میں موجیں مار رہی ہیں۔ یہ دنیا کافی ہو سکتی

ہے؟ کیا انسانی حیات کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ وہ یہاں آئے اور چند روز بری بھلی طرح کاٹ کر چل دے؟ کیا علوم طبیعیات سچے اخلاق اور سچے ایثار کی ہدایت دے سکتے ہیں؟ اگر صرف مادہ ہی اصل حقیقت ہے اور طبیعیات و ریاضیات کے قانون اس کے فرمانروا ہیں تو انسان محض ایک چلتی پھرتی کل ہے۔ اور اس کے بعد دنیا میں کوئی قوت ہے تو ایک وحشیانہ قوت ہے جو سب پر غالب آجائے گی۔ خیر و شر یا برائی بھلائی صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے ذاتی یا تمدنی ذلیل و حقیر اغراض کے مطابق یا غیر مطابق ہے۔ بلکہ اس کا تطابق یا غیر تطابق اس قانون سے ضروری اور لازمی ہے جو ہم سے بالا اور الٹی قانون ہے۔ انسان کے دل سے اس قانون کے خیال کو مٹا دو۔ اور خدا حیات جاوید انصاف و عصمت اور عذاب و ثواب کے خیالات نکال دو تو انسان کیا رہ جاتا ہے۔ صرف ایک وحشی جانور بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اس میں سے ترقی کا مادہ سب زائل ہو جائے گا اور مادیت کے زہر سے سچے اور پاکیزہ اخلاق مرجھا جائیں گے۔ افسوس کہ ان بچاڑوں پر جو ہوش سنبھالتے ہی محنت و مشقت میں جٹ جاتے جھانکیں سستے اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ کس لئے؟ اس لئے کہ چند غافل ناکوں کی عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچائیں۔ افسوس ان پر جن کی ساری عمر اس فکر و تردد میں کٹ گئی کہ کسی طرح دولت ملی جو اصل مسرت ہے۔ دولت۔ اس وقت جب کہ افنیں سستے سستے اور بلائیں جھیلے جھیلے کر جھک گئی۔ آنکھوں کی روشنی مدھم ہو گئی۔ نہ پہلے سی سکت رہی نہ پہلا سا جوش۔ قوسے میں اضمحلال اور عناصر میں اختلال آگیا۔ اب معلوم ہوا کہ صرف دولت مسرت کا باعث نہیں۔ یا اس وقت بے مانگے بلا محنت مشقت کے ملی جب کہ جوانی کا بھوت سر پر سوار تھا اور بجائے مسرت کے زحمت اور آفت کا باعث ہوئی۔ کاش ضبط نفس ہوتا۔ تھوڑی سی قناعت اور اعتدال پر نظر ہوتی۔ دولت اور دولت سے جسمانی عیش انتہائے مسرت کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن حصول دولت و عیش کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوکا تھا۔ خود اس میں اس قدر بلائیں اور افنیں بھری ہیں کہ خوشی مفقود ہو جاتی ہے۔ اصل خوشی اعتدالی قناعت اور ضبط نفس میں ہے۔ بشرطیکہ انسان کسی مقصد اعلیٰ کے حصول میں مشغول ہو۔ اور یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ باطن کی روشنی کی جھلک سے بیرونی حالات پر اثر پڑے۔ بیرونی حالات کے موافق کر لینے اور مادی سامان کے حصول سے جو لوگ دل کو مطمئن اور بامسرت بنانا چاہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ دل کی خواہشات کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ اس کی گمرانی کی کوئی تھام ہے۔

بلکہ کام دوسری طرف سے شروع کرنا چاہئے۔ اپنے ارادے میں قوت نفس پر جبر اور ضبط حاصل کرنا اور خواہشات انسانی کو اس کے تابع بنانا چاہئے تاکہ قلب کا اثر مادی حالات و خواہشات پر پڑے اور وہ اس کے لطف و مسرت کا باعث ہوں۔ اسی وقت اعتدال و قناعت نصیب ہوگی اور کام میں سہولت و استقلال پیدا ہوگا۔ لیکن اس سے بھی اعلیٰ مسرت انسان کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ بے نفسی اور بے غرضی سے کام لیتا ہے۔ حیات انسان کی تہ میں رنج و الم ہے۔ انسان ہر طرف سے خطرے اور بے اطمینانی سے گھرا ہے۔ اور زیادہ تر جو وہ کھیل اور تفریح اور دیگر اشغال میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنے آپ کو ہملائے رکھے اور دلی کاوشوں کی طرف اس کا خیال نہ جائے۔ انسانی فطرت کا ایک یہ بھی اصول ہے کہ انسان خوشی کی تلاش اور حصول سے نہیں بلکہ اپنی مصروفیت سے آلام زندگی کا مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہ عام مصروفیت اونے درجہ کی ہے۔ اعلیٰ درجہ اس کا اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ وہ بے غرض اور بے نفس ہوتا ہے اور دوسروں کو مسرت اور خوشی پہنچانے کے لئے وہ ایک تنگ دائرہ سے نکل کر انسانی ہمدردی اور اخلاق کے اعلیٰ طبقہ میں جا پہنچتا ہے اور دوسروں کو راحت پہنچانے کے خیال میں وہ اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے۔ سچے مذہب کی تعلیم یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مذہبی آدمی کی خوشی زیادہ پائدار اور مستقل اور بے غل و غش ہوتی ہے اور اسے اپنے کام پر زیادہ اطمینان ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ کا شکر اور حال پر قناعت کرتا اور آئندہ کی توقع رکھتا ہے۔ بخلاف اس بوالہوس دولت کے بندے کے جو گزشتہ پر پچھتاؤ اور حال میں مذہب اور بے اطمینان رہتا ہے اور آئندہ زمانہ اسے تاریک نظر آتا ہے۔

-----۱۲-----

ہم نے جو گزشتہ اوراق میں انسان کی مذہبی اور روحانی قوت پر بہت زیادہ زور دیا ہے تو اس کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ عقل یا سائنس و فلسفہ بیکار یا گمراہ کرنے والے ہیں۔ بلکہ اس رخ پر زیادہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ آج کل سائنس کی چکا چوند سے لوگوں کی

نگاہ اس قدر خیرہ ہو گئی ہے کہ وہ دوسرے رخ پر نظر نہیں ڈالتے۔ ورنہ سائنس و فلسفہ کے کار آمد ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے اور مادی ترقی سے اس نے انسانی تمدن کو جو مدد دی ہے وہ ظاہر ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ محض سائنس کی ترقی انسانی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اسے اس رتبہ پر پہنچا سکتی ہے جو اس کا اصل منشاء منتہا ہے۔

پھر سائنس اور مذہب میں اختلاف و مخالفت کیوں ہے؟ غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ اس اختلاف و مخالفت کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔

مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہے اور سائنس کی بنیاد عقل پر۔ اہل مذہب سائنس سے اس لئے ڈرتے ہیں۔ کہ سائنس کے اصول اور ان کے انکشافات مذہب کو کمزور اور زائل کر دیں گے حالانکہ یہ خیال محض باطل ہے۔ سائنس صدہا سال سے برابر ترقی کرتا چلا آیا ہے لیکن وہ مذہب کی بنیاد کبھی نہ ہلا سکا۔ مذہب کی قوت ابھی تک ویسے ہی قائم ہے اور قائم رہے گی۔ اس لئے کہ جس شے پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس سے باہر ہے۔ خیال مافوق العادۃ عقل سے باہر ہے، اس لئے کہ اس کا تعلق دل سے ہے دماغ سے نہیں۔ اور یہ ایک ایسا وجدان قلب ہے جس میں غیر محدود کے محسوس کرنے کی قوت ہے۔ حالانکہ عقل بذاتہ محدود ہے۔ غیر محدود یعنی خدا کا دیکھنے اور پہچاننے والا دل ہے عقل استدلال سے اس کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اولہ و براہین اسی کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہیں جس میں پہلے سے یہ وجدان ہے اور خدا کو مانتا ہے۔ جو نہیں مانتا اس کے لئے تمام دلائل بے کار ہیں۔ لہذا اہل مذہب کو سائنس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر زمین گردش کرتی ہے اور آسمان پھرتا ہے تو مذہب کو اس سے کیا تعلق؟ اگر کوئی نیا ستارہ دریافت ہوا تو مذہب پر اس کا کیا اثر؟ اگر زمین کے اندر سے نئے نئے آثار متعجبہ نکلیں اور ان سے انسان کی قدامت پر روشنی پڑے تو مذہب کو اس سے ڈرنے کی وجہ؟ اگر کشش ثقل نے سائنس میں انقلاب پیدا کیا اور بہت سے مسائل عالم کو حل کیا تو بہت مبارک۔ مذہب اس سے کیوں خائف ہے؟ اور نظریہ ارتقا انسان کی ترقی کے اصول کو بتاتا

ہے تو بتائیے مذہب کیوں اس سے گھبرائے؟

جب مذہب کی حالت ایسی مستحکم اور قوی ہے تو پھر اہل مذہب کیوں اہل سائنس سے لڑتے اور جھگڑتے اور ان پر ارتداد و کفر کے فتوے لگاتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف ایک

معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ چونکہ مذہب انسان کے ساتھ اس وقت سے ہے جب اس نے ہوش سنبھالا اور جب کہ سائنس کا نام و نشان بھی نہ تھا اس لئے مذہب کو علاوہ روحانیت و معاشیات کے وہ کام بھی کرنا پڑا جو سائنس سے مخصوص تھا۔ غرض ابتدا میں مذہب روحانی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور سائنٹفک تمام انسانی شعبوں پر حکومت کرتا رہا اور مذہب کا بادی معلم بھی تھا فلاسفر بھی تھا اور حاکم بھی تھا۔ لیکن مذہب و اخلاق کو چھوڑ کر باقی امور ضمنی تھے اور وہ مجبوراً مذہب میں داخل کر لئے گئے تھے۔ انسان نے جب ترقی کی اور اس کا تجربہ اور تمدن وسیع ہوا تو ہر ہر شعبہ الگ ہونا شروع ہوا۔ اور ان میں نئی نئی باتیں اور نئے انکشافات شروع ہوئے۔ اہل مذاہب نے جب یہ دیکھا تو انہیں یہ امر ناگوار

گزرا اور وہ یہ سمجھے کہ ان کی یہ ترقی ہماری مخالفت میں ہے۔ جو امور ابدان و حفظان صحت کے متعلق تھے وہ علم طب نے سنبھال لئے۔ جو ملکی تھے وہ علم سیاست نے لے لئے۔ اور جو نجوم و شمس و اقمار کے متعلق تھے وہ فلکیات کے تحت آگئے۔ مگر اہل مذاہب ایک مدت تک انہی باتوں پر جے رہے جو ابتدا میں ان علوم کے متعلق مذہب کی ذیل میں آگئی تھیں اور علمی ترقی سے انکار کرتے رہے اور اس ترقی کو مذہب کی مخالفت اور استیصال کا باعث سمجھتے رہے۔ لیکن درحقیقت ان امور کو نہ پہلے مذہب سے تعلق تھا اور نہ اب ہے اور نہ ان کی ترقیاں مذہب کے رستے میں حائل ہو سکتی ہیں۔ اور نہ اسے کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ کیونکہ سائنس مذہب پر کسی طرح نہ حملہ کر سکتا اور نہ اسے نقصان پہنچا سکتا ہے اس لئے کہ جس پڑ مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس اور رسائی سے باہر ہے۔

اب رہی سائنس کی مخالفت مذہب سے۔ سو یہ بالکل بیجا اور محض ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی ہے۔ کیونکہ سائنس مذہب کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ سائنس استدلال عقلی پر مبنی ہے اور سب چیزوں کو اسی سے پرکھتا ہے۔ جو چیزیں اس کے اصول پر پوری نہیں اترتیں اس کے ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ صرف عقل ہی ایک خصوصیت انسان کی نہیں بلکہ اس میں دوسری قوتیں بھی ہیں اور احقاق حق میں صرف عقل ہی پر دارومدار نہیں ہوتا بلکہ اور قوتیں بھی کام میں آتی ہیں۔ انسان کی اخلاقی اور روحانی قوتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ مثلاً "حسن کی دریافت کے لئے ذوق ایسا ہی ضروری ہے جیسی عقل۔ احقاق حق میں عقل وہیں تک کام دیتی ہے جہاں تک سلسلہ علت و معلول کا تعلق ہے لیکن جہاں اس کے سوا کچھ اور بھی ہے تو وہاں روحانی عمل شروع ہو جاتا

ہے۔ جب معمولی باتوں کی تحقیق میں عقل حالات و عادات و اغراض سے بھٹک جاتی ہے تو ان معاملات میں اس کی کیا پیش جا سکتی ہے جن کا زیادہ تر تعلق تمیز و جدائی پر ہے۔ چونکہ مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہے جو عقل سے بالا ہے اس لئے سائنس وہاں نہیں پہنچ سکتا اور اپنی نادانی اور ناہمی سے اس پر حملے کرتا اور اس کے ماننے سے انکار کرتا ہے۔ ایک بات اسے اور ہاتھ لگ گئی ہے۔ جب اس کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو وہ صاف کہہ اٹھتا ہے کہ یہ خلاف قانون فطرت ہیں۔ گویا تمام قوانین فطرت اس کے دیکھے بھالے ہیں اور وہ ان سب پر حاوی ہو چکا ہے۔ اول تو اس کہہ کی جس پر ہم آباد ہیں بساط ہی کیا ہے دوسرے جو چند قانون فطرت ہمیں معلوم ہیں بالکل محدود ہیں اور وہ صرف مادی حالت سے متعلق ہیں۔ عقل خود محدود ہے اور سائنس جس کی بنیاد اس پر ہے اور بھی محدود ہے۔ اسے غیر محدود کا علم یا معرفت کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ مادی سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ اگرچہ اس کے متعلق بھی اس کا علم بہت محدود ہے۔ پھر اس محدود علم اور ایک طرفہ علم پر اس کے یہ دعوے بیچ ہیں۔ اور بغیر اس کوچہ میں قدم رکھے جو مادہ سے بالا ہے اور بغیر اس تحقیق و معرفت کے جو اس دائرہ میں داخل ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی اس کا انکار ناقابل سماعت ہے۔ ایسی صورت میں سائنس کا مذہب کا منکر یا مخالف ہونا سراسر نادانی و ناہمی ہے۔ اہل سائنس کو زیادہ عالی ظرفی زیادہ وسیع النظری زیادہ حوصلہ و تحمل اور زیادہ تحقیق و تجسس سے کام لینا چاہئے۔ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہ کہہ دینا کہ آفتاب کا وجود ہی نہیں اور جب دوسرے اس کے ہونے کی شہادت دیں تو انہیں جھٹلانا سائنس اور فلسفہ کے اصول کے خلاف ہے۔ مگر باوجود کثرت واقعات و دلائل وہ اپنے انکار پر مصر ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعصب اور ان کی ہٹ دھرمی مذہبی تعصب اور ضد سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔

جس طرح علمائے طبیعیات و میدان ارتقا کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ چادر دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھیلائیں اور اپنی حدود سے آگے نہ بڑھیں۔ اسی طرح اہل مذاہب کو بھی چاہئے کہ وہ احتیاط سے کام لیں اور اپنی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ایک حد ہے جہاں مذہب کو رک جانا چاہئے۔ اور ایک حد ہے جہاں سائنس کو ٹھہر جانا چاہئے اور یہاں پہنچ کر سائنس اور مذہب نہ صرف اپنے پرانے قصے قصے اور عداوتوں کو بھلا دیں بلکہ دو روٹھے ہوئے

بھائیوں کی طرح من جائیں۔ عالم طبیعیات کو ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے قبل اس کے کہ وہ کائنات کے مسئلہ کو حل کرے اور اسی طرح اہل مذاہب کو بھی۔ ان کا منشا ایک ہے یعنی انسان کی ترقی اور بہبودی۔ لیکن ایک کا مقصد مادی اور ظاہری ترقی کا ہے اور دوسرے کا مقصد باطنی اور روحانی ترقی۔ ایک استدلال عقلی اور استقرا کے رستہ اپنی منزل مقصود کو پہنچتا ہے اور دوسرا جذبات اور تخیل کی راہ سے۔ لیکن کسی کو حق نہیں کہ وہ دوسرے کو خارج کر دے۔ کائنات کی انتہائی صداقت کا معلوم کرنا کوئی بری بات نہیں اور جو کوئی اس میں کوشش کرتا اور مدد دیتا ہے تو نیچر اسے نکال نہیں سکتی۔ روح اسے ضرور عیس پائے گی۔ اور جو شخص اس کوشش میں ہے کہ اس خیال کو نکال دے اور خدا کو کائنات سے خارج کر دے وہ بڑا ظلم کرتا ہے۔

جھگڑے تنازع اور جدوجہد سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ صداقت اختلاف کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ اہل مذاہب کا ضعف اس میں ہے کہ وہ سائنس سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ڈرنے کی چیز نہیں بلکہ اس سے مدد لیتا اور اسے معاون بنا کے رکھنا چاہئے۔ اگر اس کے کہیں دشمن ہیں تو ان سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ بھاگنے سے شکست بہتر ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ شکست سے فتح ہو جائے۔ مگر بھاگنے سے گمناہی کا احتمال ہے۔ اور گمناہی سے موت کا ڈر ہے۔ اور یاد رکھنا چاہئے کہ اگر مذہب میں ہم زیادہ ترقی اور روشن خیالی کو دخل دیں گے اور اسے توہمات باطلہ اور تمام غیر ضروری کثافتوں سے پاک کر دیں گے تو اس کی فتح ہی فتح ہے۔ اسی طرح سائنس کا ضعف اس میں ہے کہ اپنے محدود علم پر ٹکیے کر کے بے سوچے سمجھے اور بغیر تحقیق کے اصول مذہب پر حملہ کرتا اور اس کے خیالات سے انکار کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ انسان کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالتے ہیں جس سے مذہب بحث کرتا ہے تو اس کی نظر اور وسیع ہوگی اور وہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنی آنکھیں بند کرے گا اور اپنے دل و دماغ میں روشنی نہیں پہنچنے دے گا تو بلاشبہ اس کی قسمت میں ہے۔ یہ وقت ہے اس کی ہمت آزمائی کا۔ تحقیق و تجسس اس کے اصل اصول ہیں۔ اسے چاہئے کہ وہ انہیں اپنے محدود دائرے سے اور آگے بڑھائے اور قدرت حق کا تماشا دیکھے۔ اسے اب صداقت کے ماننے کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ اور زیادہ عالی ظرفی اور روشن خیالی سے کام لینا چاہئے اور ضد اور نفسانیت سے دست بردار ہونا چاہئے۔

بقول پروفیسر ٹیٹ و بالفور اسٹیورٹ جو اس زمانہ میں سائنس کے بہت بڑے عالم ہیں اس کائنات میں ایک قانون تو ال یا عدم انقطاع موجود ہے۔ اور یہ ہستی محض بیکار اور

معمل ہو جائے گی۔ یہ مادی عالم صرف مادی ہی سے نہیں بنا بلکہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جس پر اس کا دارومدار ہے۔ اور وہ قوت ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہ قوت اسی وقت کار آمد ہے جب کہ یہ تبدیلی ہیئت کرتی ہے۔ لیکن تجربہ سے یہ ثابت ہے کہ قوت کی تبدیلی اسے کمزور کر دیتی ہے۔ یہ بیشک ممکن ہے کہ قوت کو ہم حرارت میں تبدیل کر لیں اور اس سے کام لیں۔ لیکن ہر ایسی تبدیلی قوت حرارت کو کمزور کر دے گی اور رفتہ رفتہ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ سورج ہمارے نظام کا منبع حرارت اعلیٰ ہے اور وہ قوت جس پر ہماری حیات کا دارومدار ہے اس حرارت سے اخذ کی جاسکتی ہے جو سورج سے نکلتی ہے۔ جب کہ سورج ہمارے لئے قوت مہیا کرتا رہتا ہے تو خود وہ سرد ہوتا جاتا ہے اور آخر کار اس طرح خلائے بسیط میں حرارت نکالتے نکالتے اس میں وہ حیات قائم رکھنے والی قوت زائل ہو جائے گی جو اس وقت اس میں موجود ہے علاوہ سورج کے سرد ہونے کے ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ایٹمی رگڑ کی وجہ سے ہماری زمین اور ہمارے نظام کے دوسرے کرے بالثقاف سورج کے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ ہر ایسی حالت میں تصادم سے حرارت پیدا ہوگی اور عارضی طور پر سورج کی بجھی ہوئی قوت پھر بحال ہو جائے گی۔ اور آخر ایک روز یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور وہ بجھ بجھا کے رہ جائے گا۔ یہاں تک کہ ازمہ بیشار کے بعد اس کی پھر کسی پڑوسی سے ٹد بھیڑ ہو۔ اور اس کی جان میں جان آئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حرارت کا یہ ازالہ ایک روز ہمارے نظام کو ختم کر دے گا۔ تو پھر اس سے وہ قانون جسے قانون توال یا عدم انقطاع سے تعبیر کیا گیا ہے نہیں ٹوٹ جائے گا ایسی حالت میں وہ تسلسل جو برابر جاری رہنا چاہئے کہاں رہا؟ لیکن اگر صرف یہ عالم ظاہر ہی سب کچھ ہوتا تو بیشک یہی صورت واقع ہوتی۔ لیکن اب سائنس نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کے اور اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ایک ایسے عالم کو بھی محسوس کیا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ان قوانین کی تکمیل کے لئے جو اس نے دریافت کئے ہیں ایک غیر مرئی روحانی دنیا کا ہونا ضروری ہے۔ اسی قانون توال سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ غیر مرئی عالم سے قبل ہو گا۔ کیونکہ مرئی عالم کی کوئی ابتدا ہونی چاہئے۔ اب یہاں مذہب یا الہام اور سائنس کی سرگوشیاں شروع ہوتی ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ عالم ایک وقت میں خلق کیا گیا تھا۔ سائنس کہتا ہے کہ جس طرح یہ عالم اس وقت ہے ہمیشہ سے یہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مذہب کہتا ہے کہ دنیا اور اس کی کائنات سب مل کے خاک ہو جائے گی۔ سائنس ان قوانین کی رو سے جن کی حکومت اس دنیا پر ہے یہ

استدلال کرتا ہے کہ موجودہ نظام کا انجام یہی ہونے والا ہے۔ مذہب کتا ہے کہ ایک روحانی دنیا بھی ہے جس کا اس دنیا سے گہرا تعلق ہے اور ہماری حالت پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ سائنس بھی اب دہی زبان سے کہنے لگا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو یہ انسانی قانون مایامٹ ہو جائیں گے اور اپنے ہاتھوں آپ اپنی قبر بنائیں گے۔ کیونکہ قانون توال یا عدم انقطاع کا متقاضی یہ ہے کہ اگر یہ موجودہ کائنات برباد و تباہ ہوگی تو اس غرض سے کہ وہ دوسری جگہ ایک جدا سلسلہ قوانین کے تحت میں اپنی ہستی حاصل کرے اور نئے قانون نشوونما میں پھولے پھلے۔ اور یہی اصول افراد پر بھی صادق آتا ہے اور اس لئے بلا کسی مذہبی خیال کے روح کے غیر فانی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے۔ تو موت انسانی ترقی کی حائل اور مانع نہیں ہو سکتی۔ اور یہی آخرت یا عقیبے ہے۔

یہاں سائنس و مذہب کا وہ عناد و مخالفت جس کا اس قدر شور و غلغلہ مچا ہوا ہے اور جس پر ڈاکٹر ڈیرپیر نے فصاحت کے دریا بہا دیے ہیں۔ کا فور ہو جاتی ہے۔ سائنس اب تک ایک گنبد بے در میں چکر لگا رہا تھا۔ اب ادھر کی تھوڑی سی جھلک پہنچنی شروع ہوئی ہے۔ وہ آنکھیں مل مل کے دیکھ رہا ہے کہ یہ نئی شے کیا ہے۔ وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کی بصارت روشن اور اس کی بصیرت منور ہو جائے اور مذہب سے آکر بیعت کرے۔

غور سے اگر دیکھا جائے تو سائنس اور مذہب کی مخالفت محض غلطی اور غلط فہمی پر ہے اور طرفین نے اس میں اس قدر مبالغہ کیا ہے کہ بجائے سلجھانے کے اور الجھن پیدا کر دی ہے۔ سائنس کے جدید اور عجیب انکشافات اور انوکھے قیاسات اور نظریات سے جن پر اہل سائنس کو بڑا فخر ہے۔ اہل مذاہب گھبرا گئے کہ سائنس ہمارا جانی دشمن ہے کیونکہ وجہ یہ ہے کہ سائنس کے ہر جدید انکشاف کا یہ ناگزیر نتیجہ ہوا کہ دونوں آپس میں ٹکرا گئے۔ اور ان جدید انکشافات سے اس حالات میں تزلزل پیدا ہو گیا جس پر پہلے سے ایمان لائے بیٹھے تھے۔ ممکن ہے کہ اس حالت کو مذہب سے تعلق نہ ہو۔ لیکن چونکہ اسے قطعی اور یقینی سمجھ چکے تھے لہذا مذہب اور الہام کو بھی اسی پر ڈھال لیا تھا اور جب اسے نہیں لگی تو شور و غل مچانا شروع کیا اور مخالفت کی ایک نئی بنیاد قائم ہو گئی اور یہ سمجھ لیا کہ یہ مذہب کی عین مخالفت ہے۔ حالانکہ اسے مذہب سے کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ اہل مذاہب کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور الہام ربانی کو ہمیشہ گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ اور جہاں ان کی رائے پر بھی حملہ ہوا تو اسے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مذہب پر حملہ ہے۔

لیکن صرف اہل مذاہب ہی غلطی پر نہیں ہیں بلکہ اہل سائنس بھی اسی غلطی میں پھنسے

ہوئے ہیں۔ اہل سائنس اہل مذاہب کے اجتہادات اور آراء کو الہام ربانی سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے ان آراء کی غلطی ثابت کر دینے سے وہ سمجھتے ہیں کہ الہام ربانی کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ زیادہ تر خطرہ ”نیم حکیم“ اہل سائنس سے ہے جنہوں نے کبھی آنکھ اٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھا۔ اور جو سائنس کے قیاسات کو بھی یقیناً سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب سائنس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا اور ان میں یہ ہمیشہ مخالفت رہے گی۔ اگر بعض اہل سائنس جنہیں خدا نے اعلیٰ دماغ عطا کیا ہے یہ سمجھتے جاتے ہیں کہ مذہب و سائنس میں کوئی مخالفت نہیں اور وہ اس مادی عالم کے پرے ایک اور عالم کے بھی قائل ہوتے جاتے ہیں جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔

ڈاکٹر ڈریپر کی یہ کتاب ”کان فلکٹ بیوین سائنس اینڈ ریلیجن“ (معرکہ مذہب و سائنس) درحقیقت سائنس کی پرزور حمایت ہے۔ لیکن فاضل ڈاکٹر نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے۔ وہ یہ کہ جسے وہ مذہب کہتے ہیں وہ درحقیقت مذہب نہیں بلکہ رومن ازم ہے اور جتنے حملے بھی انہوں نے مذہب پر کئے ہیں۔ وہ بلاشبہ رومن ازم پر ہیں مذہب پر نہیں ہیں۔ بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ عام مذہب تو کیلہ خود مسیح کے مذہب پر بھی ان حملوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جب یہ بنیاد ہی غلط ہے تو وہ شاندار عمارت جو انہوں نے اس بنیاد پر قائم کی متزلزل ہو کر دھڑام سے گر پڑتی ہے۔

سائنس و مذہب کا یہ اختلاف اور ان کی باہمی بدظنی و بدگمانی ابھی مدت تک رہے گی۔ اور اسے سہتا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی اسے رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس کی بنیاد غلط فہمی اور ہٹ دھرمی پر ہے۔ اہل مذاہب کو سائنس کی صداقت پر اور سائنس کو مذہب کی صداقت پر ایمان لانا چاہئے۔ اور ایک روز آنے والا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اپنے نادانی پر پچھتائیں گے اور اپنی حرکات سے شرما کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائیں گے پھر سائنس کو مذہب سے اور مذہب کو سائنس سے کچھ عناد نہ ہو گا۔ اور یہ تو ام بھائی یک جان دو قالب ہو جائیں گے۔

-----۱۳-----

لیکن ایک مشکل اور ہے۔ سائنس کے اصول میں تو کیا فروع میں بھی بہت کم اختلاف ہے۔ سوائے ان امور کے جو قیاسی ہیں۔ کیونکہ وہ مشاہدے تجربے اور استقرا پر مبنی

ہیں۔ حالانکہ مذاہب کا یہ حال ہے کہ ہر ایک نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ ان بے حد اور بیشمار اختلافات میں یہ مشکل آپڑی کہ سچا کسے سمجھا جائے۔ اور صداقت کا پتہ کہاں ہے۔

پروفیسر میکس مور نے ایک جگہ دنیا کی زبانوں کے متعلق بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے لیکن تاہم انسان کی تاریخ میں کوئی زبان اب تک نئی نہیں بنی۔ قدیم سے جو الفاظ چلے آتے ہیں وہی اب تک چلے آتے ہیں۔ انہیں میں کچھ ہیر پھیر اور رد و بدل کر لیا جاتا ہے۔ بعینہ یہی حال مذاہب کا ہے۔ ہمیشہ نئے نئے بننے رہتے ہیں۔ نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن غور سے دیکھو تو اصل وہی ہے جو ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے۔ البتہ کچھ رد و بدل کر لیا گیا ہے۔ اختلافات صرف ان ممالک اور ان اقوام کی وجہ سے ہیں۔ جن میں مذاہب رائج ہوئے یا اس زمانہ کی وجہ سے جب کہ مذاہب کی اشاعت ہوئی۔ اگر ابتدا سے لے کر تمام مذاہب کو سلسلہ وار جمایا جائے تو یہ اختلاف کا مسئلہ صاف طور سے سمجھ میں آجائے گا۔ ملک اور قوم اور زمانہ کی وجہ سے جو خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں وہ اگر نکال دی جائیں تو پھر مشکل سے کوئی اختلاف باقی رہتا ہے اور اگر اختلافات ہیں بھی تو وہ انسانی خیال کی ترقی کے مراحل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس لئے وہ رد کرنے یا خارج کرنے کے قابل نہیں بلکہ ایک منظم سلسلہ میں آنے کے قابل ہیں۔

اس وقت کسی جدید مذہب کے قائم کرنے یا جدید صداقتوں کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل حق ظاہر کرنے کے لئے صداقت کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب کی ضرورت ہے۔ ہماری رائے میں اس کام کو اسلام نے خاطر خواہ انجام دیا ہے۔

مذہب کے لئے سب سے بڑی آفتِ مبالغہ ہے۔ ایک مذہب نے کسی ایک خوبی کو لیا اور اسے آسمان پر چڑھا دیا اور دوسری خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا دوسرے نے کسی دوسری خوبی پر اس قدر زور دیا کہ باقی خوبیوں کی کچھ حقیقت نہ رہی۔ یہودی مذہب نے ظاہری ارکان کی پابندی میں اس قدر مبالغہ کیا کہ باطنی صفائی پس پشت جا پڑی۔ اس کے خلاف عیسائی مذہب نے باطنی صفائی پر اس قدر زور دیا کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دنیا اور دنیاوی تعلقات سب بچ رہ جاتے ہیں۔ غرض مختلف مذاہب نے صداقت کے مختلف پہلوؤں کو خاص نظر سے دیکھا اور باقی پہلو یوں نہیں رہ گئے۔ اس مبالغہ سے مذاہب میں انحطاط اور تنزل پیدا ہوا۔ حالانکہ وہ بات جو باعث انحطاط ہوئی بڑی خوبی کی تھی۔ لیکن اس مبالغہ اس قدر کیا کہ وہ خود تو عیب ہو گئی۔ اور دوسری خوبیاں اس مبالغہ کی وجہ

سے کمزور ہو گئیں جس طرح کسی خاص عضو کی ورزش کرنے سے دوسرے اعضا کمزور ہو جاتے ہیں اسی طرح اخلاقی اور روحانی قوتوں کا بھی حال ہے ایک پر زور دینے سے دوسری کمزور ہو جاتی ہیں۔ مذہب کی کامل صداقت اور اصل کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ سب میں اعتدال قائم رکھے۔

انسان کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حیوانی دوسری روحانی۔ اور ان دونوں میں آپس میں اختلاف اور عناد ہے۔

پھر روحانی حالت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک عقل دوسری جذبات۔ اور یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

اخلاق و تمدن کا تہا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تعلق نہیں بلکہ یہاں دونوں (یعنی عقل و جذبات) گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی بھی دو صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان کی ذاتی ضرورتیں، دوسرے سوسائٹی کی ضرورتیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ اور باہم ایک دوسرے سے جدوجہد رکھتی ہیں۔ کیونکہ انسان شخصی حیثیت سے حقوق رکھتا ہے۔ اور بحیثیت رکن سوسائٹی اس پر فرائض عاید ہیں۔ بحیثیت انسان ناطق کے وہ کامل آزادی چاہتا ہے۔ سوسائٹی اس آزادی کی مانع ہے۔ شخصی ترقی کے لئے کامل آزادی کی ضرورت ہے۔ لیکن تمدنی ترقی کے لئے حکومت کی ضرورت ہے جو اس قسم کی آزادی کو روکتی ہے۔ اس لئے آزادی اور حکومت میں ہمیشہ جنگ و جدل رہتی ہے۔

غرض انسان اپنے تمام خیالات و تعلقات میں اختلافات سے گھرا ہوا ہے اور یہ اختلافات رفتہ رفتہ عناد و عداوت تک پہنچ جاتے ہیں جو مذہب و تمدن کی تخریب کا باعث ہوتے ہیں اور اس لئے انسان اور انسانی تمدن کی بہبودی کے لئے ضرور ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مختلف زمانوں میں مختلف نبی آئے اور اپنے اپنے عہد میں انہوں نے اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن نقص یہ رہا کہ وہ اصلاح صرف اسی زمانہ کے متعلق تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مبالغہ مذہب کے لئے سب سے بڑی آفت ہے۔ ایک زمانہ میں کسی ایک صداقت یا نیکی میں مبالغہ تھا۔ نبی نے اسے توڑنا چاہا۔ اور اس کے مقابلے میں کسی دوسری صداقت یا نیکی میں مبالغہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کامل اصلاح نہ ہو سکی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ صداقت کے تمام پہلوؤں کا کامل طور سے اظہار ہو۔ لہذا اس کی کامل اصلاح کے لئے ایک انسان کامل کی ضرورت تھی جو ملک عرب میں مبعوث ہوا۔ اس نے انسان کی مختلف حیثیتوں اور صداقت کے مختلف پہلوؤں پر ایسی غائر نظر ڈالی کہ جو اختلافات اب تک

چلے آ رہے تھے مٹ گئے۔ اور ایک ایسے مذہب کا سلسلہ قائم ہو گیا جو انسان کی دنیوی اور دینی نجات کا باعث ہوا۔ پیغمبر خدا صلعم ان اختلافات کی لم اور اصلاح کے اصلی راز کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اس لئے انہوں نے مبالغہ سے احتراز کیا اور اعتدال کو مد نظر رکھا۔ اور ان اختلاف میں ہمیشہ کے لئے مصالحت پیدا کر دی۔ یہ وہ رستہ تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ پیغمبر خدا نے اس معے کو حل کیا۔ اور انسان کی کامل بہبودی اور اصلاح کی بنیاد ڈالی جس کا احسان اس عالم پر ہمیشہ رہے گا۔

جس طرح مبالغہ انحطاط و زوال کی علامت اور تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح اعتدال تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ انسان کی حالت ایسی کش کش میں ہے کہ وہ مبالغہ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر ایک طرف جاتا ہے تو دوسری طرف سے محروم رہا جاتا ہے۔ اس لئے ایسی تعلیم کی ضرورت تھی جو اعتدال پر رکھے اور اس کی کسی قوت میں زوال نہ آنے پائے۔ اعتدال نہ صرف انسانی معاملات اور اس دنیا کے امور کی اصلاح کے لئے ضروری ہے۔ بلکہ تمام اخلاقی و نیکی اور کل کائنات کا دار و مدار اسی پر ہے۔ یہ زمین، یہ سیارے یہ نظامات جو گردش میں ہیں اگر بال برابر اپنی حد اعتدال سے تجاوز کریں تو ایک عالم میں قیامت برپا ہو جائے اور یہ سارا کارخانہ خاک میں مل جائے۔ یہی حال کائنات کی ہر شے میں ہے۔ نیکی و بدی کیا ہے؟ اخلاق کیا ہے؟ صحت کسے کہتے ہیں؟ ذوق کس چیز کا نام ہے؟ اگر ان سب باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان سب کا مدار اعتدال پر ہے۔ جہاں یہ نہیں وہاں قیام اور استحکام کی صورت نہیں۔ اسی عالم گیر اور پر معنی اصول پر پیغمبر اسلام کی تعلیم مبنی ہے اور اسی اصول پر نظر نہ رکھنے سے قدیم مذاہب میں انحطاط و زوال پیدا ہوا۔ اسلام نے اس کمی کو پورا کیا اور اپنی تعلیم سے ہمیشہ کے لئے ایسی بنیاد قائم کر دی جس میں انحطاط و زوال نہیں آسکتا۔

اگرچہ رہائشیت کو اسلام نے خارج کیا ہے اور حسن معاشرت کے متعلق احکام دیے ہیں۔ لیکن تاہم یہ بھی ہدایت کی ہے کہ بالکل دنیا ہی میں منہمک نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ دنیا کی زندگی دھوکے کی ٹٹی ٹٹھے۔ نماز روزے حج کی تاکید کی ہے۔ ظاہری ارکان پر بھی ایک حد تک نظر رکھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا کہ نیکی کے یہی معنی نہیں کہ نماز کے لئے پورب پیچتم کو منہ پھیر دیا بلکہ اللہ کی محبت میں عزیز و اقارب یتیموں محتاجوں مسافروں کو اپنا مال دینا، غلاموں کو آزاد کرنا، زکوٰۃ دینا، نماز پڑھنا، اپنے عہد کو پورا کرنا، سختی اور تکلیف میں ثابت قدم رہنا۔ اس سے بڑھ کر نیکی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ اس کا مدار محض

ظاہری ارکان پر ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی سچی محبت اور انسانوں کے ساتھ سچی ہمدردی اور ایثار میں ہے۔ اسلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دنیا و آخرت۔ مادی اور روحانی عالم دونوں کی رعایت رکھتا ہے۔ اور جب انسان ظاہری ارکان اور اصول کا پابند ہو گیا تو پھر نیکی کے معنی اس کے لئے وسیع ہو جاتے ہیں اور وہ آگے قدم رکھتا ہے۔ اور اس کا روحانی احساس قوی ہونے لگتا ہے۔ خود آنحضرت صلم کی زندگی اس کی سچی مثال ہے۔ حبابؓ صحابی آنحضرت صلم کہتے ہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر کے نیچے کملی رکھے ہوئے کعبہ کے سائے میں لیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے مشرکوں سے بہت کچھ ایذا اور تکلیف پائی تھی۔ میں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کفار پر بددعا کیوں نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ اٹھ بیٹھے اور آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمانے لگے۔ اگلے لوگوں میں ایسے ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ بے دین لوگ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر کھڑا کر دیتے تھے اور اس کے سر پر آہ چلا کر اسے دو ٹکڑے کر ڈالتے تھے لیکن اس قدر تکلیف بھی اس بندے کو دین سے نہ پھیرتی تھی اور کسی پر لوہے کی کنگھی اس سختی سے کھینچتے تھے کہ وہ اس کے گوشت کو طے کر کے پٹھے اور ہڈی تک پہنچتی تھی مگر یہ سختی اسے دین سے نہ پھیرتی تھی۔ سچ پر ثابت قدم رہنے کی اس سے بڑھ کر اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے۔

اسی طرح اسلام نے تمام تعلیم میں اعتدال کو مدنظر رکھا ہے خواہ عبادات میں ہو یا اخلاق میں۔ مثلاً" یہ فرمایا ہے کہ برائی کا بدلہ دیکسی ہی برائی ہے۔ بدلا لو تو اس کے بدلے میں اسی قدر تکلیف دو جتنی تمہیں پہنچتی تھی۔ لیکن اگر صبر کرو درگزر کرو معاف کرو اور بخش دو تو اللہ تمہیں دوہرا اجر دے گا اور اللہ ایسے لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور اس کو بار بار مختلف مقامات میں تاکید سے بیان کیا ہے اور بدلے کے مقابلہ میں عفو کا درجہ بڑا بتایا ہے۔ آخر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تم گنہگاروں، خطا کاروں، دشمنوں اور مخالفوں سے شیوہ عفو و غفران اختیار کرو گے، تو خدا بھی تمہاری خطاؤں سے درگزر کرے گا۔ یعنی بدلہ لینا اگرچہ انسان کی عادت میں داخل ہے اور مقتضائے عدالت ہے لیکن اخلاق کریمانہ کا یہی مقتضا ہے کہ برائی کے عوض بھلائی کرو اور مخالفوں کی خطاؤں اور برائیوں کو معاف کرو اور عموماً" درگزر کرو۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ بری بات کا جواب ایسا کہو جو سب سے بہتر ہو۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی۔ برائی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو کہ وہ بہت ہی اچھا ہو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم دیکھ لو گے کہ تم میں اور کسی شخص میں نداوت تھی تو اب ایک دم سے گویا وہ تمہارا دل سوز دوست ہے۔ اور حسن مدارات کی

توفیق انہیں لوگوں کو دی جاتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ انہیں کو دی جاتی ہے جن کے بڑے نصیب ہیں۔ پھر یہ بھی سمجھایا ہے کہ کسی قسم کی عداوت تم کو عدل کرنے سے باز نہ رکھے اور کسی جماعت کی دشمنی تم کو انصاف کرنے سے نہ روکے۔ تم اپنے دشمن اور دوست سب سے عدل و احسان و انصاف کا برتاؤ کرو۔ چنانچہ فرمایا ہے اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے لئے گواہی دینے کو انصاف کی۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل نہ چھوڑو۔ تقویٰ کی بات یہی ہے کہ تم عدل کرو۔ اس سے بڑھ کر حسن معاشرت اور نیکی کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے۔

اسی طور پر روپے پیسے کمانے اور اس کے صرف میں اعتدال کی ہدایت ہے۔ کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو۔ اللہ مسرفوں کو پسند نہیں کرتا۔ خرچ کرنے والے فضول خرچی نہ کریں۔ اور نہ بہت تنگ دستی کریں۔ ان کا خرچ دونوں کے بین بین ہو۔ رشتہ دار غریب اور مسافر کے حقوق دیتے رہو۔ اور دولت کو بیجا نہ اڑاؤ۔ دولت کے بیجا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔ اگر تم اپنے پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو توقع ہے ان سے منہ پھیرنا پڑے تو نرمی سے ان کو سمجھا دو۔ اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑو کہ گردن میں بندھ جائے اور نہ بالکل اسے پھیلا ہی دو کہ لوگوں کی ملامت سننے بیٹھو۔

پھر اسلام نے ایک دوسری اعلیٰ تعلیم دی ہے جو تمدن کی جان اور ترقی عالم کی روح رواں ہے۔ فرمایا ہے کہ ائما المومنون اخوة یعنی مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ یہ بات صرف اسلام میں پائی جاتی ہے کہ ایک اونے غلام اور ایک شہنشاہ برابر ہے۔ اور صرف یہ قول ہی قول نہیں بلکہ ابتدائے اسلام سے اب تک اس پر عمل جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے غلام بھی بڑے بڑے شہنشاہ ہو گزرے ہیں۔ اسلام کی حدود میں داخل ہوتے ہی غیر شخص برادری کا بھائی ہو جاتا ہے اور اس کے حقوق سب کے برابر ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم جادو کا اثر رکھتی ہے اور اس نے اشاعت اسلام میں بہت مدد دی ہے۔ دنیا میں جتنی اقوام ہیں ان کی تقسیم محض حدود جغرافیہ کی رو سے ہے۔ لیکن مسلمانوں کی قوم اسی تنگ اور اونے امتیاز سے بالا ہے۔ مسلمانوں کی راہ میں ملکی حدود آب و ہوا، رنگ اور نسل حائل نہیں۔ وہ سب ایک ہیں خواہ کہیں ہوں۔ افریقہ کا حبشی عرب کا بدو۔ ہندوستان کا برہمن، یورپ کا فرنگی، مصر کا فلاح غرض دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہی یہ سب کمزور اور عارضی امتیازات اٹھ جاتے ہیں اور وہ ایک ہو جاتے ہیں۔ مسلمان کہیں ہو

اور کوئی ہو مسلمان ہے۔ اس کا وطن سارا عالم اور اس کی برادری سب مسلمان ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے کہ سب مل کر مضبوطی سے اللہ کا ریعہ پکڑے رہو اور ایک دوسرے سے الگ نہ ہو اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اس کے فضل سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔

اس سے بھی بڑھ کر اعلیٰ اور افضل ایک اور تعلیم اسلام ہے۔ جو درحقیقت تمام عالم کے لئے صلائے عام ہے۔ یعنی پیغمبر نے فرمایا ہے **من قل لا اله الا الله فدخل الجنة** اس سے بڑھ کر کامل وسیع اور عالمگیر اصول کسی دین و مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام نے اپنا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ وسیع ہونا ممکن نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کا ہمیشہ بول بالا رہے گا اور دنیا میں اس کی حکومت ہوگی۔ گویا اسلام نے مذہب کی تکمیل کر دی اور خدا کی نعمت کو سارے عالم پر پھیلا دیا۔ اس کا مشرب اس قدر ہمہ گیر، اس کے اخلاق اس قدر پاکیزہ اور اس کی تعلیم اس قدر اعتدال پر مبنی اور انسانی طبائع کے مناسب اور انسان کی ترقی کی مدد ہے کہ دنیا کی مادی اور روحانی ترقی کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔

یہ محض اقوال نہیں ہیں بلکہ خود پیغمبر اور پاک باطن خلفاء اور تابعین نے اپنے عمل سے اخوة اسلامی اور مسالمت اور ایثار کا سچا سبق دیا ہے جس کی شہادت میں تاریخیں بھری پڑی ہیں۔

خود ڈاکٹر ڈیچر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح مسلمان پولیشل حیثیت سے عالم پر چھا گئے۔ اسی طرح انہوں نے میدان علوم و فنون میں بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور نہ صرف یونان کے مردہ علوم کو زندہ کیا بلکہ اپنے علمی انکشافات و ایجادات اور اپنے انوکھے بے ہما خیالات سے دنیا کو مالا مال کر دیا۔ اور صلح جوئی آزادی بے تعصبی اور مسالمت میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ اور یورپ کے اندھیرے گھپ میں وہ مشعل دکھائی جس کے نور سے وہ اب تک جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ غرض اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مادی اور روحانی ترقی، دنیاوی تمدن اور اخروی راحت، عقل اور جذبات مذہب و سائنس میں توافق اور توازن قائم رکھنے والا ہے۔ اب تک قدیم مذاہب میں سے کسی نے صداقت کے ایک پہلو پر بھی زور دیا تھا اور کسی نے کسی دوسرے پہلو پر۔ مگر اسلام نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور ان سب کو اس اعتدال اور خوبی کے ساتھ ترتیب دیا کہ اس کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ وہ خاتم المذاہب اور اکمل الادیان ہے۔ اور انسان کی ترقی اور نجات کا سچا اور صحیح راستہ ہے۔

میں اس موقع پر اس امر کا شمار مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یادگار رہے گا۔ جہاں تک میرا علم ہے اردو زبان میں یہ پہلا علمی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہ قائم رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے ترجمے میں دو بڑی مشکلیں تھیں ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث۔ دوسری زبان کی خوبی و فصاحت۔ اردو سی بے بضاعت زبان میں ان دونوں کا قائم رکھنا بہت دشوار کام تھا۔ مگر مولوی ظفر علی خان صاحب نے جو درحقیقت قابل مبارکباد ہیں اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے لیکن یہ اسی سے ہو سکتا ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور جسے زبان پر اس قدر قدرت ہو جیسی فاضل مترجم کو حاصل ہے۔

لہ لا رہبانیتہ فی الاسلام

لہ وما العیوۃ الامتاع الغرور

لَہ لَیْسَ الْبِرُّ اَنْ تُوَلُّوْا قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَکِنَّ الْبِرَّ مِنْ اَمْنٍ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَالْمَلَائِکَہِ وَالْکِتَابِ وَالنَّبِیِّنَ وَاَتٰی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ فَوٰی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ
وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّائِلِیْنَ وَفِی الرَّقَابِ وَاَتَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتٰی الزَّکٰوۃَ وَالْمُؤْتُوْنَ بِمَهْلِہِمُ
اِنَّا عَاطَلْنَا وَالصَّبِرِیْنَ فِی الْبَاسِءِ وَالضَّرَآءِ وَحِیْنَ الْبَاسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ
ہُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔

لَہ وَلَیُّوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السِّمَۃِ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ عَقِبٰی الدَّارِ (رعد - ۲۰)

وَجَزَاءُ سِیِّئَۃٍ سِیِّئَۃٌ مِّمَّہٗ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاجْزِہٖ عَلٰی اللّٰہِ (شور - ۳۸)

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ لِعَاقَبُوْا مِثْلَ مَا عَوَّقْتُمْ بِہٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَہُوْخِیْرٌ لِّلصَّابِرِیْنَ (نحل)

فَاعْفِ عَنْہُمْ وَاَصْفَحْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ لِمَحْسِنِیْنَ (مائدہ)

ہے وَلِیَحْفُوا وَالیَصْفَحُوا اَلَا تَعْبُوْنَ اِنْ یَغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ (نور - ۶۳)

لَہ اَدْلَعُ بِالَّتِیْ ہِیْ اَحْسَنُ (مومنون - ۴۸)

لَہ وَلَا سَتُوْی الْحَسَنَۃِ وَلَا السِّیِّئَۃِ اَدْلَعُ بِالَّتِیْ ہِیْ اَحْسَنُ فَاِذَا لَیْیَیْنُکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَانَہٗ

وَلِیْ حَمِیْمٍ ۝ وَمَا یَلْقَہَا اِلَّا فَوْحٌ عَظِیْمٌ (حم سجدہ - ۳۵)

لَہ بِاٰیٰہِا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوَّامِیْنَ لِلّٰہِ شَہَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاۡنُ قَوْمٍ عَلٰی اَنْ

لَا تَغْلُوْا اَعْلٰوًا ہُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔

لَہ کُلُوْا وَاَشْرَبُوْا وَلَا تَسْرِوْا

لَہ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ (سورہ انعام - رکوع ۱۷)

۱۱۔ وَالَّذِينَ إِذَا انْفَقَوْا لَهُمْ يَسْرَفُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا" (سورہ فرقان - رکوع ۶)
 وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ
 فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا"۔

۱۲۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ
 بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا"۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہرگز نیر و آنکہ و لش زندہ شد بعلم
ثبت ہست بر جرین عالم دوام او

ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر ایم ڈی ایل ایل ڈی

ڈاکٹر ڈریپر مصنف کتاب معرکہ مذہب و سائنس مغربی دنیا کے ان مشاہیر میں سے ہیں جو نام بوجہ ان کے علمی کارناموں کے لوح روزگار پر سنہرے حرفوں میں ابد تک لکھا رہے گا۔ ان کی ذات انگلستان کے لئے جو ان کا جنم بھوم تھا اور امریکہ کے لئے بھی جہاں وہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ سرمایہ افتخار و نازش ہے۔ اور ان کا نام دنیائے علوم و فنون میں ہر جگہ ادب و احترام سے لیا جائے گا۔

جان ولیم ڈریپر ۱۸۸۱ء میں بمقام سینٹ ہیلن پیدا ہوئے جو لور پول کے نواح میں واقع ہے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے لور پول ہی میں پائی۔ اور جب لندن یونیورسٹی کا افتتاح ہوا تو آپ فنِ کیمیا کی تحصیل کی غرض سے یونیورسٹی میں بھیج دیئے گئے۔ ۱۸۳۲ء میں آپ نے امریکہ کا عزم کیا۔ اور پنسلونیا کی یونیورسٹی میں بغرض اکتساب فن طب داخل ہو کر ۱۸۳۶ء میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ دنوں کے بعد اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے آپ ورجینا کے ہیمپڈن سڈنی کالج میں کیمسٹری کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور ۱۸۳۵ء میں نیویارک کی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر ڈریپر کی سب سے پہلی علمی تصانیف کا موضوع یہ مسئلہ تھا کہ روشنی کا موالید تلاش پر کیمیایا اثر کیا ہوتا ہے۔ اس موضوع پر آپ کی تقریباً ۴۰ تصنیفات موجود ہیں۔ روشنی کے کیمیایا اثرات میں سب سے زیادہ مہتمم بالشان اثر کاربالک ایسڈ کی وہ تحلیل ہے جو درختوں کے پتوں پر دھوپ کی شعاعوں کے پڑنے سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اسی واقعہ پر نباتات کی نشوونما کا انحصار ہے۔ اور اس کی بدولت حیوانات کو بالواسطہ یا بلاواسطہ غذا ملتی ہے۔ اس تحلیل کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہو گا۔ کہ بالفاظ دیگر اسے نثر اکساید یعنی آکسیجن کے اجزا کی عیلدگی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ روشنی کا جب بذریعہ مٹھاس الوان نور منشور تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سات رنگ کی شعاعوں کا مرکب ہے یعنی (۱) بنفشی (۲) سرمئی (۳) ارزقی (۴) اخضر (۵) اصفری (۶) نارنجی (۷) احمری۔ ۱۸۴۰ء تک علمائے سائنس کا یہ خیال تھا کہ عمل نثر اکساید بنفشی شعاع کی وجہ سے

واقع ہوتا ہے اور اسی لئے اس کا نام شعاع نشر اکسائو رکھ دیا گیا تھا لیکن یہ محض قیاسی نظریہ تھا۔ جو کسی تجربہ سے قطعی طور پر ثابت نہ کیا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر ڈرپیر کو خیال ہوا کہ اس مسئلہ کے قطعی تصفیہ کی صرف ایک شکل ہے۔ اور وہ یہ کہ تحلیل خود لوہان نور منشور کے ذریعہ سے کی جائے یعنی نباتاتی مادہ کو ہر رنگ کی شعاع کے زیر عمل لا کر دیکھا جائے۔ کہ نشر اکسائو کس شعاع سے ہوتا ہے۔ اس لطیف و دلکش تجربہ میں ڈاکٹر ڈرپیر کو پوری کامیابی ہوئی۔ اور انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ عمل تحلیل میں شعاع بغشی مطلق حصہ نہیں لیتی بلکہ یہ کام شعاع اصفری سے متعلق ہے۔ اس نتیجہ کا تمام علمی دنیا میں نہایت دلچسپی کے ساتھ نیز مقدم کیا گیا اور علمائے کیمیا کی معلومات میں اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہو گیا۔ ڈاکٹر ڈرپیر نے نور کی قوت کیمیائی کے اندازہ کرنے کا ایک آلہ بھی ایجاد کیا جس سے آگے چل کر علمائے کیمسٹری نے بہت کچھ مدولی۔ چنانچہ ہنسن اور راسکو نے جب ۱۸۵۶ء میں اپنے کیمیائی تجربوں کے متعلق ایک مضمون رائل سوسائٹی لندن کے اجلاس میں پڑھا تو اس میں اعتراف کیا کہ ڈرپیر کو اس آلہ کی مدد سے نور کے عمل کیمیائی کے بعض نہایت ہی اہم نکات کے حل میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ۱۸۴۷ء میں ڈاکٹر ڈرپیر نے ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا کہ حرارت سے نور کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان الوان نور منشور کا تجربہ زیادہ کامل و مکمل ہو گیا۔ یہ دریافت کرنا ممکن ہو گیا کہ آفتاب ستارے اور نباتات النجوم ٹھوس حالت میں ہیں یا سیال حالت میں۔ اس رسالہ میں ڈاکٹر ڈرپیر نے تجربہ ”ثابت کر دیا کہ تمام ٹھوس اجسام اور تمام مائع اجسام غالباً ایک ہی درجہ حرارت پر پہنچ کر منور ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ڈرپیر پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۳۹ء میں انسانی چہرہ کی عکسی تصویر کامیابی کے ساتھ اتاری اور نیز قمر کا عکس لیا۔

یہ چند مثالیں علمی تحقیقات و انکشافات کی اس طویل فہرست سے اخذ کی گئی ہیں۔ جس کی ترتیب و تدوین کے لئے ڈاکٹر ڈرپیر نے اپنی نمایاں قابلیتوں کو مرتے دم تک وقف کئے رکھا اور جب یہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ آپ نے اپنے انکشافات علمیہ کو جو بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہو سکتے تھے کبھی آلہ جلب و منفعت نہ بنایا۔ بلکہ سچا ذوق علمی اور ہمدردی بنی نوع انسان ان کی محرک ہوئی تو آپ کی جلالت قدر کا بے اختیار اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ کا نایاب رسالہ ”پاپولر سائنس سٹسٹل“ جس کے جنوری ۱۸۷۴ء کے نمبر سے ان حالات کا اقتباس کیا گیا ہے لکھتا ہے کہ یہ علمی انکشافات جو ڈاکٹر ڈرپیر کی سالہا سال کی عرقریزی اور

دماغ سوزی کے نتائج ہیں۔ اپنے گراں ہمارے مصارف کے تلف کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کی جیب خاص کے رہن منت ہیں۔ اگرچہ بعض علمی تجربوں پر انہیں ایک رقم نظیر صرف کافی پڑی۔ لیکن ان کی اولوالعزمی کبھی کسی غیر کی مالی سرپرستی کی روادار نہ ہوئی۔ نسوں نے اپنی کسی ایجاد کو کبھی پیٹنٹ نہ کرایا۔ بلکہ جو علمی نکتہ دریافت کیا۔ اور جو ایجاد کی اس کا شہر ازراء غایت اہل نفس خلق اللہ کی نذر کر دیا۔

ان تصانیف سے جن میں ادق علمی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ قطع نظر کر کے اگر ڈاکٹر ڈریپر کی دوسری تصانیف کو جن کا موضوع تاریخی اور نظری مباحث ہیں دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ آپ ایک مسلم اثبات اویب اور اثنا پرواز بھی ہیں۔ ۱۸۶۰ء سے لے کر ۱۸۷۲ء تک کا زمانہ آپ نے اسی قسم کی دلچسپ و کتابوں کے تصنیف کرنے میں گزارا چنانچہ یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ خانہ جنگی امریکہ اور ”معرکہ مذہب و سائنس“ اسی دور کی تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر ڈریپر کا انتقال ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ آپ کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں بقید حیات موجود ہیں۔ بیٹے علم و فضل میں اپنے نامور باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ بڑا بیٹا ڈاکٹر ہنری ڈریپر نیویارک کے کالج میں علم خواص الاشیاء کا پروفیسر ہے۔ دوسرا بیٹا ڈاکٹر جان ڈریپر نیویارک کی یونیورسٹی میں علم حیات حیوانی کا پروفیسر ہے۔ تیسرا ڈاکٹر ڈیوڈ نیل ڈریپر نیویارک کی رصد گاہ متعلقہ حوادث الجو کا ناظم ہے۔

پروفیسر رچرڈ پراکٹر اپنی تالیف ”یشر و ہلنکس“ (مطالعہ بوقت فرصت) میں جو لطیف و دلکش مضامین کا ایک نفیس مجموعہ ہے۔ ”کانٹکٹ یونین رلیجن اینڈ سائنس“ یعنی کتاب ہذا کی نسبت حسب ذیل خیال ظاہر کرتے ہیں۔ یہ کتاب ایک اعتبار سے یورپ کی دماغی ترقی کا خلاصہ ہے۔ مذہبی تعصب اور عدم مسالت پر اس میں سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی گئی ہے اور ان وجوہ پر نظرافصاف نہیں ڈالی گئی جو بسا اوقات مذہب جبر و تشدد کی محرک ہوئیں۔ لیکن بایں ہمہ یہ کتاب ایک صحیح الدماغ اور صاحب الرائے شخص کے قلم کا ماحصل ہے۔ اور اگر ان چند مقامات سے قطع نظر کیا جائے جن میں بیجا سختی پائی جاتی ہے تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب پڑھنے والوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچا چکی ہے اور پہنچا سکتی ہے۔

بحیثیت ایک مسیحی ہونے کے پروفیسر پراکٹر کو ”معرکہ مذہب و سائنس“ کی نسبت یہی رائے ظاہر کرنی چاہئے تھی اور اگر ہم (خدا نخواستہ) مسیحی ہوتے تو اس تعریف میں جس کی

یہ کتاب دوست دشمن سب کے نزدیک مستحق ہے منصفیت کے شاید اس سے بھی زیادہ شائے مانے نکالتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سائنس کے مقابلہ میں نصرانیت پر جو فرد قرارداد اور جرم ڈرپہر نے لگایا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ نصرانیت کا بڑے سے بڑا وکیل اس کے چھوٹے سے چھوٹے نکتہ کا تخیل کر سکے اور اگر چشم انصاف کھلی رکھ کہ ان واقعات پر نظر ڈالی جائے جو سائنس اور نصرانیت کی ہزار سالہ جنگ کے محرک ہو کر اس شکست فاش پر فتنی ہوئے جو نصرانیت کو اپنے حریف کے مقابلہ میں اٹھانی پڑی اور جنہوں نے نصرانیت کی روحانی و اخلاقی قوتوں کا شیرازہ بکھیر کر اسے محض پو لیٹیکل اغراض کی تکمیل کا ایک مادی آلہ بنا دیا ہے تو خواہی غواہی اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو فتح سائنس کو بمقابلہ نصرانیت حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ حق اور قوت دونوں اس کی جانب تھے اور ڈاکٹر ڈرپہر نے کوئی بات ان دونوں حریفوں کے کارناموں اور ان کی جدوجہد کے متعلق ایسی نہیں بیان کی جس کی تغلط و تردید ہو سکے البتہ ایک لغزش ڈاکٹر ڈرپہر سے یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے مذہب پر اس حیثیت سے نظر ڈالی ہے کہ اس کا الہامی حصہ غیر متحرک اور غیر ترقی پذیر ہونے کے لحاظ سے گویا جلا کے اوہام باطلہ کا ایک لالچنی مجموعہ ہے جس کی ظلمت آفتاب سائنس کی درخشاں شعاعوں کے آگے ایک پل نہیں ٹھہر سکتی۔ انہوں نے مذہب کے فلسفہ پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالی اور فطرت انسانی کے اس زبردست اقتضا کا حکیمانہ تجزیہ نہیں کیا جو مذہبی تخیل کی شکل میں بیسیویں صدی عیسوی کے انسان کو بائیں ہمہ دانش و حکمت انسان اولین سے سلا ”بعد نسل ترکہ میں پہنچا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک مقام پر مصنف نے انسان کی دماغی ساخت پر علم حیات حیوانی کے اصول سے بحث کرتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مذہبی خیالات فکر انسان کے اجزائے لاینفک ہیں اور ان سے کسی انسان کو خواہ وہ کیسا ہی تہذیب یافتہ اور روشن دماغ کیوں نہ ہو مفر نہیں لیکن یہ بحث بیچ میں برسہیل سطراد آجاتی ہے اور اس سے وہ کوئی اہم نکتہ جسے انسان کے معاد سے تعلق ہو اخذ نہیں کرتے جس کی وجہ غالباً ”یہ ہے کہ ان کے پیش نظر رومن کیتھولک نصرانیت کے مزخرفات لا طائل و شطیحات لالچنی ہیں اور انہوں نے اپنی تمام قوت انہیں کے لئے اہمال و ابطال میں صرف کر دی ہے۔

رومن کیتھولک مذہب کے پیشواؤں نے کچھ تو اس تحریف کی وجہ سے دھوکا کھا کر جس نے تورات و انجیل کی سماوی اصلیت کا پایہ اعتبار سے ساقط کر دیا کچھ اس جہالت کے اقتضا سے جو قرنہما قرن تک پادریوں کا سرمایہ امتیاز بنی رہی اور کچھ ان سیاسی ضرورتوں سے

مجبور ہو کر جنہوں نے ان کے دین کو مبدل بہ دنیا کر دیا ان باتوں میں بھی دخل دینا شروع کر دیا تھا جن سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا یعنی وہ انسان کو اخلاق حسنہ سکھاتے سکھاتے اور نجات اخروی کی راہ دکھاتے دکھاتے علم و حکمت کے بھی سبق آموز بن گئے اور سائنس کے مسائل پر بھی ملہم من الہی کی حیثیت سے رائے زنی کرنے لگے۔ اس غلط بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقائق فطرت کے متعلق جب انسان کو صحیح صحیح علم ہوا تو ان کے دعاوی جنہیں الہام سے کوئی لگاؤ نہ تھا باطل ہو گئے اور ان کے پیرو ان کو جھوٹا سمجھ کر کفر و الحاد کی طرف جھک پڑے اور مغربی دنیا ایک بڑی حد تک مذہب کی قید سے آزاد ہو گئی۔ ڈاکٹر ڈریپر کو رومن کیتھولک پادریوں کے اس طرز عمل نے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کیا کہ وہ مذہب جو سائنس کے مطابق نہ ہو۔ چھوٹا ہے اور وہ صحائف آسمانی جو حقائق فطرت کے مخالف ہوں ایمان پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ یہ عام نتیجہ بالکل صحیح ہے اس لئے کہ بقول سرسید احمد خان رحمت اللہ علیہ کے سائنس کی ہر حقیقت خدا کا کام ہے اور صحیفہ آسمانی خدا کا کلام ہے۔ دونوں میں اگر ضد ہو تو ممکن نہیں کہ دونوں سچے ہوں پس جس کی سچائی حق سلیم ہے۔ نزدیک جو معیار یقین ہے مسلم نہ ہوگی وہ باطل ہو گا۔ لیکن ہم کو ڈاکٹر ڈریپر کی بالغ نظری اور نصیحت پروری سے اس امر کی توقع تھی کہ وہ صرف یہی نتیجہ نکال کر نہ رہ جائیں گے۔ چونکہ فرقہ رومن کیتھولک کے لوگ مسئلہ عصمتِ پاپا کے قائل ہیں۔ اور اس کو تائب سمجھ کر اس کی ہر بات کو برحق سمجھتے ہیں اس لئے رومن کیتھولک مذہب جھوٹا ہے۔ سائنس کے ساتھ توافق نہیں رکھ سکتا اور چونکہ پرائسٹنٹ مذہب سچائی تلاش بائبل اور اوراق میں کرتا ہے اور اصلی سچائی صحیفہ فطرت کے اوراق میں مضمر ہے لہذا وہ عقلی بحر ان جس میں یورپ مبتلا ہوا چاہتا ہے منجر بہ ہلاکت مذہب ہو گا۔ ہم کو امید تھی کہ ڈاکٹر ڈریپر مذہب اور سائنس کے درمیان ایک خط فاضل کھینچ کر اور ایک کو معاد اور دوسرے کو معاش کا منظر قرار دے کر اس مسئلہ پر بحث کریں گے کہ اگرچہ ان کا موضوع جدا جدا ہے۔ لیکن انسان کو اس جسمانی دماغی اور روحانی منزل پر پہنچنے کے لیے جس کی طرف انگشت ارتقا اشارہ کر رہی ہے دونوں کی یکساں ضرورت ہے اور تاوقتیکہ سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے ممد و معاون نہ ہوں گے انسان کے قوائے ذہنی و روحانی متہائے بلوغ کو نہ پہنچ سکیں گے۔ ہمیں خیال تھا کہ ڈاکٹر ڈریپر موجودہ مذاہب کا مقابلہ کر کے ایک ثالث کی حیثیت سے یہ فیصلہ کریں گے کہ ان میں سے کون سا مذہب سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور اس لحاظ سے سائنس کے دوش بدوش چلنے کے قابل ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری یہ تمنائیں

اور توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر ڈریپر نے جو فیصلہ کیا ہے وہ یک طرفہ ہونے کی حیثیت سے بھی بالکل ادھورا ہے۔ انہوں نے اول تو سائنس کے مد مقابل کی شخصیت کی تعظیم کو تخصیص سے بدل دیا ہے یعنی علوم کا حریف نصرانیت کو قرار دیا ہے کسی دوسرے مذہب سے سروکار نہیں رکھا اور نصرانیت سے بھی رومائی نصرانیت مراد لی ہے۔ غالباً اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ رومائی نصرانیت ہی نے اپنے آپ کو علوم و فنون کا سب سے بڑا دشمن ثابت کیا ہے۔ دنیا میں بجز رومائی نصرانیت کے اور کوئی مذہب ایسا نہیں ہے کہ جو قدیم الایام سے ہر علمی تحریک کے ساتھ اس درجہ معاندانہ برتاؤ کرتا چلا آیا ہو اور جس کے ہاتھوں اہل علم کو اتنی سخت ایذائیں پہنچی ہوں اور غالباً اسی لیے مذہب کو سائنس کا حریف قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر ڈریپر نے مذہب سے مراد رومن کیتھولک نصرانیت لی ہے اور اپنی کتاب کا نام بجائے نصرانیت اور سائنس کے معرکہ کے ”معرکہ مذہب و سائنس“ رکھا ہے پرائسٹنٹ نصرانیت کے متعلق اگرچہ انہوں نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ اس کا اور سائنس کا میل ممکن ہے لیکن جب انہیں کے قول کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ سائنس پر پرائسٹنٹ مذہب کا ذرا سا بھی احسان نہیں ہے اور اس کی ترقی میں مارٹن لوتھر کی اصلاح نے ذرا بھی حصہ نہیں لیا اور نیز جب یہ امر پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ زمانہ حال کی فلسفیانہ تنقید نے انجیل مقدسہ کو جو پرائسٹنٹوں کا منہاج ایمان ہیں تحریف و تدریس سے مملو ثابت کر دیا ہے اور ان میں ایسے ایسے تاریخی نواقض کا موجود ہونا بدلائل قاطع پایہ ثبوت کو پہنچا دیا ہے جن سے ان کی تنزیل ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے اور جن کا جواب کسی پادری سے بن نہ پڑا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر یہ دونوں ایک دوسرے کے دلی دوست ہو سکتے ہیں۔

رومائی اور پرائسٹنٹ نصرانیت میں سب سے بڑا مابہ الافراق یہ ہے کہ رومن کیتھولک فرقہ آیات کتب مقدسہ کی تفسیر اور مذہبی عقائد کی تاویل و تعین کا حق صرف پاپائے روم اور اس کے ماتحت پادریوں سے مخصوص سمجھتا ہے اور پرائسٹنٹ فرقہ کے عقیدہ کے بموجب تورات و انجیل کی تفسیر و تاویل کے متعلق ہر لکھے پڑھے شخص کو حق اجتہاد حاصل ہے۔ یہ فرقہ اگرچہ بجائے خود بہت بڑا فرقہ ہے اور اس نے پرائسٹنٹوں کے پاؤں سے قسیمیٹ کی بیڑیاں کاٹ کر انہیں بزم خود معصوم و غیر خاضی پاپا کی غلامی سے آزاد کر دیا ہے لیکن اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے کہ تورات و انجیل کی آیات بدستور اسی منافقت آفریں شان کے ساتھ قائم ہیں جس نے سائنس کے ہاتھ میں منجیق بن کر رومائی نصرانیت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اب پرائسٹنٹ نصرانیت کے حلقہ بگوشوں کو اس حد تک

آزاد خیال بناتی جا رہی ہے کہ ان کے نزدیک خدا کی حکمت اور ان کی قوت از قبیل مترادفات ہیں تاویل کا میدان نہایت وسیع ہے۔ لیکن نہ اتنا وسیع کہ ان تحریفات کو سائنس کے ساتھ تطبیق دینے میں عقل سلیم کا خون کئے بغیر کامیابی حاصل ہو سکے جن سے تورات و انجیل کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ ایک فرانسیسی باورچی سے جو اپنے فن کا استاد تھا پیرس کے کسی امیر نے فرمائش کی تھی کہ فن طباطبی میں جو بے مثل کمال اسے حاصل ہے اس کا ثبوت سڑے ہوئے مٹن کا قلیہ تیار کرنے سے دے۔ باورچی نے جواب دیا کہ جناب والا میں سو سال پرانے بوٹ کے تلے کا شوربا تیار کر سکتا ہوں۔ لیکن سڑے ہوئے مٹن کو قابل خورش بنانا میرے امکان سے خارج ہے۔ یہی حال تحریف شدہ تورات و انجیل کا ہے۔ اگر کوئی آیت حقیقت میں الہامی ہو اگر کوئی صحیفہ حقیقت میں آسمانی ہو تو اس کی سو تاویلیں ہو سکتی ہیں لیکن ان مملات کی کیا صحیح اور مفید یقین تفسیر ہو سکتی ہے۔ جو انسان ظلم و جمل کے تراشے ہوئے ہوں اور فطرت کے حقائق مسلمہ کی ضد ہوں۔

ڈاکٹر ڈرپر اگر اس مواد کی بنا پر جو ان کے پاس موجود تھا اور جس نے اس کتاب کی ترتیب میں بقدر ایک سو صفحہ کے حصہ لیا ہے کام لیتے تو وہ باسانی ثابت کر سکتے کہ مذہب اپنی ترقی یافتہ شکل میں انسان کو نہ صرف اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ بہ آزادی تمام ان حقائق کا انکشاف کرے جو عقل انسان کی رسائی کے اندر ہیں اور تمام وہ کوششیں عمل میں لائے جن سے اس کی طبعی معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے بلکہ ان کوششوں کو اپنی آغوش عاطفت میں لے کر جہاں انسان کو روحانی اور اخلاقی حیثیت سے کامل بنا اور ابدی زندگی کے تمتعات سے بہرہ اندوز ہونا سکھاتا ہے وہاں دنیوی حیثیت سے بھی اسے اعلیٰ درجہ کے مدارج پر پہنچانا چاہتا ہے۔

اسلام کو ڈاکٹر ڈرپر نے نصرانیت کی ایک شاخ تصور کیا ہے۔ کوئی مستقل مذہب نہیں سمجھا۔ اس لئے انہوں نے اس کو رومن کیتھولک کلیسا کی اصلاح جنوبی اور پرائسٹ مذہب کو کلیسائے مذکور کی اصلاح شمالی سے تعبیر کیا ہے لیکن اگر ان کے اس خیال کو جس کے ایک حد تک معتدل ہونے میں کلام نہیں پوری طرح سے تسلیم کر لیا جائے تو پھر تو ان سے اس امر کی بدرجہ اولے توقع تھی کہ وہ اسلام کو مذہبی ترقی کی معراج یا منتہا قرار دے کر اور سائنس کی اس حیرت انگیز ترقی کو پیش نظر رکھ کر جو اسلام کی سرپرستی میں اسے میسر ہوئی اور جس نے یونان و مصر، کلد و ایران، ہندوستان و چین کی فرسودہ ہڈیوں میں نئی روح پھونک کر علوم جدیدہ کی بنیاد قائم کی اس نتیجہ پر پہنچتے کہ صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو

فطرت الہی و سنت ایزدی سے تطابق کھلی رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر مذہب و سائنس میں اگر وفاق پیدا ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ مذہب سے مراد اسلام لی جائے۔ اور یہ تعبیر نادرست بھی نہ ہو گی اس لئے کہ اگر کوئی مذہب دنیا کے تمام مذاہب کے حسنت کے شیرازہ بند ہونے کی ذبح سے ہمہ گیری کا ادعا کر سکتا ہے اور اس حیثیت سے تمام مذاہب کا پچشم انصاف قائم مقام بن سکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔

یہ دعویٰ ہم کچھ اس وجہ سے ہمیں کر رہے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں بلکہ اسلام کے دینی و دنیوی کارناموں کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں جن کا ذکر خود ڈاکٹر ڈریپر نے اس کتاب میں شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے۔ اسلام کے اس اصولی عقیدہ کا ذکر کرنے کے بعد جس کا راز لا الہ الا اللہ میں چھپا ہوا ہے اور جو ہر قوم کے ترقی یافتہ مذہبی جذبات کا نصب العین ہے۔ اور ان روحانی و اخلاقی حقائق کا بالا جمال اعادہ کرنے کے بعد جن کی کثیف حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمائی ڈاکٹر ڈریپر نے جہاں اسلام کی عدیم القصر مملکت فتوحات اور قابل رشک تمدن کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ اسلام نے خود اپنے ہاتھوں سے سائنس کے اس پودے کو سینچا ہے جسے عجائب خانہ سکندریہ کے زندہ جاوید بانی بطلمیوس سوڑنے لگایا تھا لیکن جو نصرانیت کی بنجر زمین میں خشک ہو چلا تھا۔ اور یہ اسی آبیاری کا صدقہ تھا کہ علوم و فنون حکمت و فلسفہ و صنائع و بدائع کا وہ لہلہاتا ہوا چمن عقل و ادراک کی سیر کے لئے تیار ہو گیا جن کے پھول یورپ و امریکہ میں آج نئی فلسفگی کے ساتھ مکھ رہے ہیں۔ علوم جدیدہ کا دور سولہویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ ظہور اسلام چھٹی صدی میں ہوا۔ یہ ہزار سال کا زمانہ ان متسلل و متوالی کوششوں سے بھرا پڑا ہے جو علوم قدیمہ کے احیا اور علوم مروجہ کی بقا کے متعلق دنیائے اسلام کے طول و عرض میں ظاہر ہوتی رہیں اور یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سائنس نے جو ترقی گزشتہ تین سو سال میں کی ہے اس کے لحاظ سے وہ اسلام ہی کا شرمندہ احسان ہے۔ گویا اسلام نے ایک ڈھانچ قائم کر لیا تھا جس پر یورپ نے گوشت و پوست چڑھالیا۔

تم نے قدیل خن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا

ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

ایسی حالت میں جب کہ اسلام یا بقول مصنف نصرانیت کی جنوبی شاخ نے جس کے ماننے والے روئے زمین پر بقدر تمیں کروڑ نفوس کے موجود ہیں سائنس کی ہم آہنگی و ہم صفیری کا یہاں تک کا دم بھرا ہو۔ ایسی حالت میں جب کہ ہادی عرب کے جالشیوں نے

جابلوں کو عالم، عامیوں کو فلسفی اور غلاموں کو شہنشاہ بنا دیا ہو۔ ایسی حالت میں جب کہ وادی بطحا سے ایک ابر رحمت نے اٹھ کر مغرب و مشرق میں خیر و برکت کے وہ موتی برسائے ہوں جن کو دنیا ابھی تک رول رہی ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ کل مومنین اخوة کی منادی نے ارذل ترین اقوام کو مسند نشینان بزم شرافت کے پہلو میں جگہ دے کر حریت اخوة اور مساوات کے وہ سنہرے اصول قائم کر دیئے ہوں جن پر عمومیت کے ساتھ عمل کرنا صرف دنیائے اسلام ہی میں ممکن ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ لکم دینکم ولی دین کا فرمان واجب الاذعان مسالمت اور رواداری کے وہ حقوق ادا کرتا ہو جن کا یہود و نصاریٰ مجوسی و ہنود کو یکساں اعتراف ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ وہ وزنی علما کی نص صریح نے جس میں لا اکوہ فی الدین نے شان تائیس پیدا کر دی ہے اکتکتہ ضالۃ المومن فیث وجد ہا فہو الحق بہا کی وحی منطوق کے ساتھ مل کر علم و حکمت کو خواہ اس کا ماخذ کچھ ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کی میراث قرار دیا ہو یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ مذہب اور علم کی سائی ایک اقلیم میں نہیں ہو سکتی اور یہ دونوں ایک ایسی کشش میں جٹلا ہیں جس میں بالآخر مذہب کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔

بہر حال ڈاکٹر ڈرپرنے یہ کتاب لکھ کر ہم پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے کہ تلاش حق کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس دروازہ کے اندر داخل ہو کر ہر شخص علی قدر توفیق گوہر مقصود سے اپنی جیب و دامن بھر سکتا ہے اور اگر اسے مبداء فیاض سے ذوق سلیم جسے دوسرے لفظوں میں ایمان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے عطا ہوا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ حلیف ہیں۔

ظفر علی خاں

کرم آباد۔ پنجاب

۵ مارچ ۱۹۹۰ء

دیباچہ مصنف

جس شخص کو یورپ اور امریکہ کی روشن خیال جماعتوں کی ذہنی حالت سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے اس کو معلوم ہوا ہو گا کہ لوگ جاہ مذہب سے جلد جلد اور بہ تعداد کثیر منحرف ہو رہے ہیں۔ اور اگرچہ اس جماعت نے جو راست گفتاری اور صاف گوئی کے اوصاف سے متصف ہے اس انحراف کو مخفی نہیں رکھا۔ لیکن ایک بہت بڑی جماعت ایسے اشخاص کی ہے جن کی بد اعتقادی بہت زیادہ خطرناک ہے اس لئے کہ اخلاقی جرات کے فقدان کی وجہ سے یہ جماعت اپنے اعتزال کو علانیہ نہیں ظاہر کرتی۔

یہ اعتزال اس قدر عظیم الاثر اور اس درجہ زبردست ہے کہ اس کو نہ تحقیر دیا جاسکتا ہے نہ تعزیر مٹا سکتی ہے۔ اس کا سدباب نہ استحقا و استہزا سے ہو سکتا ہے نہ سب و شتم سے نہ جبر و تعدی سے۔ وہ ساعت جلد جلد قریب آرہی ہے جب کہ اس سے نہایت خطرناک سیاسی نتائج پیدا ہو کر رہیں گے۔

دنیا کی حکمت عملی کے جسم سے قسبیت کی روح نکل چکی ہے۔ وہ جنگی جوش جو کبھی مذہب کی حمایت میں سرکھٹ نظر آتا تھا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔ اور اس کی بچی کچی یادگاریں حروب صلیبیہ کے ان سوراخوں کے مرمری مجسموں میں باقی رہ گئی ہیں جو گر جاؤں گے زمین دوز مدفنوں میں محو آرام ہیں۔

دولِ عظمیٰ نے پایائیت کے مقابلہ میں جو روش اختیار کی ہے۔ وہ اس خطرہ کی آمد آمد کا پتہ دے رہی ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ وہ طاقت جس کا منظر پاپائے روم ہے یورپ کی دو ٹوٹ آبادی کے خیالات اور تمناؤں کی وکیل ہے۔ اس طاقت کو منسوب الی السماء اور بامور من اللہ ہونے کا دعوے ہے اور اسی دعوے کی بنا پر وہ یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اس کی سیاسی فزیت بمقابلہ دولِ یورپ تسلیم کر لی جائے۔ اس کو اس جمالت کی تجدید و احیا پر اصرار ہے جو قرون وسطیٰ میں پائی جاتی تھی۔ اور وہ یہ بانگِ دہل اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ اس

کی اور تہن جدید کی ایک اقلیم میں سائی نہیں ہو سکتی۔

یہ منافقت جو ہمیں مذہب اور سائنس کے درمیان نظر آرہی ہے۔ اس کشمکش کا تسلسل ہے جو اس وقت سے چلی آتی ہے جب کہ سیاسی اقتدار کی باگ نعرانیت کے ہاتھ میں اول اول آئی۔ الہام ربانی تردید کا روادار ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ وہ اپنے آپ کو کامل و بے عیب سمجھ کر مستوجب الترمیم ہونے سے سختی کے ساتھ انبرا کرے اور اس ترمیم کو جو انسان کے نشوونمائے عقلی کی مقصنات میں سے ہو۔ ازراہ حقارت رد کر دے۔ لیکن انسانی نظم کی اٹل ترقی معلومات انسانی کے ہر شعبہ کے متعلق ہمارے مسلمات میں تبدیلی پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ایسی بحث کی اہمیت کے اظہار میں مبالغہ سے کام لے سکیں جس میں ہر ذی شعور انسان حصہ لینے پر خواہی خواہی مجبور ہے؟ مذہب سے زیادہ مہتمم بالشان اقلیت اور کیا ہو سکتی ہے پس ظاہر ہے کہ بجز ان اشخاص کے جن کے نیوی اغراض موجودہ مذہبی عقائد کے قیام کے ساتھ وابستہ ہیں باقی تمام اشخاص کی صدق دل سے یہی خواہش ہوگی کہ حق کی تلاش کریں۔ وہ مسئلہ مابہ البحت کے متعلق پوری واقفیت پیدا کرنی چاہیں گے اور اس امر کے خواہش مند ہوں گے کہ مباحثہ کرنے والوں کے دھیرو اور روش پر روشنی ڈالی جائے۔

سائنس کی تاریخ کو انفرادی اکتشافات کے ایک بے ربط مجموعہ کی کمانی نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ یہ ان دو متخالف طاقتوں کی زور آزمائی کی داستان ہے جن میں سے ایک تو عقل انسانی کی انشراح قوت ہے اور ایک روایتی ایمان اور انسانی اغراض کی متفقہ القباضی قوت۔

کسی مصنف نے اب تک اس مسئلہ پر اس پہلو سے نظر نہیں ڈالی لیکن یہی وہ پہلو ہے جو سب سے زیادہ نکتہ آموز سب سے زیادہ نتیجہ خیز اور سب سے زیادہ مہتمم بالشان ہے۔

آج سے کچھ سال پہلے مصلحت اور صوابدید اسی میں سمجھی جاتی تھی کہ اس بحث کی طرف اشارہ تک نہ کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس جھگڑے سے الگ ہی رہنے کی کوشش کی جائے۔ جماعت انسانی کا سکون نفس و اطمینان قلب اس کے مذہبی عقائد کے ثبات و قیام پر اس درجہ منحصر ہے کہ کوئی شخص بلاوجہ موجود حجت کافی ان عقائد میں خلل ہونے کے لحاظ سے حق بجانب نہیں سمجھا جا سکتا۔ لیکن چونکہ ایمان بالطنع غیر متغیر

غیر متحرک اور سائنس بالطبع مندرج اور ترقی پذیر ہے لہذا ان دونوں میں اس افراق کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے جو چھپانے سے چھپ نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں ان لوگوں کو جو تخیل کے دونوں طریقوں سے بے آشنا ہیں فرض ہو جاتا ہے۔ کہ اپنی رائے کا اظہار فروتنی لیکن مضبوطی سے کریں اور مذہب و سائنس کے حریفانہ دعاوی پر متانت و سنجیدگی کے ساتھ بلا در رعایت فلسفیانہ انداز سے نظر انتقاد ڈالیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو انسان کو وہ تمدنی و عمرانی تباہیاں آگھیریں گی جن کا سلسلہ گونا گوں مصیبتوں کے ساتھ مدتوں قائم رہے گا۔ جب یورپ کی قدیم بت پرستی اپنے ہی نواقص کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی تو نہ تو قیصران روم ہی لوگوں کا روحانی پیشوا بن سکے اور نہ اس زمانہ کے فلاسفہ ہی نے عقائد کا کوئی ضابطہ مرتب کیا۔ بلکہ انہوں نے مذہب کو بحال خود چھوڑ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب جاہل اور آلود پادریوں، کلزگداؤں زنجوں اور غلاموں کے ہاتھ میں پڑ گیا۔

اس غفلت کبرے کے باعث جو عقلی تاریکی یورپ پر چھا گئی وہ اب زائل ہو رہی ہے اور ہماری آنکھیں فہم و شعور کی صبح صادق کے نور سے منور ہونے لگی ہیں۔ جماعت انسانی طلوع آفتاب کا شوق سے انتظار کر رہی ہے تاکہ اس کی روشنی میں اسے نظر آجائے کہ وہ بھٹکتی ہوئی کدھر آ نکلی ہے۔ اس کو صاف دکھائی دینے لگا ہے کہ تمدن جس شاہراہ پر اب تک سفر کرتا چلا آیا تھا اسے چھوڑ کر اب وہ ایک نئی ڈگر پر پڑ لیا ہے جو اسے غیر معلوم سرزمین کی طرف لے جا رہی ہے۔

اگرچہ ان خیالات نے میرے دل پر نہایت گہرا اثر ڈالا تھا لیکن اس کتاب کے لکھنے اور جو خیالات اس میں ظاہر کئے گئے ہیں انہیں ملک کی خدمت میں پیش کرنے کی جرات مجھے پھر بھی نہ ہو سکتی تھی۔ بائیں ہمہ اگر میں نے یہ کتاب لکھی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے موضوع پر میں نے مدتوں غور کیا ہے اور سالہا سال تک اس کے مباحث کی تنقید میں خلوص نیت اور صدق دل سے کام لیا ہے۔ ایک اور بڑی وجہ تحریک اس کتاب کی اشاعت کی یہ ہوئی کہ یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ جو میں نے کچھ سال ہوئے شائع کی تھی یورپ اور امریکہ ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ چنانچہ یہ تاریخ نہ صرف امریکہ میں کئی بار چھپ چکی ہے بلکہ انگلستان میں مکرر طبع ہونے کے علاوہ فرانسیسی جرمن روسی پولش سروئن وغیرہ متعدد یورپین زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

تاریخ خانہ جنگی امریکہ کے نام سے یہ جو کتاب میں نے بہت بڑی محنت شاقہ اٹھا کر شائع کی تھی، اس کے مواد کی فراہمی کے دوران میں مجھے متخالف بیانات کے مقابلہ اور

متخالف دعاوی کے تصفیہ کا موقع بار بار ملا تھا۔ اہل امریکہ نے جن کی دقت نظر واقعات زیر بحث کے انتقاد کے متعلق محتاج ایضاح نہیں قبولیت عام کی جو سند اس تاریخ کو عطا کی وہ میرے لئے مزید حوصلہ افزائی کا باعث ہوئی۔ میں نے مظاہر قدرت کی عملی تحقیقات پر بھی بہت کچھ توجہ صرف کی تھی اور متعدد مشہور و معروف رسائل ان مضامین پر شائع کئے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو ان مشاغل کی نذر کر دے اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ سائنس کا درس دینے میں گزارے وہ عدم پاسداری اور حق پرستی کے ان اصولوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو فلسفہ کی نکتہ آموزی کا ماحصل ہیں۔ فلسفہ ہم میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اپنائے جس کی بھلائی کے لئے وقف کر دیں تاکہ جب ہماری مشعل زندگانی کے گل ہونے کی گھڑی قریب آئے تو ہم اس کی ٹھناتی روشنی میں گزشتہ واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے حسرت کے ساتھ امر کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ وہ مشاغل جن میں ہم عمر بھر مصروف رہے پادور ہوا اور دور از کار محض تھے۔

اگرچہ کوئی ایسی محنت نہیں جو اس کتاب کے لکھنے میں میں نے برداشت نہ کی ہو لیکن جس موضوع پر میں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس سے عمدہ برآ نہ ہو سکتے کا مجھے پورا احساس ہے۔ اس لئے کہ یہ وہ موضوع ہے جس کا حق ادا کرنے کے لئے مصنف کو سائنس تاریخ آلیات اور سیاسیات میں دسترس ہونی چاہئے اور اس کی تصنیف کا ہر ورق معارف کا گنجینہ اور حقائق کا سفینہ ہونا چاہئے لیکن میں نے اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دے لی ہے کہ یہ کتاب ان تصانیف کا محض ایک دیباچہ یا مقدمہ ہے جو زمانہ موجودہ کے واقعات اور ضرورتوں کے اقتضا سے سپرد قلم ہو کر رہیں گی۔ ہم نے ایک بہت بڑے عقلی انقلاب کی وادی میں قدم رکھا ہے۔ آج کل جو لغو اور مزخرف کتابیں پڑھی جاتی ہیں ان میں سے اکثر کا قائم مقام وہ دماغ آزما اور دالٹ آموز لڑچک ہو جائے گا جس میں ہمارے روحانی مقاصد کے خطرات ایک نئی روح پھونک دیں گے اور مذہبی جذبات ایک نیا جوش پیدا کر دیں گے۔ میں نے اس کتاب میں فریقین کے افعال و آرا کو بصراحت اور بلا رو رعایت درج کر دیا ہے۔ ایک لحاظ سے میں نے دونوں کے طرفدار بننے کی کوشش کی ہے تاکہ ان میں سے ہر ایک کی وجہ تحریک کا اندازہ اچھی طرح سے کر سکوں لیکن ایک اعتبار سے جس کا مفہوم بہت کچھ ارفع و اعلیٰ ہے میں نے اپنے مساعی کے دامن کو پاسداری کے دھبہ سے بچایا ہے اور دونوں کے کارنامے ہو ہو بیان کر دیئے ہیں۔

میں مجھے یقین ہے کہ جو حضرات اس کتاب پر نکتہ چینی کرنا چاہیں گے وہ اس امر کو

ضرور پیش نظر رکھیں گے کہ اس کا مقصد فریقین میں سے کسی ایک کے آرا و دعاوی کی حمایت نہیں ہے بلکہ دونوں کے آرا و دعاوی کو بوضاحت و صراحت اور بلا ڈرنے یا جھجکنے کے صاف صاف بیان کر دیتا ہے۔ میں نے ہر باب کی ترتیب میں عام طور پر یہ خیال رکھا ہے کہ اول مذاہب کا خیال پیش کر دیا جائے اور اس کے بعد اس کے حریف کا۔

مضمون زیر بحث پر اس طور سے نظر ڈالتے وقت میں نے معتدل یا متوسط آرا کو معرض بحث میں لانا ضروری نہیں خیال کیا اس لئے کہ اگرچہ فی نفسہ ان کے قیمتی و گرانمایہ ہونے میں شک نہیں لیکن اس قسم کے مباحث میں غیر طرفدار اور انصاف پسند ناظرین کو اعتدال پسندوں سے نہیں بلکہ انتہا پسندوں سے بحث ہوتی ہے اور انتہا پسندوں کی افراط و تفریط ہی سے نتائج ترتیب ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے مسیحیت کی دو بڑی شاخوں یعنی کلیسائے پرائسٹنٹ و کلیسائے یونان کا بہت کم ذکر کیا ہے۔ ثانی الذکر نے سائنس کے احیا کے وقت سے ترقی علوم و فنون کی کبھی بھی مخالفت نہیں کی بلکہ انہماک اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ سچائی کو خواہ وہ اس کا ماخذ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس نے ہمیشہ بنظر استحسان و احترام دیکھا ہے۔ حقائق الہامی کی جو تعبیرات اس نے کی ہیں ان کو سائنس کے اکتشافات سے بظاہر مغاثر پا کر اس نے ہمیشہ سے یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس مغائرت و منافقت کی شافی تاویل ہونے کے بعد فریقین میں مصالحت ہو جائے گی اور اس امید میں اسے ناکامی بھی نہیں ہوئی۔ تمدن جدید کے دن اچھے ہوتے اگر کلیسائے روم نے یہی روش اختیار کی ہوتی۔

مسیحیت کا ذکر کرتے ہوئے عام طور سے کلیسائے روم ہی کا حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ مسیحی دنیا کی آبادی کا جزو غالب اسی کلیسا کا پیرو ہے۔ کچھ اس لئے کہ اس کے مطالبات حد سے زیادہ بالغ فی الادعا ہیں اور کچھ اس لئے کہ ان مطالبات کا انفاذ اس نے عموماً بزور حکومت کراتا چاہا ہے۔ پرائسٹنٹ کلیساؤں میں سے کسی کو ایسا خود مختارانہ درجہ نصیب نہیں ہوا اور کسی کا سیاسی رسوخ اس درجہ عمیم الاثر نہیں ثابت ہوا۔ ان کلیساؤں نے اول تو جبر و مزاحمت کو روا ہی نہیں رکھا اور اگر کتنی کی چند صورتوں میں انہوں نے جابرانہ طرز عمل اختیار کیا بھی ہے تو وہ فتوائے بدعت کے صدور کی حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتا۔

مسیحیت کے طرز عمل پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کبھی بھی زور حکومت کے اپنا اثر نافذ و اربابانہ نہیں چاہا۔ اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کسی انسان کو

بوجہ اس کے عقائد کے بدعتی قرار دے یا اس کے تہنی حقوق کو پامال کرے۔ اپنے مسلمات یا خیالات کی توثیق و اشاعت کی غرض سے اس نے کبھی کسی شخص کو عتاب روحانی یا عذاب جسمانی میں مبتلا نہیں کیا اور سزائے موت کا تو ذکر ہی نہیں۔ اس کے دامن پر قسادت و بے رحمی اور معصیت و جرائم کا وہبہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن جب ہم محکمہ احتساب عقائد کے کارناموں کو یاد کر کے پاپائے روما کے قصر ”وٹیکن“ کے اندر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ ہاتھ جو اس وقت دعا کے لئے ارحم الراحمین کی جناب میں اٹھے ہوئے ہیں بے گناہوں کی خون سے رنگے دکھائی دیتے ہیں۔

تاریخ نگاری کے دو طریقے ہیں۔ شاعرانہ و عالمانہ۔ اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ واقعات و حوادث انسان کے تابع ہیں اسی لئے ان تصانیف میں جو اس طریقہ کے مطابق لکھی جاتی ہیں کسی سربر آوردہ شخص کا انتخاب کر لیا جاتا ہے اور اس کے حیرت انگیز کارناموں کی تصویر کھینچ کر اسے کسی قصہ کا سورما بنادیا جاتا ہے۔ طریقہ ثانی الذکر کی رو سے معاملات انسانی ایک مسلسل زنجیر کے مشابہ ہیں جس میں ہر واقعہ کسی واقعہ سابقہ کا معلول اور کسی واقعہ آئندہ کی علت ہے اور اس اعتبار سے واقعات انسان کے تابع نہیں بلکہ انسان تابع واقعات ہے۔ طریقہ اول الذکر ان تصانیف کا ذمہ دار ہے جو خواہ کیسی ہی دلچسپ اور دل پسند کیوں نہ ہوں لیکن ان کا درجہ حقیقت میں افسانوں اور قصوں سے کچھ ہی اونچا ہوتا ہے۔ طریقہ ثانی الذکر بالکل ہی روکھا پھیکا ہے۔ بلکہ شاید موجب استکراہ بھی ہو اس لئے کہ وہ ہم ہر اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ قانون کی حکومت اٹل اور انسان کی کوشش ناچیز ہے۔ جو مہتمم بالشان مسئلہ اس کتاب کا موضوع ہے اس کو خیال آرائی و عجوبہ آفرینی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس شخص کو جسے اس مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ ہو مقدّم کے اس تسلسل پر اپنی نگاہ جمائے رکھنی چاہئے جو تاریخ عالم میں پایا جاتا ہے اسے پایاؤں اور مدبروں اور شہنشاہوں کی پرچھائیوں کی طرف سے جو ڈھلتی پھرتی چھاؤں کی طرح ہیں ازراہ تحقیر منہ پھیر لینا چاہئے۔

اگر شاعرانہ تاریخوں کے ساقط الاعتبار ہونے کے ثبوت کی ضرورت ہو تو ہمارا ذاتی تجربہ اس کا شاہد ہے۔ ہمارے ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست بھی بسا اوقات ہمارے روزانہ اعمال کی حقیقی نیّتوں سے واقف نہیں ہو سکتے اور اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ارادوں کی غلط تاویل کرتے ہیں۔ پس جب ان واقعات کی حالت یہ ہے جو روزمرہ ہماری نگاہ کے سامنے گزرتے ہیں تو ان اشخاص کے کارناموں کی نسبت کوئی قطعی حکم لگانا تو

صریحاً ناممکن ہے جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور جن کی ہم نے صورت تک نہیں دیکھی۔

مضامین زیر غور کے انتخاب و ترتیب میں ایک حد تک قومیں نے اس کو نسل کی روکدلو سے مدد لی ہے جو بھدارت پایا پچھلی مرتبہ روما میں منعقد ہوئی تھی اور ایک حد تک واقعات تاریخی کی ترتیب سے حضرات ناظرین دلچسپ کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں گے کہ جن مسائل پر ہم اب غور کر رہے ہیں وہ وہی ہیں جن پر قدیم فلاسفہ یونان نے بحث کی ہے یعنی خدا کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ دنیا کیا ہے؟ دنیا کا انتظام کس طرح چلتا ہے؟ کیا حق کا کوئی معیار ہمارے پاس موجود ہے؟ جو ناظرین ان غوامض کی تہ کو پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ”آیا ہم نے ان مسائل کو ان سے بہتر حل کیا ہے؟“

القصد اس کتاب کے مقدمات کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

میں نے اول جدید سائنس کا علوم قدیم سے مقابلہ کر کے اور یہ دکھا کر کہ نظریات پر مبنی ہونے کے بجائے اس کا انحصار، مشاہدہ، تجربہ اور ہندسہ مباحثہ پر ہے ثابت کیا ہے کہ اس کی ابتدا مقدونی فتوحات کی وجہ سے ہوئی جنہوں نے ایشیا اور یورپ میں تعلق پیدا کر دیا۔ ان فتوحات پر ایک اجمالی نظر ڈال کر اور عجائب خانہ اسکندریہ کے مختصر حالات بیان کر کے میں نے جدید سائنس کی نوعیت اور خصوصیت کی توضیح کی ہے۔

پھر میں نے بر سبیل ایجاز ظہور مسیحیت کے مشہور واقعات کا اعادہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نے ترقی کرتے کرتے شہنشاہانہ اقتدارات حاصل کر لئے اور بت پرستی کے ساتھ مخلوط ہو جانے کے باعث جو سلطنت روما کا مروجہ مذہب تھی اس کی شکل بالکل تبدیل ہو گئی۔ چونکہ اس کو صاف معلوم ہو چکا تھا کہ سائنس کا اور اس کا میل نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس نے اسکندریہ کے فلسفیانہ مدارس جبرا ”بند کر دیئے اور اس کا ردوائی پر اس کی سیاسی ضرورتوں نے اسے مجبور کیا۔

نصرانیت اور سائنس کو ایک دوسرے کا حریف ظاہر کرنے کے بعد میں نے ان کی پہلی غلافیہ زور آزمائی یعنی اصلاح اولیٰ یا اصلاح جنوبی کی داستان قلمبند کی ہے۔ اس تنازع میں امر مابہ النزاع ماہیت باری تعالیٰ تھا۔ اس کا نتیجہ ظہور اسلام ہوا جس نے ایشیا اور افریقہ کا بہت بڑا حصہ اور بیت المقدس اور کارٹھج کے تاریخی شہر مسیحی دنیا سے چھین لئے اور وحدانیت خدا کے اصول کو اس مملکت کے بہت بڑے حصے میں شائع کر دیا جس پر کبھی رومنہ الکبرے کا پھر اڑتا تھا۔

اس سیاسی واقعہ کے بعد سائنس میں نئے سرے سے جان پڑ گئی اور عربوں کے ممالک محروسہ میں دارالعلم مدارس اور کتب خانے جا بجا قائم ہو گئے۔ کشور کشایان اسلام نے جو عقل و ادراک میں بسرعت تمام ترقی کر رہے تھے ماہیت ذات باری کے ان تجسیمی خیالات کو جو ان کے عامیانہ عقائد میں ملے ہوئے چلے آتے تھے ترک کر دیا اور ان کے بجائے اس قسم کے حکیمانہ و فلسفیانہ عقائد اختیار کر لئے جن کا ظہور مدتوں پہلے ہندوستان میں ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت روح انسانی کے متعلق علم اور مذہب میں دوسری نزاع پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں فلسفہ ابن رشد کو ترقی ہوئی اور مسائل انفصال و انجذاب نے رواج عام پایا۔ ازمہ وسطی کے اختتام پر محکمہ احتساب عقائد یورپ سے ان مسائل کو خارج کرنے میں کامیاب ہوا اور اب وینسین کو نسل نے باضابطہ طور پر مذہبی رسوں کے ساتھ ان کی تکفیر کر دی ہے۔

اس اثنا میں ہیئت، جغرافیہ اور دوسرے علوم کے اکتساب کی بدولت نظام شمسی میں زمین کے مرتبہ اور دوسرے اجرام سماوی کے ساتھ اس کے تعلق اور ترکیب کائنات کے متعلق صحیح خیالات قائم کئے جا چکے تھے۔ اور چونکہ مذہب کو جو کتب مقدسہ کی آیات کی اس تاویل پر مبنی تھا جو تعبیر راشدہ و صحیحہ تصور ہوتی تھی اس امر پر اصرار تھا کہ زمین مرکز کائنات ہے اور موجودات میں کوئی شے بلحاظ عظمت و نشان اس سے لگا نہیں کھاتی لہذا تیسری نزاع برپا ہو گئی۔ اس جنگ میں سائنس کا علم بردار کلیلیو تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے بعد ایک اور ضمنی بحث دنیا کی عمر کے بارہ میں چھڑ گئی۔ کلیسا کو اصرار تھا کہ دنیا کی عمر صرف چھ ہزار سال ہے اس بحث میں بھی اسے زک اٹھانا پڑی۔

تاریخ اور سائنس کی روشنی سے یورپ میں بتدریج اجالا ہو رہا تھا۔ سولہویں صدی میں رومانی نصرانیت کا اقتدار اور اثر بوجہ ان عقلی زکوں کے جو اسے اٹھانی پڑی تھیں اور نیز باعث اپنی سیاسی اور اخلاقی حالت کے بہت کچھ گھٹ گیا۔ بہت سے ارباب زہد و اتقا کی نظر سے یہ امر مخفی نہ تھا کہ مذہب خود ان خرابیوں کا ذمہ دار نہ تھا جو اس میں پائی جاتی تھیں بلکہ ان مفاسد و زایم کا باعث وہ رشتہ اتحاد تھا جو اس نے زمانہ قدیم میں روما کی بت پرستی کے ساتھ قائم کر لیا تھا پس اس کا علاج بجواس کے اور کچھ نہ تھا کہ قرون اولے کی پاک اور صاف نصرانیت کی طرف عود کیا جائے۔ اس طور پر وہ چوتھی نزاع برپا ہوئی جو اصلاح آخرے یا اصلاح شمالی کے نام سے موسوم ہے۔ اس نزاع نے جو خاص شکل اختیار کی وہ معیار حق سے تعلق رکھتی تھی یعنی سچائی کا معیار اصلی کلیسا ہے یا بائبل اس بحث کے تصفیہ میں حریت عقل کا شاخسانہ نکل آیا یعنی امور عقلی میں ہر انسان کو شخصی اجتہاد کا

حق حاصل ہے۔ لوہرنے جو اس دور کا سب سے زیادہ مشہور و سرر آورہ شخص ہے اپنے مقاصد کی تکمیل میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور جب جنگ کے بعد دونوں حریف الگ ہو گئے تو معلوم ہوا کہ شمالی یورپ رومانی نھرانیت کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

اب ہمارے سامنے یہ بحث ہے کہ انتظام عالم کس طرح چل رہا ہے۔ آیا اس انتظام کا تکفل خدا کی متسلل و متوالی مداخلت سے متعلق ہے یا اذلی و غیر متغیر قانون سے مسیحی دنیا کی عقلی تحریک نشوونما کے اس نقطہ پر اب پہنچی ہے جس پر عربی دماغ دسویں اور گیارھوں صدیوں میں پہنچ چکا تھا اور ان مسائل پر جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے پیش نظر تھے اب مکرر غور ہو رہا ہے۔ مسئلہ ارتقا، مسئلہ پیدائش، مسئلہ نشوونمائے موالید وہ مباحث ہیں جو انیسویں صدی کی نھرانیت کو دسویں صدی کے اسلام سے ترکہ میں ملے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ان عام عنوانات کی ذیل میں اس مہتمم بالشان مباحث کے تمام اصولی نکات آجائیں گے اور ان جامع ابواب کی تحت میں واقعات زیر غور کو جمع کرنے اور ہر مجموعہ پر جداگانہ بحث کرنے سے ہمیں ان کے باہمی تعلق اور ان کی تاریخی ترتیب کا صحیح علم ہو جائے گا۔

سائنس اور مذہب کی ان معرکہ آرائیوں کی داستان میں حتی الامکان بہ ترتیب زمانی سپرد قلم کی ہے اور بہ نظر تکمیل و اتمام ذیل کے تین ابواب کا اضافہ اصل بحث پر کر دیا ہے۔

(۱) لاطینی نھرانیت نے تمدن جدید کو کیا فائدہ پہنچایا۔

(۲) سائنس سے تمدن جدید نے کیا فیض پایا۔

(۳) مذہب اور سائنس کی عنقریب چھڑنے والی جنگ میں وائیکن کونسل کے اعلان کے لحاظ سے رومانی نھرانیت کا رویہ۔

حق و راستی کی جستجو میں اکثر اشخاص نے مختلف مذہبی فرقوں کے تنازعات کی جزئیات پر اپنی توجہ کو اس حد تک صرف کر رکھا ہے کہ وہ صدیوں کا جھگڑا جس کے تاریخی واقعات سے ان اوراق میں بحث ہے لوگوں کو بہت کم معلوم ہے۔ میں نے مستقیم العزم ہو کر کوشش کی ہے کہ اس کتاب کو بلارو و رعایت لکھوں اور فریقین کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے حق کو ہرگز نہ چھپاؤں۔ اس امر کا اندازہ کہ اس کوشش میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے میں ناظرین اولاً الالباب کے حق پسندانہ فیصلہ پر چھوڑتا ہوں۔

نیویارک یونیورسٹی

جان ونیم ڈیپر

دسمبر ۱۹۷۳ء

بسم الله الرحمن الرحيم

معرکہ مذہب و سائنس

پہلا باب

سائنس کی ابتداء

یونانیوں کی مذہبی حالت چوتھی صدی قبل مسیح میں سلطنت ایران پر حملہ آور ہو کر وہ قدرت کے نئے نئے مناظر دیکھتے ہیں اور نئے نئے مذاہب سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ مقدونی فوج کشی سے فن حرب فن انجینری اور سائنس کو جو تحریک پہنچتی ہے اسکندریہ میں ایک دارالعلم کے قیام کا باعث ہوتی ہے۔ یہی دارالعلم جس میں تجربہ مشاہدہ اور مندرسانہ تنقید کے ذریعہ سے علوم و فنون کی ترقی کے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔ سائنس یعنی علوم و فنون کا سرچشمہ قرار پاتا ہے۔

ارباب فکر و دانش کی نظر میں کوئی سماں اتنا دردناک نہیں ہوتا جتنا کسی پرانے مذہب کا زوال اور وہ بھی اس مذہب کا زوال جس نے اپنے زمانہ میں بنی نوع انسان کی کئی نسلوں کے لیے تسکین روحانی کا سرمایہ بہم پہنچایا ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے چار سو سال پہلے یونان علم و حکمت میں اتنی جلد جلد ترقی کر رہا تھا کہ قدیم مذہب کی قبا اس کے قامت پر تنگ ہو چلی تھی۔ وہاں کے فلاسفہ نے جب ماہیت کائنات پر غور کیا تو قوانین فطرت کی عظمت و جبروت کے مقابلہ میں اولمپس کے دیوتا انہیں سخت حقیر اور ذلیل نظر آئے۔ مورخوں نے جب معاملات سیاسی

کے انضباط و ترتیب اور افعال انسانی کی ہموار اور باقاعدہ روش پر نگاہ ڈالی اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھا کہ دنیا میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آتا جس کی کوئی صریح علت کسی واقعہ سابقہ کی شکل میں موجود نہ ہو تو انہیں شبہ ہونے لگا کہ کہیں وہ معجزے اور آسمانی نشانات جن سے عمدہ حقیق کے سفائن معمور ہیں محض من گھڑت قصہ کہانیاں ہی تو نہیں۔ اور جب فوق القدرت سے واقعات کا ظہور موقوف ہو گیا تو یہ بدیہی سوال پیدا ہوا کہ کیا وجہ ہے کہ کسی دیوتا کے منہ سے اب کوئی پیشین گوئی سننے میں نہیں آتی اور کرامات و عجائبات کا دروازہ مطلقاً مسدود ہو گیا ہے۔

قدیم روایات نے جو قرمزاقرن سے سینہ بسینہ چلی آتی تھیں اور جس کی صداقت خوش عقیدہ اشخاص کے لئے اصول موضوعہ کا حکم رکھتی چلی آئی تھی جزائر بحر روم اور ارض ملحقہ کو فوق العادت عجائبات سے آباد کر رکھا تھا۔ چنانچہ ان ممالک کی نسبت عام طور سے مشہور تھا کہ وہاں عجیب الخلق ہستیاں مثلاً "جادوگر۔ جادوگریناں۔ دیو۔ بھوت۔ پریلیں۔ پروار سانپ کے بالوں والی بلائیں۔ نصف انسان اور نصف گھوڑے کے دھڑ والی آتیں اور یک چشم عفریت بستے ہیں۔ آسمان کی لاجوردی محراب کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ یہ بہشت کا صحن ہے جس میں مادیات دیوتاؤں کی بیبیوں اور آشتاؤں کے حلقہ میں دربار کرتا ہے۔ ان دیوتاؤں کے مشاغل بھی نوعیت میں انسانی مشاغل پر تفوق نہ رکھتے تھے یعنی آسمان والے بھی زمین والوں کی طرح جذبات ہیمیمہ و اعمال سیہ سے بری نہ تھے۔

یونان کے ساحل کی انخنائی بیت نے ایک ایسے مجمع الجزائر کے موزوں موقع کے ساتھ مل کر جس کے بعض جزیرے خوشنائی اور دلفریبی کے لحاظ سے دنیا بھر میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ یونانیوں میں جہاز رانی جغرافیائی، اکتشاف اور ممالک غیر میں نئی آبادیاں قائم کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔ ان کے جہاز بحیرہ اسود اور بحیرہ روم میں چکر لگانے لگے اور قرب و جوار کے سمندروں کا چپہ چپہ انہوں نے چھان مارا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مہتمم بالشان عجائبات جن کی ثناء و صفت سے کتاب "اذیسی" کے اوراق مزین تھے فرضی ڈھکوسلے ثابت ہوئے۔ قدرت کے واقعات کے متعلق جب زیادہ تجسس و تقصص سے کام لیا گیا تو معلوم ہوا کہ آسمان محض فریب نظر کا نام ہے اور اولیس کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ اگر ہیں تو ستارے ہیں یا فضائے بسیط غرض مکان کے ساتھ مکین بھی تشریف لے گئے نہ "ایونین" خاندان کے معبود باقی رہے جن کا ذکر ہو مرنے کیا ہے اور نہ "ڈورک" قبیلہ کے دیوتا جن

کے بھجن ریسائڈ نے گائے ہیں۔

لیکن یہ نہ سمجھتا چاہیے کہ اتنا بڑا انقلاب بغیر کسی مزاحمت یا مخالفت کے واقع ہو گیا اول اول عوام الناس خصوصاً اہل مذہب نے مشککین کے اٹھتے شہادت پر لازم ہی کا فتویٰ لگایا۔ انہوں نے خاٹیوں میں سے بعض کا مال و اسباب ضبط کر لیا بعض کو جلاوطن کر دیا اور بعض کو قتل کر ڈالا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جن باتوں کو لوگ ہزار ہا برس سے مانتے چلے آئے ہیں وہ ضرور ہے کہ صحیح صحیح ہوں ورنہ اتنی مدت تک قائم کیوں رہتیں۔ لیکن جب شہادت مخالف اس قدر زبردست ہو گئی کہ اس کا کوئی جواب نہ ہو سکتا تھا تو انہیں مجبوراً تنہیم کرنا پڑا کہ یہ عجائبات استعارے تھے جن کے پردے میں قدما کی دانش و حکمت نے بہت سے مقدس و پوشیدہ رموز و نکات کو ظاہر کیا تھا۔ اگرچہ خود ان کے دل میں بھی یہ خدشہ پیدا ہو چلا کہ ممکن ہے کہ جن باتوں کی ہم حمایت کر رہے ہیں ان کی حقیقت افسانہ سے زیادہ نہ ہو لیکن چونکہ مذہب کا اثر دل پر قوی تھا لہذا ان کی کوششوں نے یہ صورت اختیار کی کہ اپنے معتقدات کو اپنے عقلی وادرا کی نشوونما کے ساتھ تطبیق دینے لگے۔ لیکن ممکن نہ تھا کہ یہ کوششیں بار آور ہوں۔ اس لیے کہ یہ امر مقدرات سے ہے کہ انسانی رائے خاص خاص مدارج ارتقا طے کرنے بعد ایک خاص نقطہ پر جا کر ٹھہر جائے۔ انسان جس عقیدہ کو حرمت اور توقیر کی نظر سے دیکھتا ہے اول اول اس کے متعلق اس کے دل میں شہادت و شکوک ناشی ہوتے ہیں۔ شکوک کے بعد تاویل کا دور آتا ہے۔ تاویل مبدل بہ اختلاف ہو جاتی ہے۔ اور اختلاف کل عقیدہ کو ایک فرضی افسانہ سمجھ کر انکار کی انتہائی اور قطعی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

فلاسفہ اور مورخین کے بعد شعراء کے اعتزال کی باری آئی۔ یورپ پیڈیز پر فاسد العقیدہ ہونے کا الزام لگایا گیا۔ اسٹیکس کفر بننے کی پاداش میں سنگسار ہوتے ہوتے بچا۔ لیکن جن لوگوں کی اغراض بے بنیاد باتوں کی حمایت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں ان کی مجنونانہ کوششیں کبھی بار آور نہیں ہو سکتیں۔ اس عقلی بل چل کے آثار ادب و انشا کے ہر شعبہ میں نظر آنے لگے یہاں تک کہ عوام الناس بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

قومی مذہب کے اس استیصال میں اہل یونان کے فلسفیانہ اکتشافات کو ان کی حکیمانہ تنقید سے بہت کچھ مدد ملی تھی۔ اسی تنقید کا نتیجہ تھا کہ عقاید مروجہ کے متعلق جو عام شکوک پھیل گئے تھے ان کی تائید میں شواہد و دلائل کا ایک انبار جمع ہو گیا اور مختلف مذاہب کے عقاید کے باہمی مقابلہ سے ان نواقض کی بنا پر جو ان میں پائے گئے یہ ثابت کیا

گیا کہ انسان کے پاس حق اور صدق کا کوئی معیار نہیں۔ نیکی اور بدی کے خیالات اس عالم کون و فساد میں سرے سے موجود ہی نہیں بلکہ مطلقاً "تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں اس لیے کہ ایک ملک میں جو بات بری سمجھی جاتی ہے وہی دوسرے ملک میں اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اچھائی اور برائی نیکی اور بدی محض چند اعتبارات کا نام ہے جنہیں بنی نوع انسان نے اپنے فواید کے لحاظ سے قائم کر رکھا ہے۔ ایٹھن میں بعض فرقے تو یہاں تک ترقی کر گئے تھے کہ نہ صرف انہیں اس بات سے انکار تھا کہ کسی ان دیکھی ان بوجھی اور فوق القدرت ہستی کا وجود ہو سکتا ہے بلکہ وہ دنیا کو ایک خواب پریشان ایک خیال موهوم تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حقیقی وجود کسی شے کا نہیں ہے۔

یونان کی مابیت ارضی و طبعی کا اثر اس کی پولیٹیکل حالت پر بھی پڑا۔ اس نے اہل یونان کو متعدد جماعتوں میں تقسیم کر دیا جن کی اغراض مختلف اور مقاصد جداگانہ تھے اور یہ بات ناممکن ہو گئی کہ ان کی ایک حکومت قائم ہو۔ ان مسلسل خانہ جنگیوں نے جو یونان کی رقیب ریاستوں کو ایک دم چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھیں اس کی ترقی رفتار کو روک دیا۔ ملک کی مالی حالت سقیم تھی اور ملک کے سربراہ اور وہ لوگ جاہل تدین سے منحرف ہو گئے تھے۔ وہ حب وطن کی بے با جس کو ممالک غیر کے سیم و زر کے بدلے فروخت کرنے میں ذرا پس پیش نہ کرتے تھے اور ایرانی رشوت کی قربانگاہ پر یونانی اغراض کی بھینٹ چڑھانا ان کے لئے مساوات ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فنون بت تراشی و تعمیر کے ان محاسن نے جن کی دلاویزی و رعنائی آج تک دنیا میں اپنی مثال آپ سمجھی گئی ہے یونان کو حسن صوری کا اس حد تک شیفتہ ووالہ بنا دیا تھا کہ اس میں حسن معنوی یعنی سعادت و صداقت کے عملی امتیاز کی قابلیت سلب ہو گئی تھی۔

یونان کو جو حصہ یورپ میں واقع تھا اس نے تو خود مختاری و حریت کے ان خیالات کی بدولت جو وہاں پھیلے ہوئے تھے ایران کے با بگذار بننے سے انکار کر دیا لیکن ایشیائی یونان بلا تامل اس کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ اس زمانہ میں سلطنت ایران رقبہ میں موجودہ یورپ کے نصف کے برابر تھی۔ ایک طرف اس کے ساحلوں کو بحر روم۔ بحیرہ اسجین۔ بحیرہ اسود۔ بحیرہ خزر کی موجیں بوسہ دیتی تھیں۔ دوسری طرف اس کی سرحد بحر قلزم۔ خلیج فارس اور بحر ہند سے ملی ہوئی تھی۔ اس کے میدانوں اور وادیوں کو دنیا کے سب سے بڑے چھ دریا۔ فرات۔ دجلہ۔ انڈس۔ جیحون۔ سیحون اور نیل جن میں سے ہر ایک کا طول ہزار میل سے زیادہ تھا سیراب کرتے تھے۔ اس کی سطح سمندر کی سطح سے کہیں تیرہ سو فٹ نیچی اور کہیں

میں ہزار فٹ بلند تھی اور اسی نشیب و فراز کا نتیجہ تھا کہ اس میں ہر قسم کی نپاتی پیداوار مروجہ تھی اور معدنی دولت کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ میڈیا اور بائل کا جاہ و جلال اور اسیریا اور کالڈیہ کی عظمت و تمکنت اسے متفقہ و مشترکہ طور پر ترکہ میں ملی تھی اور یہ وہ دولتیں تھیں جن کے تاریخی کارنامے بیس صدیوں پر پھیلے ہوئے تھے۔

ایران یورپین یونان کو سیاسی پہلو سے ہمیشہ حقیر و ہج میرز سمجھتا رہا اس لئے کہ اس کا رقبہ کسی ایرانی صوبہ کے نصف کے مساوی بھی نہ تھا۔ لیکن جو چڑھائیاں اس سرکش علاقہ کو نیچا دکھانے کے لئے ایران نے وقتاً فوقتاً کیں ان کے اثا میں اسے یونانیوں کی جنگی قابلیت کا اعتراف کرتے ہی بنی اور یہی وجہ تھی کہ ایرانی افواج کے سب سے زیادہ جانہاز اور جری دستہ ان یونانی سپاہیوں سے مرکب تھے جنہیں فرماں روا یان ایران نے پیش قرار معاوضے دے کر نوکر رکھ لیا تھا۔ افواج ایران کے سپہ سالار اور ایرانی جہازوں کے بیڑے کے امیر البحر تک بعض دفعہ یونانی ہوتے تھے۔ ان خانہ جنگیوں کے دوران میں جنہوں نے ایران کو طوائف الملوکی کا موقف بنا دیا تھا تخت و تاج کے دعوے داروں کی رقیبانہ کوششیں بسا اوقات یونانی سپاہیوں ہی کے مردانہ اوصاف کی شرمندہ احسان ہوئیں۔ ان نیرو آزمائیوں سے جو نتائج مترتب ہوئے وہ نہایت اہم تھے۔ بہادر اور جنگجو یونانیوں نے جن کے جوہر سپہ گری کو اب تک ایران کے روپیہ نے خرید رکھا تھا ایک نظر میں معلوم کر لیا کہ سلطنت روہ انحطاط ہے اور تلوار کے زور سے تخت تک پہنچ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ کیونکہ میدان جنگ میں سائرس کے کام آنے کے بعد زونفن کا اپنے دس ہزار ہمراہیوں کو ایران سے صحیح و سلامت لے لکنا ایک ایسا زندہ جاوید واقعہ تھا جس نے اس بات کو قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ بالکل ممکن ہے کہ یونانی فوج قلب ایران پر ترکنا کرے اور وقت آ پڑے تو صحیح و سلامت واپس چلی جائے۔

زرکسیں نے ہیلپانٹ پر پل باندھ کر اور کوہ ا-تھاس کی خاکنائے کو اپنائے کی شکل میں بدل کر یونانیوں کے دلوں پر ایشیائی سپہ سالاروں کی جنگی قابلیت کا سکھ بٹھا دیا تھا لیکن سلامس پلیٹیا اور ماتھیکل کی لڑائیوں نے یہ نقش محو کر دیا۔ ایران کے مالامال صوبوں کو تاخت و تاراج کرنے کی ہوس کا ایک طوفان ان کے دلوں میں امنڈ آیا۔ اسپارٹا کا بادشاہ اکیسیلیس اسی خواہش کے اقتضا سے ایران پر چڑھ دوڑا اور کئی نمایاں فتوحات حاصل کیں لیکن ایرانی گورنمنٹ نے اس موقع پر اپنی قدیم حکمت عملی سے کام لے کر اس کی پیش قدمی کو روک دیا یعنی اسپارٹا کی ہمسایہ ریاستوں کو رشوت دے کر خود اسپارٹا پر حملہ کرا دیا۔

اسکیسیلیس کو اب اپنے گھر کی پڑگئی اور جب جہاز پر سوار ہو کر وہ اسپارٹا کو واپس جانے لگا تو یہ تلخ اور تعریض آمیز جملہ اس کے منہ سے نکلا کہ ”آہ میں مغلوب بھی ہوا تو فقط تمیں ہزار ایرانی تیر اندازوں سے“۔ اس سے اس کی مراد ایرانی سکھ ”دارک“ سے تھی جس پر تیر انداز کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

اس کے بعد فیلقوس شاہ مقدونیہ کو ایک زیادہ تر اہم مقصد نے ایک بہت بڑے جنگی پیانہ پر ان کوششوں کی تجدید و احیا کا خیال دلایا۔ تمام یونانی ریاستوں کو اس نے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اسے یونان کی افواج متحدہ کا سپہ سالار اعظم قرار دیں نہ اس غرض سے کہ صوبجات ایران کو تاخت و تاراج کیا جائے بلکہ اس غرض سے کہ دولت ایران کو مسخر کر کے یونان کا حلقہ بگوش بنا لیا جائے۔ ابھی اس عظیم الشان مہم کی تیاریاں مکمل نہ ہوئی تھیں کہ وہ قتل کر ڈالا گیا اور اس کا بیٹا سکندر جو ابھی بالکل نو عمر تھا اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ فیلقوس کے قتل کے بعد یونانیوں کی ایک عام مجلس شوریٰ بمقام کارنٹھ منعقد ہوئی تھی اور اس میں بالاتفاق یہ قرار پایا تھا کہ سکندر اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھے۔ انہی دنوں الیریا میں کچھ فساد اٹھ کھڑا ہوا۔ سکندر کو اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے اپنی فوج لے کر شمال کی جانب دریائے ڈیوب تک جانا پڑا۔ اس کی غیبت میں اہل تھنبہ نے دیگر قبائل کے ساتھ مل کر اس کے برخلاف سازش کی۔ واپس آ کر اس نے تھنبہ کو ایک دہاوے میں سر کر لیا اور اہل شہر میں سے چھ ہزار کو قتل کیا، تیس ہزار کو لونڈی غلام بنا کر بیچ ڈالا اور شہر کو مسمار کر دیا۔ یہ جبر و تشدد اس کی فوجی مال اندیشی کی بہت بڑی دلیل ہے اس لئے کہ جب وہ ایشیا کی تسخیر میں مصروف تھا تو اس کی غیبت میں کسی کو سراٹھانے کی جرات نہ ہوئی۔

۳۳۴ قء کے موسم بہار میں سکندر ہیلپانٹ کو عبور کر کے ایشیا کے ساحل پر نگر انداز ہوا۔ اس کی فوج تعداد کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ چونتیس ہزار پیادے تھے اور چار ہزار سوار۔ خزانہ بھی اس کے ہمراہ واجب ہی تھا یعنی کلم ستر ٹیلنٹ لے کر گھر سے نکلا تھا۔ ایرانی فوج دریائے گر - تیکس کے اس پار ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔ سکندر نے سیدھا غنیم کا رخ کیا اور دریا کو چیرتا ہوا حریف سے جا بھڑا۔ گھسان کی لڑائی ہوئی۔ ایرانی اگرچہ جان توڑ کر لڑے لیکن سکندر کی بہادر اور قواعد دان فوج کے آگے ان کی ایک پیش نہ گئی۔ شکست فاش کھا کر انہوں نے راہ فرار اختیار کی اور کل ایشیائے کوچک مع بے شمار خزانوں کے سکندر کے قبضہ میں آ گیا۔ سال کا باقی حصہ سکندر نے ممالک مفتوحہ کے فوجی نظم و

نق میں گزارا۔ اس اثناء میں دارا فرما روئے ایران چھ لاکھ کا بڑی دل لے کر آگے بڑھا تاکہ مقدونی فوج کو شام کی طرف پیش قدمی کرنے سے روکے۔ کوستان ہمسس کی گھاٹیوں میں دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ ایرانیوں کو اس دفعہ بھی شکست ہوئی۔ اس خونریز جنگ میں جانوں کا جس قدر نقصان ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سکندر اور اس کا ایک جرنیل بطیموس جب ایک گھاٹی میں سے گزرے تو اسے کشتوں کے ایک عظیم الشان پٹے سے اٹا ہوا پایا اور دونوں کو اس گنج حبیباں کے اوپر سے ہو کر گذرنا پڑا۔ سکندر کے ہمراہ جو واقع نہیں تھے انہوں نے حساب لگایا کہ اس جنگ میں ایرانی فوج کا نقصان بقدر نوے ہزار پیادوں اور دس ہزار سواروں کے ہوا۔ شاہی حرم سرا کا خیمہ دارا کی بی بی اور اس کے کئی بچوں سمیت فاتح کے قبضہ میں آیا۔ اس طور پر ملک شام بھی یونانی فتوحات کی سلک میں منسلک ہو گیا۔ دمشق میں دارا اور اس کے اعیان دولت کی کثیر الحدود خواص مع بیشمار خزانہ کے سکندر کے ہاتھ آئیں۔

سوپریمیا کے میدانوں کی جانب اخیر جنگ کے لئے پیش قدمی کرنے سے پہلے سکندر نے ان ممالک کی حفاظت کے خیال سے جنہیں وہ فتح کرتا ہوا پیچھے چھوڑ آیا تھا اور نیز اس غرض سے کہ اس کے اور سمندر کے درمیان غنیم کو حاصل ہونے کا موقع نہ ملے بحروم کے ساحل کے کنارے کنارے جنوب کا رخ کیا اور رستہ میں جو جو شہر پڑے انہیں فتح کرتا گیا۔ ایس کی لڑائی کے بعد جو مجلس شوری منعقد ہوئی تھی اس میں سکندر نے ایک تقریر کرتے ہوئے اپنے افسران فوج سے کہا تھا کہ ایسی حالت میں جب کہ تازہ معر نہیں ہوا اور معرہ قبرص ایران کے قبضہ میں ہیں دارا کا تعاقب کرنا کسی طرح قرین مصلحت نہیں اس لئے کہ اگر ایران بندر گاہوں پر مکرر قابض ہو گیا تو مرکز جنگ یونان میں منتقل ہو جائے گا۔ پس بحر اس کے چارہ نہیں کہ سمندر کے قبضہ میں ہمارا کوئی شریک و سیم نہ ہو۔ سکندر اچھی طرح جانتا تھا کہ معرہ اور قبرص پر قبضہ کر لینے کے بعد اسے یونان کی طرف سے کوئی کھٹا نہیں ہو سکتا۔ تازہ کے محاصرہ میں اسے چھ مہینے کی مدت لگی۔ اس تاخیر کی پاداش میں اس نے اہل تازہ میں سے دو ہزار کو سولی پر لٹکا دیا۔ یورشلیم نے بلا مزاحمت ہتھیار ڈال دیے اور اس لئے اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا گیا لیکن عازہ کے ایرانی گورنر بیطس نے مقدونی فوج کو رستہ میں جاہازانہ مقابلہ سے دو مہینے تک روڑا اٹکائے رکھا۔ آخر ایک سخت حملہ کے بعد اس شہر کو بھی سکندر کی کشور کشا تلوار نے معر کیا۔ شہر کے دس ہزار باشندے قتل کئے گئے اور باقی اپنے بی بی بچوں سمیت لومبڈی ظلام بنا کر بچ ڈالے گئے۔ خود

بھٹس کو فاتح کے رتھ کے پیوں کے ساتھ باندھ کر شر کے گردا گرد گھسیٹا گیا۔ اس کے بعد کسی کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ اہل مصر نے جنہیں ایرانی حکومت سے نفرت تھی یونانی حملہ آور کا باہتیاق تمام خیر مقدم کیا اور مصر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اس کے ہاتھ آگیا۔ مصر کے انتظام میں سکندر نے اپنی مصلحتوں کو پیش نظر رکھا یعنی بڑے بڑے فوجی عہدے مقدونی افسروں کو دے دیے اور ملکی نظم و نسق کی باگ اہائے وطن کے ہاتھ میں رہنے دی۔

جب ایران پر آخری حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو سکندر جو پیرامین دیوتا کے مندر کی جاترا کو روانہ ہوا جو دو سو میل کے فاصلہ پر صحرائے لبیا کے ایک خوش سواد مرغزار میں واقع تھا۔ مندر کے غیب دان کاہن نے اسے یہ خوش خبری سنائی کہ تم اسی پیکل کے دیوتا کی اولاد ہو جو سانپ کی شکل اختیار کر کے تمہاری ماں اولہپاس کو اپنے تصرف میں لایا تھا۔ یہ خیال کہ بے باپ کے بھی اولاد ہو سکتی ہے اور یہ نتیجہ دیوتاؤں اور ان عورتوں کی مواصلت سے مرتب ہوتا ہے جو ان کی منظور نظر ہوں اس زمانہ میں اس قدر عام تھا کہ جو شخص اقراں و اماتل میں غیر معمولی طور پر نمایاں اور سرور آورہ ہوتا تھا آسمانی نسل سے سمجھا جاتا تھا اس قسم کے خیالات صدہا سال تک لوگوں میں پھیلے رہے۔ چنانچہ رومہ الکبریٰ کی نسبت عام طور سے یہ مشہور تھا کہ ایک دفعہ ایک کنواری لڑکی رہی سلویا نامی گھڑا لے ہوئے پانی بھرنے کے لیے چشمہ پر جا رہی تھی کہ بارس دیوتا کی اس پر نظر پڑ گئی۔ دیوتا اس دو شیرہ پر عاشق ہو گیا اور اس تشفق کا نتیجہ رومیوس ہوا جس نے شہر روما کی بنا ڈالی۔ اگر کوئی شخص اس روایت کے صحیح ہونے میں شک لاتا تو خدا جانے اس کی کیا گنت بنتی۔ خود فلاطون کی نسبت یہ مشہور تھا کہ اس کی ماں پیر کیٹونی کنواری تھی جسے پالو دیوتا سے حمل رہ گیا تھا اور دیوتا ارشان کو جس کے ساتھ پیر کیٹونی کی نسبت ٹھہری تھی فلاطون کے آسمانی نسب کا حال بتا دیا تھا۔ بانی فلسفہ اشراقیہ کے مصری تلامذہ کے سامنے اگر کوئی شخص اس کی ایوت کے ساوی الاصل ہونے کے متعلق شبہ ظاہر کرتا تو ان کی ناراضی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ ”شاہ اسکندر لین جو پیرامین“ کے القاب کے ساتھ جب سکندر کے احکام و فرائین جاری ہوتے تھے تو شام اور مصر کے باشندے انہیں اس انتہائے تعظیم و توقیر کی نظر سے دیکھتے تھے جس کا آج کل صحیح اندازہ ہونا مشکل ہے۔ لیکن آزاد خیال یونانی اس آسمانی نسبت کی اصلی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اولہپاس جس سے زیادہ روشنی اس معاملہ پر اور کوئی نہ ڈال سکتا تھا ازراہ مزاح کہا کرتی تھی کہ ”بہتر ہو اگر سکندر مجھے

اس فضیلت سے معاف رکھے تاکہ جو پیر کی بی بی کے ہر وقت کے رقیبانہ طیش و غضب سے تو بچی رہوں۔" مقدونی مہم کے واقعہ نویس ایرین کا بیان ہے کہ سکندر کی یہ کوشش کہ اس کا ربانی الاصل ہونا اس کی رعایا کے ذہن نشین ہو جائے قابل ملامت نہیں قرار دی جاسکتی اور نہ اس سے اس پر کوئی بڑا الزام عائد ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی تاویل بادی الظہر میں یوں ہو سکتی ہے کہ اس کا مطلب اس کوشش سے اس سے زیادہ نہ تھا کہ اس کی فوج پر اس کا زیادہ رعب اور اقتدار قائم ہو۔

جب سب انتظام خاطر خواہ ہو چکا تو سکندر شام کو واپس آیا اور اپنے لشکر کے ساتھ جس میں اب پچاس ہزار جنگ آزمودہ اور قواعد دان بنادر موجود تھے شرق کا رخ کیا۔ دریائے فرات کو عبور کر کے وہ کوستان میسا کے دامن و امن سفر کرتا رہا تاکہ مسوپوتیمیا کے جنوبی میدانوں کی شدید تمازت سے پناہ ملے۔ اس رستہ کے اختیار کرنے میں ایک یہ فائدہ بھی تھا کہ گھوڑوں کے لیے چارہ بہ افراط مل سکا۔ دجلہ کے بائیں کنارے اریٹلا کے قریب اس کا مقابلہ گیارہ لاکھ کے اس عظیم الشان لشکر سے ہوا جسے دارا بائیل سے لایا تھا۔ ایرانیوں کو باوجود کثرت تعداد شکست ہوئی اور ان کا بادشاہ مارا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدونی پہ سالاران تمام ممالک پر قابض ہو گیا جو دریائے ڈیوب اور انڈس کے درمیان واقع تھے۔ اس کے بعد سکندر نے اپنی فتوحات کو دریائے گنگا تک وسعت دی جو مال و متاع اس کے ہاتھ آیا وہ قیاس و شمار سے باہر ہے ایرین لکھتا کہ ایک فقط سوسا میں اسے پچاس ہزار ٹیلنٹ کی رقم ملی۔

زمانہ حال کے فن حرب میں جس شخص کو دستگاہ حاصل ہے وہ ان حریت انگیز فوجی کارناموں کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آہائے ہیلپناٹ کا عبور۔ غنیم کی مزاحمت کے باوجود دریائے گر۔ نیکیس کا مرور۔ موسم سرا میں مفتوحہ ایشیائے کوچک کی تنظیم و تسبیح۔ بحر روم کے شامی ساحل کے کنارے کنارے فوج کے سینہ و قلب کی یلغار۔ ناز کے محاصرہ کی مشکلات صعب کا حل۔ شہر عازہ کی تسخیر۔ یونان سے ایرانی سلسلہ تعلقات کا انقطاع۔ بحر روم سے ایران کے جنگی بیڑے کی بے دخلی۔ اتھینس یا اسپارٹا والوں کو رشوت دے کر مقدونیہ کے برخلاف ابھارنے کے متعلق ایرانیوں کی مستمر حکمت عملی کا توڑ۔ مصر کی فتح اور ایک اور موسم سرا گزار کر اس کے ملکی و فوجی انتظام کی تکمیل۔ آئندہ موسم بہار میں کل فوج کا بحیرہ اسود اور بحیرہ قلزم کی متخالف سمتوں سے کوچ کر کے مسوپوتیمیا کے شہر زار میدانوں میں اجتماع۔ تھبائیس کے شکستہ ہل پر بید مجنوں سے ڈھکے

ہوئے کناروں والے فرات سے گذر کر دریائے دجلہ کا عبور۔ اریلا کی عظیم الشان اور یادگار زمانہ جنگ سے پہلے شہنشاہِ طلائیہ گری۔ میدانِ جنگ پر ترجیحی سمت میں فوج کی نقل و حرکت۔ قلبِ فہیم پر تکتاز (اور یہ وہ چال ہے جس کی تقلید صد ہا سال بعد آسٹریٹر کے میدانِ جنگ پر کی گئی)۔ شہنشاہِ ایران کا ان تھک اور سرگرم تعاقب۔ یہ تمام ایسے کارنامے ہیں جس کے لحاظ سے زمانہِ مابعد کا کوئی سپہ سالار سکندر پر فوقیت نہیں لے گیا۔

اس طور پر یونانیوں کی دماغی تحریک کو بہت بڑی تقویت پہنچی۔ یونان میں لینے ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے مقدونی فوج کے ہمراہ دریائے دیوب سے لے کر تباہ رودنیل اور رودنیل سے گنگا کے میدانوں تک سفر کیا تھا۔ ممالکِ آلِ روئے بحیرہ اسود کی برہنہ ہواؤں سے ان کا مغز استخوان تک منجمد ہوا تھا اور مصری صحراؤں کی آتشبار اور ریگ افشاں لوؤں نے ان کے چروں کو جھلسا تھا۔ مصر کے اہرامِ جنین کھڑے کھڑے بیس صدیاں گزر چکی تھیں۔ لکسار کے مخروطی مینار جن پر مصرِ قدیم کے رازِ مخط تصویر منقوش تھے قطار اندر قطار ابوالول جو اسرارِ انجیز غموشی کا مرقع تھے۔ ان فرمانرواؤں کے دیوہیکل مجسمے جنہوں نے صبحِ آفرینش کے طلوع کے وقت نامِ حکومت ہاتھ میں لی تھی۔ یہ تمام عبرت افزا منظر ان کے پیشِ نظر ہو چکا تھا۔ ایسہ ہیڈن کے عالی شان ایوانوں میں وہ اسیرا کے ان قدیم بادشاہوں کے تختوں کے سامنے کھڑے ہو چکے تھے جن کے چروں سے جلال و رعب ٹپکتا تھا اور جن کے حاجب و محافظ پروار ساڑھے تھے۔ بابل کی شہنشاہ جس کا دور کسی زمانہ میں ساٹھ میل سے اوپر تھا اور جو باوجود تین صدیوں اور تین حملہ آوروں کی تاخت و تاراج کے اسی فٹ بلند تھی ابھی تک قائم تھی۔ بعل کے سرسبز مندر کے کھنڈر زبانِ حال سے پکار پکار کر اس کی گزشتہ عظمت و شوکت کی شہادت دے رہے تھے اور اس کی چھت پر وہ رمدگاہ موجود تھی جس میں کالدیہ کے اختر شمار نبوت دان راتوں کو بیٹھ کر عالمِ بالا کی روشن و تہناک استیوں سے ہلکام ہوا کرتے تھے۔ ابھی تک فرمانروایانِ بابل کے دو حلوں اور ان شہرہ آفاق حلقہٴ باغات کے آثار باقی تھے جن کے بتاور درختوں کو دیکھ کر یہ دھوکا ہوتا تھا کہ نضائے ہیبت میں آگے ہوئے ہیں اور جن کلوں کے ذریعہ سے ان باغوں میں دریا کا پانی پہنچایا جاتا تھا ان کے ٹوٹے پھوٹے نشان بھی ابھی تک موجود تھے۔ اس شہر میں جو معنوی جمیل نہروں اور تالیوں کے ایک کثیر التعداد اور پیچ در پیچ سلسلہ کے ساتھ بہ زمانہ سابق تیار کی گئی تھی وہ کوستانِ آمِ مینیا کی پھلی ہوئی بیج سے لہرز رہتی تھی اور دریائے فرات کا پشت اس انداز سے باندھا گیا تھا کہ نہروں کے ذریعہ سے جو پانی شہر میں

جائے وہ زائد از ضرورت بہاؤ کا سدباب کر سکے۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب و غریب شاید وہ سرنگ تھی جس کے ذریعہ سے دریائے فرات کے نیچے سے آمدورفت ہوتی تھی۔

کالبدیہ اسیرہ اور باہل کے حیرت افزا اور عظیم الشان آثار تو نہایت ہی قدیم تھے یہاں تک کہ ان کے آغاز پر زمانہ کی رات کا سیاہ پردہ پڑا نظر آتا ہے لیکن ایران بھی زمانہ مابعد کے عجائبات سے خالی نہ تھا۔ پر سپہرلس (اصططخ) کے ستون دارپوانوں کو مناشی کا اعجاز خانہ کہنا چاہئے جن میں کندہ کاری بت تراشی مینا کاری کے نفیس و پاکیزہ نمونے۔ سنگ مرمر کی سلوں کے کتب خانے۔ مخروطی مینار۔ ابوالہول اور دیوپیکر سائڈ قرینہ سے آراستہ تھے۔ اکبتانا تاجدار۔ ان ایران کا اطلاق یعنی موسم گرما بسر کرنے کا مقام تھا۔ اس شہر کے گرداگرد سات فصیلیں ترشے ہوئے اور مجلڈا پتھر کی تھیں۔ ہر اندر کی فصیل باہر کی فصیل سے اونچی ہوتی جاتی تھی۔ یہ فصیلیں جو سہ سیاہ کی قنجمی مناسبت سے تیار کی گئی تھیں رنگ میں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ شاہی محل کی چھت چاندی کی اینٹوں کی تھی اور شہتیروں پر سونے کے پتروں کا خول چڑھا ہوا تھا۔ آدھی رات کو جب روغن غلط کی مشطوں سے محل میں چراغاں کیا جاتا تھا تو جبکہ گھٹ کی یہ گنجھٹ ہوتی تھی کہ آفتاب کی روشنی کا سہل آنگھوں میں پھر جاتا تھا۔ شہر کے وسط میں ایک پر فضا باغ جو شاہان مشرق کی دلفریبوں کا سب سے بڑا سہلان ہے لگایا گیا تھا۔ غرض سلطنت ایران ویسپانٹ سے لے کر انڈس تک گھرار عالم بنی ہوئی تھی۔

ہم نے ان حیرت افزا فتوحات کے حالات کا ذکر بالتفصیل اس لئے کیا ہے کہ حمایت میں جو ترقی یونانیوں نے ان کی وجہ سے کی وہ اسکندریہ میں ہمہ سہ و ریاضی اور فنون عملی کے ان دارالعلوم کے قیام کا باعث ہوئی جو سائنس کا مبداء و غشا ہیں۔ اگر سلسلہ بہ سلسلہ سراغ لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہماری تمام صحیح معلومات کا ماخذ اصلی یہی مقدونی فتوحات ہیں۔ صوبہ نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان جب کارگاہ ہستی کی نئی اور عظیم الشان قوتوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے قوائے دماغی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ سکندر کے سپاہیوں اور ہمارے اہل کو ہر خطی پر غیر حرقب اور دلفریب مناظر دکھائی دئے۔ دنیا کی تمام قوموں میں یونانیوں کی قوت مشاہدہ سب سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور جو کچھ وہ دیکھتے تھے اس سے بہت جلد اور بدرجہ علمیت متاثر ہو جاتے تھے۔ ایک جگہ اگر انہیں غیر محدود رنگین نظر آئے تو دوسرے مقام پر ایسے پہاڑ دکھائے دئے جن کی چوٹیاں بادلوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ صحرائوں میں انہیں سراب نے دھوکا دیا تو انہیں کوہ میں مہارنگار بادلوں کے

مہیب اور دیوہیکل سایہ نے انجیسے میں ڈالا۔ غریب خرمستانوں اور زمردیں سرو و صنوبر کی سیر کرتے ہوئے وہ جھاؤ اور مندی کی سرزمین میں پہنچے۔ اریٹلا کے میدان میں انہیں ہندوستان کے سدھے ہوئے جنگی ہاتھیوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ بحیرہ خزر کے ساحل کے جنگوں میں ان کی یلغار کی دھمک نے شیر بہر کو بیدار کیا۔ ایسے ایسے جانور ان کے دیکھنے میں آئے جو یودپ کے جانوروں کے مقابلہ میں نہ صرف عجیب الخلق بلکہ ہراتب عظیم الجثہ تھے۔ گینڈا، اونٹ، دریائی گھوڑا، ٹیل و گنگا کے تنگ ان کے لئے بنزرا عجائبات تھے۔ ایسی ایسی قوموں سے ان کی لڑائیاں ہوئیں جو شکل و شمائل اور وضع و قطع میں ان سے بالکل مختلف تھیں۔ کبھی وہ سیاہ قام افریقی سے نبرد آزما ہوئے اور کبھی سامنے شامی اور گندم رنگ ایرانی سے ان کی ٹڈبھڑ ہوئی۔ خود سکندر کی نسبت یہ واقعہ مشہور ہے کہ بستر مرگ پر پڑے پڑے وہ اپنے امیر البحر نیار کس سے اس کے دریائی سفر کی دلچسپ سرگزشت سن سن کر جی ہلایا کرتا تھا جو اس نے دیوائے انڈس سے خلیج فارس تک کیا تھا۔ سکندر نے جب اول اول دریا کے مدوجزر کو دیکھا تو اسے بہت حیرت ہوئی۔ اسے یہ خیال تھا کہ بحیرہ اسود اور بحیرہ خزر بھی بحر احمر اور بحر فارس کی طرح جیسا کہ نیار کس نے دریافت کیا تھا کسی بڑے سمندر کی خلیجیں ہوں گی۔ چنانچہ اس قیاس کو پایہ تحقیقات پر پہنچانے کے لئے اس نے جہاز تیار کرائے تھے۔ اس کا یہ بھی ارادہ تھا کہ اس کے جہازوں کا بیڑہ افریقہ کے گرداگرد چکر لگاتا ہوا آبنائے جبل الطارق میں سے ہو کر بحر روم میں داخل ہو جائے۔ اور یہ خیال اس کے ذہن میں اس قدیم روایت نے پیدا کیا تھا کہ یہ مہم ایک بار فراعنہ کے زمانہ میں طے ہو چکی تھی۔

ممالک مفتوحہ کے بہت سے غریب و نادر ایسے تھے جنہوں نے نہ صرف بڑے سے بڑے باداران یونان بلکہ اعلیٰ ترین حکمائے یونان کو محو حیرت کر دیا۔ کیلستینج کو بائبل میں مسلسل ایک ہزار نو سو تین سال کے کھدائی مشاہدات اجسام فلکی ہاتھ لگے جو اس نے پہلے اسطو کی خدمت میں بھیج دیے۔ چونکہ یہ رصدی نتائج پختہ اینٹوں پر ثبت تھے اس لئے یہ ممکن ہے کہ اس کے دوسرے نئے آثار قدیمہ کے تلاش کرنے والوں کو سریانی سلاطین کے ششی کتب خانوں میں سے مل جائیں۔ مشہور مصری ہیئت دان بطلموس کو ایک بائبل جدول ہاتھ لگی تھی جس میں ۷۴۷ قبل مسیح سے لے کر اس وقت تک کے مشاہدات کسوف و خسوف کے نتائج مندرج تھے۔ ان نتائج میں سے جو ہم تک پہنچے ہیں بعض کی محققانہ تنقید کے لئے ضرور ہے کہ ایک عرصہ دراز تک نہایت وقت نظر اور شلسل سے رصد بینی کی گئی

ہو۔ بابلی مندسوں نے سال انقلابی کی جو مدت قائم کی تھی وہ زمانہ حال کی مستحکم مدت سے فقط ۲۵ ٹائیہ کم ہے اور سال کو کسی کی مدت کا اندازہ اصلی مدت سے صرف بقدر دو دقیقہ کے زیادہ ہے۔ استنبال نقطہ اعتدال لیل و نهار کا بھی ان کو علم ہو چکا تھا۔ کسوف و خسوف کے اسباب وہ دریافت کر چکے تھے اور اپنے مجوزہ دور کی مدد سے جس کا نام ان کی اصطلاح میں سیروس تھا وہ ان کے اوقات وقوع کی نسبت پیشین گوئی کر سکتے تھے۔ اس دور کی مدت انہوں نے 6586 دن سے کچھ زیادہ قرار دی تھی اور یہ مدت اصلی مدت سے فقط ساڑھے انیس دقیقہ کم ہے۔

ان واقعات سے اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہم پہنچتا ہے کہ مسوپوٹیمیا میں فنیت کو نہایت استقلال اور قابلیت کے ساتھ ترقی دی گئی تھی اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں آلات رصد نہایت ہی ناقص اور غیر مکمل تھے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیوں کر انہوں نے اس فن میں ایسا کمال حاصل کر لیا۔ ان قدیم علماء ہیئت نے کواکب کی ایک فرست تیار کی تھی منصفۃ البروج کو بارہ برجوں میں تقسیم کیا تھا۔ دن اور رات کے بارہ بارہ گھنٹے مقرر کئے تھے۔ ارسطو کا بیان ہے کہ انہوں نے بہت کچھ وقت احتجاب کواکب کی تحقیقات میں جو چاند کے حائل ہونے کے باعث واقع ہوتا ہے صرف کیا تھا۔ ان کو نظام شمسی کی ترکیب کا صحیح علم تھا اور وہ سیاروں کے مقامات کے اعتباری تغیرات کی ماہیت سے بھی واقف تھے۔ دھوپ گھڑی۔ پانی کی گھڑی۔ اصطرباب اور دھوپ گھڑی کا کائنات ان کی ایجاد ہے۔

ان کی چھپائی کا طریقہ بھی جس کا حال اس وقت کے موجودہ نمونوں سے ظاہر ہوتا ہے خالی از ہر نہ تھا۔ جو کچھ چھاپنا ہوتا تھا ایک گردش کرنے والے میلن پر شرفی حروف میں کندہ کر دیا جاتا تھا اور اس میلن کو نرم گیلی مٹی کی اینٹوں پر پھیر دیا جاتا تھا جس سے میلن کے حروف اینٹوں پر ابھر آتے تھے اور پھر نہ مٹ سکتے تھے۔ ان کی اینٹوں کی کتابیں ابھی تک ہماری معلومات متعلقہ ادب و تاریخ میں بہت کچھ اضافہ کرنے والی ہیں۔ مناظرہ مرایا کے اصول سے بھی وہ بے خبر نہ تھے۔ مقام نمود میں جو شیشہ محدب برآمد ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی چیز کو بڑا کر کے دکھانے والے آلات کی ماہیت بھی جانتے تھے۔ فن حساب میں وہ مراتب اعداد کی قیمت سے واقف ہو چکے تھے لیکن ہندوستان کی متمم بالشان ایجاد صفر مان سے چھوٹ گئی تھی۔

ان واقعات نے کشور کشا ایرانیوں کی آنکھیں کھول دیں۔ آج تک تجربہ اور مشاہدہ

سے انہوں نے کام نہ لیا تھا۔ ان کا سب سے بڑا عقلی کارنامہ ان کے تخیل کی شاعرانہ بلند پروازی تھی اور بس۔

یونانیوں کی دماغی ترقی کو جس کے عمرگ ایک حد تک فطرت کے وسیع مشاہدات ہوئے ممالک مفتوحہ کے مذاہب کی واقعیت سے بہت بڑی تقویت پہنچی۔ یونان کی بت پرستی کو ایران نے ہمیشہ نفرت و کراہیت کی نظر سے دیکھا تھا۔ چنانچہ جب کبھی فرمان روایان ایران نے یونان پر فوج کشی کی تو یونانی مندروں کے انہدام اور ان کے بہایم صفت دیوتاؤں کی تذلیل و توہین کا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جب اس قسم کی توہین و تذلیل کی پاداش میں دیوتاؤں کی طرف سے کوئی آفت ایرانیوں پر نازل نہ ہوئی تو لوگوں کی اس عقیدت میں جو اپنے معبودوں کی طرف سے ان کے دلوں میں جاگزیں تھی تزلزل واقع ہو گیا اور یونانی مذہب کی جڑ کھوکھلی ہو چلی۔ اولپس کے ان ناپاک دیوتاؤں کے پھاری جن کی بخش کاریاں ہر پاکباز شخص کے اندامِ انتہا پر لرزہ طاری کرنے والی تھیں اب ایسے مہتمم بالشان اور سنجیدہ و متین مذہب سے دوچار ہوئے جس کی بنیاد فلسفہ پر رکھی گئی تھی۔ ہر اس سلطنت کی طرح جس کی مدت حکومت طویل ہوتی ہے ایران میں بھی متحدہ مذہبی انقلابات واقع ہو چکے تھے۔ اول اول اس نے زردشت کا موحدانہ مسلک اختیار کیا۔ وحدانیت کے بعد ثنویت کا دور آیا اور ثنویت کی جگہ مجوسیت نے لے لی۔ مقدونی فوج کشی کے وقت اہل ایران کے عقاید یہ تھے کہ ایک عقل کل تمام کائنات کی خالق محافظ اور حکمران ہے جو راستی کا جوہر پاک اور صداقت و خیر کا سرچشمہ ہے۔ اس قادر بے ہمتا کو کسی بت یا تصویر کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کیا جاسکتا اور چونکہ اس دنیائے دنی میں ہر شے دو متخالف قوتوں کے آثار کی دوگونہ مظہر ہے لہذا قادر مطلق کے زیر فرمان دو ہموزن و ہمزا ازیلی و ابدی طاقتیں ہیں جنہیں استعارۃ نور و ظلمت کہہ سکتے ہیں۔ یہ دونوں طاقتیں ایک ایسی کشاکش اور زور آزمائی میں مصروف ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں۔ عالم ان دونوں کا عرصہ کارزار اور انسان ان کا مال غنیمت ہے۔

ثنویت کی قدیم روایات میں مذکور تھا کہ بدی کی طاقت (اہرمن) نے ایک سانپ کو اس کام پر مامور کیا کہ نیکی کی طاقت (یزدان) کے بنائے ہوئے بہشت کو جا کر تباہ کر ڈالے۔ یہ روایات یہودیوں کو اس زمانہ میں معلوم ہوئیں جب وہ بابل میں قید کے دن کٹ رہے تھے۔

جس طرح نور اور سایہ لازم و ملزوم ہیں اسی طرح خیر و شر ضرر و فساد کا لازم و ملزوم ہیں۔ اس دنیا میں جس کا خالق اور حکمران خیر مطلق ہے شر کی توجہ اگر کی جاسکتی ہے تو صرف اسی

طریقہ سے۔ عنصر خیر و عنصر شر یعنی یزدان و اہرمن میں سے ہر ایک کے ماتحت مجوسیوں کے عقیدہ کے بموجب فرشتے اور وزیر اور فوجیں بھی تھیں۔ اس مسلک کی رو سے ہر نیک انسان کا فرض ہے کہ راستی، پاکبازی اور محنت کے اصول اختیار کرے۔ اسے یقین رکھنا چاہئے کہ اس کا لبد خاکی کی قید سے آزاد ہونے کے بعد اسے عالم عقبی میں زندگی عطا ہوگی اور وہ اسی جسم سے اٹھے گا اس کی روح کو بھائے ابدی حاصل ہوگی اور وہ فہم و ادراک کی نعمتوں سے مستفیض ہو کر حیات اخروی بسر کرے گا۔

سلطنت کے دور اخیر میں مجوسی عقاید زردشتی عقاید پر بتدریج بہت کچھ غالب آ گئے تھے۔ مجوسیت دراصل پرستش عناصر تھی۔ ان میں سے آگ کو خدائے برتر کی نیابت کا حق سب سے زیادہ حاصل تھا۔ ان کے آتش کدوں میں جو بجائے مسفت مندروں کے زیرِ ستا قائم کئے جاتے تھے ہمیشہ آگ روشن رہتی تھی اور آفتاب بوقت طلوع انسانی پرستش کا مقصد اعظم سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح بادشاہ کے ہوتے ہوئے اور کسی پر نظر نہیں پڑ سکتی اسی طرح آفتاب کی موجودگی میں باقی تمام اجرام فلکی نظر سے غائب ہو جاتے ہیں اور مستحق عبادت نہیں سمجھے جاسکتے۔

۳۲۳ قء میں سکندر اپنے بڑے بڑے منصوبوں کو ادا ہوا چھوڑ کر ۳۳ سال کی عمر میں بمقام باہل اشغال کر گیا۔ بعض لوگوں کو اس کی قبل از وقت موت سے شبہ ہوا کہ اسے زہر دے کر مار ڈالا گیا ہے۔ اس کی طبیعت ایسی چڑچڑی اور اس کا مزاج ایسا بے قابو ہو گیا تھا کہ اس کی فوج کے بڑے بڑے افسر یہاں تک کہ اس کے بے تکلف دوست اس کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کلائش کو جو اس کا رضامی بھائی اور ساتھ کا کھیلا ہوا دوست تھا اس نے حالت غیظ و غضب میں خنجر بھونک کر مار ڈالا۔ کیلستیمز کو جو اس کے اور ارسطو کے درمیان علمی واسطہ تھا اس نے سولی دلوادی یا جیسا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے اول کھنبہ میں جکڑ کر انواع و اقسام کے عذاب میں مبتلا کیا اور اس کے بعد مصلوب کیا۔ ایسی حالت میں بعید از قیاس نہیں کہ محض اپنی جان بچانے کے خیال سے اس کے گرد و پیش کے لوگوں نے اس کے قتل کی سازش کی ہو۔ ارسطو کی بھی اس سازش میں شرکت بیان کی جاتی ہے لیکن یقیناً یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ ارسطو طرح طرح کی عقوبتوں کے ساتھ سوہار مرنا قبول کرتا لیکن ایسے سنگین جرم کے ارتکاب کے معین ہونے کا ہرگز روادار نہ ہوتا۔

سکندر کی آنکھیں بند ہوتے ہی خوزیری اور خانہ جنگی کا ایک ہنگامہ بپا ہو گیا جو کئی سال تک فرو نہ ہوا اور اس وقت بھی جب کہ اس کے افسران فوج نے سلطنت کے حصے

بخڑے کر لیے اور ہر ایک نے ایک نئی اور خود مختار بادشاہت قائم کر لی اس فساد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس طوفان بے تمیزی میں جو قسے قصے پیش آئے ان میں سے صرف ایک واقعہ ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ بطلمیوس ارسینو نامی ایک حینہ و جلیلہ خواص کے بطن سے شاہ فیلقوس کا بیٹا تھا اور اس لحاظ سے گویا سکندر کا علائی بھائی ہوتا تھا۔ بچپن میں ایک دفعہ باپ نے خفا ہو کر دونوں کو جلاوطن کر دیا اور اس وقت سے وہ برابر سکندر کے ہمراہ رہا۔ کوئی ایسی جنگ یا مہم نہ تھی جس میں اس نے سکندر کا ساتھ نہ دیا ہو۔ وہ اول مصر کا گورنر اور بالاخر مطلق العنان فرمانروا ہو گیا۔

روڈس کے محاصرہ کے وقت بطلمیوس نے وہاں کے باشندوں کی ایسی گراں بہا مدد کی کہ انہوں نے فرط امتنان سے اس کی تعظیم و تکریم دیوتاؤں کے برابر کی اور اسے سوثر یعنی نجات دہندہ کا لقب دیا۔ مصر کے سلسلہ مقدونیہ کے فرمانروایان مابعد سے اس کو یہی لقب ممتاز کرتا ہے۔

بطلمیوس سوثر نے بجائے ان شہروں کے جو سابق میں مصر کا پایہ تخت رہ چکے تھے اپنا دارالحکومت اسکندریہ میں قائم کیا۔ جو پیرامین کے مندر کو جاتے وقت اسکندر نے اس شہر کی بنیاد یہ سمجھ کر ڈالی تھی کہ موقع کے لحاظ سے یہ شہر یورپ اور ایشیا کی تجارت کا مرکز اتصال ہو سکے گا۔ یہ امر خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نہ خود اسکندر نے بہت سے یہودیوں کو فلسطین سے لا کر یہاں آباد کیا اور نہ صرف بطلمیوس سوثر نے اور ایک لاکھ یہودیوں کو ہیرشلیم کے محاصرہ کے بعد یہاں لا بھایا بلکہ اس کے جانشین فلیدلفس نے بھی ایک لاکھ اٹھانوے ہزار یہودی غلاموں کو ان کے مصری آقاؤں کو معقول زر فدیہ ادا کر کے آزاد کرا دیا۔ ان تمام یہودیوں کو وہ تمام مراعات و حقوق عطا کئے گئے جو خود مقدونیوں کو حاصل تھے۔ اس لطف و انصاف کے برتاؤ کی وجہ سے کثیر التعداد یہودی اور بہت سے اہل شام برضا و رغبت خود آ آ کر مصر میں آباد ہوتے گئے۔ ان لوگوں کو یونانی یہودیوں کا امتیازی لقب عطا کیا گیا۔ وثر کی فیاض اور مہربان حکومت کا شہرہ سن کر بیشمار یونانیوں نے بھی مصر کو اپنا جلاؤ بنا لیا اور پڑیکاس اور اینگیگوس کے حملوں سے یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی کہ یونانی سپاہی دوسرے مقدونی سپہ سالاروں کی اطاعت سے منحرف ہو کر سوثر کی فوج میں آ ملنے کے لئے بہ آمادگی تمام تیار ہیں۔

اس اعتبار سے اسکندریہ میں گویا تین مختلف قوموں کے لوگ آباد تھے یعنی یہودی، یونانی اور یہودی۔ اور یہ وہ واقعہ ہے جس کا اثر موجودہ یورپ کے مذہبی عقاید میں

صاف نظر آتا ہے۔

یونانی معماروں اور انجینئروں نے اسکندریہ کو اپنی صنعت کے زور سے دنیائے قدیم کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر بنا دیا تھا۔ عالیشان محلوں، خوش افغا مندروں اور دل آرا تماشا گاہوں سے شہر کا کوئی حصہ خالی نہ تھا۔ وسط میں دو وسیع سایہ دار سڑکوں کے مقام اتصال پر جو ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتی تھیں، پتھروں، فواروں اور مخروطی میناروں کے درمیان وہ شاندار مقبرہ کھڑا تھا جس میں مصریوں کی رسم کے موافق سکندر کی خنوط آلودہ نعش محو آرام تھی۔ سکندر کا جنازہ نہایت طمطراق اور شکوہ و جلال کے ساتھ دو سال کے مانتی سفر کے بعد باہل سے لایا گیا تھا۔ اول اول تابوت طلائے خالص کا تھا لیکن چونکہ اس کی وجہ سے مقبرہ کو ناپائیداری کی دستبرد کا صدمہ سہتا پڑا لہذا بجائے طلائے احمر کے تابوت سنگ مرمر کا بنا دیا گیا۔ لیکن نہ تو فن تعمیر کے یہ نظر افزہ اور دل فریب کرشمے اور نہ سفید سنگ مرمر کا وہ عظیم الشان مینارہ روشنی ہی ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا تھا اور اس قدر بلند تھا کہ وہ آگ جو ہر وقت اس کی چوٹی پر جلتی رہتی تھی جہازوں کو میلوں سے نظر آتی تھی۔ مقدونی فرمانروایان مصر کی اصلی و حقیقی اور سب سے زیادہ شاندار اور انہٹ یادگار عجائب خانہ اسکندریہ ہے جس کا اثر دنیا میں اس وقت تک قائم رہے گا جب کہ اہرام مصر کی بنیادوں کے سنگریزے تک پس کر گرد روزگار میں مل گئے ہوں گے۔

اس عجائب خانہ کی ابتدا بطلیموس سوڑ کے عہد میں ہوئی اور اس کے بیٹے بطلیموس فلید نے اسے تکمیل کو پہنچایا۔ عجائب خانہ کی عمارت بدوشین میں واقع تھی جو شاہی محل کے نزدیک شہر کے اس حصہ کا نام تھا جہاں امرا و اعیان دولت آباد تھے۔ یہ عمارت سنگ مرمر کی تھی اور اس کے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے تھے تاکہ لوگ ان میں چل قدمی کرتے ہوئے مکالمہ کا لطف اٹھا سکیں۔ اس کے کمروں میں سگڑاشی کی صنعت کے نمونے تھے۔ فلید نے اس کتب خانہ کا نام چاروں طرف نہایت ہی حسین مجسمے اور دلربا تصویریں قربینہ سے سجائی ہوئی نظر آتی تھیں۔ بالآخر اس کتب خانہ میں چار لاکھ جلدیں جمع ہو گئیں اور جب رفتہ رفتہ مزید کتابوں کے رکھنے کی گنجائش باقی نہ رہی تو ایک اور کتب خانہ اسی کے قریب سورسین یعنی سر پلس کے مندر میں قائم کیا گیا۔ اس دوسرے کتب خانہ میں جو پہلے کتب خانہ کا بچہ کہلاتا تھا آخر میں تین لاکھ جلدیں جمع ہو گئیں۔ اس حساب سے گویا ان دونوں شاہی کتب خانوں میں سات لاکھ کتابیں موجود تھیں۔

اسکندریہ فقط مصری کا پایہ تخت نہ تھا بلکہ عقل و ادراک کے لحاظ سے تمام دنیا کا مرکز حکومت تھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں عقل مشرق آکر عقل مغرب سے ہم آغوش ہوئی۔ یہ قدیم زمانہ کا پیرس ہر طرح کی نشاط انگیز ادبائشوں اور تفکک آفرین آزاد خیالیوں کا نقطہ اتصال بن گیا۔ یہاں کی دلچسپ اور رنگین صحبتوں میں شریک ہو کر یودیوں تک کے دلوں سے دلولہ حب وطن و مہذبہ جوش قومی محو ہو گیا۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی زبان چھوڑ دی اور یونانی زبان اختیار کر لی۔

عجائب خانہ کے قیام سے بطلمیوس سوڑ اور اس کے بیٹے فیلڈلفس کے پیش نظر تین مقصد تھے۔ (۱) علوم موجودہ کی بقاء (۲) اس کی ترقی اور (۳) اس کی اشاعت۔

(۱) علوم موجودہ کی بقاء

سرکاری کتب خانہ کے صدر متمم کو حکم دیا گیا کہ جو کتابیں مل سکیں سرکاری خرچ سے خرید لی جائیں۔ عجائب خانہ میں کتابوں کی ایک جماعت اس خدمت پر مامور تھی کہ جن کتابوں کے مالک انہیں فروخت نہ کرنا چاہتے ہوں ان کی صحیح نقلیں کریں۔ باشندگان ممالک غیر جب کوئی کتاب مصر میں لاتے تھے تو وہ فوراً ”عجائب خانہ میں بھیج دی جاتی تھی اور نقل مطابق اصل ہونے کے بعد اصلی نسخہ کتب خانہ میں رکھ لیا جاتا تھا اور نقل مالک کتاب کے حوالہ کر دی جاتی تھی۔ بسا اوقات پیش قرار رقمیں معاوضہ یا ہرجانہ کے طور پر بھی دی جاتی تھیں۔ مثلاً بطلمیوس پور بیڑی کے عہد کا واقعہ ہے کہ اکتھنس سے یورپیڈیز سفارت اور اسٹیل کی تصانیف بہم پہنچا کر اس نے ان کی نقول کے ساتھ پندرہ ہزار ڈالر ہرجانہ کے طور پر اصل نسخوں کے مالکوں کے پاس بھجوا دئے۔ شام کی مم سے جب وہ واپس ہوا تو اکبتانہ اور سوسا سے وہ تمام مصری یادگاریں فتح و نصرت کے شاہی لے جواتا ہوا ہمراہ لایا جنہیں کیتباد اور دوسرے ایرانی حملہ آور مصر سے لوٹ کر لے گئے تھے۔ ان یادگاروں کو اس نے یا تو ان کے اصلی مقامات پر نصب کرا دیا اور یا اپنے عجائب خانوں کے سامان آرائش پر اضافہ کیا۔ جب کسی تصنیف کا نقل کے ساتھ ترجمہ بھی ہوتا تھا تو ایسا پیش قرار معاوضہ دیا جاتا تھا کہ آج کل اس کا یقین کرنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بائبل کے نسخہ ”سہواجنٹ“ کے ترجمہ کے لئے جو بطلمیوس فیلڈلفس کے حکم سے ہوا اسی طرح کا گراں قدر معاوضہ دیا گیا۔

(۲) ترقی علوم

عجائب خانہ اسکندریہ کے قیام کی ایک بہت بڑی غرض یہ بھی تھی کہ سرکاری خرچ سے ایک ایسی جماعت اشخاص کی کفالت کی جائے جو یہاں رہ کر اپنے آپ کو تحصیل علم کے لیے وقف کر دیں۔ بسا اوقات خود فرمانروائے وقت بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتا تھا چنانچہ ان خوردنوش کی صحبتوں کے لطائف کی روایتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ علانیہ مقیم عجائب خانہ کو لحاظ بحکیم علوم و فنون ابتداً "چار طبقات میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی (۱) ادب (۲) ریاضی (۳) ہیئت اور (۴) طب۔ فروعی علوم کو باعتبار مناسبت ان میں سے کسی ایک کے ساتھ شریک کر دیا گیا تھا مثلاً "علم حیوانات طب کی ایک شاخ قرار دیا گیا تھا۔ کسی سرد آورہ عالم کو اس دارالعلم کے حاکم اعلیٰ کی خدمت دی جاتی تھی اور وہی اس کے جزو و کل کا انتظام کرتا تھا۔ اول اول اس عہدہ پر ڈسٹرکٹ فلیرکس کا تقرر ہوا جو کئی سال تک ایجنٹر کا گورنر رہ چکا تھا اور علم و فضل میں یکنائے روزگار تھا۔ حاکم اعلیٰ کے ماتحت متمم کتب خانہ ہوتا تھا۔ اس خدمت پر بعض ایسے نامور اشخاص مقرر ہوئے جن کی فضیلت کی شہرت ہم تک پہنچی ہے۔ مثلاً ایرانا تسمیز اور اپالوننس روڈکس۔

عجائب خانہ کے متعلق ایک باغ نباتات اور جانور خانہ بھی تھا۔ ان کا مقصد جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ تھا کہ نباتات و حیوانات کے حالات کے اکتشاف میں مدد ملے۔ ایک رصدگاہ بھی قائم کی گئی جس میں فلکی کرے۔ سادہ کرے۔ دوائر متعلقہ انقلابات۔ سینفی وشتوی۔ دوائر استوائی۔ اضطرب۔ کواکب کے حقیقی و اعتباری مواقع کے مقیاس اور دوسرے مروجہ آلات ہیئت موجود تھے اور پیکائش کے آلات درجوں اور درجے کے چھٹے حصوں میں منقسم تھے۔ رصد گاہ کے فرش پر ایک خط نصف النہار کھنچا ہوا تھا۔ وقت اور حرارت کا صحیح انداز کرنے کے لئے اگرچہ آلات موجود تھے مگر ان کے نامکمل ہونے کے باعث صحیح اندازہ لگانے میں دقت پیش آتی تھی۔ تیسیس کی آبی گھڑی سے ٹھیک وقت دریافت نہ ہو سکتا تھا اور حرارت کے درجات کی دریافت کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ مائیات کے وزن دریافت کرنے کا آلہ پانی کے کورے میں تیرتا رہتا تھا اور پانی کی لطافت یا کثافت سے حرارت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ فلیدنس کو اخیر اخیر میں موت کی طرف سے سخت خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے بہت سا وقت اسیر حیات کی تلاش میں صرف کیا۔ اس قسم کے مشاغل کے لئے عجائب خانہ میں ایک کیمیا خانہ قائم کیا گیا تھا۔ اس زمانہ کے مخالفانہ خیالات کے باوجود طب کے مینہ کے متعلق علم تشریح کی تحقیقات کی غرض سے ایک کمرہ چیرنے پھاڑنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا اور اس کمرے میں نہ فقط مردوں کی

بلکہ ان زندوں کی بھی چرچاڑ کی جاتی تھی جن کی نسبت کسی جرم سنگین کی پاداش میں سزائے موت کا حکم ہو چکا ہوتا تھا۔

(۳) اشاعتِ علوم

عجائب خانہ میں معلومات انسانی کے ہر شعبے پر کچھ دئے جاتے تھے یا مباحثے ہوتے تھے یا درس و تدریس کا کوئی اور موزوں طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ علوم و فنون کے اس عظیم الشان مرکز میں اطراف و اکناف عالم سے طالب العلم جوق جوق آتے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ اس دارالعلوم کے طلبہ کی تعداد چودہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ بعد میں کلیسائے عیسوی تک کے بعض سرور آوردہ پیشوا مثلاً کلیئس انگریز، نڈریس۔ آریجن اور ایتھینسیس یہیں سے تعلیم پا کر نکلے۔

اس عجائب خانہ کے معلق جو کتب خانہ تھا اسے جوئس سیزر نے محاصرہ اسکندریہ کے وقت جلوا دیا۔ اس نقصان عظیم کی تلافی کے لیے مارک انٹونی نے یو مینز شاہ پر کمیس کا جمع کیا ہوا کتب خانہ ملکہ کلیوپٹرا کی نذر کیا۔ ابتدائے یہ کتب خانہ بطلموسی کتب خانہ کی مسابقت کے خیال سے قائم کیا گیا تھا۔ جب یہ کلیوپٹرا کے ہاتھ لگا تو سوہکلس کے کتب خانہ میں ضم کر دیا گیا۔

اب ہم کو مختصراً یہ بیان کرنا باقی رہتا ہے کہ یہ بے نظیر دارالعلم جس کو قدامت ازراہ فخر ”مدرسہ ایبہ اسکندریہ“ کا نام دے رکھا تھا کس فلسفہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا اور انسانی معلومات کے ذخیرے میں جن جن باتوں کا اس کی وجہ سے اضافہ ہوا ان میں سے بعض کی نوعیت کیا تھی۔

ہمارا فرض ہے کہ اس بے مثال عجائب خانہ کے جلیل القدر بانی کی یادگار میں ہم ”تاریخ فتوحات اسکندر“ کو جو خود اسی کی تصنیف ہے تصانیف علمی کی صف اول میں جگہ دیں۔ بطلمیوس سوڑ جس طرح ایک بہت بڑا سپہ سالار اور ایک بہت بڑا تاجدار تھا اسی طرح ایک بہت بڑا مصنف بھی تھا۔ زمانہ ان احسانات کی یاد کو نہیں مٹا سکا جو اس نے ہم پر کئے ہیں۔ مگر اس کی تصنیف کے ساتھ اس نے اچھا برتاؤ نہیں کیا اس لئے کہ ”تاریخ فتوحات اسکندر“ کا ایک بھی نسخہ آج موجود نہیں۔

اسکندر بطلمیوس اور ارسطو کی باہمی دوستی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ فلسفہ مشائخہ عجائب خانہ اسکندریہ کا عقلی سنگ بنیاد قرار پائے۔ شاہ فیلقوس نے اسکندر کی تعلیم و تربیت پر ارسطو کو

نامور کیا تھا جس نے اپنا یہ اثر دکھایا کہ جب سکندر ایران کی تسخیر میں مصروف تھا تو باوجود انہماک مشاغل فوجی کے روپیہ کے علاوہ دوسرے طریقوں سے کتاب ”علم خواص الاشیاء“ کی تیاری میں ارسطو کی مدد کرتا رہا جو اس وقت تکھی جارہی تھی۔

ارسطو کے فلسفہ کا اصل اصول یہ تھا کہ جزئیات کے مطالعہ سے بذریعہ استقرا کلیات اخذ کئے جائیں جن واقعات و حقائق پر عمل استقرا کا انحصار ہے ان کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر یہ عمل زیادہ صحیح اور زیادہ قریب وثوق ہوگا۔ اسی طریقہ سے بذریعہ تجربہ و مشاہدہ واقعات کے جمع کرنے میں بے انتہا محنت پڑتی ہے اور ساتھ ہی واقعات مجتمہ سے نتائج نکالنے میں بہت کچھ غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ طریقہ گویا عقل و محنت پر مبنی ہے نہ کہ تصور و تخیل پر۔ خود ارسطو سے بسا اوقات جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں وہ اس طریقہ کی بے اعتباری پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ اس کے معتبر ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔ ان غلطیوں کا اصلی باعث صرف یہی ہے کہ کلیہ قائم کرنے میں جن واقعات سے کام لیا گیا وہ تعداد میں ناکافی تھے۔

ارسطو کے قائم کئے ہوئے بعض کلیات نہایت پر شکوہ ہیں مثلاً ”ایک کلیہ اس نے یہ قائم کیا کہ ہر شے حیات کے سانچہ میں ڈھلنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے اور تماشا گاہ فطرت میں جو مختلف اعضائی صورتیں اور شکلیں ہمیں نظر آتی ہیں یہ حالات و کیفیات موجودہ کے مقتضیات کی تابع ہیں۔ اگر حالات و کیفیات بدل جائیں تو صورت و اشکال میں بھی تبدیلی پیدا ہو جائے۔ پس اس طور پر ہستی کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے جو نباتات و حیوانات سے ہوتا ہوا انسان تک پہنچتا ہے اور موجد کی مختلف جماعتیں ایک دوسرے میں بتدریج اس طرح ضم ہوتی ہوئی چلی جاتی ہیں کہ حدود الغمام محسوس نہیں ہوتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ استقرا یہ جس کی ایجاد کا فخر ارسطو کو حاصل ہے ایک بہت بڑا زبردست طریقہ ہے اور جو ترقی سائنس نے اس وقت تک کی ہے وہ اسی کی شرمندہ احسان ہے۔ یہ فلسفہ جب تکمیل کو پہنچا تو مظاہر سے ان کے اسباب و علل کا استقرا کیا جانے لگا اور اسباب کے دریافت ہونے کے بعد یہ اتباع طریقہ اشاریہ سبب سے سبب کی تفصیل مستنبط ہونے لگی۔

اس طور پر اسکندر نے میں عقلیات کی بنیاد جہاں ایجنز کے ایک نامور حکیم کے اصولوں پر رکھی گئی اظہار قیامت کا سرا بھی ایجنز ہی کے ایک دوسرے مشہور حکیم کے سر رہا۔ اس حکیم کا نام زینو تھا جس کی اصل اگرچہ قبرس یا فیشیا سے تھی لیکن کئی سال سے اس

نے مستقل طور سے یونان کے پایہ تخت ہی میں یودوباش اختیار کر لی تھی۔ اس کے شاگرد ”اسٹونک“ (جبریہ) کے نام سے مشہور تھے۔ اس کے عقاید اسکے مرنے کے بعد مدتوں قائم رہے اور مصیبت کے وقت میں جب انسان کا بجز نیکی کے اور کوئی یاروددگار نہیں ہوتا اس کے لیے سرمایہ تسکین و تسلی ثابت ہوئے اور نہ صرف مشاہیر یونان بلکہ رومنہ الکبریٰ کے جلیل القدر حکیموں، مدبروں، سپہ سالاروں اور فرمانرواؤں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتے رہے۔

زینو کا مقصد یہ تھا کہ روزانہ زندگی کے لیے ایک دستور العمل مقرر کیا جائے جس کی بدولت انسان برائی بھلائی میں تمیز کر سکے اور کوشش کی جائے کہ انسان نیک چلن ہو جائے۔ اس کا قول تھا کہ تعلیم نیکی کی اصلی بنیاد ہے اس لیے کہ اگر آدمی کو معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا شے ہے تو وہ خواہ مخواہ اس کی طرف مائل ہو گا۔ علم کا مواد ہم پہنچانے کے لیے ہمیں اپنے حواس پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ باقی رہا اس مواد کی تالیف و ترتیب کا کام سو اس کی نصیب دار عقل ہے۔ اس بارہ میں زینو اور ارسطو کا اتفاق رائے ہدایت پایا جاتا ہے۔ ہر خواہش یا شہوت یا آرزو ناقص علم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہماری جبلت یا طبیعت تو مقدرات سے ہے لیکن یہ ہمارا کام ہے کہ اپنے جذبات کو روکیں اور عقل کی پابندی کے ساتھ آزادانہ فہم فقہ اور پاکبازانہ زندگی بسر کرنا سیکھیں۔ ہماری زندگی ہماری دماغی قوتوں کی مطیع ہونی چاہئے اور زمانہ کے رنج و راحت سے نہ کبیدہ خاطر و بدل ہونا چاہئے نہ مسرور و خرم بلکہ قلب میں سکون و طمانیت کی کیفیت پیدا کرنی چاہئے۔ ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہم آزاد ہیں۔ اپنے اپنائے جنس کے غلام نہیں ہیں۔ ہمارے پاس ایک بیش قیمت خزانہ ہے جو تمام دنیا مل کر بھی اگر چاہے تو ہم سے نہیں چھین سکتی اور وہ خزانہ موت ہے۔ ہمیں یہ امر نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ فطرت اپنے عمل درآمد میں عام نتائج کو پیش نظر رکھتی ہے اور افراد کے بچانے کی کبھی فکر نہیں کرتی بلکہ انہیں اپنے مقاصد عامہ کی تکمیل کا آلہ قرار دیتی ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کریں اور نیکی اعتدال صبر تحمل انصاف اور علم کے اکتساب میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہئے کہ عالم متغیر ہے۔ فنا کے بعد بقا اور بقا کے بعد فنا لازمی ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں ہر شے مر رہی ہے اور مرے گی موت سے ڈرنا یا اس پر کڑھنا فضول ہے۔ جس طرح ہر سال آبشار کی ایک ہی صورت رہتی ہے لیکن جس پانی سے یہ مرکب ہے وہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اسی طرح قدرت کی نمود سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ

ماہ کی ایک سیل ہر وقت یہ رہی ہے جس کے وجود کو بقا ہے لیکن شکل آنی و فانی ہے۔ کائنات بحیثیت مجموعی ناقابلِ تغیر ہے۔ بجز فیضِ اجزائے لائجرمی اور قوت کے اور کسی شے کو بقا نہیں۔ فطرت کی صورتیں جو ہمارے پیش نظر ہیں چند روزہ ہیں اور ضرور ہے کہ گذر جائیں۔

ہمیں اس واقعہ کی طرف سے خالی الذہن نہ ہونا چاہئے کہ اکثر انسانوں کی تعلیم ناقص ہوتی ہے۔ اس لئے ہم کو اپنے زمانہ کے مذہبی عقاید کے خلاف بے ضرورت کوئی بات نہ کہنی چاہئے۔ خود ہمارے لئے یہ جان لینا کافی ہے کہ اگرچہ ایک ایسی قوت ضرور موجود ہے جو ہر ایک لحاظ سے کامل و مکمل ہے لیکن کسی ہستی کاملہ کا وجود مطلق نہیں۔ ایک غیر مرئی جوہر کے وجود میں تو کلام نہیں لیکن یہ کہنا کہ ایک ایسا شخص یا ذاتی خدا موجود ہے جس میں انسان کی صورت اور جذبات اور احساسات پائے جاتے ہیں اتنا باعثِ کفر نہ ہو گا جتنا موجبِ لغویت۔ الہام و تنزیل کی وقعت ایک ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں۔ جس شے کو انسان اتفاق یا حادثہ سے تعبیر کرتا ہے اسے ایک غیر معلومہ علت کا معلول سمجھنا چاہئے۔ اتفاقات و حوادث تک ایک مقررہ ضابطہ کے پابند ہیں جس سے وہ سرمو تجاوز نہیں کر سکتے۔ تائیدِ ایزدی یا شانِ ربانی جس قوت کا نام رکھا گیا ہے اس کا مطلق کیسے وجود نہیں۔ اس لئے کہ قدرت کا طرزِ عمل اٹل اور امٹ قوانین کا تابع ہے اور اس لحاظ سے کائنات گویا ایک بہت بڑی کل ہے جو خود بخود چل رہی ہے۔ نظام کائنات کی رگ و پے میں جو زندہ طاقت ساری دوائر ہے اسے جلا خدا کہتے ہیں۔ وہ انقلابات اور تغیرات جن کا اثر ہر شے پر پڑتا ہے کسی طرح ٹل نہیں سکتے اور اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی ترقی پابندی قضا و قدر ایک بیج کی طرح ہے جو صرف اسی طریقہ پر اگ سکتا ہے جو اس کے لئے پہلے سے معین کر دیا گیا ہے۔

انسان کی روح شعلہ حیات کائنات کی ایک چنگاری ہے۔ حرارت کی طرح اس کا نفوذ ایک جسم سے دوسرے جسم میں ہوتا رہتا ہے اور بالاخر اس کا انضمام یا انجذاب اس جوہر کلی میں ہو جاتا ہے جس سے اس کا انفصال ہوا تھا۔ اس لئے ہم کو عدم یا فتنائے محض کا اندیشہ نہ کرنا چاہئے بلکہ انجذاب یا اتصال کا یقین رکھنا چاہئے اور جس طرح تھکا ہوا توی اس غفلت کی تمنا کرتا ہے جو نیند سے ہم آغوش ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے اسی طرح فلاسفہ کو چاہئے کہ کمروہات دنیا سے تنگ آکر اس حالتِ مطمئنہ کو اپنا مطمح نظر قرار دیں جو اس خاکدان کی قید سے آزاد ہونے کے بعد میسر ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ باتیں ایسی ہیں جن پر

غور کرتے وقت ہمیں ہر ہر قدم پر شبہ و شک سے کام لینا چاہئے اس لئے کہ دماغ اپنے اندرونی ذرائع معلومات ہی سے حقیقت اشیاء سے مطلع نہیں ہو سکتا۔ عقل اولیٰ سے بحث کرنا خلاف شیوہ حکما ہے۔ ہمیں صرف مظاہر یعنی ان واقعات سے سروکار رکھنا چاہئے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ سب سے زیادہ ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ انسان کے لئے حقیقت مطلق کا اکتشاف محال ہے۔ مادہ کے متعلق انسانی تحقیقات کا انتہائی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کامل العلم ہونے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ یہاں تک کہ اگر اسے علم کامل حاصل ہو بھی جائے تو اس کے پاس کوئی معیار موجود نہیں جس کی بنا پر اسے اپنی معلومات کے صحیح و کامل ہونے کا یقین ہو سکے۔

ان تمام باتوں کو تسلیم کر لینے کے بعد ہمارے لئے باقی کیا رہا؟ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ تحصیل علم کی کوشش کریں۔ نیکی اور پاکبازی کو اپنا شعار قرار دیں۔ اپنے اپنے جنس سے دوستانہ برتاؤ رکھیں۔ ایمانداری اور راستبازی کو ہاتھ سے نہ دیں۔ جو کچھ پیش آئے اس کو صبر و رضا کے ساتھ گوارا کریں اور ایسی زندگی بسر کریں جو ہر اعتبار سے عقل کے احکام کی پابند ہو۔

اگرچہ عجائب خانہ اسکندریہ کے قیام کا مقصد خاص فلسفہ مشائیہ کی اشاعت و ترویج تھا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ دوسرے مذاہب فلسفہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ عجائب خانہ کی بدولت فلسفہ اشراقیہ نہ صرف حد کمال تک پہنچا بلکہ آخر میں ارسطو کی حکمت کا ناسخ ثابت ہوا اور جدید اکاڈمی کے ذریعہ سے عیسائیت پر ایک مستقل اور دیرپا اثر چھوڑا گیا۔ فلاطون کا فلسفیانہ طریقہ ارسطو کے طریقہ کی ضد تھا یعنی اس میں ابتدا کلیات سے کی جاتی تھی جس کا وجود ہی مذہبی اعتقادات کی طرح قیاسی ہے اور کلیات سے جزئیات یا تفصیلات کا استخراج کیا جاتا تھا۔ بخلاف اس کے ارسطو استقراء کے عمل کی وساطت سے جزئیات سے کلیات تک پہنچتا تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ افلاطون کے مذہب کی بنیاد تخیل پر تھی اور ارسطو کی عقل پر۔ فلاطون ایک ابتدائی خیال کو سامنے رکھ کر اس کے تجزیہ سے اس کی تفصیلات تک پہنچتا تھا اور ارسطو جزئیات و تفصیلات سے نتائج استخراج کر کے ایک کلیہ قائم کرتا تھا۔ اسی لیے افلاطون کے طریقے سے بہت جلد بظاہر نہایت شاندار مگر دراصل ناقابل اعتبار نتائج پیدا ہو جاتے تھے حالانکہ ارسطو کے طریقہ سے اگرچہ نتائج دیر میں نکلتے تھے اور ان کے استخراج میں بے انتہا دقت اٹھانی پڑتی تھی لیکن ہوتے بہت زیادہ محکم اور دیرپا تھے۔

ان نتائج کے استخراج کے لئے واقعات کے جمع کرنے میں جس کج کاوی اور دیدہ ریزی سے کام لیا پڑتا تھا اور تجربہ اور مشاہدہ میں جو جانکاری اور عرقریزی گوارا کرنی پڑتی تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ فلاطون کا فلسفہ گویا ایک شاندار قلعہ ہے جس کی بنیاد ہوا پر ہے اور ارسطو کی حکمت ایک مضبوط اور سنگین عمارت ہے جو بہت سی محنتیں برداشت کرنے اور بہت سی ناکامیوں کا رنج اٹھانے کے بعد ایک ٹھوس اور مستحکم چٹان پر بنائی گئی ہے۔

قوت منیہ سے کام لیتا بمقابلہ قوت عقیدہ کے عمل میں لانے کے کہیں زیادہ دلاویز ہے۔ جب اسکندریہ کے عقلی انحطاط کا دور آیا تو مشاہدہ کی دیدہ ریزیوں اور فکر و غور کی جانکاریوں کے بجائے طبیعتیں زیادہ تر سل اور آسان طریقوں کی طرف رجوع ہو گئیں۔ فلسفہ اشراقیہ جدید کے مدرسوں میں امونیس سیکاس اور پلاٹینس جیسے تخیلی پرست متفکمین کا جہوم نظر آنے لگا۔ خدا کی شان ہے کہ قدیم عجائب خانہ کے جفاکش مندسوں کے جانشین ایسے لوگ بنیں جنہوں نے فلسفہ کو بازپچہ اطفال سمجھ رکھا ہو۔

دارالعلم اسکندریہ اس طریقہ کی پہلی مثال پیش کرتا ہے جس نے زمانہ حال کے ماہرین علم طبیعیات کے ہاتھ میں آکر ایسے حیرت خیز نتائج پیدا کئے ہیں۔ اس طریقہ کے اختیار کرنے والوں نے وہی و خیالی باتوں سے ابا کیا اور اپنے مفروضات و نظریات کو ان واقعات و حقائق کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا جو مندرسانہ ثبوت کی تائید سے تجربہ اور مشاہدہ کی بدولت حاصل ہوئے تھے۔ انہوں نے اس اصول کو عام طور سے رواج دیا کہ صحیفہ فطرت سے حقائق کے اقتباس کرنے کا صحیح طریقہ عملی تجربہ ہے۔ ارسطیدس کی تحقیقات اشیاء کے وزن مخصوص کے متعلق اور بطلمیوس کی تصانیف مناظر و مریا کے موضوع پر ہمارے آج کل کے عملی فلسفہ کے اکتشافات سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں اور زمانہ مابعد کے مصنفین کی فرضی و قیاسی مسملات کی طرف انگشت حقارت سے اشارہ کر رہی ہیں۔ لہٰذا کہتا ہے کہ دارالعلم اسکندریہ کے قیام سے پہلے یونانیوں نے علم ہیئت کے متعلق اگر کوئی عملی کام کیا تو وہ یہ تھا کہ ۴۳۴ ق م میں میٹن اور یوگسٹین نے نقطہ انقلاب یعنی کا مشاہدہ کیا۔ دارالعلم اسکندریہ ہی میں پہلی مرتبہ ہم کو اس امر کی مثال ملتی ہے کہ جو مشاہدات کئے گئے ان میں داویوں کی پیمائش کے آلوں اور علم مثلث کے اصولی طریقہ حساب سے کام لیا گیا۔

نہ تو اس کتاب میں اتنی عجائبات ہیں اور نہ اس کا موضوع اجازت دیتا ہے کہ عجائب خانہ اسکندریہ نے معلومات الہامی میں جو جو اضافے کئے ان کا یہاں مفصل ذکر کیا جائے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا مٹا صرف اسی قدر ہے کہ اس کتب کے پڑھنے والے کو ان ترقیات کی عام نوعیت کا اندازہ ہو جائے۔ اگر تفصیل مطلوب ہو تو میری کتاب ”ہسٹری آف دی انٹلیکچوئل ڈیولپمنٹ آف یورپ“ (یورپ کے دماغی نشوونما کی تاریخ) کا چھٹا باب ملاحظہ فرمایا جائے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حکیم زکو کے فلسفہ میں حقیقت مطلق کے ادراک کے متعلق شک ظاہر کیا گیا ہے۔ ادھر زنون شکوک و شبہات میں گرفتار تھا ادھر اقلیدس اپنی اس معرکہ الارا تصنیف کی تیاری میں مصروف تھا جو تمام دنیا کے مقابلہ میں کوس تحدی بجا کر بنی نوع انسان کو یہ دعوت دینے والی تھی کہ اگر دعویٰ ہے تو مجھ میں کوئی نقص نکالو۔ بائیس صدیوں کے گزرنے کے بعد بھی یہ کتاب صحت، سلاست، صفائی، اکملت، اثبات اور استقرائے تام کا ایک عظیم المنظر نمونہ ہے۔ اس مندرجہ اعظم کی تصانیف نہ صرف ریاضی کی دوسری شاخوں مثلاً ”فصول مخروطی یا اشکال کثیر النتائج میں پائی جاتی ہیں بلکہ علم الاصوات اور علم مناظر و مرایا پر بھی بعض رسائل ایسے ہیں جو اس سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ مناظر و مرایا میں اس نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ شعاعیں آنکھ سے نکل کر اشیائے مرئیہ پر پڑتی ہیں۔

ارشمیدس نے اگرچہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں سسلی میں جا کر اقامت اختیار کر لی تھی لیکن اس کا شمار بھی اسکندریہ ہی کے ماہرین علم ہندسہ و طبیات کے زمرہ میں کرنا چاہئے۔ ریاضی میں اس نے دو کتابیں کہہ اور اسطوانہ کی مابینت پر لکھی ہیں۔ ان تصانیف میں اس نے ثابت کیا ہے کہ ہر ٹھوس کہہ کا جسم مقدار میں اس اسطوانہ کی مقدار کا دو ٹکٹ ہوتا ہے جو اس کا محیط ہو۔ اس انکشاف پر اسے اس قدر ناز تھا کہ مرتے وقت اس نے یہ وصیت کی کہ یہ شکل اس کی قبر کے تعویذ پر کندہ کی جائے۔ دائرہ اور شکل قریب ایلیسوی کی ترتیب پر بھی اس نے بحث کی ہے۔ اس کا ایک رسالہ اشکال میثل مخروط و میثل کہہ پر ہے۔ اس کے علاوہ اس چکر دار شکل کو بھی اس نے اپنی عقل دقیقہ سنج کی موشگافی کا موضوع قرار دیا ہے جو اس کے نام سے مشہور ہے اور جس کا خیال اس کے ذہن میں اول اول اس کے دوست کانن نے اسکندریہ میں پیدا کیا تھا۔ اس کے بعد اس پایہ کا مندرجہ یورپ دو ہزار ہمال تک پیدا نہ کر سکا۔ طبیات میں اس نے ہایات کی بنا ڈالی۔ وزن مخصوص کے دریافت کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ پانی پر تیرتی ہوئی اشیاء کے توازن یعنی مرکز ثقل پر بحث کی۔ بہرم کی مابینت کا پتہ لگایا اور دریائے نیل سے پانی کھینچنے کے لئے ایک چنچ

کی شکل کا آلہ ایجاد کیا جو ابھی تک اس کے نام سے مشہور ہے۔ غیر متناہی بیچ اور نیز وہ شیشہ آتشی جس سے ساری آکیوز کے محاصرہ میں اس نے اہل روما کے جہازوں کا بیڑہ جلا دیا اسی کی ایجادات میں داخل ہیں۔

ایراٹا ستھیز بھی جو ایک وقت میں کتب خانہ کا صدر مہتمم تھا بہت سی اعلیٰ درجہ کی تصانیف کا مصنف تھا۔ خطوط سرطان و جدی کا درمیانی فاصلہ اسی نے دریافت کیا اور زمین کی جسامت کے معلوم کرنے کی کوشش بھی اول اول اسی نے کی۔ براہ علموں کے جوڑ اور پھیلاؤ۔ پہاڑوں کے سلسلوں کے مقامات وقوع۔ بادلوں کے عمل۔ طبقات الارض کی غرقابی۔ ڈوبے ہوئے طبقات کے ابھار۔ آبنائے در وانیال و جبل الطارق کے افتتاح اور بحیرہ اسود کے تعلقات پر اس کے مباحث موجود ہیں۔ اس نے حالات ارضی پر ایک مکمل کتاب تین مقالوں میں لکھی تھی۔ پہلے مقالہ میں طبیعیات سے بحث تھی دوسرے میں ریاضیات سے تیسرے میں تاریخ سے۔ اس کتاب کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر ان ممالک کا ایک نقشہ بھی شامل تھا جو اس وقت تک معلوم ہو چکے تھے۔ اس کی ”تاریخ شاہان تھیبز“ کے بعض اجزا زمانہ کی دستبرد سے بچ رہے ہیں اور چند سال سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے ہیں ورنہ صدہا سال تک تو ہماری موجودہ دینی تاریخ کے مقابلہ میں جس کی حیثیت ایک مجموعہ لغویات سے زیادہ نہیں ان پر اعتنا ہی نہ ہوا۔

اس مقام پر ان دلائل کا بیان کرنا ضرور نہیں ہے جو سکندریہ کے علمائے زمین کو گول ثابت کرنے کے لئے اختیار کیں۔ ان لوگوں کو کرہ زمین۔ قطبین محور زمین۔ خط استوا۔ دائرہ قطب شمالی۔ دائرہ قطب جنوبی۔ نقطہ اعتدال لیل و نہار۔ نقطہ انقلاب سینٹی و شتوی۔ سردی اور گرمی کی تقسیم اور مسائل متعلقہ کا صحیح صحیح طور پر علم تھا۔ یہاں صرف اپالوتیس کی ان تصانیف کا نام ہی لیا جاسکتا ہے جو اس نے فصول مخروطی اور مقادیر اکثر و اقل پر قلمبند کی تھیں۔ الفاظ ”ایپس“ (شکل ۱) ہیلیجی یعنی وہ شکل جو کسی جسم مخروطی کو ترچھا تراشنے سے پیدا ہوتی ہے) اور ”ہائی پر بلا“ (شکل بعید ایسنوی) کا اول اول اسی نے استعمال کیا۔ ارسطیل اور تمارکس کی رصد بینی کا ذکر بھی بوجہ قلت مباحثات یہاں اچھا ہوا ہی کیا جاسکتا ہے۔ استقبال نقطہ اعتدال لیل و نہار کا عظیم الشان اکتشاف جو ہمارے کس نے کیا ہے تمارکس ہی کے ہیستی مشاہدات پر مبنی تھا۔ قمر کی عدم مساوات اولین اور مساوات مرکز کی تحقیقات بھی ہمارے کس نے کی ہے۔ حرکت دھاری کے اصول پر اجسام فلکی کی ظاہری گردش کی تفسیر کے لئے اس نے وہ مندرجہ طریقہ ایجاد کیا جس میں دو غیر مساوی

دائرہوں سے اس طرح کام لیا جاتا ہے کہ چھوٹے دائرہ کا مرکز ہمیشہ بڑے دائرہ کے محیط پر گردش کرتا رہے یا دو مختلف مرکز و دائرہ ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں۔ اس نے ستاروں کی ایک فہرست بھی ایک خاص طریقہ کے مطابق تیار کی تھی جس کی رو سے وہ ستارے جو بظاہر ایک خط مستقیم میں نظر آتے ہیں درج فہرست کئے گئے ہیں۔ جن ستاروں کا فہرست میں اس طور اندراج ہوا وہ شمار میں 1080 ہوتے تھے۔ آسمان کی طرح اس نے زمین کے متعلق بھی اسی طرح کی کج گادی کی تھی۔ یعنی عرض بلد اور طول بلد کے خط کھینچ کر دیا وہ امصار اور دوسرے مقامات کی نشاندہی کی تھی۔ شمس و قمر کی میزانیں بھی اول اول اسی نے تیار کی تھیں۔

مندسین۔ منجمین اور طبعیین کے اس جلیل القدر گروہ کی فہرست میں بطلمیوس کا نام ہمیں نور کے حروف میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی شہرہ آفاق کتاب ”سینکسیس“ (یعنی عالم ہلالا کی مندرسانہ ساخت) ڈیڑھ ہزار سال تک ہیئت کے متعلق دنیا کا ستور العمل بنی رہی اور نظام بطلمیوسی کا چراغ صرف اس وقت گل ہوا جب کہ نیوٹن نے اپنی غیر فانی تصنیف ”پرنسپل“ لکھ کر اس مند کو زمیت دی جو پندرہ صدیوں تک ”سینکسیس“ کے مصنف کے لئے وقف رہی تھی۔ بطلمیوس کی کتاب کی ابتدا اس اصول سے ہوتی ہے کہ زمین گول ہے اور فضائے محیط میں قائم ہے۔ اس میں میزان الاوتار کے بنانے کی ترکیب اور ان آلات کا حال مندرج ہے جن سے نقاط انقلاب یعنی دشتوی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ محققانہ بحث کے بعد اصول اعوجاج طریق الشمس کا استخراج کیا ہے۔ علم یا جیب کے ذریعہ سے ارضی عرض بلد نکالنے کا طریقہ بتایا ہے۔ موسموں کا حال بیان کیا ہے۔ معمولی وقت کو کبھی وقت میں تحویل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ کبھی سال پر انقلابی سال کو ترجیح دینے کی وجہ بیان کی ہیں۔ نظام شمسی کا ذکر کرتے ہوئے اس اصول کی توضیح کی ہے کہ وہ دو ارجن میں سیارے آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں مختلف مرکز ہیں۔ مساوات وقت کے اصول کی تشریح کی ہے۔ قمر کی حرکات پر بحث کرتے ہوئے اس کی عدم مساوات اولین اس کے گمن اور اس کے نقطہ راس و ذنب کا حال لکھا ہے۔ اس کے بعد خود بطلمیوس کے عظیم الشان اکتشاف یعنی قمر کی عدم مساوات ثانیہ پر بحث کرتے ہوئے جن نے بطلمیوس کے نام کو فنا کے رہین منت ہونے سے بچا لیا اسے اس مندرسانہ اصول کا تابع کیا گیا ہے۔ جس کے بموجب دو غیر مساوی دائروں میں سے چھوٹا دائرہ اپنے مرکز کو بڑے دائرہ کے محیط پر رکھ کر اس کے گرد گردش کرتا ہے۔ پھر زمین سے سورج اور چاند کا فاصلہ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے

لیکن اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ آگے چل کر ہمارے کس کی تحقیقات یعنی استقبال نظام اعتبار لیل و نہار کا بیان کیا ہے جس کا مکمل زمانہ پچیس ہزار سال ہے۔ بالآخر 1022 ستاروں کی فہرست مرتب کی گئی ہے اور ککشاں کی نوعیت پر نظر انقاد ڈالنے کے بعد سیاروں کی حرکت پر نہایت محققانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک اور امر جس نے بطلموس کی علمی شہرت کے استحقاق کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے یہ ہے کہ سیاروں کے مدار کی تعین میں وہ میسٹ واناں ازمہ ماضیہ کے ترصدات سے اپنے مشاہدات کا مقابلہ کرنے کے بعد اسے قائم کرتا ہے۔ چنانچہ زہرہ کے مدار کو معین کرتے وقت اس نے تمارکس کے مشاہدات کو پیش نظر رکھا ہے۔

عجائب خانہ اسکندریہ میں لیسٹس نے اٹھن ایجاد کیا تھا۔ اس کے شاگرد ہیرو نے دواسطوانوں کے اضافہ سے اسے ترقی دی۔ اول اول دخانی اٹھن سے بھی کام ہی کام لیا گیا کہ وہ بھی ہیرو کی ایجاد سے تھا اور ایک خاص ترکیب سے چلایا جاتا تھا جو یہ تھی کہ وہات کے ایک کھوکھلے گولے میں جس میں ایک چھوٹا سا منفذ ہوتا تھا پانی بھر دیا جاتا تھا اور نیچے آنچ پھنچائی جاتی تھی۔ حرارت پہنچنے پر پانی بھاپ کی شکل میں تبدیل ہو جاتا تھا اور بھاپ کے ذور سے گولا گردش کرنے لگتا تھا جس سے اٹھن چلنے لگتا تھا۔ سر-پلس کے ایوانوں کی فحوشی میں ٹیسس اور اپالونیس کی آبی گھڑیاں خلل ڈالتی تھیں جن میں سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ گرتے تھے اور وقت کا اندازہ کرتے جاتے تھے۔ جب رومہ الکبریٰ کی تقویم اس قدر ناقص ہو گئی کہ سال و ماہ کے حساب میں ہر وقت غلطیاں ہونے لگیں تو جولیس سیزر نے اس کی اصلاح کے لئے لیسٹسجینڈریت دان کو اسکندریہ سے طلب کیا۔ چنانچہ اس کے مشورہ کی بنا پر قمری سال منسوخ کیا گیا اور سرکاری سال شمسی قرار پایا اور اس وقت سے وہ تقویم رائج ہو گئی جو جولیس سیزر کے نام سے منسوب ہے۔

مصر کے مقدونی فرمانرواؤں کو اس برتاؤ کے لحاظ سے جو انہوں نے اپنے زمانہ کے مذہبی عقائد کے ساتھ کیا مورد الزام قرار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کا آلہ بنایا یعنی جلا اور عوام پر اس کے ذریعہ سے اپنا شاہانہ اقتدار قائم رکھا اور جو سمجھ بوجھ رکھتے تھے ان کی تشفی فلسفہ سے کر دی۔ لیکن بلاشبہ ان کے اس طرز عمل کا موید وہ تجربہ تھا جو یونانیوں کو اپنی ایشیائی فوج کشی کی وجہ سے حاصل ہوا تھا اور جس کی بدولت وہ اقوام عالم میں ممتاز و سرمد آوردہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے آبائی وطن کی مذہبی روایات کے بوسیدہ ظلم کو اپنی آنکھوں کو نہا ہوا دیکھ چکے تھے اور ان عجائبات کی عظمت کو

جن کا پردہ قدیم شاعروں کے تخیل نے بحر روم کے اطراف و جوانب پر ڈال رکھا تھا تجربہ اور معلومات کی تیز روشنی کے سامنے کافور ہوتے ہوئے مشاہدہ کر چکے تھے۔ اولہس کی پراسرار چوٹیوں سے دیوتا عاتب ہو چکے تھے اور دیوتا تو ایک طرف رہے خود اولہس کا وجود ایک وہی و فرضی فسانہ سے زیادہ ثابت نہ ہوا تھا۔ ہیڈیز کے خوفناک نکاروں کا نقش پردہ تصور سے محو ہو چکا تھا اس لئے کہ خود ہیڈیز ہی کا کہیں وجود نہ تھا۔ ایشیائے کوچک کے سبز جنگلوں، سایہ دار شمنوں اور پتے دریاؤں سے مقامی دیوتا اور دیبلان رخصت ہو چکی تھیں یہاں تک کہ ان کے پجاریوں کو شبہ ہونے لگا کہ یہ معبود کبھی ان مقامات میں رہتے بھی تھے یا نہیں۔ شامی لڑکیاں اگر اپنے عشقیہ گیتوں میں ابھی تک اڈانس کے حسرتاں انجام کی یاد کو تازہ رکھتی تھیں تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اڈانس کا حقیقت میں وہ حشر ہوا جو روایات میں مذکور تھا بلکہ محض بطور تفسن طبع۔ ایران نے رہ رہ کر اپنا قومی مذہب تبدیل کیا تھا۔ زردشت کے الہامی مذہب کو چھوڑ کر اس نے مشوی عقائد اختیار کئے تھے۔ پھر نئے سیاسی اثرات سے متاثر ہو کر مجوسیت کو اپنا قومی مسلک قرار دیا تھا۔ اس نے آگ کی پرستش کی تھی اور اپنی قریانگاہوں کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر مقدس عنصر سے روشن رکھا تھا۔ اس نے سورج کو اپنا معبود مانا تھا۔ اور جب سکندر آیا تو اس کا میلان عقیدہ ہمہ اوست کی طرف ہو چلا تھا۔

اس ملک کے لئے جس کی دھگیری وہاں کے مقامی دیوتا سیاسی مصیبت کے وقت نہ کر سکے ہوں تبدیل مذہب ایک لازمی شے ہے۔ مصر کے قدیم دیوتاؤں کو جن کے جلال و عظمت کی یادگار میں اونچے اونچے پتار اور بڑے بڑے مندر قائم کئے گئے تھے ممالک غیر کے حملہ آوروں کی کھوار کے سامنے پے پے اپنی گردن جھکانی پڑی۔ اہرام و ابوالہول کی سرزمین میں دیوتاؤں کی مورتوں نے کسی زندہ طاقت کے مظہر ہونے کا ثبوت دینا مدت سے چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں کو اب ان پر مطلقاً ایمان نہ رہا تھا۔ اب ایسے دیوتاؤں کی ضرورت تھی جنہوں نے حال ہی میں جنم لیا ہو اور پکی وجہ تھی کہ آئیں کی جگہ سہس نے لے لی۔ اسکندریہ کے گلی کوچوں میں ہزاروں یہودی ایسے تھے جو اس خدا کو بھول چکے تھے جس نے سرپس کے مندر کے سب سے زیادہ مخفی حجرے کو اپنی سکونت کے لئے مخفی کر رکھا تھا۔

روایت الہام یا زمانہ کسی کا اثر باقی نہ رہا تھا۔ یورپین علم الاصنام کے افسانے ایشیائی الہام کی روایتیں۔ مصری کاہنوں کے قدامت آلودہ عقائد سب کے سب مٹ چکے تھے یا

منٹے جاتے تھے۔ یہی وہ نشانیاں تھیں جنہیں دیکھ دیکھ کر فرمانروایان سلسلہ بطلموسیہ کی آنکھوں میں مذہبی عقاید کی بے ثباتی کی تصویر پھر گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ایک چیز ایسی بھی ہے جو مذہب کی مختلف شکلوں سے زیادہ دیرپا ہے۔ یہ شکلیں تو طبقات الارض کے ازمناہ قدیمہ کی اعضائی شکلوں کی طرح ایک دفعہ ناپید ہو کر ہمیشہ کے لئے پردہ خفا میں چلی جاتی ہیں اور دوبارہ منصفہ شہود میں نہیں آ سکتیں لیکن وہ چیز جس پر اس ظاہر بے حقیقت اس نمود بے بود عالم کا پردہ پڑا ہوا ہے کیا ہے؟ ازلی و ابدی حقیقت!!

یہ حقیقت ہم کو ان پاور ہوا روایتوں سے نہیں معلوم ہو سکتی جو ان لوگوں سے ہمیں ترکہ میں پہنچی ہیں جنہوں نے صبح تمدن کے طلوع کے وقت عالم ہستی کا جلوہ دیکھا تھا اور نہ ان بزرگوں کا خواب و خیال اس کا ماخذ ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو ملہم من اللہ تصور کرتے تھے بلکہ اس کا مبدا و منشا ہندسانہ تحقیقات اور فطرت کا نظری و علمی تجربہ ہے۔ جس سے بنی نوع انسان پر مستقل بے شمار اور بے بہا برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

وہ دن کبھی نہ آئے گا جب کہ تحریر اقلیدس کی ایک شکل سے بھی کسی کو انکار ہو گا۔ ایرانا تسمیہ کے اس دعوے کی تردید کی کبھی کسی کو مجال نہ ہو گی کہ زمین گول ہے۔ اسکندریہ اور سائر اکیوز میں جو عظیم الشان طبعی ایجادات و اکتشافات ہو چکے ہیں وہ لوح روزگار سے کبھی مٹ نہ سکیں گے۔ ہمارے کس۔ پالوئیں۔ بطلموس اور ارشمیدس کے نام ہر مذہب و ملت کے لوگوں میں اس وقت تک جب تک کہ انسان کے سر میں دماغ اور منہ میں زبان ہے تعظیم کے ساتھ لئے جائیں گے۔

اس طور پر عجائب خانہ اسکندریہ کے بطن سے علوم جدیدہ پیدا ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ اس عجائب خانہ کے قیام سے مدتوں پہلے چین اور مسوپوٹیمیا میں اجرام فلکی کے مشاہدات ہو چکے تھے اور ہندوستان میں فن ریاضی کو ایک حد تک ترقی دی جا چکی تھی لیکن ان ممالک میں سے کسی میں بھی علمی تحقیقات میں تسلسل اور ربط نہیں پایا گیا اور نہ عملی تجربوں ہی سے کام لیا گیا۔ یہ فخر موجودہ سائنس کی طرح اسکندروی سائنس ہی کو حاصل ہے کہ اس نے مشاہدہ محض کی حد سے بڑھ کر فطرت کے مطالعہ اور علمی تجربہ کی دازی میں قدم رکھا۔

یونان کے صوبہ تسلی میں ایک پہاڑ ہے جس کا ارتفاع ۹۷۴۹ فٹ اور حد الشج کی بندی ۹۰۰۰ فٹ ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی پر جو نہایت وسیع و فراخ ہے ہر وقت بادلوں کا ایک گھنا ٹوپ چھایا رہتا ہے۔ ہومر اور اس کے بعد کے زمانہ کے یونانی شعرا کا یہ عقیدہ تھا کہ اس چوٹی پر مادو تازیوں جس کا دوسرا نام جو پٹر تھا دوسرے چھوٹے بڑے دیوتاؤں اور دیویوں کے ساتھ رہتا ہے اور وہاں سے یہ سب جب چاہتے ہیں بادلوں میں لپٹے ہوئے آسمان کو چلے جاتے ہیں۔ مترجم

۳۔ کتاب ”ایڈ“ کے شہر آفاق مصنف ہومر یونانی کی دوسری منظوم تصنیف کا نام۔ ہومر کا زمانہ مسیح کی ولادت سے نو سو چالیس سال قبل بیان کیا جاتا ہے۔ گویا حضرت سلیمان کی ولادت سے کوئی دس بارہ سال بعد۔ ”اڈیسی“ کو لحاظ سے ”ایڈ“ کا جو یونان کی مہابارت ہے ضمیمہ سمجھا جائے۔ مترجم

۴۔ یہاں اولیس کے یعنی وحشی وجود سے انکار کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مصنف کا فشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اولیس جو دیوتاؤں کا مسکن سمجھا جاتا تھا تحقیقات کرنے پر ڈھکوسلا ثابت ہوا۔ مترجم

۵۔ ایک قدیم یونانی شاعر جس نے آٹھویں صدی قبل مسیح کا وسطی زمانہ پایا ہے۔ اس کی تصانیف جن کی زبان ہومر کی زبان سے ملتی جلتی ہے جرمنی میں شائع ہو چکی ہیں۔ مترجم

۶۔ یونانی ڈراما نویس کی اس صنف میں جس کا خاتمہ حسرت پر ہوتا ہے یورپیڈیز ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔ ۴۸۱ قبل مسیح میں بمقام سلامس پیدا ہوا۔ فلسفہ، بلاغت، طبیات میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اول اول اس کا پیشہ نقاشی تھا۔ اس کے بعد شاعری کی طرف متوجہ ہوا۔ سقراط سے اس نے تعلیم تو نہیں پائی مگر اس کے زمرہ احباب میں ضرور شریک تھا۔ فلسفیانہ عقائد رکھنے کی وجہ سے اہل ایٹنز اس کے دشمن جان ہو گئے اور اس زمانہ کے مشہور ہزال ارسٹوفنس نے اس کی ہجو کی۔ یہاں سے جان بچا کر وہ مقدونیہ کے دربار میں جا پناہ گزین ہوا لیکن دو شاعروں سے وہاں بھی اس کی جھڑپ ہو گئی اور انہوں نے اس پر کتے چھوڑے جنہوں نے اسے چڑ پہاڑ ڈالا۔ اس کا انتقال ۴۰۶ ق م میں ہوا۔ اشارہ کتابیں اس کی تصنیف سے ہیں اور ان کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ مترجم

۷۔ ڈراما نویس کے اسی شعبہ کا جس کا اوپر ذکر ہوا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ۵۲۵ ق م میں یونان کے شہر ایوس میں پیدا ہوا اور ۴۵۶ ق م میں بمقام گیلہ واقع جزیرہ نمائے سسلی وفات پائی۔ اول میر-تھان کی جنگ اور اس کے دس سال بعد ۴۸۰ ق م میں سلامس کی مشہور بحری لڑائی میں

شریک ہوا۔ سترٹانک اس کی تصنیف سے ہیں جن میں سے صرف سات ہم تک پہنچے ہیں۔ اس کا طرز ادا نہایت دلکش ہے اور عبارت نہایت سلیس سمجھی جاتی ہے۔ ڈراما میں مکالمہ کا طریق اسی کا رواج دیا ہوا ہے۔ مترجم

کہ اس مقام کا ٹھیک موقع تو معلوم نہیں لیکن زونون نے جو حالات اس جنگ کے جو یہاں ۴۰۱ ق م میں ہوئی بیان کئے ہیں ان سے نتیجہ نکالا گیا ہے کہ بابل سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر جانب شمال و مغرب دریائے فرات کے بائیں کنارے پر واقع تھا۔ یہ جنگ مشرق و خرو ایران اور اس کے بھائی اردشیر میں ہوئی تھی۔ سائرس مارا گیا اور اردشیر فتح یاب ہو کر تخت نشین ہوا۔ مترجم

جمع الجزائر یونان کے ایک جزیرہ کا نام ہے جو ایتھنز کے قریب واقع ہے۔ اس کا رقبہ کوئی دس مربع میل ہو گا۔ جس جنگ کی طرف متن میں اشارہ ہے وہ ایک بحری لڑائی تھی جو ۴۸۰ ق م میں ایرانیوں اور یونانیوں میں ہوئی اور ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ مترجم

یہ یونان قدیم کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو شہر قمیض سے ساڑھے چھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ ۴۷۵ ق م میں یہاں ایرانیوں اور یونانیوں میں ایک سخت جنگ ہوئی جس میں میدان یونانیوں کے ہاتھ رہا۔ مترجم

نلہ ابتدا میں ایک یونانی مقدار وزن کا نام تھا جو مختلف ریاستوں میں مختلف تھی۔ یعنی کس ۱۲۲ ۲۸ سیر تھی اور کس ۱۲۲ ۴ سیر۔ بعد میں اس لفظ کا اطلاق نفروئی سکہ رائج الوقت کی مساوی مقدار پر ہونے لگا۔ اگر ٹیلنٹ کی مقدار ۱۲۲ ۴ سیر بھی فرض کی جائے تاہم سکندر کے خزانہ میں اس مہم پر روانہ ہونے کے وقت آج کل کے ارز نقرہ کے حساب سے ایک لاکھ نوے ہزار روپیہ سے زیادہ رقم موجود نہ تھی۔ مترجم

نلہ قدیم دولت فیشیا کا ایک بہت بڑا شہر جو اپنی جنگی قوت اور تجارتی عظمت کی وجہ سے مشہور تھا۔ اور بیروت سے ۴۷ میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب کی سمت میں واقع تھا۔ اس کا کچھ حصہ ایک جزیرہ پر جو ساحل سے کوئی پون میل ہو گا اور کچھ حصہ ساحل پر آباد تھا۔ دسویں صدی قبل مسیح میں حضرت سلیمان کے دوست شاہ ہیرام نے اسے اپنا پایہ تخت قرار دیا اور موقع کی موزونی کے لحاظ سے اس کی دولت و قوت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ باوجودیکہ متعدد حملہ آوروں نے اس پر چڑھائی کی اور یہ شہر کئی مرتبہ لٹا اور برباد ہوا لیکن یہ تباہی ہر دفعہ عارضی ثابت ہوئی وہ بجز بجز کر بنا اور اجڑا کر برباد ہوا اور ہر دفعہ پہلے سے بھی زیادہ رونق کے ساتھ آباد ہوا۔ اس کی یہ رونق و عظمت حروب ملیہ کے زمانہ تک قائم رہی۔ ۱۱۹۱ء میں شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ سرسویز کے افتتاح سے اس کی تجارتی اہمیت بالکل کم ہو گئی۔ آج کل اس کا نام صور ہے اور اس کی آبادی ۵۰۰۰ ہے۔ مترجم

نلہ ارض کنعان کا سب سے قدیم شہر۔ اس کی اہمیت اور عظمت کا راز اس کے جغرافیائی موقع

میں پوشیدہ تھا۔ یعنی یہ اس شام اہ پر واقع تھا۔ مصر کو شام سے ملائی تھی۔ یہ شہر ۳۳ء میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ جنہوں نے اس کا نام غزہ رکھا۔ آج بھی اس کا یہی نام ہے اور اس وقت اس کی آبادی پندرہ بیس ہزار ہے۔ مترجم

آلہ میں اس موقع پر اس امر کا اظہار واجب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یادگار رہے گا۔ جہاں تک میرا علم ہے اردو زبان میں یہ پہلی علمی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہ قائم رکھا گیا ہے اس کتاب کے ترجمے میں دو بڑی مشکلیں تھیں ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث۔ دوسری زبان کی خوبی و فصاحت۔ اردو سی بے بضاعت زبان میں ان دونوں کا قائم رکھنا بہت دشوار کام تھا۔ مگر مولوی ظفر علی خاں صاحب نے جو درحقیقت قابل مبارکباد ہیں اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے۔ لیکن یہ اسی سے ہو سکتا ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور جسے زبان پر اس قدر قدرت ہو بھیگی فاضل مترجم کو حاصل ہے۔

آلہ ارسطو کا سنجھا اور شاگرد اور سکندر کا ہم سبق تھا۔ ۳۶۰ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۲۸ ق م میں اپنی صاف گوئی کے باعث سکندر کے حکم سے قتل کیا گیا۔ مترجم

۱۱۱۱ سال انقلابی سے مراد وہ زمانہ ہے جو زمین کو منصفۃ البروج کے کسی ایک نقطہ مثلاً "نقطہ اعتدال صیفی یا نقطہ اعتدال شتوی سے روانہ ہو کر پھر اسی نقطہ تک پہنچنے میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس کی مدت ۳۶۵۲۳۲۲۶ یوم شمسی ہے۔ مترجم

۱۱۱۱ سال کوہی سے مراد ان دو حالتوں کا درمیانی فصل ہے جب کہ زمین آفتاب اور کوئی ایک ستارہ ایک ہی سمت میں پائے جائیں۔ اس فصل کی مدت ۳۶۵۲۵۱۳۸ یوم شمسی ہوتی ہے۔ مترجم

کلہ زمین چونکہ کمال کرہ نہیں ہے لہذا جس محور پر یہ اپنے گرد گھومتی ہے وہ اس کے مدار کی جانب جھکا ہوا ہے اور اسی لئے وہ بڑے دائرے جو مدار ارض اور خط استوا کی بطوح کے تقاطع سے الافلاک میں پیدا ہوتے ہیں ایک دوسرے کو دو نقطوں پر قطع کرتے ہیں جن کا نام نقاط اعتدال لیل و نہار ہے۔ ان فلکی دائرے میں سے ایک کا نام منصفۃ البروج ہے اور دوسرے کا دائرہ استوا ہے۔ دونوں نقطے منصفۃ البروج کے گرد آہستہ آہستہ گھومتے ہیں لیکن یہ گردش لمحاظ نوعیت موجب نہیں ہوتی بلکہ سائبہ ہوتی ہے اور اسی کا نام نقاط اعتدال لیل و نہار کا استقبال یا استقبال اعتدالین ہے۔ اس کی وجہ سے دائرہ استوا کے قطب کو منصفۃ البروج کے قطب کے گرد گردش کرنی پڑتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین کا محور ایک شکل بعید الیسنوی بناتا ہے جس کا محور منصفۃ البروج کے قطب میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس گردش کا زمانہ ۲۵۸۰۰ سال ہے۔ گویا استقبال اعتدالین کا سالانہ اوسط ۵۰۶۲ ثانیہ ہے۔ مترجم

۸۔ قرآن کا ثابت یا سیار اور آفتاب کے درمیان یا سیار کا ثابت اور آفتاب کے درمیان حائل ہو جانا۔ مترجم

۹۔ اسکندریہ کا ایک یونانی مندر۔ پانی کھینچنے کا عمل۔ آبی گھڑی اور سانپن یعنی خم دار نلی اس کی بجائے ہیں اور اسی لئے وہ زیادہ مشہور ہے۔ مترجم

۱۰۔ حکیم زینو نے خدا کا انکار کیا لیکن ایک غیر مرئی جوہر۔ ایک زندہ طاقت کا اقرار کیا۔ تائید ایزدی کو سراہا لیکن قانون قدرت کو سراہا۔ کارفرمائے قضا و قدر سے سرتابی کی لیکن تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ حاکم کو نہ مانا لیکن حکم کو جائز اور قابل اطاعت سمجھا۔

”ظنی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں“ اس پر بھی جناب باری کی ہستی سے انکار نہ ہو سکا۔ اپنی اپنی سمجھ ہے۔ کوئی اسے کسی طرح مانے کوئی کسی طرح لیکن اس پھندے سے بچ نکلتا محال ہے۔

”ہندو نے ضم میں جلوہ پایا تیرا آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا“ ”دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا“ مترجم

اسی لفظ اکاؤی جس کے معنی بیت الحکمت کے ہیں ایک یونانی لفظ اکاؤیمیا سے مشتق ہے۔ اکاؤیمیا نواح ایتھنز میں ایک مقام کا نام تھا جہاں اول سقراط اور اس کے بعد فلاطون اپنے شاگردوں کو اکثر درس دیا کرتے تھے۔ فلاطون نے پچاس سال تک اس مقام پر حکمت آموزی کی اور یہی وجہ تھی کہ اکاؤی کے معنی فلسفہ اشراقیہ کی درسگاہ کے ہو گئے۔ فلاطون کی وفات کے بعد جو ۳۲۸ ق م میں واقع ہوئی اس کے فلسفہ میں ترمیمات ہونی شروع ہو گئے جس کی وجہ سے مذہب اشراقیہ کی تین شاخیں ہو گئیں۔ تینوں شاخیں علی الترتیب قدیم اکاؤی و وسط اکاؤی اور جدید اکاؤی کے نام سے موسوم ہیں۔ قدیم اکاؤی سے مراد خالص اشراقی عقائد کا مسلک ہے۔

وسط اکاؤی کی بنا حکیم آریستو نے ڈالی جس کا سن ولادت ۳۱۶ ق م ہے۔ اس کے بعد ۱۵۵ ق م میں حکیم کارنیڈز نے جو دیو جانس کلبی کا شاگرد تھا جدید اکاؤی قائم کی۔ کارنیڈز کا خیال تھا کہ ماہیت اشیا اور اک انسانی سے بالا ہے۔ اس سے اس کی یہ مراد تھی کہ یہ بات ثابت نہیں کی جا سکتی کہ ادراک شے کو مادہ کے جوہر یا عرض کے لحاظ سے شے مدرک کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے جو کچھ ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ فقط اسی قدر ہے کہ ادراک اور شے مدرک میں ایک قسم کا باہمی تعلق ہے جس کا اثر انسان کے نظام عصبی پر مترتب ہوتا ہے۔ اس سے کارنیڈز نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسانی معلومات غیر یقینی ہیں۔ مترجم

۱۱۔ ذہنیات اور موجودات خارجی میں باوجود شائی اور اشراقی توجہات کے جو عقلی تناقض مدتوں سے چلا آتا تھا اس کے رفع کرنے کے لئے حکما کے ایک گروہ نے جنہیں مسیحی علم کلام کا بانی کہا

جا سکتا ہے تیسری صدی عیسوی میں فلسفہ کا ایک نیا مذہب فلسفہ اشراقیہ جدید کے نام سے اسکندریہ میں قائم کیا۔ اس مذہب کا مقصد یہ تھا کہ عقل اور ایمان میں توافق پیدا کیا جائے۔ ہستی علی الاطلاق یعنی خدا کی ذات کا تعقل چونکہ افلاطون کے کلیات عقلی کی وساطت سے ہوتا محال تھا لہذا فلسفہ اشراقیہ جدید کے بانیوں نے مکاشفہ کے مسئلہ کو رواج دیا۔ اس مسئلہ کا مفہوم یہ ہے کہ ادراک کے اجزائے عائدہ ومنعقدہ یعنی نفس ناقصہ و شے مدركہ باہم مخلوط و منضم ہو کر ایک ہو جائیں اور ان میں کوئی فرق نہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی تاویل یوں کی جاسکتی ہے کہ انسان کی تمنا ہے کہ اس کو علم مطلق حاصل ہو لیکن اس حصول کے لئے خارجی اشیا کا ادراک یا طریقہ استعمال بیکار ہے۔ علم مطلق اس کو اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ انجلاء نفس اور تزکیہ باطن سے محسوسات اور موجودات خارجی کو وہ اپنا پر تو بتا لے اور بیرونی اثرات سے یہاں تک مستغنی ہو جائے کہ عالم اور معلوم ایک ہو جائیں اور اس طور پر سب چیزوں کا ادراک مکاشفہ یا بصیرت سے ہونے لگے۔ کثرت کے تصور سے جو عقلی مشکلات فلاسفہ کو اکثر پیش آئی ہیں ان سے بچنے کے لئے فلسفہ اشراقیہ جدید کے پیروں نے مسئلہ انفصال کو اصول ہمہ اوست کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ اس مسئلہ سے مراد یہ ہے کہ کائنات مری کے جملہ شواہد خالق علی الاطلاق سے ماخوذ اور اس کے مظاہر ہیں۔ مترجم

سلسلہ ایک یونانی فیلسوف جس کا زمانہ ۱۷۵ء سے ۲۵۰ء تک ہے۔ فلسفہ اشراقیہ جدید کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ سیکاس کے معنی یونانی زبان میں محال کے ہیں اور یہی اس کے نام کے رکن ثانی کی وجہ تسمیہ ہے۔ اسکندریہ میں وہ حمالی کا پیشہ کرتا تھا۔ فروریوس کہتا ہے کہ اس کے ماں باپ عیسائی تھے اور وہ خود بھی ابتدا میں عقائد عیسوی کا پابند تھا مگر بعد میں مرتد ہو گیا۔ بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ وہ مرتے دم تک عیسائی رہا لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ فلسفیانہ تخیل نے مذہب عیسوی کے اصولوں کی طرف سے اس کے دل میں شبہات و شکوک پیدا کر دیے اور اس نے فلسفہ اشراقیہ میں تصوف کا پیوند لگانا چاہا۔ اس نے اپنے خیالات قلبند نہیں کئے بلکہ جو کچھ اپنے شاگردوں کو سکھایا زبانی طور پر سکھایا اور یہ تعلیم مدتوں سینہ سینہ چلی آئی۔ خدا کو وہ تثلیث کی شکل میں مانتا ہے لیکن اس تثلیث کے ارکان بجائے باپ بیٹے اور روح القدس کے جوہر مطلق عقل فعال اور قوت تامہ ہیں۔ مترجم

سلسلہ ۲۰۳ء میں مصر میں پیدا ہوا اور ایونیس سیکاس سے دس سال تک فلسفہ کی تحصیل کی۔ اس کے بعد ایرانیوں اور ہندوؤں کے فلسفہ سے واقفیت پیدا کرنے کی غرض سے مشرقی ممالک کی طرف روانہ ہوا۔ چند سال کے بعد وہ روما آیا اور وہاں پچیس سال تک درس دیتا رہا۔ فروریوس اور لائیچنس اس کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ رہبانیت اس کی زندگی کا جزو اعظم تھی۔ ایک دفعہ اس کے دوستوں نے اصرار کیا کہ تصویر کھینچو۔ اس نے جواب دیا کہ انسان ایک سایہ ہے

اور سایہ کی نقل اتارنا حماقت ہے۔ پلائینس گوشت نہیں کھاتا تھا اور نماتا بھی نہ تھا۔ ۲۷۰ء میں جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو طبیب کے معالجہ سے بھی انکار کیا۔ اس کی تصانیف سے جو تعداد میں چون ہیں ایک ہستی کاملہ کے خیال کا پتہ چلتا ہے جو ہر خواہشمند پر اپنی خیر و برکت کا پرتو ڈالنے کے لئے ہر وقت آمادہ ہے۔ پلائینس کا خیال تھا کہ فلاسفہ میں ربانی عنصر موجود ہوتا ہے اور یہ لوگ عوام کا لافنام کی طرح اس بات کے محتاج نہیں ہوتے کہ علایق مادی سے اپنے آپ کو منقطع کریں۔ خود ان کی طبیعتوں میں عالم بالا کے حقائق کے اکتساب کا رجحان موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح عشاق میں اس حسن کے ادراک کی استعداد موجود ہوتی ہے جو جسم سے معرا ہے اور موسیقی کا مذاق رکھنے والے ایک کمر درجہ میں حسن مجرود کا تعقل کر سکتے ہیں پلائینس کی تصانیف کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انگریزی میں اس کے بعض مقالات کا ترجمہ مسٹر ٹیلر نے کیا ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۳۴ء) لوئس نے بھی اپنی تاریخ فلسفہ (مطبوعہ لندن ۱۸۶۷ء) میں پلائینس کا حوالہ دیا ہے۔ مترجم

۵۷۰ لیبلیس ایک مشہور فرانسیسی مهندس اور ہیئت دان ہے جو ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا۔ سائنس میں اس کی اجتہادی عظمت کا یہ پایہ ہے کہ اسے نیوٹن کا سیم و عدیل سمجھا جاتا ہے۔ نظام شمسی کی حرکات کے اصول کے متعلق اس نے ۱۷۹۹ء میں ایک مشہور و معروف کتاب لکھی جس میں قمر۔ سیارگان اعظم کے اقمار۔ مشتری اور زحل کی ہر دو عدم مساوات اور حقیقت مدوجزر پر نہایت جدت و تحقیق سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ چار جلدوں میں بورڈج نے کیا اور بمقام بوٹن ۱۸۴۹ء میں چھپوایا۔ مترجم

۷۱۰ خط استوا کے شمال اور جنوب میں دو فرضی دوائر واقع ہیں جنہیں سرطان اور جدی کہتے ہیں۔ آفتاب موسم شتا و صیف یعنی جاڑے اور گرمی میں خط استوا کے جن بعید ترین نقطوں پر ہو کر گذرتا ہے انہیں نقاط انقلاب مینفی و شتوی کہتے ہیں۔ مترجم

۷۱۰ یونانی علم الانام کی روایات میں ایک نوجوان کا نام ہے جس پر بوجہ اس کے غایت درجہ حسین و جمیل ہونے کے ونس یعنی عشق و محبت کی دیوی عاشق ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اڈانس پر ایک جنگلی سور نے حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا۔ ونس نے اپنے معشوق کے زخم پر اگرچہ شراب آسانی کے قطرے نپکائے جس سے زگس کے پھول پیدا ہو گئے لیکن وہ اس زخم جانستان سے جان بر نہ ہو سکا۔ مترجم

دوسرا باب

عیسائیت کی ابتدا

شای اقدارات حاصل کرنے کے بعد اس کی قلب مابیت۔ اس کا تعلق سائنس کے ساتھ۔

روما کی جمہوری حکومت کی مذہبی حالت۔ جمہوریت کے مبدل بہ حکومت معضی ہونے سے لوگوں کا میلان توحد کی طرف ہو جاتا ہے۔ سلطنت روما میں مذہب عیسوی کی اشاعت۔ عیسائیت کو حکومت جس طریقہ سے ہاتھ آئی ہے اس کے سیاسی مقتضیات عیسائیت اور بت پرستی کے باہمی اتحاد کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ عیسائیت کے عقاید اور رسوم کے متعلق ٹرٹلین کا بیان۔ فلسطین کی حکمت عملی کا مخرب اثر۔ عیسائیت کا اتحاد حکمران جماعت کے ساتھ۔ عیسائیت اور سائنس کا تناقض باہمی۔ کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی اور تحصیل فلسفہ کی ممانعت۔ اگسٹائن کے فلسفہ اور پادریوں کے علوم کی حقیقت۔ کتب مقدس کو سائنس کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔

سیاسی معنوں میں عیسائیت وہ ترکہ ہے جو سلطنت رومہ الکبریٰ نے دنیا کے لئے چھوڑا۔

جب روما نے جمہوری طرز حکومت چھوڑ کر معضی حکومت کا طریقہ اختیار کیا تو وہ تمام آزاد و خود مختار قومیں جو بحر روم کے چاروں طرف آباد تھیں روما کی مطیع و منقاد ہو چکی تھیں۔ ان کا یکے بعد دیگرے مسخر ہونا بجائے اس کے کہ ان کو تباہ کرتا ان کے حق میں موجب سلامتی ثابت ہوا اس لئے کہ وہ ہمیشہ کی لڑائیاں جو ان کو ایک دوسرے سے دست و گریباں رکھتی تھیں موقوف ہو گئیں اور وہ مصیبتیں جو ان آئے دن کی خونریز معرکہ

آرائیوں سے پیدا ہوتی تھیں عالمگیر امن سے مبدل ہو گئیں۔

نہ صرف اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر بلکہ فاتحانہ رعونت کے جذبہ کے اقتضا سے دولت روم نے مفتوح اقوام کے دیوتاؤں کو اپنے پایہ تخت میں لا بسایا اور اس رواداری اور مسالمت کے ساتھ جس سے بوئے استغنا آتی تھی اس نے ان سب کی پرستش کو جائز قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اصلی وطن میں جو غیر محدود اقتدار ہر دیوتا کو اپنے پجاریوں پر حاصل تھا وہ ان دیوتاؤں اور دیویوں میں شامل ہونے کی وجہ سے جن کا ایک جم غفیر اس کی طرح دوسرے ممالک سے لایا گیا تھا عنقا ہو گیا۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے جغرافیائی اکتشافات اور فلسفیانہ تنقید کی بدولت لوگوں کے قدیم مذہبی عقائد میں پہلے ہی بہت کچھ تزلزل واقع ہو چکا تھا۔ رومنہ الکبریٰ کے اس طرز عمل کی بدولت جو رہا سہا اعتقاد تھا اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

تمام ممالک مفتوحہ کے فرمانروا تخت سے اتارے جا چکے تھے اور ان کی جگہ ایک شہشاہ مند آراے حکومت تھا۔ اسی طرح دیوتا بھی سب کے سب معدوم ہو چکے تھے۔ سیاسی اور مذہبی خیالات میں جو تعلق ہمیشہ قائم رہا ہے اس کے لحاظ سے یہ بات ہرگز قابل تعجب نہ تھی کہ متعدد معبودوں کی پرستش کے بجائے ایک معبود سے لو لگانے کا خیال دلوں میں گھر کر جائے۔ روم میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اول اول شہنشاہ کے مرنے پر اسے ربانی اعزاز دئے گئے اور رفتہ رفتہ زندہ شہنشاہ خود جتنے لگا۔

جس آسانی سے دیوتا پیدا کر لئے جاتے تھے دلوں میں اس کا ایک زبردست اخلاقی اثر پیدا ہوئے بغیر نہ رہا۔ جب کوئی نیا دیوتا لوگوں کی عقیدت کے سانچہ میں ڈھل کر نکلتا تھا تو پرانے دیوتا کی لامحالہ تضحیک ہوتی تھی۔ مشرق میں اوتاروں نے اور مغرب میں انسانوں نے دیوتاؤں کا روپ دہار کر اولہس کی ربانی آبادی کو بہت جلد جلد بوجھنا شروع کر دیا تھا۔ ایشیا کا اگر یہ قاعدہ تھا کہ دیوتا آسمان سے اتر کر انسانی قالب میں بروجی رنگ کے اندر ظاہر ہوتے تھے تو یورپ میں انسان زمین سے صعود کر کے آسمان پر چلا جاتا تھا اور دیوتاؤں کے زمرہ میں شریک ہو جاتا تھا۔ روم کے دامن اعتقاد کو ٹھک کی جس گرد نے آلودہ کیا وہ یونان سے نہ اٹھی تھی بلکہ کثرت مذاہب کی وجہ سے روم میں خود یہ اعتقادی کی خاک اڑنے لگی تھی۔

تعدد سے توحید کی طرف رجوع کرنے میں روم کی آبادی کے تمام طبقوں نے یکساں سرعت کے ساتھ کام نہیں لیا۔ تجارت قانون دان اور سپاہی جو اپنے مشاغل کی نوعیت کے

لحاظ سے سرد و گرم زمانہ کا زیادہ تجربہ رکھتے ہیں اور دماغی قابلیت سے بھی نسبت زیادہ بہرہ اندوز ہوتے ہیں سب سے پہلے متاثر ہوئے۔ ان کے بعد کاشتکاروں اور مزدوری پیشہ لوگوں کی باری آئی۔

جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما مستحکم ترقی پر فائز ہو گئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجہ اخیر کو پہنچ چکی تھی۔ اہل روما کی عیش پرستی و عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ ان کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہئے کہ زندگی کو ایک سلسلہ العیش بنا دے۔ پاکبازی حفظ نفس کے عنوان نعمت پر بمنزلہ تمدن ہے اور اعتدال سلسلہ حفظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے۔ ان کے دسترخوان سونے چاندی کے پائینوں سے جن پر جواہرات کی بچے کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے ملازم زرق برق کی پوشاکیں پہنے ان کی خدمت کے لئے کمر بستہ کھڑے رہتے تھے۔ ماہرویوان روما جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر کی قید سے آزاد تھیں ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف دوہلا کرنے کے لئے محو ناز رہتی تھیں۔ عالیشان ہاموں و کشتا تماشا گاہوں اور جوش آفرین دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت تک مصروف زور آزمائی کرتے تھے جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سونہ جائے اہل روما کے سامان قییش پر مزید اضافہ ہوتا تھا۔ دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت اور پرستش کے لائق اگر کوئی شے ہے تو وہ قوت ہے۔ اس لئے کہ اسی قوت کی بدولت تمام اس سرمایہ کا حاصل کرنا ممکن ہے جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرقریزیوں سے پیدا ہوا ہے۔ مال و املاک کی ضبطی۔ صوبجات کے محاصل کی تشخیص زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے اور فرمانروائے دولت روما اس زور و قوت کا نشان یا علامت ہے۔ غرض روما کے نظام تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی لیکن یہ جھلک اس نمائش طبع کی چمک کے مشابہ تھی جو یونان عہد قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا۔

اس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں دولت روما کے ایک مشرقی صوبہ یعنی شام میں طبقہ ادنیٰ کے چند بے بضاعت لوگوں نے ایک مذہبی برادری قائم کر رکھی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اپنائے جنس کے ساتھ نیکی کا سلوک کیا جائے۔ ان لوگوں کے اصول ہمہ گیر اخوت کے اس جذبہ سے توافق کلی رکھتے تھے جس کا پیوند ممالک مفتوحہ کے الحاق و انضمام نے اخلاق کی شاخ میں لگایا تھا۔ یہ اصول حضرت عیسیٰ ابن مریم کی تلقینات سے تھے۔

اس زمانہ میں بنی اسرائیل کا بعض روایات کی بنا پر یہ عقیدہ تھا کہ ان کی قوم میں سے ایک نجات دہندہ پیدا ہو گا جو ان کے گزرے ہوئے جاہ و جلال اور کھوئی ہوئی عظمت و توقیر کے احیا و رجعت کا باعث ہو گا۔ حضرت عیسیٰؑ کے شاگرد تو انہیں وہ مسیح موعود سمجھ کر ان پر ایمان لے آئے جس کے ظہور کی بشارت بزمانہ سابق دی جا چکی تھی لیکن یہودی کاہنوں نے یہ دیکھ کر کہ جناب مسیحؑ کی تعلیم ان کی اغراض کے منافی ہے ان کی شکایت رومی گورنر سے کر دی جس نے کاہنوں کی رضامندی مقدم سمجھ کر انہیں بہ تامل بسیار موت کے حوالہ کیا۔

جناب مسیحؑ کی فیاضانہ تعلیم جس میں انسانی اخوت کا نکتہ مضمّن تھا اس واقعہ کے بعد بھی زندہ رہی۔ حواریان مسیحؑ نے منتشر ہونے کے بجائے اپنا ایک جتھا قائم کر لیا۔ اصول مساوات جائداد کی بنا پر اس برادری کا ہر رکن جائداد مشترکہ میں اپنا اپنا سرمایہ اور آدمی شریک کر دیتا تھا۔ اس طور پر جماعت مسیحی کی بیواؤں اور یتیموں کی پرورش اور مفلوہوں اور مریضوں کی نگہداشت ہونے لگی۔ اس سچ سیر زد کس پرسر جماعت نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک نئی اور جیسا کہ واقعات نے آگے چل کر ثابت کر دیا ایک زبردست جماعت کی شکل اختیار کر لی جس کا نام کلیسا تھا۔ کلیسا کو نئی تحریک تو اس لئے کہنا چاہئے کہ اس قسم کی کوئی جماعت اس سے پہلے وجود میں نہ آئی تھی اور زبردست اس لئے کہ مقامی کلیساؤں نے جو اول اول منتشر و منفرد تھے اپنی مشترکہ اغراض کے تحفظ کے خیال سے اجتماعی تدابیر اختیار کرنی شروع کیں اور ان سب کے باہمی اجتماع سے ایک کلیسا پیدا ہو گیا۔ اسی اجتماع کی بدولت عیسائیت کو تمام سیاسی فتوحات میسر ہوئیں۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں روما کے جنگی تسلط کی وجہ سے عالمگیر امن قائم ہو چکا تھا اور اقوام مفتوحہ میں برادرانہ ارتباط کے خیالات پیدا ہو گئے تھے۔ لہذا سلطنت کے طول و عرض میں جدید تحریک یعنی مسیحی تعلیم کی سریع السیر اشاعت کے لئے رستہ صاف تھا۔ یہ تحریک ارض شام سے شروع ہوئی اور تمام ایشیائے کوچک میں پھیلی ہوئی قبرس یونان اور اٹلی میں جا پہنچی اور بالاخر وہاں سے مغرب کی طرف بڑھتی ہوئی فرانس اور برطانیہ پر مسلط ہو گئی۔

مسیحیت کے اعلان ان منادوں نے بہت بڑا حصہ لیا جو ہر طرف اس دین کی منادی کرتے پھرتے تھے۔ اور یہ وہ طریقہ تھا جس سے فلسفہ کے قدیم مذاہب کے پیروؤں نے کبھی فائدہ نہ اٹھایا تھا۔

اس نئے مذہب کی حد بندی میں سیاسی حالتیں ایک بڑے درجہ تک معین ہوئیں۔ چنانچہ آخر الامر عیسائیت ان تمام ممالک میں پھیل گئی جن پر رومی پھر اڑتا تھا۔ اور بجائے یروشلم کے جس کے مشہد مسیح ہونے میں کلام نہیں روا جہاں پطرس کا وفات پانا مشتبہ ہے مذہبی پایہ تخت ہو گیا۔ لیکن باوجود ان حبرک و مقدس یادگاروں کے جو شیشمن اور کیلوری کے ساتھ وابستہ ہیں بہتر یہی تھا کہ عیسائیت کا پرچم سات پہاڑیوں والے شمشاہی دارالامارہ پر لہراتا ہوا نظر آئے۔

سالہا سال تک مذہب عیسوی صرف تین اصولوں کی تلقین کرتا رہا یعنی حق اللہ حق، الذات اور حق العباد۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ خدائے بزرگ و برتر کی تعظیم و تکریم کرے۔ ذاتی طور پر نیک اور پاکباز ہو اور اپنے اہنائے جنس کے ساتھ بھلائی کرے۔ اول اول جب یہ مذہب کمزور تھا تو اس نے لوگوں کو نرمی اور انکسار کے ساتھ دعوت دی لیکن جب مسیحی جماعت تعداد اور اثر کے لحاظ سے غالب ہو چلی تو اس میں سیاسی شان نمودار ہوئی اور حکومت کے اندر حکومت اور سلطنت کے اندر سلطنت قائم کرنے کا رجحان اس میں پایا جانے لگا۔ چنانچہ یہ رجحان اس وقت سے لے کر اب تک برابر قائم رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا میلان اس کے نشوونما کا لازمی نتیجہ ہے۔ فرمانروایان روم نے اس کی اس اوج کو اپنے نظم و نسق سلطنت کی راہ میں مزاحم پا کر اس کا سدباب جنگی قوت سے کرنا چاہا اور ایسا کرنے میں انہوں نے اپنے ان فوجی اصولوں کو پیش نظر رکھا جن کی رو سے شمشاہانہ تفوق کے برقرار رکھنے کا ذریعہ بجز دباؤ کے اور کچھ نہ تھا۔

۳-۴۳۰ء کے موسم سرما میں بعض پلٹنوں کے عیسائی سپاہیوں نے ان مذہبی رسوم میں شریک ہونے سے انکار کر دیا جو دیوتاؤں کی پوجا کرنے اور انہیں بھینٹ دینے کے لئے قدیم سے چلی آئی تھیں۔ یہ بغاوت اس سرعت کے ساتھ پھیلی اور حالت ایسی نازک ہو گئی کہ قیصر ڈیولکلیش کو مجبوراً ایک مجلس شوریٰ اس غرض سے منعقد کرنی پڑی کہ اس موقع پر کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ جو مشکلات پیدا ہو گئی تھیں ان کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ قیصر کی ملکہ اور اس کی بیٹی دونوں کی دونوں مسیحی المذہب تھیں۔ قیصر ایک نہایت بیدار مغز اور فرزاند و دور میں فہم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نئی جماعت کے زور کو توڑنا جس کے بغیر چارہ نہیں ایک سیاسی ضرورت ہے لیکن پھر بھی جب اس نے فرمان انطوائے بغاوت جاری کیا تو یہ صراحت کر دی کہ خونریزی سے اجتراز کیا جائے۔ لیکن ایک غیظ آلود انہوہ کے جوش و خروش کو کون روک سکتا ہے۔ کومیڈیا کے گرجے کی اینٹ سے اینٹ بج

گئی۔ اس کا جواب مسیحی جماعت نے یہ دیا کہ قیصر کے محل کو آگ لگا دی۔ ایک شاہی فرمان کی علانیہ توہین کی اور اسے پڑے پڑے کر ڈالا۔ مسیحی افسران فوج ملازمت سے برطرف کئے گئے۔ قتل عام کی نوبت پہنچ گئی۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ واقعات کی سیل جوار کا ہواؤ اس قدر زبردست تھا کہ قیصر بھی اس کی روک تھام نہ کر سکا۔

اب یہ بات روز روشن کی طرح آشکار ہو گئی کہ عیسائی گروہ نے جو سلطنت کا ایک رکن اعظم ہے ان سفاکانہ مظالم کی وجہ سے جوش میں آکر جو اس پر روا رکھے گئے تھے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ اب ان سختیوں کو برداشت نہ کرے گا۔ ڈایو کلیشن نے ۳۰۵ء میں اپنی مرضی سے تخت چھوڑ دیا۔ قسطنطین نے جو تخت و تاج کے مسابقت میں سے تھا ازراہ غایت مال اندیشی کھلم کھلا مسیحیت کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر حصہ میں مرد عورت بچے بوڑھے اس کی جان نثاری اور ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے اور اس کی خاطر لڑنے مرنے کے لئے مستعد ہو گئے۔ اس کے علاوہ شاہی افواج میں جو مسیحی بہ تعداد کثیر موجود تھے وہ اس کی جانبازانہ متابعت کے لئے تیار ہو گئے۔ سلویا کے پہل کے قریب ایک بہت بڑی جنگ ہوئی جس میں اسے کامل فتح حاصل ہوئی اور اس کے تمام منصوبے بار آور ہو گئے۔ پہلے میکسن اور اس کے بعد لاسینس کی موت نے ان تمام رکاوٹوں کو جو اس کی راہ میں حائل تھیں دور کر دیا اور اولین مسیحی فرمانروا ہونے کی حیثیت سے اس نے قیصرہ کے تخت پر قدم رکھا۔

فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ اب جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے اور مرتبے ملنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا دار لوگ جنہیں مذہب کی خس برابر بھی پروا نہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ جوشیلے حامی ہو گئے۔ چونکہ وہ بظاہر عیسائی لیکن بہ باطن مشرک و بت پرست تھے لہذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی۔ قسطنطین نے کہ وہ بھی انہیں کا ہم مشرب تھا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے ان کے اس منافقانہ طرز عمل کا سدباب ہو۔ قسطنطین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گزری اور کہیں آخری وقت ۳۳۷ء میں جا کر اس نے ان مذہبی مراسم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔

ان ترمیمات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے جو مذہب عیسوی میں یہودی عناصر کی آمیزش کی وجہ سے پیدا ہو کر آج کے دن تک قائم ہیں اور جن کی بدولت اس مذہب کو سائنس کے ساتھ دست و گریبان ہونا پڑا ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس زمانہ میں جب اس دین کا

چشمہ گدلانہ ہوا تھا اس کی کیا حالت تھی۔ حسن اتفاق سے یہ کیفیت ہمیں ٹرٹلین کی اس تحریر سے بہم پہنچتی ہے جو اس نے قیصر سیویرس کے زمانہ میں جب کہ عیسائیوں پر طرح طرح کے ظلم ہو رہے تھے بمقام روما قلعہ بند کی تھی۔ یہ تحریر جس میں عیسائیوں کی طرف سے ان الزامات کا جواب دیا گیا ہے جو ان پر غیر مسیحیوں نے لگائے تھے قیصر کے نام نہیں ہے بلکہ اس کا روئے سخن ان حکام عدالت کی طرف ہے جو ملزمن کے مقدمات کی دریافت کی غرض سے مامور ہوئے تھے۔ اس میں نہایت سلیقہ اور متانت کے ساتھ ان تمام دلائل و واقعات کا استنفا کیا گیا ہے جو راقم عیسائیت کی تائید میں پیش کر سکتا تھا اور تمام دنیا کو مسیحی عقائد اور مسیحیوں کی حالت سے روشناس کیا گیا ہے۔ وہ سختی و خشونت جو یادریوں کے طرز خطاب کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اس میں نام کو نہیں پائی جاتی بلکہ ہر ہر سطر سے تاریخی متانت و ثقاہت نکھ رہی ہے۔ عمدہ قدیم کی مسیحی تصانیف میں جو درجہ اس تحریر کو حاصل ہے کسی اور تصنیف کو میسر نہیں ہوا۔ ٹرٹلین کی اس تحریر کا زمانہ ۲۰۰ء ہے۔

ٹرٹلین اپنا بیان صفائی نہایت قابلیت سے شروع کرتا ہے۔ وہ حکام عدالت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ مسیحیت دنیا میں نئی نئی آئی ہے اور اس ملک میں جو اس کا اصلی وطن نہیں ہے اگر اسے دشمنوں سے سابقہ پڑے تو اس میں کوئی الجھنے کی بات نہیں۔ اس کی استدعا صرف اسی قدر ہے کہ روما کے میئر ٹریٹ اسے برات کا موقع دیں اور اس کا بیان سماعت کئے بغیر اس کے خلاف تجویز صادر نہ کریں۔ اگر اسے ایسا موقع دیا گیا تو سلطنت کے قوانین آفتاب و مہتاب بن کر چمکیں گے لیکن اگر اسے اپنی برات میں زبان ہلانے کی اجازت نہ دی گئی تو اس انصاف کی اغراض پوری نہ ہوں گی جس کے لحاظ سے رومہ الکبریٰ شہرہ اتفاق ہے۔ کسی شے سے خواہ وہ فی الحقیقت نفرت ہی کے قابل کیوں نہ ہو ایسی حالت میں نفرت کرنا جب کہ ہم کو اس کے متعلق کچھ علم نہ ہو خلاف شیوہ معدلت ہے۔ روما کے قوانین کا تعلق ان افعال سے ہے جو اشخاص سے سرزد ہوں نہ کہ اشخاص کے اسما سے۔ لیکن افسوس ہے کہ بایں ہمہ بعض اشخاص روما کی عدالتوں میں سزایاب ہوئے ہیں نہ اس لئے کہ ان سے کوئی جرم سرزد ہوا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ مسیحی کہلاتے تھے۔

اس کے بعد وہ مسیحیت کی ابتدا۔ اس کی ماہیت اور اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس کی بیا عبری اناجیل پر ہے جو سب کتب سے زیادہ متبرک اور قدیم ہیں اور اس مسئلہ کے متعلق میئر ٹریٹوں سے اس طرح خطاب کرتا ہے۔ صحف موسیٰ جن میں خدا نے یہودی اور اس لحاظ سے عیسائی مذہب کو ایک بیش بہا خزانہ کی طرح محفوظ کیا ہے

آپ لوگوں کی قدیم ترین کتب بلکہ آپ کی سرکاری عمارات آپ کی قائم کی ہوئی حکومت آپ کے بڑے بڑے شہروں، آپ کے تاریخی کارناموں، آپ کی زبانی یادگاریوں اور آپ کی اس ابجد کے حروف کی ایجاد سے بھی زیادہ قدیم ہیں جو علوم و فنون کی موبل اور عجائبات قدرت کی محافظ ہے۔ بلکہ میں اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ صحائف آپ کے دیوتاؤں، آپ کے مندروں، آپ کے غیب گو کاہنوں اور آپ کی رب النوعی قربانیوں سے بھی عمر میں زیادہ ہیں۔ ان صحائف کی تخریل کا زمانہ محاصرہ ثرائے سے ایک ہزار سال اور ہومر سے پندرہ سو سال پہلے کا ہے۔ زمانہ راستی کا حلیف ہے اور ارباب فہم و تمیز بجز ان باتوں کے جو مستحق اور مسلم ہوں اور جن کی تصدیق زمانہ کر چکا ہو اور کسی بات کو نہیں مانتے۔ ان صحیفہ مقدسہ کی صحت کا سب سے بڑا انحصار ان کی غیر معمولی قدامت پر ہے۔ سلسلہ بطلمیوسیہ کے سب سے زیادہ فاضل فرمانروا اقلیدس نے جس کی اکیلیت مسلم اثبوت ہے ڈیٹرکس فلیرکس کے مشورہ سے ایک نسخہ ان کتب سادی کا بہم پہنچایا تھا جو اب تک اس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ان کتب کے سادی الاصل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے زمانہ میں ہو رہا ہے وہ پہلے سے ان میں مذکور ہے اور جو واقعات انسان کو ان کے نازل ہونے کے بعد سے پیش آئے ہیں وہ سب ان میں مندرج ہیں۔

کیا کسی پیشین گوئی کا پورا ہونا اس کی سچائی کی دلیل نہیں ہے؟ ان واقعات نے جو پیش آچکے ہیں جب ان پیشین گوئیوں کی سچائی پر مرلگا دی ہے جو ان کے متعلق قبل از قبل کی گئی تھیں تو کیا ان واقعات کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے جن کے وقوع کے متعلق دوسری پیشین گوئیاں اسی قبیل کی موجود ہیں ہم مورد الزام قرار دے جاسکتے ہیں؟ پس چونکہ ہم ان باتوں پر ایمان لائے ہیں جن کے متعلق اناجیل میں پیشین گوئی کی جا چکی ہے اور جو پیشین گوئی کے مطابق ظہور میں آئیں لہذا ضرور ہے کہ ہم دوسری باتوں پر بھی ایمان لائیں جو ابھی ظہور میں نہیں آئیں لیکن ان کے متعلق انہیں اناجیل میں دوسری پیشین گوئیاں موجود ہیں۔

اناجیل مقدسہ کی تعلیم یہ ہے کہ خدا ایک ہے جس نے کائنات کو عدم سے پیدا کیا اور جو اگرچہ ہر روز نظر آتا ہے لیکن پھر بھی آنکھوں سے نماں ہے۔ اس کی غیر محدودیت کا حال بجز اس کے اور کسی کو معلوم نہیں۔ اس کی بے انتہا بڑائی نے اسے چمپا رکھا ہے لیکن ساتھ ہی ظاہر بھی کر رکھا ہے۔ اس نے انسان کے اعمال حسد و سیئہ کے لحاظ سے جزا

و سزا مقرر کی ہے۔ یوم نشور کے دن تمام وہ انسان جو آفریش کائنات سے اسکے خاتمہ تک پیدا ہو کر مر چکے ہیں اس کے حکم سے دوبارہ زندہ ہوں گے اور اپنے دنیوی قالب اختیار کریں گے۔ اس کے بعد وہ ان کے اعمال کی جانچ کرے گا اور جو نیک ہوں گے انہیں تو لذت جلدانی عطا فرمائے گا اور جو بد ہوں گے انہیں ابدی شعلوں میں جھونک دے گا۔ دونخ کی آگ سے مراد وہ چھپے ہوئے شعلے ہیں جو قعر زمین میں بھڑک رہے ہیں۔ زمانہ گذشتہ میں وہ متادوں یا پیغمبروں کو اخلاق و روحانیت کی تعلیم کے لیے مامور کر چکا ہے۔ اس قدیم زمانہ کے پیغمبر یہودیوں کی قوم میں پیدا ہوئے اور انہوں نے غیب کی آواز بنی اسرائیل تک پہنچائی جنہوں نے اس آواز کو بشل اناجیل قلمبند کر لیا۔ ہم پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم ایک انسان کی پرستش کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے خدا کی عبادت نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ہمارے دلوں میں جناب مسیح کی طرف سے جو ارادت و عقیدت جاگزیں ہے اس سے خدا کی اس عظمت میں جس کا ہمیں اعتراف ہے کوئی فرق نہیں آتا۔

ان بزرگان دین کی برگزیدگی کی وجہ سے یہودیوں پر خدا نے اپنے خاص احسانات اور برکتیں نازل کیں اور ان کو شرف ہم کلامی عطا کیا۔ تائید ایزدی سے وہ مراتب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ لیکن خبث نفس کے باعث یہ سرکش قوم خدا کو بھول گئی اور اس کے قوانین پر جس پرستی کو ترجیح دینے لگی۔ اس پر خدا نے انہیں متنبہ کیا کہ اگر تم باز نہ آؤ گے تو میں تم سے زیادہ وفادار اور اطاعت شعار بندوں کو اپنی رحمتوں کا شرف بخشوں گا لیکن جب ان کے تہذیب نے اس انتخاب کو بھی نظر انداز کیا تو خدا نے ان کو ان کے وطن سے خارج کر دیا اور وہ دشت غربت میں سرگرد و سرا سید بھٹکنے لگے۔ آج وہ تتر بتر ہو کر تمام عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے نصیبوں میں ذلت و خواری ہے۔ وہ دبدر مارے مارے پھرتے ہیں اس ہوا سے ان کے شام نا آشنا ہیں جس کے جھونکوں نے ان کے گواروں کو جھلایا تھا۔ اس زمین کو ان کی آنکھیں ترس گئی ہیں جہاں انہوں نے اول اول عالم ہستی کا تماشا دیکھا تھا۔ اب ان کا سر پرست نہ خدا ہے نہ انسان۔ خدا نے جس بات کی انہیں دھمکی دی تھی وہ پوری کر کے دکھا دی۔ اس نے دنیا کے دوسرے ممالک اور دوسری اقوام سے ایسے بندوں کا انتخاب کیا جو ان کے مقابلہ میں زیادہ وفادار تھے۔ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے اس نے یہ بشارت دی تھی کہ ان نئے بندوں پر اس کی خاص رحمتوں کا نزول ہو گا اور ان میں ایک مسیحا پیدا ہو گا جو ان میں ایک نئی شریعت کی اشاعت کرے گا۔ یہ مسیحا جناب عیسیٰ تھے جو

خدا بھی ہیں اس لئے کہ جس طرح ایک شیخ سے دوسری شیخ جلتی ہے اسی طرح ایک خدا سے دوسرا خدا پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا اور اس کا بیٹا متحد الوجود ہیں۔ روشنی دونوں شمعوں کی ایک ہی ہے۔

کتب مقدسہ میں مذکور ہے کہ ابن اللہ کا ظہور دنیا میں دو مرتبہ ہو گا۔ پہلی مرتبہ بحالت عجز و انکسار۔ دوسری مرتبہ محشر کے روز جاہ و جلال کے ساتھ۔ یہودیوں کو یہ کل باتیں ان کے پیغمبر پیشتر سے جتنا چکے تھے لیکن ان کے گناہوں کی تاریکی ان کی آنکھوں پر کچھ ایسی چھا گئی تھی کہ جب وہ پہلی مرتبہ آیا تو انہوں نے اسے بالکل نہ پہچانا اور اس وقت تک اس کی آمد آمد کا فضول انتظار کر رہے ہیں۔ وہ یہی کہتے رہے کہ مسیح کے مجرے آسمانی نشان نہ تھے بلکہ جاوے کے کرشمے تھے۔ علمائے مذہب اور پیشوایان دین اس کو حسد کی نظر سے دیکھنے لگے اور حاکم وقت پالیٹ کے دربار میں جا کر اس پر طرح طرح کے بتان باندھے۔ اس کو صلیب پر چڑھایا گیا اور جب اس کا دم نکل گیا اور وہ زمین میں دفن کر دیا گیا تو تین دن کے بعد وہ قبر سے اٹھا اور چالیس دن تک اپنے حواریوں میں رہا۔ اس کے بعد وہ بابل میں لپٹا ہوا سیدھا آسمان کو چلا گیا اور یہ وہ واقعہ ہے جس کی شہادت رومیوں یا کسی اور رومی بادشاہ کی معراج کی انسانی شہادت سے بدرجہا زیادہ معتبر ہے۔

اس کے بعد ٹرلین نے شیطان اور اس کے گروہ کثیر الانفار کی حکموں اور ماہیت بیان کی ہے اور کہا ہے کہ شیاطین اپنے فرمانروا ابلیس کے حکم سے طرح طرح کی بیماریاں۔ تغیرات ہوا، امراض دہائی اور پیداوار ارضی کی تباہی کے بانی ہوتے ہیں۔ انہیں کے ورغلانے سے انسان بچوں کو بھیجت دیتا ہے تاکہ انہیں قربانیوں کا خون جو ان کی غذا ہے چونے کو ملے۔ شیاطین پرندوں کی طرح سبک سیر ہوتے ہیں اس لئے ریل مسکون میں جو واقعات گذرتے ہیں سب ان کو معلوم ہو جاتے ہیں اور چونکہ ان کی بود و باش ہوا میں ہے لہذا ان کو عرش کے حالات بھی معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کو دھوکا دے کر غلط باتیں باور کرا دیتے ہیں اور غیب گوئی بھی کرتے ہیں جو انسان کو گمراہ کرتی ہے۔ مثلاً ”روما میں شیاطین نے اس واقعہ کا اعلان کیا کہ شاہ پرسیوس پر رومی فوجوں کو فتح حاصل ہو گی لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ پیشین گوئی اس وقت کی گئی جب کہ فتح کی خبر ان کو مل چکی تھی۔ وہ بیماروں کو جھوٹ موٹ اچھا بھی کر دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ اول تو کسی شخص کے جسم میں طول کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بیمار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کوئی نسخہ تجویز کر کے اس کو ستانا چھوڑ دیتے ہیں اور آسیب زدہ کو یہ خیال ہوتا ہے کہ

اسے واقعی شفا ہو گئی۔

اگرچہ عیسائی شہنشاہ کو خدا نہیں مانتے مگر پھر بھی وہ اس کی ترقی دولت و اقبال کے لئے ہمیشہ دستِ بدعا رہتے ہیں اس لئے کہ وہ عظیم تسلط جو دنیا میں پڑنے والا ہے اور وہ بلائے مہرم جس سے نظامِ عالم کا شیرازہ بکھرنے کا خوف ہے اسی وقت تک رکی ہوئی ہے جب تک کہ یہ سلطنت قوی شوکت قائم ہے۔ عیسائیوں کی یہ دعا ہے کہ خدا ان کو دنیا کا یہ ہولناک خاتمہ نہ دکھائے۔ وہ فقط ایک جمہوری سلسلہ کے قائل ہیں لیکن یہ سلسلہ تمام عالم کو محیط ہے۔ ان کی ایک برادری ہے۔ وہ ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں اور نجاتِ اخروی کے امیدوار ہیں۔ وہ صرف شہنشاہ اور حکام ہی کے لئے نہیں بلکہ قیامِ امن کے لئے بھی دعا کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتب مقدسہ کو اس غرض سے پڑھتے ہیں کہ ان کے ایمان میں استواری، ان کی امیدوں میں وسعت اور اس بھروسے میں استحکام پیدا ہو جو انہیں خدا کی ذات پر ہے۔ ان کی مجلسیں افہام و تفہیم کی غرض سے منعقد ہوتی ہیں۔ وہ بدکرداروں کو اپنی جماعت سے خارج کر دیتے ہیں اور ان کے پیشوایانِ دین ان کے افراد کی رائے سے منتخب ہوتے ہیں جنہیں ان کا اقتدار کرنا ہوتا ہے۔ ہر مہینہ کے ختم پر ہر جماعت کے ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی مقدرت کے موافق کچھ رقم بطور چندہ دے لیکن چندہ دینے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ جو رقم اس طور پر جمع ہوتی ہے وہ گویا چندہ دینے والوں کے زہد و اتقا کی ضمانت ہے۔ یعنی اپنے نفس کی آسائش پر صرف نہیں کی جاتی بلکہ مساکین کی پرورش اور تجیز و تخمین یکس اور ناچار یتیم بچوں کی خبر گیری۔ ضعیف العرخلدانِ دین کی امداد اور ان لوگوں کی اعانت میں اٹھائی جاتی ہے جن کے جوازِ تباہی میں آگئے ہوں یا جن کو دینِ حق پر ثابت قدم رہنے کی وجہ سے جلاوطنی یا قید یا کالوں میں مزدوری کرنے کی سزا دی گئی ہو۔ عیسائیوں میں بجز ان کی بیبیوں کے اور کل مال و متاع مشترک الاستعمال ہے۔ نہ تو وہ اس حرص سے پیٹ بھرتے ہیں کہ گویا کل ہی مرجائیں گے اور نہ عمارتیں ایسی عالیشان بناتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیامت کے بورئے لپٹیں گے۔ ان کی زندگی کا مقصد پاکبازی، انصاف، صبر، اعتدال اور صحت ہے۔

رُٹلین نے جہاں اپنے زمانہ کے مسیحی عقائد اور روشِ زندگی کی یہ دہذیر تصویر کھینچی ہے وہاں حکامِ عدالت کو ایک عظیم الشان واقعہ کے متعلق جو عنقریب پیش آنے والا تھا ان الفاظ میں بے دھڑک و ہمکی بھی دی ہے۔ اگرچہ ہماری جماعت کے قیام کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن وہ کونسا مقام ہے جہاں ہم موجود نہیں۔ شر۔ قلعے۔ جزیرے۔ صوبے۔

انجمنیں۔ شر کے گلی کوچے، شاہی محلات، وکلائے جمہور کے اجلاس، فوجی پارکیں غرض ہر اس مقام پر جو آپ لوگوں کی قوت کی خارجی علامت ہے ہم لوگ برابر پائے جاتے ہیں۔ بجز آپ کے مندروں کے ہم نے آپ کے قبضہ میں اور کوئی شے نہیں چھوڑی۔ غور کیجئے کہ اگر ہم چاہیں تو جنگ کا کیسا طوفان عظیم پا کر سکتے ہیں۔ اگر ہم کو ہمارا مذہب جس کی تعلیم یہ ہے کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے نہ روکے ہوئے ہو تو کس سرعت اور مستعدی سے ہم مسلح ہو کر آپ کے خلاف معرکہ آرا ہو سکتے ہیں۔

اپنا بیان صفائی ختم کرنے سے پیشتر ٹلین نے اس دعوے کا از سر نو ذکر کیا ہے جس پر ازمہ مابعد میں عملدرآمد ہونے سے یورپ کی علمی ترقیوں پر ایک بہت بڑا اثر پڑا۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ کتب مقدسہ کو وہ گنج شایگان سمجھنا چاہئے جس سے دنیا نے علوم و فنون اور دانش و حکمت کے موتی اور جواہر ریزے حاصل کئے ہیں۔ اگر کسی حکیم نے فلسفہ کا کوئی نکتہ بیان کیا ہے تو انہیں صحف کے اسرارِ حکیمہ سے فیض پا کر اور اگر کسی شاعر کو کوئی اچھوتا مضمون ہاتھ آیا ہے تو انہیں مقدس کتابوں کی تفصیل آفرینی کی بدولت۔ غرض اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد جدید و عتیق صدق و حقیقت کا معیار مطلق ہیں اور جو مسئلہ ان کے اصول کے مطابق نہ ہو وہ لامحالہ غلط ہے۔

ٹرلین کی اس فاضلانہ تحریر سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جب عیسائیت معاندین و مخالفین کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنی ہوئی زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی تو اس وقت اس کی کیا حالت تھی۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ شہنشاہانہ اقتدارات حاصل کرنے کے بعد اس میں کیا تبدیلی پیدا ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیوریس کے زمانہ کی عیسائیت اور قسطنطین کے زمانہ کی عیسائیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بت پرستی اور مذہب عیسوی کے مخلوط ہو جانے کے دو بڑے اسباب تھے۔ اول نئے خاندانِ شاہی کی ملکی مصلحتیں اور سیاسی ضرورتیں۔ دوم وہ طرزِ عمل جو نئے مذہب نے اپنی اشاعت کے لئے اختیار کیا۔

۱۔ اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اس نے اپنی گون کا سمجھا اسے تخت پر بٹھا دیا لیکن یہ قدرت اسے پھر بھی نہ حاصل ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی بت پرستی کا استیصال کلی کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔ عیسائیت اور اسلام میں اس بارہ میں یہ بڑا فرق ہے کہ

اسلام نے اپنے مد مقابل کو مطلقاً "نیست و نابود کر دیا اور اپنے عقائد کو بلا کسی آمیزش کے شائع کیا۔"

فلسطین کا طرز عمل ہمیشہ اس کے اس عندیہ کی شہادت دیتا رہا کہ وہ اپنی رعایا کے کل طبقوں کو ایک آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے فریق کامیاب کی وکالت کو اپنی فرمانروائی کا اصول نہیں قرار دیتا چاہتا۔ پس جہاں اس نے گرجا تعمیر کئے بت پرستوں کے لئے مندر بھی بنوا دیئے۔ اگر پادریوں کی سرگوشیوں پر کان دھرا تو بت پرست کاہنوں سے بھی مشورہ کیا۔ فلسطین کی مسیحی کونسل منعقد کی تو دولت کے بت پر بھی چڑھاوے چڑھائے۔ اصطلاح کی رسم کو قبول کیا تو ایک تنہ بھی مسکوک کرایا جس پر اس کا رہائی لقب ثبت تھا۔ فلسطین میں سنگ ساق کے ایک مینار کی چوٹی پر اس کا جو مجسمہ نصب کیا گیا وہ اصل میں اپالو دیوتا کی ایک قدیم صورت تھی جس کے خط و خال بدل کر فلسطین کی صورت سے مشابہ بنا دیئے گئے اور سر کے گردا گرد وہ میخیں جن کی نسبت بیان کیا جاتا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرتے وقت کام میں لائی گئی تھیں اس صنعت گرمی کے ساتھ جھائی گئیں کہ عظمت و جلال کے تاج کی شکل پیدا ہو گئی۔

اس خیال سے کہ بت پرستوں کے دل میں شکست نے جو ناسور ڈال دیا ہے اس کا اندمال مراعات خاص اور نواز شمائے پنہاں کے مرہم سے ضروری ہے فلسطین نے اپنے دربار میں بت پرستی کی رسموں کی تجدید و ترویج سے نہ صرف اغماض کیا بلکہ ان کوششوں کو استحسان کی نظر سے دیکھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کوششوں میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے اسی کے خاندان کے اراکین تھے۔

2۔ اس شہنشاہ کو جو محض دنیا کا بندہ تھا اور جس کے مذہبی اعتقادات خس سے بھی کم وقعت تھے اپنا ذاتی فائدہ سلطنت کی بہبودی اور دونوں مخالف جماعتوں یعنی عیسائیوں اور بت پرستوں کی بھلائی اسی میں نظر آئی کہ جہاں تک ہو سکے ان میں یگانگت و ارتباط پیدا کیا جائے۔ اور تو اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں تک کو اس حکمت عملی سے چنداں اختلاف نہ تھا اس لئے کہ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پرانے عقائد کا پیوند لگا دیا گیا تو مذہب جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی اور آخر کار نجاستوں کی آمیزش سے پاک ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا۔ اس انضمام و اختلاط کی بزم آرائی میں شہنشاہ کی ماں بیٹا نے شاہی دربار کی بیگمات کے ساتھ مل کر شمع انجمن کا کام دیا۔ مصلحت شناس اور مزاحدان لوگوں کو ملکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی ایک نئی تدبیر ہاتھ آگئی۔ بیت المقدس کے ایک

عار سے حضرت میسیٰؑ کی صلیب۔ دونوں چوروں کی سلیبس۔ واقعہ قلیب کا کتبہ اور وہ شخص جو اس موقع پر استعمال میں لائی گئی تھیں تین صدیوں تک امانت رہنے کے بعد برآمد کی گئیں۔ اور ایک مناسب حال معجزہ سے جس کے تصنیف کرنے میں ان بزرگواروں کو ذرا بھی دقت پیش نہ آئی ان حبرک آثار کی تصدیق بھی ہو گئی۔ غرض اچھی خاصی آثار پرستی شروع ہو گئی۔ یونانیوں کے اوہام باطلہ ازسرنو نمودار ہو گئے اور اس زمانہ کی تصویر آنگھوں میں پھرنے لگی جب کہ وہ آلات جن سے محاصرہ ٹرائے کا مشورہ برنجی گھوڑا تیار کیا گیا تھا بیلاپائٹم میں رکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ جب کہ پیلاپٹس کا عصائے شاہی کردیٹا میں۔ اگلیرکانیزہ فیلس میں اور سیمین کی تلواریں کومیدیا میں کاٹنا موجود تھی۔ جب کہ اہل نیچا کیلیرڈیٹا کے جنگی سور کی کھال دکھا سکتے تھے اور بہت سے شہروں کو یہ دعویٰ تھا کہ ان کے پاس شہر ٹرائے کے محافظ دیوتا کا اصلی بت موجود تھا۔ جب کہ منوادہی کے ایسے ایسے مجسمے پیش کئے جاسکتے تھے جو برہمے لاسکتے تھے۔ ایسی ایسی تصویریں دکھائی جاسکتی تھیں جو ہنس سکتی تھیں۔ ایسی ایسی مورتیں موجود تھیں جنہیں پینہ آسکتا تھا اور ایسے ایسے ہزار ہا معبد اور پیکل اطراف ملک میں پھیلے ہوئے تھے جہاں معجزوں سے مریض اچھے کئے جاسکتے تھے۔

جوں جوں زمانہ گذر تا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرلین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایہ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا۔ اولیس تو وہی پہلا سا موجود ہو گیا مگر دیوتاؤں کے نام بدل دئے گئے۔ سلطنت کے جن صوبوں کی قوت بڑھی ہوئی تھی وہاں کے باشندوں نے علی الرغم مذہب شاہی اپنے قدیم عقائد اختیار کر لئے۔ عقیدہ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا۔ نہ صرف اتھنس کی پرستش بہ تبدیل نام ازسرنو ہونے لگی بلکہ اس کا بت بھی جو کسی زمانہ میں ایک ہلال کے قوس پر رکھا ہوا نظر آیا کرتا تھا ازسرنو نمودار ہو گیا۔ اس دہی کا مجسمہ جو گود میں اپنے بچے ہورس کو لئے ہوئے ہے بت تراشی اور نقاشی کی صنعتوں کے ذریعہ سے ہمارے زمانہ تک حضرت مریم اور ان کے معصوم فرزند کی دلربا تصویر کی شکل میں پہنچا ہے۔ نئے لباس میں قدیم تصورات کی اس تجرید کا ہر جگہ بہ اشتیاق تمام غیر مقدم کیا گیا۔ جب اہل انڈیا کے سامنے اس امر کا اعلان کیا گیا کہ وہاں کی مسیحی مجلس نے بھدرارت بطریق سائرل یہ فیصلہ کیا ہے کہ مریم عذرا کو ”خدا کی ماں“ کے لقب سے یاد کیا جائے تو ان لوگوں نے خوشی کے آنسوؤں سے اپنے بطریق کے قدم دھوئے۔ یہ اشک ریزی اسی قدیم ناشور کی تراوش تھی جس پر اگرچہ مسیحیت

کے اثر کی وجہ سے انکو آچلا تھا مگر مادہ فاسد ہنوز اندر باقی تھا۔ اگر ان کے آباؤ اجداد کے زمانہ میں ڈایا دہی کے لئے یہی بات کی جاتی جو چناب مریم کے لئے کی گئی تو ان کے دلوں پر بھی یہی اثر ہوتا۔

دنیا دار نو مسیحیوں کی تالیف قلوب کا یہ طریقہ جس پر ان کے رسوم و عقائد کے اختیار کر لینے سے عمل کیا گیا ان لوگوں کے اعتراض سے نہ بچا جن کی بصیرت اس کی علت غائی کی یہ پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ فاسٹس نے قیصر آگسٹائن سے برملا ان ملامت آمیز الفاظ میں خطاب کیا: ”تم میں اور بت پرستوں میں کیا فرق باقی رہا۔ اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ تمہاری جماعت علیحدہ ہے اور ان کی جماعت علیحدہ۔ ورنہ افعال دونوں کے ایک ہی سے ہیں۔ ان کے ہاں قربانیاں ہوتی ہیں جن میں بد مستیوں کا زور ہوتا ہے تمہارے ہاں بزم محبت ترتیب دی جاتی ہے جو مذہبی شکل میں ہوسنا کی اور عیش پرستی کا دوسرا نام ہے۔ ان کے ہاں بت بچتے ہیں۔ تمہارے ہاں شہداء اولیا کی پرستش ہوتی ہے۔ تم ان کی طرح مردوں کی روحوں کی تواضع شراب و کباب اور چنگ و رباب سے کرتے ہو۔ بت پرستوں کے تمام مذہبی تہوار تمہارے ہاں اسی ذوق و شوق سے منائے جاتے ہیں۔ غرہ ماہ اور راس الجدی و راس السرطان میں آفتاب کی تحویل کے وقت تم وہی رسمیں ادا کرتے ہو جو بت پرستوں کے ہاں رائج ہیں اور طرز ماند و بود اور عادات و اطوار کے لحاظ سے تو تم میں ان میں مطلق فرق نہیں۔“ غرض کہ بت پرستی کے تمام رسم و رواج جاری ہوئے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ شادیوں میں عشق و محبت کی دہی وینس (زہرہ) کے بھجن گائے جاتے تھے۔

اس مقام پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر کر ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ عیسائیت کے ساتھ بت پرستی کے شامل کر دینے کی اس چال نے بالاخر لوگوں کو انحطاط عقلی کے کس طبقہ سافل تک پہنچا دیا۔ بت پرستی کی رسمیں اختیار کر لی گئیں۔ پرستش کے نمائش اور بھڑک دار طریقے جاری ہو گئے۔ پادریوں نے پر تکلف لباس اور ٹوپیاں اور تاج پہننے شروع کر دیے۔ کافوری شمعیں۔ سونے چاندی کے گلدان مراسم مذہبی کے لوازم میں داخل ہو گئے۔ عبادت میں براتوں کے جلوس کی سی دھوم دھام نظر آنے لگی۔ قربانی کے ذریعہ سے طہارت ہونے لگی۔ رومی بت پرست کاہنوں کی جادو کی چھڑی عیسائی اسقف کی حکومت ملی کا عصا بن گئی۔ مگر جاشہدا کے مزاروں پر بنائے جانے لگے اور ان کی تطہیر و تقدیس ان رسموں کے ذریعہ سے ہونے لگی جو سلف میں بت پرست پجاریوں کے ہاں رائج تھیں۔ جھوٹ سچ جہاں کہیں

کسی شہید کے کچھ آثار بہم پہنچ گئے فوراً ان کی یادگار میں میلے اور عرس قائم کر دئے گئے۔ خدا کے غضب کو فرو کرنے اور آسیب اتارنے کا سب سے بڑا ذریعہ فاقہ کشی قرار دیا گیا۔ بیت المقدس اور شہدا کے مزاروں کی زیارت و طواف کے لئے لوگ ہزار ہا کوس چل کر جاتے تھے۔ بیت المقدس سے منوں خاک دھول لا کر لوگ موتیوں کے مول بیچتے تھے اور اس مٹی کو شیطان کے دفیعہ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ دم کئے ہوئے پانی کے اوصاف و خواص میں تو کسی کو کلام ہی نہ تھا۔ مورتیں اور تہرکات گرجاؤں کے ضروری لوازم تھے اور خوش عقیدہ لوگ جنوں کی طرح ان کو بھی پوجتے تھے۔ جس طرح زمانہ سابق میں بت پرستوں نے بعض مقامات کو خوارق عادات اور معجزات کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اسی طرح خاص خاص مقامات عیسائی دنیا میں بھی اعجاز و کرامات کے مرکز قرار دئے گئے۔ عیسائیوں کی نجات یافتہ روحوں کو حاضرات کے طریقہ پر طلب کیا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ روحمیں اطراف عالم میں بھٹکتی پھرتی ہیں یا اپنے مقابر کے اوپر منڈلا رہی ہیں۔ مندروں اور قریان گاہوں کی تعداد خارج از حد شمار تھی۔ توبہ اور ازالہ معصیت کے لئے خاکی کو جو تکلیف دہ اور ایذا رسان لباس پہننا پڑتا تھا اس کی بت سی قسمیں تھیں۔ حضرت مریم کی عید تقطیر کا تہوار اس غرض سے قائم کیا گیا کہ جو بت پرست نئے نئے عیسائی ہوئے تھے ان کے دلوں سے چین دیوتا کے یوم جشن کے منسوخ ہونے کی کھٹک جاتی رہے۔ مورتوں صلیب کے ٹکڑوں ہڈیوں کیلوں اور دوسرے تہرکات کی پرستش عام رواج پامنی گویا اچھی خاصی عباد پرستی رائج ہو گئی۔ ان آثار حبرکہ کی تصدیق کا انحصار دو براہین پر تھا یعنی پادریوں کے حکم یا معجزات کے اظہار پر۔ اولیا کے پھنے پرانے کپڑوں اور ان کی قبروں کی خاک تک حبرکہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ فلسطین سے کچھ بوسیدہ ہڈیاں لائی گئیں اور ان کی نسبت بوٹوق تمام یہ مشہور کیا گیا کہ یہ حضرت مرقس اور حضرت جیمس اور دوسرے اولیائے حمد سابق کے آثار جسمانی ہیں۔ بت پرستی کے زمانہ میں انسان کو دیوتا بنا دیا جاتا تھا عیسائیوں نے اسے دلی کر دکھایا کہ اسکا تصرف بھی معاملات انسانی میں ربانی مداخلت سے کسی طرح کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ مقامی دیوتاؤں کی جگہ مقامی پیر اور اولیا قائم ہو گئے۔ اس کے بعد عشاے ربانی کی پراسرار رسم کا ظہور ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ پادری کے عمل سے روٹی اور شراب مسیح کے گوشت اور خون کی صورت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ مرور قرون نے عیسائیت اور بت پرستی کے اس الحاق کو اور زیادہ کامل و مکمل کر دیا۔ نئے نئے تہوار منائے جانے لگے جن میں سے ایک تو اس برجھے کی یادگار میں قائم کیا گیا تھا جس سے حضرت

عیسیٰ کے پہلو میں چڑکا دیا گیا تھا۔ ایک ان میخوں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے قائم کیا گیا تھا جن سے آپ کا جسم صلیب میں جڑ دیا گیا تھا اور ایک سے کانٹوں کے اس تاج کی یاد تازہ رکھنا مقصود تھا جو مصلوب کرتے وقت آپ کو پہنچا دیا گیا تھا۔ اگرچہ عیسویوں خانقاہوں میں کانٹوں کا یہ بے بہا تاج موجود تھا لیکن زمانہ کا یہ رنگ تھا کہ کوئی شخص یہ کہنے کی جرات نہ کر سکتا تھا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ سب کے سب تاج اصلی ہوں۔

پادری نیوٹن نے اس تعلق کی نسبت جو عیسائیت اور بت پرستی میں پیدا ہو گیا تھا۔ جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کا اقتباس اس مقام پر خالی از قاعدہ نہ ہو گا۔ وہ کہتے ہیں۔ ”کیا آج کل اولیا و ملائکہ کی پرستش ہر اعتبار سے زمانہ سابق کی پرستش شیاطین سے مشابہ نہیں ہے؟ صرف نام کا فرق ہے۔ باقی سب کچھ یکساں ہے۔ بت پرست اپنے بزرگوں کو دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے۔ عیسائیوں نے اپنے بزرگان دین کو خدا بنا رکھا ہے۔ جن لوگوں نے اس قسم کی پرستش کو مذہب عیسوی میں رائج کیا وہ خوب جانتے تھے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک طریقہ عبادت کی جگہ دوسرے طریقہ عبادت نے لے لی ہے اور چونکہ دونوں طریقہ دراصل ایک ہی ہیں لہذا ان کی رسمیں بھی ایک ہی سی ہیں۔ وقت واحد میں متعدد قریانگاہوں پر لوبان یا خوشبوی کی دھونی دینا۔ گرجاؤں کو جاتے اور وہاں سے واپس آتے وقت آب متبرک یا نمک ملے ہوئے پانی کا ان میں چھڑکاؤ کرنا۔ دن دوپہر صدمہ چراغوں اور موم بتیوں کا جڑوں کی قریانگاہوں اور مورتوں کے سامنے جلانا۔ پیاریوں اور خطروں سے فوق العادت طور پر شفا یا نجات پانے کے شکرانہ میں نذر و نیاز گذرانا اور منتیں چڑھانا۔ گذرے ہوئے بزرگان دین کو ولی یا خدا قرار دینا۔ ہر ایک صوبہ یا ضلع کو کسی گذرے ہوئے نامور بہادر یا ولی یا پیر کی حمایت میں خاص طور سے سونپنا، قبروں اور مزاروں پر جا کر مردوں کی پرستش کرنا یا ان کے آثاروں کو پوجنا۔ جڑوں کی تقدیس اور ان کو سجدہ کرنا اور ان کو صاحب اعجاز و کرامات جاننا۔ گذرگاہوں، شاہراہوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بت خانوں، قریانگاہوں اور مورتوں کا قائم کرنا۔ گاہے باجے دھوم دھڑکے کے ساتھ جڑوں اور آثاروں کے جلوس نکالنا۔ خاص خاص اوقات پر مجاہدہ اور ریاضت کے دھوکے میں جسم کو درے مار مار کر ایذا پہنچانا۔ پادریوں کے مختلف فرقے اور برادریاں قائم کرنا۔ پادریوں کا خاص انداز سے اپنی جائیداد منڈوانا۔ ازدواجی تعلقات سے عمر بھر محترز رہنے کو جنس ذکور و اثناٹ دونوں کے زہد و اتقا کی دلیل سمجھنا۔ یہ سب وہ رسمیں ہیں جو اور بت سی رسموں کے ساتھ بت پرستوں اور پوپ روما کے پیروؤں کے توہمات کی اجزا سے لاینفک

ہیں اور یہی نہیں بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہی مندر اور وہی بت جو ایک زمانہ میں جوہر اور اس کی برادری کے دوسرے خٹاسوں سے نامزد تھے آج مریم عذرا اور دوسرے مسیحی اولیا سے منسوب ہیں۔ دونوں کی عبادت کی رسمیں اور کتبے ایک سے ہیں اور جو معجزے اور کرامتیں زمانہ سلف میں بت پرستوں کا منہاج ارادت تھیں وہی آج کے دن مسیحیوں کی عقیدت کی تکیہ گاہ ہیں۔ غرض کل کی کل بت پرستی مسیحیت میں منتقل ہو گئی ہے۔ دونوں کا مبداء و منشا ایک ہی اصول و فروع ایک ہیں۔ یہاں تک کہ قدیم و جدید اور بت پرست و مسیحی روا میں طریقہ عبادت کے لحاظ سے نہ صرف تو افق بلکہ تقابلی تام پایا جاتا ہے۔“

پادری نیوٹن صاحب کی رائے سے استفادہ کرنے کے بعد ہم پھر قسطنطین کے زمانہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ قدیم اور عام پسند عقائد کی بقاء بلکہ ان کی ترویج میں ان مراعات و بدعات کے ذریعہ سے حصہ لیا گیا لیکن مسیحی فریق نے جو فریق غالب تھا اپنے فیصلوں کو بزور حکومت نافذ کرانے میں کبھی بھی ایک لمحہ کا تامل نہ کیا اور حکومت کی طرف سے بھی ان فیصلوں کے نفاذ میں پوری طرح سے تائید کی گئی۔ اس طور پر قسطنطین تاسیا کی کونسل کے احکام کی پوری پوری تعمیل کرتا رہا۔ ایرنس کے معاملہ میں تو اس نے یہاں تک حکم دے دیا کہ جس شخص کو اس کافر اکفر کی کوئی کتاب ملے اور وہ اسے جلا نہ ڈالے اس کی گردن ماری جائے۔ اسی طرح شہنشاہ تھوڈوسیوس اصغر کے زمانہ میں منظور کو جلا وطنی کی سزا دے کر صحرائے افریقہ کے ایک دور دراز حصہ میں جہاں درختوں کے ایک جھنڈ اور پانی کے ایک چشمہ کے سوا صد ہا فرسنگ تک ریگ رواں اور سموم سوزان کا عمل تھا بھیج دیا گیا۔

بت پرست فریق میں سلطنت کے قدیم طبقہ امرا کے بت سے ذی وجاہت خاندان شریک تھے اور پرانے فلسفیانہ مذاہب کے تمام پیرو اس کے حامی و مددگار تھے (فریق مخالف کو یہ لوگ نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ان کا یہ دعویٰ تھا کہ انسان کو علم صرف مشاہدہ اور عقل کے ذریعہ سے محنت اٹھانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

بہ خلاف اس کے مسیحی فریق کا یہ دعویٰ تھا کہ کل علم اناجیل و روایات کلیسا میں محفوظ ہے اور خدا اپنی الہامی کتابوں میں انسان کے لئے نہ صرف حق و صدق کا معیار قرار دے چکا ہے بلکہ اس کی دانست میں جن باتوں کا جاننا ہمارے لئے ضروری تھا وہ سب ہمیں بتا چکا ہے۔ اس لئے کتب مقدس انسانی معلومات کا مجموعہ ہیں جس پر اضافہ ہوا غیر ممکن ہے

اور اس علمی اجارہ میں پادری بحیثیت شہنشاہ کسی رقیب یا حریف کی مسابقت گوارا نہیں کریں گے۔

یہاں سے علم کی دو قسمیں ہو گئیں علوی و سفلی اور دو مخالف فرقے پیدا ہو گئے جن میں سے ایک نے اپنا ہادی و رہبر عقل کو قرار دیا اور دوسرے نے الہام کو۔ بت پرست جماعت کو اپنے فلاسفہ کے علم و فضل پر غرور تھا اور عیسائیوں کو اپنے بزرگان دین کے الہام پر۔

اس طور پر کلیسا نے علم و حکمت کا مبداء و منشا بن کر اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور اس کے فیصلوں کی بحکیل کے لئے زور حکومت ہر وقت تیار رہنے لگا۔ اس طرز عمل نے اس کے آئندہ کارناموں پر جبر و تحکم کی مر لگا دی اور ایک ہزار سال تک وہ یورپ کی دماغی ترقی کا سد راہ بنا رہا۔

قیصر قسطنطین کے عہد سے مسیحیت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جب کہ اس نے مذہبی رنگ چھوڑ کر سیاسی رنگ اختیار کیا اور اسے دنیوی سلطنت حاصل کرنے کی فکر شروع ہوئی۔ اگرچہ ایک لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مذہب گرتے گرتے بت پرستی کی شکل میں مسخ ہو گیا لیکن دوسرے اعتبار سے یہ کہنا بھی نادرست نہ ہو گا کہ اس نے ترقی کرتے کرتے قدیم یونانی اضم پرستی کی نشوونما پذیرفتہ صورت اختیار کر لی۔ یہ اصول کہ جب دو جسم آپس میں ٹکراتے ہیں تو دونوں کی صورت بدل جاتی ہے طبعیات و عمرانات دونوں پر یکساں صادق آتا ہے۔ بت پرستی نے مذہب عیسوی کے اصول میں تعمیر پیدا کر دیا اور مذہب عیسوی نے بت پرستی کی حیثیت بدل دی۔

مصر میں جہاں قدیم الایام سے تثلیث کا زور رہا ہے مسیحی تثلیث کے معرکہ الارا مسئلہ کا چھڑنا ایک لازمی بات تھی۔ سب سے زیادہ اہم بحث اس مسئلہ میں یہ تھی کہ ابن اللہ ہونے کی حیثیت سے مسیح کا کیا درجہ قرار دیا جائے۔ اسکندریہ میں ان دنوں ایک پادری ایریس نامی رہتا تھا جو ایک دفعہ بشپ (اسقف) کی خدمت کا امیدوار تھا مگر محروم رہا۔ اس نے یہ بحث پیش کی کہ لحاظ رشتہ فرزند و پدری ضرور ہے کہ ایک وقت ایسا ہوا ہو جب کہ بیٹے کا وجود نہ تھا۔ اس لئے کہ باپ کی عمر بیٹے سے زیادہ ہونی چاہئے۔ پس حضرت مسیح نے یہاں تک حکم دے دیا کہ جس شخص کو اس کافر انکفر کی کوئی کتاب ملے اور وہ اسے جلا نہ ڈالے اس کی گردن ماری جائے۔ اسی طرح شہنشاہ ثیوڈوسیوس اصغر کے زمانہ میں دستور کو جلاوطنی کی سزا دے کر صحرائے افریقہ کے ایک دور دراز حصہ میں جہاں درختوں کے

ایک جہنم اور پانی کے ایک چشمہ کے سوا صدمہ ہا فرسنگ تک ریگ رواں اور سموم سوزان کا عمل تھا بھیج دیا گیا۔

بت پرست فریق میں سلطنت کے قدیم طبقہ امراء کے بت سے ذی وجاہت خاندان شریک تھے۔ اور پرانے فلسفیانہ مذاہب کے تمام پیرو اس کے حامی و مددگار تھے۔ فریق مخالف کو یہ لوگ نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ انسان کو علم صرف مشاہدہ اور عقل کے ذریعہ سے منت اٹھانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

یہ خلاف اس کے مسیحی فریق کا یہ دعویٰ تھا کہ کل علم اناجیل و روایات کلیسا میں محفوظ ہے اور خدا اپنی الہامی کتابوں میں انسانوں کے لئے نہ صرف حق و صدق کا معیار قرار دے چکا ہے بلکہ اس کی دانست میں جن باتوں کا جاننا ہمارے لئے ضروری تھا وہ سب ہمیں بتا چکا ہے۔ اس لئے کتاب مقدس انسانی معلومات کا مجموعہ ہے جس پر اضافہ ہونا غیر ممکن ہے۔ اور اس علمی اجارہ میں پادری ہمایت شہنشاہ کسی رقیب یا حریف کی مسابقت گوارا نہیں کریں گے۔ احتساب مذہبی لوگوں کے عقائد کی جانچ پڑتال کے لئے قائم کیا۔ ایک شامی فرمان اس مضمون کا صادر ہوا کہ جن لوگوں کے عقائد روما کے بشپ ڈماس اور اسکندریہ کے بشپ پیٹر کے عقائد کے مطابق نہ ہوں گے وہ جلاوطن کئے جائیں گے اور ان کے حقوق چھین لئے جائیں گے۔ اور جو شخص ایسٹریکی عید اسی وز منائے گا جس روز یسودی مناتے ہیں اس کو قتل کی سزا دی جائے گی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یونانی زبان کا چرچا مغرب میں بہت ہی کم ہوتا جاتا تھا اور علوم صحیح مفقود ہو گئے تھے۔

اس زمانہ میں اسکندریہ کا بشپ تھیوفیل تھا۔ اسیرس کا ایک قدیم مندر مسیحیوں کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ اس کو سمار کر کے اس کی جگہ گر جا بنایا جائے۔ نئی عمارت کی بنیاد کھودتے وقت قدیم پرستش کے بعض فحش آثار برآمد ہوئے۔ تھیوفیل نے حیا و شرم کے جذبات کو حرارت مذہبی کے طاق پر رکھ کر ان علامات قبیحہ کی تشہیر کی۔ تثلیث کی بحث کے زمانہ میں جب عیسائیوں کے مذہب کی ناکوں میں توہین و تذلیل کی جاتی تھی اس وقت پچارے عیسائی تو چپ چاپ رہے لیکن اس موقع پر جب کہ خود بت پرستوں کی باری آئی تو ان سے ضبط و تحمل نہ ہو سکا۔ وہ فساد پر آمادہ ہو گئے اور ایک عام بلوہ ہو گیا۔ ”سرپین“ کو انہوں نے اپنا بنگاہ بنایا اور وہ فساد اور خونریزی ہوئی کہ شہنشاہ کو مد اعلت کرنی پڑی۔ اس نے تھیوفیل کے نام اس مضمون کا فرمان بھیجا کہ ”سرپین“ کو منہدم کر دیا جائے۔ اس طرح وہ عظیم الشان اور قدیم کتب خانہ جس کو تاجداران سلسلہ بطریقوسہ نے جمع کیا تھا اور

جو جو لیس سیزر کی آتش نئی سے بچ رہا تھا اس جابل و متعصب پادری کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔

تھیا فیلس کے بعد اسکندریہ کی دینی پیشوائی کی خدمت اس کے بھتیجے سینٹ ساریل کو ملی جو اپنے دلپذیر اور پرتاثر مواظ و خطبات کی وجہ سے اسکندریہ کے مذہبی حلقوں میں مشہور و ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ حضرت مریم کی پرستش اسی کی کوششوں سے اسکندریہ میں عام ہو گئی۔ لیکن جو اثر اس کی عام پسند تقریروں نے اہل اسکندریہ کی نہجین طبعیتوں میں پیدا کیا تھا اسے ایک عورت ہائی پیشا نامی نے بہت کچھ کمزور کر دیا۔ ہائی پیشا جس کا باپ تھیان بڑے پایہ کا مہندس تھا نہ حرف فلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کی شارح تھی بلکہ اپالونیس اور دوسرے مہندسوں کی تصانیف پر بھی اس نے عالمانہ شرحیں لکھی تھیں۔ ہر روز اس کے مدرسہ کے سامنے امرا و اعیان کے رتھوں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ اور اسکندریہ کے تمام وضع و شریف اس کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ جن مسائل پر اس کی تقریریں ہوتی تھیں وہ وہی سمجھتے ہیں جن پر ہمیشہ سے بحث ہوتی چلی آئی ہے لیکن آج تک حل نہیں ہو سکے یعنی ”میں کیا ہوں؟“ ”کون ہوں؟“ ”کہاں ہوں؟“ اور ”میرے علم کی کیا حد ہے؟“

ہائی پیشا اور ساریل! ایک کو علم و حکمت میں تبحر دوسرے کو جہل و تعصب میں توغل!! بھلا اجتماع ضدین کیونکر ممکن تھا؟ ساریل نے سمجھ لیا کہ اگر یہی لیل و نمار رہا تو ہائی پیشا کے آگے اس کی شیخت کا چراغ گل ہو جائے گا اور یہ سمجھ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بن پڑے اپنے حریف کا خاتمہ کر دے۔ ایک دن ہائی پیشا مدرسہ کو جا رہی تھی کہ ساریل کی امت کے ایک گروہ کثیر الانفار یعنی بہت سے پادریوں نے اسے آگیرا۔ ان سب نے مل کر بیچ بازار میں اس کے کپڑے نوج کھوٹ ڈالے اسے بالکل برہنہ کر دیا اور پھر کچھتے گھسیٹتے ہوئے ایک گرجا میں لے گئے جہاں عصائے پطرس کی متواتر ضربوں سے اس کا سر توڑا گیا۔ اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ گوشت و پوست کو سبھوں سے چھپا گیا اور ہڈیاں آگ میں جموٹ دی گئیں۔ اس خوفناک جرم کے متعلق ساریل نے جواب تک نہ لیا گیا۔ گویا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ چونکہ مقصد محمود تھا اس لئے اس کی تکمیل کا جو ذریعہ اختیار کیا گیا وہ بھی محمود ہو گیا۔

اس واقعہ کے ساتھ ہی یونانی فلسفہ کا اسکندریہ سے چرچا اٹھ گیا اور اس علم کا جس کی اشاعت کے لئے فرمانروایان سلسلہ بطلموسیہ نے اس قدر کوششیں کی تھیں قبل از وقت خاتمہ ہو گیا۔ ”سیرتین“ کا کتب خانہ برباد ہو ہی چکا تھا جو کچھ رہی سہی انگلیں فلسفہ و

حکمت کے اکتساب کی دلوں میں باقی تھیں ان کا ہائی چیشیا کے عبرتناک انجام نے یوں خون کر دیا۔ انسانی خیال کے پاؤں میں مذہب نے بیڑیاں ڈال دیں۔ آزادی خیال کا خاتمہ ہو گیا۔ فرض ۱۴۳۳ء وہ تاریخ ہے جب کہ انسان کو متنبہ کر دیا گیا کہ ہر شخص صرف انہیں خیالات کو ذہن میں جگہ دے سکتا ہے جس کی اجازت حکام کلیسا صادر کریں۔ امتیاز میں بھی فلسفہ دم توڑ رہا تھا۔ جیٹیشن نے اس کی تعلیم کی ممانعت کر دی اور اس شہر کے تمام مدارس بند کر دیے۔

سلطنت روما کے مشرقی صوبجات میں تو یہ واقعات گزر ہی رہے تھے لیکن مغرب میں بھی وہ قوت رنگ لائے بغیر نہ رہی جو ان واقعات کی محرک ہوئی تھی۔ ایک برطانوی راہب جس نے اپنا نام پلیمس رکھ لیا تھا مغربی یورپ اور شمالی افریقہ کے علاقوں سے ہو کر گذرا۔ وہ جہاں جاتا تھا یہ وعظ کرتا تھا کہ موت دنیا میں حضرت آدمؑ کے گناہ کی وجہ سے نہیں آئی بلکہ وہ بچا اور فطرتاً فانی تھے اور اگر ان سے گناہ سرزد نہ بھی ہوتا جب بھی وہ ضرور مرتے۔ ان کے گناہوں کی ذمہ داریاں انہیں کی ذات تک محدود تھیں جو ان کی اولاد پر کسی طرح حائد نہیں ہوتیں۔ ان صغریٰ و کبریٰ سے پلیمس نے جو مذہبی کتے اخذ کئے وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت کچھ نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔

روما میں پلیمس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی لیکن کارہج میں سینٹ آگسٹائن کے ایما سے اس پر بہت کچھ لے دے ہوئی۔ اور اسے بدعتی قرار دیا گیا۔ ڈا۔ سپولس میں ایک بڑی مجلس ان الزامات کی تحقیقات کے لئے منعقد کی گئی جو اس پر لگائے گئے تھے اور اگرچہ ارکان مجلس نے اسے بری کر دیا لیکن جب انوسنٹ اول روما کے بطریق اعظم سے اس معاملہ میں استلٹا کیا گیا تو اس نے پلیمس کی تکفیر کا فتویٰ صادر کیا۔ اس فتوے کی قبیل نہ ہونے پائی تھی کہ انوسنٹ کا انتقال ہو گیا اور اس کے جانشین زامبس نے فتوے کو منسوخ کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ پلیمس کے عقائد درست ہیں۔ وہ جماعت جو پوپ کی معصومیت کی منکر ہے ابھی تک ان مخالف و متضاد فتاویٰ کو اپنے فریق مخالف کی تردید میں پیش کرتی ہے۔ پلیمس کی قسمت یوں پلٹے کھا رہی تھی کہ افریقہ کے عیار اور چالباز پادریوں نے کاؤنٹ ولرس کو کاٹھ کر قیصر تک رسائی پیدا کر لی۔ وہاں سے یہ فرمان صادر ہوا کہ پلیمس بیک کافر ہے اور اس کے ساتھی جلاوطن کئے جائیں اور ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے۔ یہ گناہ کہ موت کا گذر دنیا میں بہوط آدم سے پہلے ہو چکا تھا گویا ایک سرکاری جرم تھا۔

جن اصول پر یہ عجیب و غریب فیصلہ مبنی تھا ان پر غور کرنا خالی از نفع نہ ہو گا۔ چونکہ مسئلہ زیر بحث محض فلسفہ کا ایک مسئلہ تھا اس لئے خیال ہو سکتا تھا کہ اس پر جو بحث کی جائے گی وہ قوانین فطرت کی رو سے کی جائے گی لیکن ایسا نہ کیا گیا بلکہ فقط مذہبی پہلو سے بحث کی گئی۔ جس شخص نے اس کتاب کو بغور پڑھا ہے اسے یاد ہو گا کہ ٹرٹلین نے مذہب عیسوی کے جو ارکان بیان کئے ہیں ان میں گناہ اولین۔ شقاوت مطلق۔ سرنوشت ازلی۔ غم اور کفارہ کے مسائل کا کہیں ذکر نہیں۔ عیسائیت کے جو مقاصد اس نے بیان کئے ہیں ان میں حصول نجات کے اس طریقہ کا نشان تک نہیں پایا جاتا جو دو صدی بعد مذہب عیسوی کا جزو لاینک بنا دیا گیا۔ ان اہم مسائل کی توضیح و تشریح کے لئے ہم سینٹ آگسٹائن کا رجحی کے رہیں منت ہیں۔

اس مسئلہ کا تصفیہ کرتے وقت کہ موت کا گذر اس دنیا میں حضرت آدم کے ہبوط سے پہلے ہو چکا تھا یا وہ فقط ان کے گناہوں کی پاداش میں بطور سزا تجویز کی گئی تھی یہ تو کسی نے نہ پوچھا کہ آیا کلیسائے رومن کے خیالات قانون فطرت کے موافق ہیں یا مخالف بلکہ دریافت کیا گیا تو یہ کیا گیا کہ وہ سینٹ آگسٹائن کے عقائد سے بھی مطابق رکھتے ہیں یا نہیں۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ جس عقیدہ کو پادریوں نے اس شہود کے ساتھ سراپا حقیقت قرار دیا اس کو آج کل کے مسلم اکتشافات نے بے و بالا کر دیا ہے۔ انسان کے ظہور سے مدتوں پہلے کروڑوں افراد بلکہ مخلوقات کی ہزار ہا نوعیں اور جنسیں نیست و نابود ہو چکی تھیں اور جو باقی ہیں وہ ایک ادنیٰ اور ناچیز جزو ہیں ان بے شمار گروہوں کا جن کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

اس بحث و مباحثہ کے اخیر فیصلہ سے ایک نہایت اہم نتیجہ مرتب ہوا۔ کتاب پیدائش کو بنائے مذہب عیسوی قرار دیا جا چکا تھا۔ پس جب اس کی اس روایت کو کہ حضرت آدم سے بہشت میں گناہ سرزد ہوا جس کی ان کو سزا دی گئی مذہبی لحاظ سے اس قدر موثق مانا گیا تو کیا وجہ ہے کہ بزرگان دین عیسوی اس کتاب کو تمام فلسفہ اور علوم کا محکم و معیار نہ قرار دیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بیت۔ طبقات الارض۔ جغرافیہ۔ علم الانسان۔ علم تاریخ غرضیکہ معلومات انسانی کے کل شعبوں کو اس سے تطبیق دے دی گئی۔

چونکہ سینٹ آگسٹائن کے عقائد نے دینیات کو سائنس کا حریف بنا دیا ہے لہذا اس ذی اثر بزرگ کے بعض خالص فلسفیانہ خیالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنا خالی از لطف نہ ہو گا۔ اس کی ایک کتاب ہے جس کا نام ”کنفشنس“ (اقتالات) ہے۔ اس کتاب کی گیارہویں

بارہویں اور تیرہویں فصل میں اس نے کتاب پیدائش کے پہلے باب کی تفسیر لکھی ہے جس کے بعض موزوں مقامات کا ہم ذیل میں اہتمام کرتے ہیں۔

یہ مقامات مکیمانہ مباحث سے معمور ہیں۔ اگرچہ اکثر حصہ مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقت نہیں رکھتا۔ ایک مقام پر خدا سے دعا مانگی ہے کہ بارالہا مجھے توفیق عطا فرما کہ اس کتاب مقدس کو سمجھ سکوں اور اس کے معانی مجھ پر ظاہر ہو جائیں۔ اس کا بیان ہے کہ یہ کتاب حشو و زوائد سے پاک ہے لیکن ایک ایک لفظ سے صمدی معنی پیدا ہو سکتے ہیں۔

خلقت کی صورت سے ظاہر ہے کہ اس کا خالق ضرور ہو گا۔ مگر ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس خالق نے زمین اور آسمان کو کیوں کر بنایا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس نے ان کو زمین اور آسمان کی حدود کے اندر بنایا ہو اس لئے کہ دنیا دنیا کے اندر موجود رہ کر نہیں بنائی جاسکتی اور نہ وہ ایسی حالت میں بنائے جاسکتے تھے جب کہ ان کے بنانے کے لئے کوئی سامان ہی موجود نہ تھا۔ اس ابتدائی چیتان کا حل سینٹ آگسٹائن نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ ”تو نے کہا اور زمین و آسمان بن گئے۔“

مگر یہ مشکل یہاں ہی طے نہیں ہو جاتی۔ سینٹ آگسٹائن لکھتا ہے کہ جو الفاظ خدا نے کہے ان کے اجزائے ترکیبی میں بوقت اظہار فصل واقع ہوا ہو گا یعنی الفاظ و حروف یکے بعد دیگرے ادا کئے گئے ہوں گے۔ ضرور ہے کہ کوئی شے مخلوق ان الفاظ کا ذریعہ اظہار بنی ہو۔ پس وہ شے گویا آسمان اور زمین کی پیدائش سے پہلے موجود ہو گی حالانکہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی مادی شے زمین و آسمان سے قبل کیونکر موجود ہو سکتی ہے۔ اس شے کا مخلوق ہونا لازمی ہے اس لئے کہ الفاظ منہ سے نکل کر ختم ہو گئے مگر ہم کو معلوم ہے کہ خدا کا کلام ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

اس کے علاوہ ممکن نہیں کہ الفاظ یکے بعد دیگرے ادا ہوئے ہوں۔ کل الفاظ وقت واحد میں ادا ہوئے ہوں گے ورنہ حدوث اور زمان لازم آتا ہے۔ تدریج کے لئے زمان کی قید لازمی ہے حالانکہ اس وقت سوائے قدم و ہٹا کے اور کچھ موجود نہ تھا۔ خدا کا علم اور قول ان امور کی بابت جو بقید زمان حادث ہوتے ہیں ازل و ابد سے متصف ہے۔

پھر بہت کچھ اخلاق کے ساتھ سینٹ آگسٹائن نے کتاب پیدائش کے اختتامی الفاظ ”ابتدا میں“ کی شرح کی ہے۔ اس شرح میں اس نے کتاب مقدس کی ایک اور آیت سے مدد لی ہے جو یہ ہے: ”اے خدا تیری منامیاں کس قدر عجیب و غریب ہیں۔ تو نے ان کو اپنی حکمت سے بنایا۔“ پس یہ ”حکمت“ ہی گویا ”ابتدا“ تھی اور اسی ”ابتدا میں“ خدا نے زمین و آسمان بنائے۔

آگے چل کر سینٹ آگسٹائن کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ آسمان و زمین بنانے سے پہلے خدا کیا کر رہا تھا۔ اگر اس کی صفت خالقیت کسی خاص وقت سے شروع ہوئی تو اس سے زمان لازم آتا ہے نہ کہ قدم اور قدم میں کوئی شے حادث نہیں ہوتی بلکہ سب کچھ موجود و مستقر ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب دینے میں اس نے اس بلاغت آفرینی سے کام لیا ہے جس کے لحاظ سے وہ مشہور ہے۔ وہ کہتا ہے: ”میں اس سوال کے جواب میں یہ تو نہ کہوں گا کہ خدا زمین و آسمان بنانے سے پہلے ان لوگوں کے لئے جو اس کے اسرار اور کنہ کا کھوج لگانا چاہتے ہیں جنم کے بنانے میں مصروف تھا۔ البتہ مستقر کو یہ جواب دوں گا کہ زمین و آسمان پیدا کرنے سے پہلے خدا نے کوئی شے نہیں بنائی اس لئے کہ مخلوق ہونے سے پہلے کوئی شے مخلوق نہیں ہو سکتی۔ زمانہ خود مخلوق ہے اور اس لئے ممکن نہیں کہ خلقت کے قبل اس کا وجود ہو۔ پھر زمانہ کیا ہے؟ زمانہ گزشتہ تو ہے نہیں۔ زمانہ مستقبل بھی معدوم ہے۔ رہ گیا زمانہ موجود۔ اس کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہے۔ اگر ہو تو شاید وہ شے ہو جسے دو عدموں کے درمیان کوئی بقا نہیں۔ زمانہ طویل یا زمانہ قلیل مسملات ہیں اس واسطے کہ جب ماضی و مستقبل ہی موجود نہیں تو ان کا وجود کیا۔ ان کا وجود سوا روح کے اور کیس نہیں۔“

جس عبارت میں سینٹ آگسٹائن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ گویا ایک مجددانہ بڑ ہے جس کا مخاطب خدا ہے۔ اس کی تصانیف کی حقیقت خواب پریشان کے ایک مجموعہ سے زیادہ نہیں۔ اس خیال سے کہ ناظرین ہمارے اس بیان کی تصدیق کر سکیں ہم بلا انتخاب کسی ایک مقام سے اس کی عبارت کے چند فقروں کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ ذیل کی عبارت بارہویں فصل سے نقل کی جاتی ہے۔

”پس اے میرے خدا یہی وہ بات ہے جو میری سمجھ میں آتی ہے جب کہ میں تجھے اپنے کلام پاک میں یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور زمین نہ تو دکھائی دیتی تھی نہ اس کی کوئی شکل تھی۔ اور سمندر پر اندھیرا چھایا ہوا تھا اور تو نے یہ نہیں فرمایا کہ تو نے ان کو کس دن پیدا کیا۔ یہ ہے وہ بات جو میری سمجھ میں آئی ہے اور اس کی وجہ فلک الافلاک ہے یعنی وہ عقلی آسمان جس کی عقل کو سب کچھ ایک ہی دفعہ معلوم ہو جاتا ہے تھوڑا تھوڑا کر کے اس طرح نہیں معلوم ہوتا کہ گویا چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے یا کوئی چیز آئینہ میں سے نظر آ رہی ہے بلکہ کل کا کل تیرا منظر بن کر دوبارہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک شے کا علم اب ہوا اور ایک شے کا تھوڑی دیر کے بعد بلکہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ان عقل کو بلا تدریج یا فصل زمان سب کچھ ایک

ہی دفعہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین غیر مرئی اور غیر مشکل اور تدریج زمانی سے عاری ہے۔ اور تدریج یا فصل ہی وہ حالت ہے جس کے باعث ایک شے اب ظاہر ہوتی ہے اور ایک شے کچھ دیر کے بعد۔ اس لئے کہ شکل یا صورت کے موجود نہ ہونے سے اشیا میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ پس ہر شے کا وجود انہیں دونوں کے ساتھ وابستہ ہے یعنی ایک تو اس ابتدائی ہستی کے ساتھ جو شکل پکڑ چکی تھی اور ایک اس ابتدائی ہستی کے ساتھ جس کی کوئی شکل نہ تھی۔ ایک فلک تھا لیکن فلک الافلاک تھا۔ دوسری زمین تھی لیکن وہ زمین جو متحرک اور بے شکل تھی۔ انہیں دونوں کی وجہ سے یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جیسا کہ اے خدا تیری کتاب مقدس بلا تخصیص ایام کہتی ہے کہ ابتدا میں خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ کیونکہ ساتھ ہی اس امر کی بھی تشریح و توضیح کر دی گئی کہ معبود ذہنی کوئی زمین ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ یہ قبہ لا جوردی دوسرے دن پیدا کیا گیا اور اس کا نام آسمان رکھا گیا۔ جس سے ہم کو بلا تحمین ایام معلوم ہو جاتا ہے کہ کس آسمان کا پہلے ذکر کیا گیا۔ اے خدا تیرا کلام بھی کس قدر گہرا ہے جس کی سطح ہمارے سامنے ہے۔ ہم بچوں کی طرح ہیں اور وہ ہمارا دل لبھاتی ہے۔ اے میرے خدا تیرے کلام کی گہرائی تعجب خیز ہے اور بہت ہی تعجب خیز ہے۔ اس گہرے کونکس میں جھانکتے ہوئے دل پر ہیبت چھا جاتی ہے وہ ہیبت جو عزت و آہد میں لپٹی ہوئی ہے اور لرزہ طاری ہو جاتا ہے وہ لرزہ جو عشق و محبت کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس کے دشمنوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ کاش تو اپنی تیغ دودم سے قتل کر ڈالتا تاکہ وہ تیرے کلام سے دشمنی کرنے کے قابل نہ رہے اور میرے نزدیک ان کا اپنے نفس کے اندر مارا جانا بہت ہی پسندیدہ ہے اس لئے کہ اس طور پر وہ تیری ذات کے اندر بقا حاصل کر سکیں گے۔“

ذیل کے فقرہ کا اقتباس سینٹ آگسٹائن کی کتاب ”اقبالات“ کی حیر ہویں فصل سے کیا جاتا ہے جس میں وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ مسئلہ تثلیث کتاب پیدائش میں موجود ہے۔ اس اقتباس سے ہمارا مقصود اس کی شان تفسیر نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ دکھانا ہے کہ وہ کتاب مقدس کے اسرار و غوامض کی گتھیاں کیوں کر سلجھاتا ہے۔

”اب مجھ کو تثلیث نظر آ رہی ہے اور اس طرح نظر آ رہی ہے جیسے آئینہ میں کوئی چیز دھندلی دھندلی دکھائی دیتی ہو۔ اور یہ اے میرے خدا تیرا جلوہ ہے کیونکہ تو نے باپ ہونے کی حیثیت سے آسمان و زمین کو اس کا مظہر بن کر پیدا کیا جو ہماری عقل و تمیز کا مبدا ہے اور جو تیری عقل ہے اور تجھ سے پیدا ہوا اور ازل و ابد میں تیرا شریک و سیم ہے یعنی تیرا بیٹا۔ ہم فلک الافلاک کا بہت کچھ حال بیان کر چکے ہیں اور اس زمین کا جو دکھائی نہ

دری تھی اور بغیر کسی صورت کے تھی، اور تاریک سمندر کا بھی لحاظ اس کی مسخ شدہ روحانیت کے تزلزل اور بے ثباتی کے ہم نے بہت کچھ ذکر کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے اس کی شکل اختیار کر لی ہو جس نے بقدر اس کی نشوونمائے موجودہ کے اس میں جان ڈالی تھی اور اس کی روشنی کی وجہ سے حسن و جمال کے سانچے میں ڈھل کر وہ فلک الافلاک بن گیا ہو جو آگے چل کر اس طرح قائم کیا گیا کہ اوپر نیچے پانی ہی پانی تھا۔ اس طرح خدا کے نام کے ذریعہ سے مجھ کو باپ کی حقیقت کا علم ہوا جس نے یہ کائنات بنائی اور ابتدا کے نام کے ذریعہ سے مجھے بیٹے کی ماہیت معلوم ہوئی جس میں ساری دواڑ ہو کر اس نے اس کائنات کو پیدا کیا اور اپنے خدا پر بھلے ثلثیت ایمان لا کر جب میں نے اس کے کلام پاک کو اور زیادہ تجسس اور شخص کی نظر سے دیکھا تو مجھے روح القدس کا جلوہ سطح آب پر نظر آگیا۔ پس اے میرے خدا مجھ پر ثلثیت یعنی باپ بیٹے اور روح القدس کی حقیقت آشکارا ہو گئی کہ وہی آفرینیت کون و مکان ہے۔“

سینٹ آگسٹائن کی تصانیف کو اہل مذہب پندرہ سو برس سے مستند مانتے چلے آئے ہیں۔ اس لئے ہم کو بھی لازم ہے کہ ان کا ذکر ادب سے کریں اور سچ تو یہ ہے کہ ہم کو سوء ادبی کی ضرورت بھی نہیں۔ جن فخرات کا ہم نے ان کی تصانیف سے اوپر اقتباس کیا ہے وہ اپنی تنقید خود کر رہے ہیں۔ سائنس اور مذہب میں جو نزاع پیدا ہو گئی اس کے بانی مبنی بھی حضرت ہیں۔ کتاب مقدس کی اصلی غرض یہ تھی کہ لوگوں کو نیکی اور پاکبازی کا رستہ دکھائے۔ ان بزرگوار نے علوم انسانی کی قسمت کا فیصلہ جو اس کے بس کا نہ تھا اس کے حوالے کر کے نہایت بے باکی کی راہ سے انسان کے قوائی عقلی پر جابرانہ حکومت کا سلسلہ قائم کر دیا۔ مثال تو قائم ہو ہی چکی تھی پھر بہت سے پیدا ہو گئے۔ مشاہیر فلاسفہ یونان کی تصانیف کو ان مقدس پیروان کلیسا نے علوم سفلی کی ذیل میں داخل کیا۔ عجائب خانہ اسکندریہ کے عدیم المثال اور روشن کارناموں پر جمالت تعصب اور غیر مملک القوم مہملات کے کالے بادلوں کی گھٹا چھا گئی جس میں سے پادریوں کے قہر و انتقام کی بجلیاں رہ رہ کر کوندے لگیں۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ علوم و فنون میں جن کا مدار علیہ الہام ربانی ہو کسی تعمیر یا تبدل یا ترقی کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اگر الہام کو سائنس کا سرچشمہ مان لیا جائے تو تمام نئے اکتشافات غیر ضروری ٹھہرتے ہیں۔ جو باتیں خدا کو بتانی منظور تھیں وہ اس نے بذریعہ کتب مقدس انسان پر ظاہر کر دیں۔ ان کے سوا اور کسی قسم کی دریافت کی کوشش گویا خدا کی کنہ کی بیہودہ اور گستاخانہ تلاش ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس مقدس سائنس کی حقیقت کیا ہے جو بذریعہ الہام ربانی حاصل ہوا اور جس پر بزرگان دین یعنی پادری صاحبوں نے معلومات انسانی کا حصر کر دیا۔ یہ علم وہ علم ہے جو کائنات کے تمام مادی و روحانی مظاہر کو افعال انسانی کے مشابہ قرار دیتا ہے اور خدائے قوم کو ایک عظیم الجثہ انسان سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ اس کی رو سے زمین ایک چمٹی سطح ہے جس پر آسمان گنبد کی طرح قائم ہے یا بقول سینٹ آگسٹائن جملی کی طرح گھنچا ہوا ہے۔ آسمان میں سورج، چاند اور ستارے اس غرض سے حرکت کرتے ہیں کہ انسان کو شبانہ روز روشنی پہنچائیں۔ زمین اس بارے میں خدا نے عدم سے پیدا کیا ان تمام حیوانات و نباتات سمیت جو اس پر آباد ہیں چھ دن میں تیار ہوئی۔ آسمان کے اوپر بہشت ہے اور زمین کے نیچے ایک تاریک و آتشی مقام میں دوزخ ہے۔ زمین مرکز کائنات ہے اور باقی تمام اجسام فلکی و غیر فلکی اس کے تابع اور اس کے فائدہ کی غرض سے بنائے گئے ہیں۔ انسان کو زمین کی خاک سے بنایا گیا۔ اول اول وہ اکیلا تھا مگر بعد میں اس کی ایک پہلی سے عورت بنائی گئی۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اسے خدا نے فردوس میں جو دریائے فرات کے کنارے واقع تھا رہنے کو جگہ دی۔ وہ نہایت عاقل اور پاک تھا لیکن چونکہ اس نے ثمر ممنوعہ کھا کر خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی لہذا اسے مشقت اور موت کی سزا دی گئی۔ اس انسان اول کی اولاد کو اس کی سزا سے کچھ عبرت نہ ہوئی بلکہ ان سے ایسی ایسی بدیاں اور شرارتیں سرزد ہوئیں کہ خدا کو ان کے تباہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور اس لئے ایک طوفان عظیم روسے زمین پر نازل کیا گیا کہ پہاڑوں کی چوٹیاں تک پانی میں غرق ہو گئیں۔ جب یہ طوفان انسان کو غارت کر چکا تو ایک ہوائے تند چلی جس نے پانی کو خشک کر دیا۔

اس آفت سے حسرت نوع اور ان کے تین بیٹے ہام، سام اور یا فث مع اپنی بیویوں کے ایک کشتی میں سوار ہو کر بچ گئے۔ ان میں سے سام نے ایشیا کو از سر نو آباد کیا ہام نے افریقہ کو اور یا فث نے یورپ کو۔ چونکہ امریکہ کی حقیقت مقدس پادری صاحبوں کو معلوم نہ تھی اس لئے اس کی آبادی کے مورث اعلیٰ کے نام کی گنجائش نہیں نکالی گئی۔

اب ذرا سنئے کہ یہ بزرگوار اپنے دعاوی کی تائید میں کس قسم کے دلائل پیش فرماتے ہیں۔ لکٹنٹ شمس نے زمین کے کروی شکل ہونے کی تردید ان الفاظ میں کی ہے: ”کیا یہ ممکن ہے کہ انسان اس درجہ لغو اور مہمل ہو کہ یہ بات باور کر لے کہ درخت اور پودے زمین کی دوسری طرف نیچے کو لٹک رہے ہیں۔ یا وہاں کے باشندوں کے پاؤں اوپر ہیں اور سر نیچے۔ اگر ان لوگوں سے پوچھا جائے کہ ان مہملات کی کیا توجیہ کرتے ہو اور کیوں یہ

چیزیں زمین پر سے گر نہیں جاتیں تو وہ کہتے ہیں کہ خاصیت اشیاء یہی ہے کہ بھاری چیزیں بھرنے کے آروں کی طرح مرکز کی طرف مائل ہوں اور ہلکی چیزیں مثلاً "بادل و ہوا اور آگ مرکز سے اوپر کی طرف اٹھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کو کیا کہوں جو ایک بار غلطی کرتے ہیں تو اس پیلے پن سے اس قائم ہو جاتے ہیں کہ ایک حماقت کی تائید میں دوسری حماقت پیش کرتے ہیں۔" مسئلہ تقابل و جلیں یعنی اس مسئلہ کے متعلق کہ زمین کے دوسری طرف جو انسان آباد ہیں ان کے پاؤں کے تلوے ہمارے پاؤں کے تلووں کے متقابل ہیں سینٹ آگسٹائن یوں ارشاد فرماتے ہیں: زمین کے اس طرف آبادی کا ہونا محال ہے اس لئے کہ کتاب مقدس میں حضرت آدم کی اولاد میں سے کوئی قوم اس قسم کی بیان نہیں کی گئی۔" لیکن شاید سب سے زیادہ زبردست اور لاجواب دلیل زمین کے کروی شکل ہونے کے خلاف یہ پیش کی جاتی تھی کہ اس طرف کے باشندوں کو حشر کے دن خداوند خدا کا ہوا سے زمین پر اترنا کیوں کر نظر آئے گا۔

دنیا میں موت کی آمد، واقعات عالم میں روحانیات کا حکیم تصرف۔ ملائکہ و شیاطین کے مناصب۔ زمین کا ایک وقت معبودہ پر آگ سے جل جانا۔ بائبل کے مینارہ کا واقعہ۔ زبانوں کا اختلاف۔ بنی نوع انسان کا روئے زمین پر منتشر ہونا۔ مظاہر قدرت مثلاً "کوف و خوف و قوس قزح کی تاویل۔ یہ تمام ایسے مسائل ہیں جن پر یہاں بحث کرنا فضول ہے۔ خصوصاً ان تصورات پر جو مقدس پادری صاحبوں نے خدا کی ذات و صفات کے متعلق قائم کئے ہیں میں کچھ نہیں کہنا چاہتا اس لئے کہ ان تصورات کے پردہ پر خدا کی جو شبیہ کھینچی گئی ہے وہ انسان سے بہت ہی مشابہ شان ایزدی سے بہت ہی گری ہوئی ہے۔

البتہ کاساس انڈیکا پبلیکیشنز کے بعض خیالات کا التقاط اس مقام پر کرنا غیر موزوں نہ ہو گا۔ یہ خیالات چھٹی صدی میں عام طور سے رائج تھے۔ اس شخص نے ایک کتاب "کریجن ٹاپوگرافی" (مسیحی جغرافیہ) کے نام سے لکھی تھی جس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ اس لٹھرانہ عقیدہ کی تردید لی جائے کہ زمین کروی شکل ہے اور نیز بت پرستوں کے اس دعویٰ کا ابطال کیا جائے کہ منطقہ حارہ کے جنوب میں منطقہ معتدلہ واقع ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جغرافیہ کے صحیح اور سچے اصول کی رو سے زمین ایک سطح زوارہ الزوایا ہے جو بقدر چار سو دن کی مسافت کے مشرق سے مغرب تک اور شمالاً "جنوباً" اس سے نصف فاصلہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے چاروں طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے جن پر آسمان قائم ہے۔ شمال میں ایک پہاڑ واقع ہے جو سب پہاڑوں سے بڑا ہے۔ جب یہ پہاڑ آفتاب کی شعاعوں کا حائل ہو جاتا ہے تو دنیا پر تاریکی چھا جاتی ہے جسے رات کہتے ہیں۔ زمین بالکل سطح نہیں

ہے بلکہ جنوب کی طرف تھوڑی سی جھکی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دریائے فرات و دجلہ وغیرہ جگے بھاؤ کا رخ جانب جنوب ہے نہایت تیزی سے بہتے ہیں لیکن دریائے نیل کا دہارا بلندی پر چڑھنے کے باعث بہت سست رفتار ہے۔

بچہ جو ساتویں صدی میں اسی طبقہ کا ایک مصنف ہو گذرا ہے لکھتا ہے: ”دنیا چھ دن میں پیدا کی گئی اور زمین اس کا مرکز اور سب سے بڑا جسم ہے۔ آسمان ایک آستین اور سیال جسم مدور ہے جو زمین پر شامیانہ کی طرح بٹا ہوا ہے اور مرکز زمین سے اس کا ہر ایک حصہ مساوی البعد ہے۔ یہ ہر روز نہایت تیزی سے گھومتا ہے مگر اس تیزی میں سات سیاروں کی مزاحمت کی وجہ سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ تین سیارے زحل مشتری اور مریخ آفتاب سے اونچے ہیں۔ ان کے نیچے آفتاب ہے اور آفتاب کے نیچے باقی تین سیارے ہیں یعنی زہرہ عطارد اور قمر۔ ستارے اپنے مقررہ دائروں میں گردش کرتے ہیں۔ اور شمالی ستاروں کا مدار سب سے چھوٹا ہے۔ مرش مغل کی حدود مقرر ہیں۔ اس میں ملائکہ آباد ہیں جو زمین پر اتر کر انسانی شکل اختیار کرتے ہیں اور انسانی فرائض ادا کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ آسمان کی حرارت بخ کے ٹھنڈے پانی سے معتدل ہوتی رہتی ہے ورنہ اسے آگ لگ جائے۔ فلک ادنیٰ کا نام آسمان ہے اس لئے کہ یہ آب فوقانی و تحتانی کے درمیان حد فاصل ہے۔ آسمانی عالم آب فلک الارواح سے نچا مگر تمام جسمانی اشیا سے اونچا ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا ذخیرہ ایک دوسرے طوفان کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے لیکن ہمیں ان لوگوں کے ساتھ اتفاق ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ عالم آب ثوابت کی حرارت کے اشتداد میں اعتدال پیدا کرنے کی غرض سے بنایا گیا ہے۔“

جمل تعصب اور خیرہ چشمی کی بھی کوئی حد ہے!! کیا انہی لغو اور مہمل خیالات کی اشاعت کے لئے فلاسفہ یونان کی تصانیف سے اپا کیا گیا تھا؟ لیکن جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ ایک دن ان مہملات کی قطعی کھلنے والی تھی۔ جب ”رہنارمیشن“ (اصلاح کینہ) کا دور آیا تو ان فاضل نقادوں نے جو اس زمانہ میں پیدا ہوئے ان تمام مصنفین کی کتابوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کے بعد ان کو حقارت کی اس ٹوکری میں جمویک دیا جو ان کے لئے صدہا سال سے تیار کی جا رہی تھی۔ آج کے دن ان میں سے ایک کتاب بھی ایسی نہیں جسے ہم نفرت کی نظر سے نہ دیکھتے ہوں۔

علوم و فنون کا جو نظام اس طور پر مدون کیا گیا اس کا سب سے زیادہ عجیب و غریب جزو اس کی منطق اور اس کے دعوؤں کے ثبوت کا ڈھنگ تھا۔ اثبات و عادی کے لئے معجزات

پیش کئے جاتے تھے اور ایک واقعہ کے ثبوت میں ہمیشہ کسی غیر متعلق واقعہ کی مثال پیش کر کے سمجھ لیا جاتا تھا کہ ثبوت مکمل ہو گیا۔ ایک عربی عالم نے اس طرز ثبوت کی نسبت کیا خوب لکھا ہے: ”اگر کوئی بھان متی کا تماشا کرنے والا مجھ سے کہے کہ تین کا عدد دس سے زیادہ ہے اور اس کا ثبوت چاہو تو میں اس چھڑی کا سانپ بنا کر دکھا دیتا ہوں تو میں بے شک اس کے ہچکنڈے کا تو قائل ہو جاؤں گا مگر اس کے دعویٰ کو کسی طرح تسلیم نہ کروں گا۔“

چونکہ وہ فریق جو سلطنت میں برسرِ اقتدار ہو گیا تھا اس قسم کی کتابیں تصنیف کرنے سے عاجز تھا جنہیں بت پرست مصنفین کی مشہور تصانیف سے عقلی طور پر یارائے مسابقت ہو سکے اور یہ ممکن نہ تھا کہ فریق مذکورہ مقابل کو دافئ و حکمت میں اپنے سے بڑھ کر تسلیم کرے لہذا مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ علوم سفلٰی یعنی فلسفہ و طبیعیات کی اشاعت کی راہ میں نہ صرف روڑے اٹکائے جائیں بلکہ فلاسفہ و طبعیین پر سختیاں کی جائیں تاکہ وہ اکتساب و ترویجِ علوم و فنون سے بالکل ہی دست بردار ہو جائیں اور علم کا چراغ گل ہو جائے۔ قیصر ویشٹائن کے عہد میں جو مظالم حکمائے اشراقیین پر روا رکھے گئے ان کی محرک یہی پولیشکل مصلحت تھی۔ ان پر جادوگری کا الزام لگایا گیا اور بہت سے فلاسفہ قتل کرا دیے گئے۔ فلسفہ کو قدم قدم پر خطرات کا سامنا تھا۔ فلسفہ دانی سرکاری جرائم کی فہرست میں شامل ہو گئی۔ علم و حکمت کی جگہ اب عجائبات و توہمات نے لے لی جن سے طبعیتوں کو عشق پیدا ہو گیا۔ اور مصر کے جن مشاہیر نے عجائب خانہ اسکندریہ کو بقائے دوام کی چادر اڑھا دی تھی ان کے جانشین جاہل اور اہلِ پرست راہبوں کے گردہ بن گئے۔

لے ایشیائے کوچک کا ایک قدیم شہر جسے سکندر کی فوج کے ایک افسر اٹیگوس نے بنایا اور دوسرے افسر پرڈیکاس نے اپنی بی بی کی یادگار میں اس کا نام تاسیہ رکھا۔ مترجم
لے جس طرح مسلمانوں میں شرع کے تین ماخذ ہیں قرآن۔ حدیث اور اجماع اسی طرح عیسائیوں میں بھی ان مسائل کے متعلق جو مابہ النزاع ہوتے تھے اور جن کا تصفیہ انجیل سے نہ ہو سکتا تھا پادریوں کی کونسلیں منعقد کی جاتی تھیں چنانچہ اس قسم کی پہلی کونسل ۳۲۵ء میں بعد ازاں قیصر قسطنطین تاسیہ میں منعقد ہوئی۔ مترجم

لے ٹرائے کے محاصرہ کو جسے ہومر نے اپنی مشہور کتاب ”ایڈ“ میں زندہ جاوید کر دیا ہے جب دس سال کی مدت گزر چکی اور یہ شہر یونانیوں سے سر نہ ہو سکا تو پولیسیر کو جو ہمارے یونان میں بوجہ اپنی ذکاوت و فراست کے ایک خاص شہرت رکھتا تھا ایک جیلہ سوچا۔ اس نے پیتل کا ایک

گھوڑا تیار کیا اور اس کے جوف میں خود چھپ گیا اور اس گھوڑے کو شہر پناہ کے قریب لے جا کر راتوں رات رکھ دیا۔ محصورین اسے ایک انجنیے کی بات سمجھ کر اندر اٹھالے گئے۔ اس ترکیب سے یولیسیز شہر کے اندر داخل ہو گیا اور گھوڑے سے باہر نکل کر شہر کا پچانگ کھول دیا اور محاصرین شہر پر قابض ہو گئے۔ مترجم

گنہ مشہور جغرافیہ نویس اسطرابو لکھتا ہے کہ جنوبی اطالیہ کا یہ شہر ۷۰۰ قبل مسیح میں ظلیج ٹارٹم کے کنارے آباد کیا گیا تھا۔ دوسری صدی قبل مسیح تک اس کا شمار دولت یونان کے سب سے زیادہ آباد اور مرفہ الحال شہروں میں ہوتا رہا۔ لیکن ہنی ہال افریقی پہ سالار کی فوج کشی کے زمانہ کے بعد سے اس میں انحطاط کے آثار شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ یہ ایسا جگہ کہ جب سیرو کا زمانہ آیا تو بجز چند بوسیدہ دیواروں اور کھنڈروں کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ حکیم فیثاغورث کی زندگی کے آخری دن یہیں گزرے اور سیرو کے زمانہ تک اس کی قبر کے آثار بھی یہاں موجود تھے۔ مترجم

۱۰۰۰ ق م قدیم یونانی روایات میں اپنی بہادری اور شجاعت کے لحاظ سے بے مثل سمجھا جاتا تھا۔ ایک روایت یہ تھی کہ اس کے باپ نینٹلس نے ایک دفعہ دیوتاؤں کی دعوت کی اور بیٹے کو فوج کر کے ممانوں کے سامنے دسترخوان پر جن دیا۔ صرف ایک دیوتا کو دھوکا ہوا اور وہ مقتول کا ایک بازو کھا گیا۔ اس کے بعد ہرس نے آپ حیات چھڑک کر اسے زندہ کر دیا اور جس دیوتا نے اس کا بازو کھا لیا تھا بجائے گوشت و خون کے بازو کے عاج کا بازو لگا دیا۔ مترجم

۱۰۰۰ ق م قدیم یونان کا ایک شہر جس پر اہل ایجنٹر نے ۴۴۷ ق م میں قبضہ کیا۔ اسی مقام پر سکندر کے باپ شاہ فیلقوس نے یونانی ریاستوں کی متحدہ فوجوں کو شکست فاش دے کر ان ریاستوں کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس شہر کے کچھ کھنڈر ابھی تک باقی ہیں۔ مترجم

۱۰۰۰ ق م لجنہ "ایڈ" کے مشاہیر میں سب سے زیادہ ممتاز و سرمد آوردہ پہلوان کا نام ہے۔ مترجم
۱۰۰۰ ق م قدیم یونانی روایات کے بموجب جش کا ایک شاہزادہ تھا جو ژاعے کی جنگ میں لشکر کے محصورین کی کمک کے لئے آیا تھا اور بہت کچھ داد شجاعت دینے کے بعد آخر ایکلیز کے ہاتھوں مارا گیا۔ مترجم

۱۰۰۰ ق م گومیڈیا دولت روما کا ایک آباد اور پر رونق شہر تھا جس کی بنا گومیڈیز اول نے ۴۴۳ ق م میں ڈالی تھی۔ قیصر ابو کلیشین و قسطنطین اس زمانہ میں جبکہ رومی افواج ممالک مشرق کے صحر کرنے میں مصروف تھیں یہیں بودپاش رکھتے تھے۔ چنانچہ قسطنطین کا انتقال ۲۲ مئی ۳۳۷ ق م کو اسی مقام میں ہوا۔ اسکندر اعظم کا وقایع نویس ایرن میں پیدا ہوا تھا۔ مترجم

۱۰۰۰ ق م قدیم یونانی علم الادیان میں مذکور ہے کہ اینٹس شاہ کیلیڈان نے آرمیس دچی کو بیعت نہیں دی تھی۔ اس پر دچی نے غضب ناک ہو کر ایک جنگی سور کو مامور کیا کہ اس بادشاہ کی سلطنت کو تباہ کر ڈالے چنانچہ یہ آفت آسمانی ملک کو برباد کرنے لگی۔ بادشاہ کے بیٹے میبلر نے یونان کے بہت

سے سوماؤں کے ساتھ مل کر اس بلائے نامانی کے استیصال کی غرض سے ایک جتنا قائم کیا اور بالآخر اپنے برعصے سے ہلاک کر ڈالا اور اس کی کھال پر بطور فتح و نصرت کی کشتی کے قبضہ کر لیا۔ مترجم

۱۔ تیسری صدی عیسوی کے وسط میں بمقام لبیا پیدا ہوا اور چوتھی صدی کے شروع میں اسکندریہ کا نائب پادری مقرر ہوا۔ حضرت عیسیٰ کے متعلق عیسائیوں کا عام عقیدہ تیسری صدی میں یہ تھا کہ خدا بھل انسان یسوع مسیح کے قالب میں نمودار ہوا لیکن اس کی یہ انسانی حیثیت اس کی ربانی حیثیت کے تابع تھی۔ بالفاظ دیگر بیٹا اگرچہ خدا تھا لیکن باپ پر فوقیت نہ رکھتا تھا اور نہ اس کے مساوی تھا بلکہ اس سے دوسرے درجہ پر تھا۔ لیکن چوتھی صدی کے شروع میں بوجہ ان تواضع کے جو انیت و الوہیت کے اس پراسرار و ناقابل فہم مسئلہ میں پائے جاتے تھے لوگوں میں اختلاف رائے پیدا ہو چلا۔ بعض کی یہ رائے تھی کہ بیٹا باپ سے دوسرے درجہ پر ہے۔ لیکن جو زیادہ خوش عقیدہ تھے اور بیٹے کی جناب میں زیادہ ارادت رکھنے کے مدعی تھے یہ دعویٰ کرنے لگے کہ بیٹا اور باپ مساوی ہیں۔ ایرکس آخر الذکر جماعت کا مخالف تھا اور اس مخالفت میں اس نے نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ اگر بیٹے کا درجہ باپ سے کم ہے تو وہ خدائے مطلق نہیں یعنی باپ کے برابر نہیں اور چونکہ برابر نہیں اس لئے اس کا جوہر یا اصل خدا کے جوہر یا اصل سے مختلف ہے اور اگر برابر ہے تو اس کا جوہر کامل اور نقص سے مبرا ہے اور اس لئے وہ خود بھی کامل اور بے عیب ہے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ دو خدا موجود ہو گئے جو ہر ایک لحاظ سے مساوی الٰہیت ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ خدا کے علاوہ جو غیر مخلوق ہے اگر کوئی شے موجود ہو سکتی ہے تو وہ مخلوق ہستیاں ہیں یعنی وہ موجودات حادث جنہیں خدائے قدیم نے عدم سے پیدا کیا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ بیٹا قدیم نہیں ہو سکتا بلکہ ایک ایسا وقت بھی تھا جب کہ وہ نہ تھا اس لئے وہ زمانی اعتبار سے محض اول و اشرف المخلوقات ہے۔ رحمت ہو ایرکس کی روح پر جس کے یہ سچے سیمیانہ عقائد دو صدی تک کلیت کے ظلم کو توڑنے کی کوشش میں سرگرم رہے۔ لیکن بت پرستی عیسائی مذہب کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھی۔ ساتویں صدی کے خاتمہ سے پہلے ایرکس کے مذہب کا خاتمہ ہو گیا۔ غرض یہی عقائد تھے جن کی وجہ سے بچارہ ایرکس کافر اقرار قرار دیا گیا اور جلاوطن ہوا۔ مترجم

۲۔ اہل اس حقیقت کو جس پر علوم جدیدہ کو اس قدر ناز ہے اور جس کے اکتشاف کے لئے اسے علم و حکما کے بے تعداد تجربوں اور مشاہدوں کا شرمندہ احسان ہونا پڑا کہ کے ایک ایسے جو نہ اشراقی تخیل سے آشنا تھا نہ مشائی عقل میں دسترس رکھتا تھا جس کو نہ کبھی مندسانہ تجربہ سے سابقہ پڑا نہ طبعیانہ مشاہدہ کا اتفاق ہوا ان روشن الفاظ میں وہ کہہ رہا ہے۔ ”کل من علیہا فان ویبقی وجد ربک والجلال والاكرام“۔ ”کل نفس ذائقته الموت“۔ جس ہمہ گیر اصول کی طرف ان ربانی الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے اس کا اطلاق اشرف المخلوقات آدم سے لے کر ازل

موجودات جراثیم تک یکساں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معارف و حقائق پر انسان کی عقل مجرد کے علاوہ ایک اور طاقت بھی روشنی ڈال سکتی ہے اور وہ طاقت مذہب ہے۔ مذہب اور سائنس گو اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے مختلف اشیا کے حقیقت آموز ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ ضمناً اگر کسی ایسے مسئلہ کا ذکر مذہب میں آجائے جس پر بحث کرنا سائنس کا کام ہو تو مذہب کوئی ایسی بات کہہ جائے جسے عقل انسانی غلط ثابت کر سکے۔ اس لئے کہ مذہب اور سائنس روشنی کی وہ کرنیں ہیں جو ایک ہی شعلو سے نکلی ہیں۔ ایک خدا کا کلام ہے دوسرا خدا کا کام۔ دونوں میں تضاد ممکن نہیں۔ مسئلہ حدوث ممت بعد از ہبوط یا قبل از ہبوط آدم کے متعلق صیاسیت نے جو غلطی کی ہے وہ جیسا کہ خود مصنف نے ظاہر کر دیا ہے اس مذہب سے منسوب نہیں کی جاسکتی جس کی تلقین رطلین نے کی تھی اگرچہ الوہیت مسیح کے متعلق اس زمانہ کے عقائد بھی فاسد ہو چکے تھے۔ جو رومن کیتھولک پادریوں کے اختراعات کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ غرض حقیقت ہر جگہ ایک ہے خواہ اس کا اظہار مذہب کے ذریعہ سے ہو خواہ سائنس کی وساطت سے۔ اسلام نے جو شرک بت پرستی اور توہمات باطلہ کی آمیزش سے شروع ہی سے پاک رہا جو کچھ سکھایا ہے وہ ہمارے اس دعوے پر گواہ عادل ہے۔ مترجم

اللہ جن دو مقامات کا اقتباس یہاں کیا گیا ہے اگرچہ بہترین ہوتا کہ انہیں قلم انداز کر دیا جاتا اس لئے کہ ان کا مطلب یا تو خود جناب آگسٹائن نے سمجھا ہو گا اور یا وہ محض سمجھ سکتا ہے جس کو روح القدس کے فیضان سے خاص طور پر بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا ہو لیکن اس خیال سے کہ ناظرین بھی سیٹ آگسٹائن کی ہرزہ سرائی یا بقول مصنف مہذبانہ بڑ کا لطف اٹھانے میں ہمارے ساتھ شریک ہو سکیں اصل عبارت کا لفظی ترجمہ درج کرنا ہم نے ضروری خیال کیا۔ مترجم

اللہ امام غزالی علیہ الرحمۃ کی طرف اشارہ ہے۔ مترجم

تیسرا باب

نزاع مذہب و سائنس دربارہ مسئلہ توحید۔ پہلی یعنی جنوبی اصلاح

اہل معراصر کرتے ہیں کہ مریم عذرا کی پرستش کو رواج عام دیا جائے۔ قسطنطنیہ کا بطریق نسطور ان کی مخالفت کرتا ہے لیکن انجام کار بوجہ اس رسوخ کے جو مصریوں کو دربار قیصر میں حاصل ہے وہ نسطور کو حلاوطن کرا دیتے ہیں اور نسطور کے پھر منتشر ہو جاتے ہیں۔

اصلاح جنوبی (یعنی اسلام) کا آغاز۔ حملہ ایران۔ اس کے اخلاقی نتائج۔ اصلاح عرب۔ حضرت محمدؐ نسٹوری فرقے کے راہبوں سے ملتے ہیں اور ان کے اصول اختیار کر کے ان اصول پر اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ مریم عذرا کی پرستش، مسئلہ تثلیث اور اس عقیدے سے جو توحید باری سے توافق نہیں رکھتا وہ ابا کرتے ہیں۔ عرب کی بت پرستی کو بہ جبر مٹا دیتی ہیں اور دولت روم پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کے جانشین شام مصر ایشیائے کوچک شمالی افریقہ اور ہسپانیہ کو مسخر اور فرانس پر حملہ کرتے ہیں۔

اس کشمکش سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وحدت واجب الوجود کا اصول دولت روم کے اکثر حصہ میں رائج ہو جاتا ہے۔ سائنس از سر نو زندہ ہوتا ہے اور مسیحی دنیا کے بہت سے مشہور مرکز حکومت مثلاً "اسکندریہ" کا رتھج یہاں تک کہ بیت المقدس تک عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔

دولت روم کی حکمت عملی نے عہد قدیم کی عیسائیت میں بت پرستی کا عنصر ملا کر سلطنت

کے باشندوں کو کفار مسیحی نمایا دیا تھا۔ بت پرست اور عیسائی لمحاظ عقائد ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دونوں فریق ایک دوسرے میں مذہبی طور پر ضم ہو گئے تھے۔ عیسائیت نے بت پرستی میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں اور بت پرستی نے عیسائیت کو بہت کچھ متغیر کر دیا تھا۔ یہ دو غلام مذہب دولت روما کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔

اس اختلاط سے جو عظیم الشان توسیع مرتب ہوئی اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسیحی جماعت دولت مند ہو گئی اور اس کے سیاسی اقتدار کا پلہ بھاری ہو گیا۔ سرکاری مانگنڈاری کی رقم خلیفہ کا ایک بہت بڑا حصہ کلیسا کے خزانوں میں داخل ہونے لگا۔ اس دولت پر دست مسابقت دراز کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دین عیسوی کی حمایت کا جامہ ریائی پن کر حقیقت میں اس کے دعویٰ فوائد سے مستفید ہونے کو اپنا نصب العین قرار دے رکھا تھا۔

قیصر زمانہ سابق کے عہد میں فتوحات کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ سلطنت کی تکمیل ہو چکی تھی۔ سپاہیانہ زندگی کے مقاصد اصلی سب ختم ہو چکے تھے۔ جنگ و جدل تغلب و تصرف اور لوٹ مار کا زمانہ گزر چکا تھا۔ لیکن اہل حرص و ہوا کے لئے ایک اور رستہ بھی کھلا تھا اور ان کی مقصد برآریوں کے اور بھی بہت سے طریقے تھے۔ کلیسائی زندگی کی کامیابی میں ان عظیم الشان فوائد کا راز چھپا ہوا تھا جو عہد گزشتہ کے جنگی کارناموں کے مقابلہ میں سودمندی کے اعتبار سے کسی طرح کم نہ تھے۔

ایسی زمانہ میں مذہبی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سیاسی تاریخ کے پرکار کا مرکز کشاکش قسطنطنیہ اسکندریہ اور روما کے بطریقوں کی مسابقتانہ جدوجہد تھی۔ ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ اپنے حریفوں کو نچا دکھا کر عثمان سلطنت و اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ قسطنطنیہ کے دعویٰ تفوق کا انحصار اس واقعہ پر تھا کہ وہ قیصر کا پایہ تخت ہے۔ اسکندریہ کو اپنی تجلیدی اور علمی حیثیت پر ناز تھا اور روما اپنی گزشتہ عظمت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتا تھا۔ لیکن قسطنطنیہ کے بطریق کے منصوبوں کی راہ میں ایک بڑی مشکل بھی حائل تھی اور وہ یہ کہ قیصر کی ہر وقت اس پر نظر رہتی تھی اور وہ کسی معاملہ میں خود سرانہ کارروائی نہ کر سکتا تھا۔ بخلاف اس کے اسکندریہ اور روما کو مرکز حکومت سے دور ہونے کے باوجود شہنشاہ کی مداخلت کا خوف نہ تھا اور وہ بے کھلے من مانی کارروائیاں کر سکتے تھے۔ مشرق میں مذہبی مباحث عموماً خدا کی ذات و صفات کے متعلق ہوتے رہے ہیں لیکن

مغرب میں اس قسم کے مناقشوں کا میلان تعلقات و حیات انسان کی طرف رہا ہے۔ یہ خصوصیت ان تغیرات میں صاف طور سے نمایاں ہے جن سے مذہب عیسوی ایشیا و یورپ میں متاثر ہوا۔ اس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں سلطنت روم کے مشرقی صوبوں میں ایک عقلی الجھل مچی ہوئی تھی۔ تثلیث۔ جوہر ذات باری تعالیٰ۔ درجہ ابن اللہ۔ ماہیت روح القدس۔ اقدار مریم عذرا۔ وہ مسائل تھے جن پر نہایت سختی کے ساتھ مذہبی حلقوں میں مناظرے اور مجادلے ہوتے تھے۔ آج ایک فریق فحارہ فح و نصرت بجاتا تھا تو کل دوسرا فریق اپنی کامیابی کا اعلان کرتا تھا اور متخاصمین اپنے دعاوی کے ثبوت میں کبھی معجزے اور کراہیں پیش کرتے تھے اور کبھی نبوت تیغ آزمائی تک پہنچتی تھی جس سے خون کی ندیاں بہ نکلتی تھیں۔ یہ کوشش کبھی نہ کی جاتی تھی کہ آراء متقابل کو منطقیانہ استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر کھوٹے کھرے کا امتیاز کر لیا جائے۔ لیکن ان سب متخالف فرقوں کے نزدیک یہ امر متفق علیہ تھا کہ بت پرستانہ مسلک کی تمام قدیم شکلیں باطل تھیں اس لئے کہ جس آسانی سے ان مذاہب کا استیصال ہو گیا وہ خود ان کے بطلان پر دلالت کرتی تھی۔ چنانچہ پادریوں نے بہ بانگ دل اس امر کا اعلان کر دیا کہ جب امتحان کا وقت آیا تو دیوتاؤں کی مورتمیں اپنی حفاظت میں انگلی تک نہ اٹھا سکیں۔

یورپ کی جنوبی اقوام نے ہمیشہ تعد و ذات باری تعالیٰ کو اپنا کیش و آئین قرار دیا ہے اور ساری اقوام کا میلان عقیدہ وحدت واجب الوجود کی طرف پایا گیا ہے۔ شاید زمانہ حال کے ایک مصنف کے خیال کے مطابق اس کی یہ وجہ ہو کہ پہاڑوں وادیوں جزیروں دریاؤں اور غلجیوں کی رنگا رنگ منظر آرائیاں انسان کے دل میں معبودوں کی کثرت کا تصور پیدا کر دیتی ہیں اور ایک وسیع و فح ریگستان اور ناہید اکنار سمندر کا نظارہ اس کے دماغ پر جناب باری کی یکلی کی نقش مرسم کرتا ہے۔

مکی مصلحتوں نے قیصران روم سے سفارش کی تھی کہ عیسائیت اور بت پرستی کی آمیزش کو ہنظر استہسان دیکھیں اور اس میں شک نہیں کہ اس طرز عمل نے دونوں حلقوں کی باہمی رقابت کی تہی کو کسی قدر کم کر دیا تھا۔ عام پسند مذہب عیسوی کی ہشت وہی قدیم لوہپس قرار دیا گیا تھا جس میں یونانی دیوتا رہا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس ہشت میں بجائے یونانی دیوتاؤں کے جو وہاں سے نکال دئے گئے تھے ایک بت بڑے سفید تخت پر باپ یعنی خدا بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کے دہنے ہاتھ کی طرف بیٹا تھا۔ بیٹی کے برابر مقدس مریم زوہت کا خلعت پہنے انواع و اقسام کے زیوروں سے لدی ہوئی جلوہ افروز تھیں۔

اور خدا کے بائیں طرف روح القدس متمکن تھی۔ اس تخت کے گرد اگر دلا کہ کا ایک جم غیر ہاتھوں میں بانسریاں لئے پر اجماع کھڑا تھا۔ ملائکہ کی صفوں سے گذر کر ایک وسیع میدان نظر آتا تھا جہاں اطعمہ لذت و اشربہ نغیسہ سے لدی ہوئی میزیں بھیجی ہوئی تھیں جو نیک اور پاکبار بندوں کی ارواح پر فتوح کے کام و ذہان کے لئے سرمایہ لذت جادوانی بہم پہنچاتی تھیں۔

عوام و جمال کے اطمینان کے لئے تو راحت و سرور کی یہ تصویر کافی تھی اور شاید ان کا ذہن اس تصویر کے دوسرے رخ کی طرف کبھی غفل بھی نہ ہوتا ہو اور ان کے دل میں یہ سوال پیدا نہ ہوتا ہو کہ آخر ایسے غیر حقیر و غیر متحرک ظاہر میں جس کو دیکھ دیکھ کر طبیعت کا کبھی نہ کبھی اچاٹ ہو جانا لازمی ہے لذت آفرینی کی قابلیت کس حد تک موجود ہو سکتی ہے لیکن جو ذرا سمجھ دار تھے ان سے عوام کا لانعام کی تقلید کی توقع نہ کی جاسکتی تھی۔ طبقہ اعلیٰ کے دقیقہ سنج و نکتہ رس پیشوایان دین میں بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے ان تصورات کو جو مادہ پرستی اور ہوس رانی کی آلائشوں سے آغوشہ تھے کمال حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھا اور حاضر و ناظر قادر مطلق خدا کی ذات صفات کو ان ٹپاک قیود سے بری کرنے کے لئے اپنی آواز بلند کی۔

عیسوی مذہب میں بت پرستی کے عنصر کی آمیزش کا عمل تو ہر طرف جاری ہی تھا۔ اب ہر بطریق کو ہر دعویٰ بننے یا اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لئے اس بات کی فکر پڑ گئی کہ جس طرح بن پڑے اپنے مقتدیوں کے عقائد کو عام اس سے کہ ان عقائد کا زمانہ قبل ظہور مسیحیت ہو یا بعد ظہور مسیحیت مذہب میں داخل کر لیا جائے۔ مصریوں نے اسی طرح مسئلہ تثلیث کے متعلق اپنے خاص قسم کے عقائد کو عیسائیت میں زبردستی داخل کرا لیا تھا اور اب وہ چاہتے تھے کہ مریم عذرا کی پرستش کے بہانہ اسے آئس کی قدیم پرستش کو از سر نو زندہ کیا جائے۔

انہیں دنوں میں قیصر تھوڈو سیس نے سلور کو جو فلسفہ میں تھیوڈور ساکن ماسپوشیا کا ہم مسلک تھا خطبہ کا بطریق اعظم مقرر کیا (۷۴۳ء) ان ذلیل تجسیمہ عقائد سے جو عوام میں پھیلے ہوئے تھے سلور کا انکار تھا اور اس کا یہ خیال تھا کہ خدائے ذوالجلال و قیوم کو جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں ساری دوا ہے ذات یا صفات میں انسان کے مطلب یا مماثل قرار دینا کفر ہے۔ سلور پر ارسطو کے فلسفہ نے نہایت گہرا اثر ڈالا تھا اور اس کی یہ کوشش تھی کہ عقائد مشابہہ کو خالص مسیحی عقائد کے ساتھ تطبیق دی جائے تاکہ اس پر اس میں اور

اسکندریہ کے بطریق سایل میں جھگڑا ہو گیا۔ سایل کا تعلق کلیسا کی اس جماعت سے تھا جو بت پرستی کی حامی تھی اورِ نسطور اس فریق کا سرگروہ تھا جو مذہب کو مطابق عقل ثابت کرنے میں کوشاں تھا۔ یہ سایل وہی ہے جس نے ہائی پیشیا کو قتل کیا تھا۔ سایل نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ حضرت مریم کی پرستش خدا کی ماں ہونے کی حیثیت سے ارکان کلیسا میں داخل ہو جائے اور نسطور کا مقصد تھا کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ قسطنطیہ کے صدر گرجا میں نسطور نے ایک خطبہ پڑھا جس میں خدائے قیوم کی صفات کو شرک سے مبرا قرار دیتے ہوئے اس نے ازراہ استعجاب یہ سوال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے خدا کی ماں ہو؟ اس کے علاوہ متعدد موقعوں پر اس نے اور جو خطبے پڑھے یا مضامین لکھے ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت مریم کو خدا کی ماں نہ سمجھنا چاہئے بلکہ حضرت مسیح کے انسانی حصہ کی ماں تصور کرنا چاہئے اور یہ انسانی حصہ ربانی حصہ سے ایسا ہی جدا ہے جیسا معبود اپنے معبود سے۔

اسکندریہ کے اپنی درجہ کے پادریوں کی شہ پا کر قسطنطیہ کے پادریوں نے ”خدا کی ماں“ کی حمایت کا بیڑا اٹھایا اور نسطور کی مخالفت شروع کی۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ شہنشاہ کو مجبور ہو کر حکم دینا پڑا کہ افسس میں کونسل منعقد ہو۔ سایل نے اس اثنا میں دربار شامی کے صدر خواجہ سرا کو کئی سو مشقال سونے کی رشوت دے کر شہنشاہ کی بہن تک رسائی حاصل کر لی۔ اس طور پر آسمانی دربار کی مقدس دوشیزہ کو اپنے ہی ہم جنسوں میں سے ایک حمایت کرنے والی شہنشاہی دربار کی مقدس دوشیزہ کی شکل میں ہاتھ آ گئی۔ سایل مردوں اور عورتوں کے ایک جم غفیر کو جو طبقہ اراذل و افکار سے تھا ہمراہ لئے ہوئے کونسل میں پہنچا اور خود بخود صدر نشین مجلس بن بیٹھا۔ اس کے ہمراہیوں نے شور مچانا شروع کر دیا اور اس شور و غل میں قبل ازاں کہ شامی بطریق جو کونسل میں شریک ہونے کے لئے طلب کئے گئے تھے پہنچیں شہنشاہ کا فرمان پڑھوا دیا گیا۔ اس طور پر سائل نے ایک دن میں میدان مار لیا اور اپنے حریف کو شکست فاش دے کر خوش خوش گھر پہنچا۔ نسطور نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے کہ اس کے عذرات تو سن لئے جائیں اور جو دلائل وہ پیش کرنا چاہتا تھا ان کو ایک نظر دیکھ تو لیا جائے لیکن اس کی ایک پیش نہ گئی۔ بلا اس کے کہ اس کو صفائی کا موقع دیا جاتا اس پر فرد قرار داد جرم لگا دی گئی۔ جب شامی بطریق جو نسطور کے طرف دار تھے پہنچے تو انہوں نے ایک جلسہ میں اس فیصلہ سے ناراضی و بیزاری کا اظہار کیا۔ شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ فریقین میں فساد ہو گیا۔ سینٹ جان کے گرجا میں

لاٹھی چل گئی اور بہت کچھ سر پھٹول ہوئی۔ نسطور مورد عتاب ہوا اور جلاوطن کر کے مصر کے ایک ریگستان میں بھیج دیا گیا۔ اس کے دشمن عمر بھر اس کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے رہے اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی مرقیہ خوانی ان الفاظ میں کی گئی کہ ”اس کی کفر بکتے والی زبان میں کیڑے پڑ گئے تھے اور اگرچہ وہ مصری ریگستان کی جھلنے والی لوؤں کی لپیٹ سے مر کر بیچ لگلا ہے لیکن یقین ہے کہ اب اس کا جسم جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونکا جائے گا۔“

لیکن نسطور کی شکست اور سزایابی اس کے عقائد کو کسی طرح بے مٹا سکی۔ سینٹ سیمیون کی کتاب کے پہلے باب کی آخری آیت اور اسی کتاب کے تیسرے باب کی پچھنیس اور پچھنیس آیتوں کے صاف اور صریح الفاظ کو جن کے مفہوم میں تاویل کو دخل نہیں پیش نظر رکھ کر وہ اور اس کے پیرو اس بات کا اعتراف نہ کر سکتے تھے کہ آسمان کی نئی ملکہ کی حالت دو شیزگی ایک ہمیشہ قائم رہنے والی صفت ہے۔ ان کے فلسفیانہ رجحانات کی جھلک بہت جلد ان کے طرز عمل میں نظر آنے لگی۔ جس زمانہ میں نسطور ریگستان افریقہ میں قید کاٹ رہا تھا اس کے بہت سے پیرو ہجرت کر گئے اور دریائے فرات کے کنارے جا آباد ہوئے جہاں انہوں نے کلیسائے کلدانیہ قائم کیا۔ انہیں کی سامی نے ایڈیسا کے مشہور دارالعلم کی بنا ڈالی۔ نیسی (نسیسین) کے دارالعلم سے وہ علاء حکما تاج فعلیت سر پر رکھ کر نکلے جنہوں نے نسطوری عقائد کو شام عرب ہندوستان تاتار مصر اور چین میں پھیلا دیا۔ نسطوریوں نے قلعہ شاہ کو اپنا عقل مسلک قرار دیا اور ارسطو کی تصانیف کا ترجمہ شاہی اور ایرانی زبانوں میں کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے زمانہ مابعد کے دوسرے مصنفین مثلاً پلاطینی کی تصانیف کا بھی ترجمہ کیا۔ یسودیوں کے ساتھ مل کر انہوں نے جندی ساہور میں ایک طبی مدرسہ قائم کیا۔ ان کے مناہوں نے عیسائیت کو نسطوری شکل میں اطراف و اکناف ایشیا میں یہاں تک پھیلا دیا کہ اس کے پرستش کرنے والوں کی تعداد بالآخر کلیسائے یونان و کلیسائے رومن کیتھولک کے یورپین پیروؤں کی مجموعی تعداد سے بھی بڑھ گئی۔ یہ امر خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ عرب میں نسطوری مسیحیوں کا ایک بطریق موجود تھا۔

غرض قسطنطنیہ اور اسکندریہ کی ان مذہبی معرکہ آرائیوں نے ایشیا کے مغربی حصے کو بہت سے فرقوں کی جولانگاہ بنا دیا جو ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور چونکہ دربار شاہی نے ان میں سے اکثر کو سخت سخت سزائیں دی تھیں اور ان پر طرح طرح کی سختیاں کی تھیں لہذا ان کے دلوں میں شہنشاہ کی طرف سے نفرت اور کینہ کا طوفان پھا ہو رہا

تھا۔ اس کا نتیجہ ایک بہت بڑے مذہبی انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوا جس کا اثر آج کے دن تک ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر تھا کہ تمام دنیا اس کی لپیٹ میں آ گئی۔

اس مہتمم بالشان واقعہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے مناسب ہو گا کہ اسے دو جداگانہ اجزا میں تحلیل کر کے ہر ایک پر باری باری سے نظر ڈالی جائے یعنی اول تو ایرانیوں کے ہاتھوں ایشیائی مسیحیت کی ہنگامی و عارضی پامالی اور دوم وہ قطعی اور فیصلہ کن اصلاح جو عربوں کے ذریعہ سے عمل میں آئی۔

اولاً۔ مشرقی دہوار اپنے آئے دن کے انقلابات کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ اسی طرح کے ایک انقلاب نے خسرو دلی عہد تخت ایران کو مارس القیروم کے دیوار میں جا کر پناہ لینے اور اس سے مدد مانگنے پر مجبور کیا۔ مارس نے اپنے شاہی مہمان کی دلجوئی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور ایک لشکر جرار اس کے ہمراہ کر دیا جس کی مدد سے خسرو مالک تخت و تاج ہو گیا۔ لیکن وہ نمایاں فتوحات جو اس لشکر نے ایران میں حق کو حق و دار تک پہنچانے کے لئے حاصل کی تھیں خود مارس کے دولت و اقبال کی محافظت نہ کر سکیں۔ یعنی رومی فوج میں غدر پھا ہو گیا۔ اس بغاوت کا سرغنہ ایک شخص فوکاس نامی تھا جو فوج میں سو چارہوں کی کمان کے عہدہ پر مامور تھا۔ قیصر کے مجتنبے منہدم کر دئے گئے اور قسطنطین کے بطریق نے اس اعلان کے ساتھ کہ فوکاس کے مذہبی عقائد کلیسائے مقدس کی میزان احتساب میں پورے اترتے ہیں اس کی تاجپوشی کی رسم اپنے ہاتھ سے ادا کی۔ برگشتہ بخت مارس ایک خانقاہ سے جہاں اس نے پناہ لی تھی کشاں کشاں باہر لایا گیا۔ اس کے پاؤں بیٹے یکے بعد دیگرے اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کئے گئے اور آخر میں اس کی گردن ماری گئی۔ اس کی ملکہ کو سینٹ صوفیا کے گرجے سے بطالیف الجمل باہر نکلنے کی ترغیب دی گئی اور جب وہ اس مقام امن سے اپنی عین کم سن بیٹیوں کو لئے ہوئے باہر نکلی تو ان چادروں کو طرح طرح کے عذاب دے کر بے رحم کیا گیا۔ شاہی خاندان کے ہوا خواہوں پر انواع و اقسام کے ظلم کئے گئے۔ ظالموں نے بعض کی آنکھیں نکالوا ڈالیں۔ بعض کی زبان گدی سے کھنچوا ڈالی۔ بعض کے ہاتھ پاؤں کنوا ڈالے۔ بعض کو کوڑے مار مار کر مار ڈالا اور بعض کو زندہ جلا دیا۔

جب یہ خبر روم میں پہنچی تو بطریق گرگوری نے خوشیاں منائیں اور دعا مانگی کہ فوکاس کو اپنے دشمنوں پر غالب آنے کی توفیق بخشے۔ اس دلیل چالپوسی کے صلہ میں اسے اسقف اعظم کا لقب دیا گیا۔ اس کی اور نیز بطریق قسطنطین کی حمہ مخالفت کی وجہ غالباً یہ تھی کہ

مارس کی نسبت یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ ایرانیوں سے راہ و رسم رکھنے کے باعث اس کا میلان مجوسی عقائد کی طرف ہو گیا ہے۔ چنانچہ قسطنطینیہ کے کئی کوچوں میں جب اسے تشریف کیا گیا تو عوام الناس نے اس پر پھبتیاں اڑائیں اور آوازے کئے اور اس کو ازراہ استحقار مجوسی کہہ کر پکارا۔

خسرو کو جب اپنے دوست کے قتل کا حال معلوم ہوا تو دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی اور غم اور غصہ کا ایک طوفان اس کے دل میں امنڈ آیا۔ فو کا س نے مارس اور اس کے بیٹوں کے سرکری کے پاس بھیج دیئے تھے۔ جب یہ کئے ہوئے سر اس کے دربار میں پیش ہوئے تو اس نے لرز کر اپنا منہ پھیر لیا اور اپنے محسن کے قاتلوں کو اس کا انتقام لینے کے لیے فوراً دولت و دعا پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

افریقہ کے نائب السلطنہ ہر قلس کو بھی جو سلطنت کا رکن اعظم تھا اس دردناک سانحہ کے سننے سے نہایت صدمہ ہوا اور اس نے دل میں ٹھان لی کہ جو ہو سو ہو قیصران روم کے تخت کو ایک کریمہ النظر اور فرد مایہ فوجی افسر کی غاصبانہ دستبرد سے بچایا جائے۔ فو کا س کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اس کا قد چھوٹا اور اس کی صورت کمزور تھی۔ اس کی تالیم گھنی بھورن اس کے سرخ رنگ کے بالوں اور اس کی گھیل ٹھڈی نے جس پر داڑھی کی علامت تک نہ تھی اس کے چہرے کے ایک مہیب داغ کے ساتھ مل کر اس کی شکل کو نہایت ہی گھٹاؤنا اور ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ وہ جاہل مطلق اور کندہ نازش تھا۔ ملک کے قوانین سے بالکل نااہل تھا حتیٰ کے ہتھیاروں کے استعمال سے بھی واقف نہ تھا۔ اور عیاش اور شرابخواری اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ پہلے تو ہر قلس نے اسے خراج دینے اور اس کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر کھلم کھلا علم مخالف بلند کیا لیکن چونکہ ضعف بھری اور انحطاط قوائے اس قابل نہ رکھا تھا کہ میدان جنگ کی سختیوں اور صعوبتوں کی خود تاب لا سکے لہذا یہ خطرناک مہم اس نے اپنے بیٹے کو جو کہ اس کا نام بھی ہر قلس تھا سوئی۔ نوجوان ہر قلس ایک جہاز جنگی بیڑا لے کر روانہ ہوا اور موافق ہواؤں کی مدد سے بہت جلد قسطنطینیہ کے سامنے آ پہنچا۔ زمانہ کی ادا پہچاننے والا پادری۔ ارکان سلطنت اور شہر کے باشندے فتح کا پہلہ اس کی طرف جھکا ہوا دیکھ کر اس کے شریک ہو گئے آخر غاصب گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔

لیکن قسطنطینیہ کا یہ انقلاب فرمانروائے ایران کی یلغار کا مزاہم نہ ہوا۔ کسری کے مجوسی سردوں نے یونانیوں کی دعوغ آمیز اور خالمانہ ادھام پرستیوں کے خلاف اس کے کان اچھی .

طرح سے بھر دیئے تھے اور اس کو جتلا دیا تھا کہ یونانیوں کی ایک نہ سخی چاہئے بلکہ جو کچھ کرنا چاہئے اپنی قوتِ ممتازہ کے بھروسے پر کرنا چاہئے۔ غرض خسرو نے دریائے فرات کو عبور کیا۔ شام کے مسیحی فرقوں نے جو قسطنطنیہ کی طرف سے خار کھائے بیٹھی تھی اس کی فوج کے راستے میں اپنی آنکھیں بچھا دیں۔ حملہ آور کا خیر مقدم ہر جگہ نہایت ہٹاک سے کیا۔ جس شہر میں اس کا گذر ہوا وہاں کے باشندے روم کی اطاعت کا جوا کندھے سے اتارا کر اس کے ساتھ مل گئے۔ اس طرح اٹالکیہ، قیصریہ اور دمشق جیسے دیگرے نہایت آسانی سے مسخر ہوتے ہوئے چلے گئے۔ بیت المقدس کسی قدر مزاحمت کے بعد بلکہ میں سر ہو گیا۔ ایرانیوں نے مرقدِ مسیح اور قسطنطنیہ دہلنا کے گرجاؤں میں آگ لگا دی۔ صلیب عیسوی کو بطور یادگار فتح ایران بھیج دیا۔ گرجاؤں کا مال و متاع لوٹ لیا۔ مقدس حرکات کو جنہیں دستِ اہام نے بڑے چاؤ سے جمع کیا تھا نیست و نابود کر دیا۔ پھر مصر پر حملہ کیا اسے فتح کر کے سلطنتِ ایران کے ساتھ شامل کر لیا۔ اسکندریہ کے بطریق نے بھاگ کر قبرس میں جا پناہ لی۔ ساحلِ افریقہ طرابلس تک ایرانی فوج کے قبضہ میں آگیا۔ شمل کی جانب ایشیائے کوچک کل کا کل مسخر ہو گیا اور دس سال تک ایرانی فوجیں قسطنطنیہ کے سامنے ہاسپورس کے ساحل پر ڈیرے ڈالے پڑیں رہی۔

جب ہر قل پر سخت ہی کمپنی تو اس نے بدرجہ مجبوری صلح کی التجا کیا۔ لیکن پر غرور اور تکبر کرسی نے یہ جواب دیا کہ جب تک شہنشاہِ روم اپنے مصلوبِ خدا سے البا کر کے آفتاب کی پرستش نہ کرے گا میں اس کی التجا سے صلح قبول نہ کروں گا۔ آخر بعدِ وقت ساڑھے سات سو من سونا اسی قدر چاندی ایک ہزار غلٹ ہائے قاخرہ ایک ہزار گھوڑی اور ایک ہزار صاحبِ جمال دو شیزہ لڑکیاں سلطنتِ روم کی آزادی کا فدیہ قرار پائیں۔

لیکن ہر قل کی یہ اطاعت چند روزہ تھی۔ اس نے کچھ عرصے کے بعد نہ صرف وہ ملک جو خسرو نے اس سے چھینا تھا واپس لے لیا بلکہ ایران پر چڑھائی کر کے وہ جنگی کارنامے یاد دلائے جن کے لحاظ سے دولتِ روم کا سب سے زیادہ روشن زمانہ یادگار تاریخ ہے۔

اگرچہ سلطنتِ روم کی جنگی عظمت اس طور پر بحال ہو گئی تھی اور اگرچہ اس نے وہ تمام ملک جو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا واپس لے لیا تھا لیکن ایک نقصان اسے ایسا پہنچا تھا جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہ تھی۔ یعنی دولتِ ایمان گئے وقت کی طرح پھر نہ آ سکتی تھی۔ مجوسیت نے ساری دنیا کی آنکھوں کے سامنے مسیحیت کا خاکہ اڑایا تھا اور حضرت مسیح کے مزار کو آگ لگا کر۔ گرجاؤں کو لوٹ کر اور مٹا کر۔ بیش بہا حرکات کو خاک کی طرح

ہوا میں اڑا کر اور صلیب کو ہر طرح کے تسخر اور تنفیک کے بعد مال غنیمت میں ملا کر مسیحیت کے مقدس ترین مقامات یعنی بیت اللہ، بنشین اور کیلوری کی توہین کی تھی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ شام مصر اور ایشیائے کوچک میں معجزوں کی بھرمار تھی۔ کوئی گرجا ایسا نہ تھا جو ایک طول و طویل فہرست آسمانی نشانات کی پیش نہ کر سکتا ہو۔ بات بات پر معجزے اور کرامتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ لیکن اس نازک موقع پر جب آسمانی نشانات کی ایسی سخت ضرورت تھی ایک بھی نشان ظاہر نہ ہوا۔

ارض مشرق کی مسیحی آبادی نے جب دیکھا کہ مجوسی حملہ آوروں نے ان کے گرجاؤں کو آگ لگا دی ان کی خانقاہوں کو مسمار کر دیا ان کی پاک یادگاروں کی بے حرمتی کی اور اس پر بھی حملہ آوروں پر عذاب آسمانی نازل نہیں ہوا تو اس بوالجبی سے انہیں کچھ دیر کے لئے ساکت و صامت کر دیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا کا قرآن کفار پر بجلی بن کر گرے گا۔ آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ زمین پھٹ جائے گی۔ خدا کی تلوار برق خالص کی طرح آج فلک پر چمکتی ہوئی نظر آئے گی اور ان دین مقدس کی بے حرمتی کرنے والوں کا حشر بھی وہی ہو گا جو سائبرئیل کا ہوا تھا۔ لیکن کچھ نہ ہوا۔ ایک آسمانی نشانی بھی اس موقع پر ظاہر نہ ہونے پایا۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ لوگوں کا تعجب مہل بہ خوف ہو گیا اور خوف کی جگہ بد اعتقادی نے لے لی۔

ٹانیا اگر اس میں شک نہیں کہ ایرانی فتوحات کے نتائج مسیحیت کے حق میں سخت خطرناک تھے لیکن ان نتائج کو پھر بھی اس مہتمم بالشان واقعہ کا محض ایک مقدس سمجھنا چاہئے جس کا ذکر اب آتا ہے یعنی مسیحیت کے خلاف جنوبی اقوام کی بغاوت۔ اس واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو ممالک عیسائیوں کے قبضہ میں تھے ان کا نو دسواں حصہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا یعنی ایشیا و افریقہ، کلا اور یورپ جزا "مسیحیت کی حلقہ گوشی سے آزاد ہو گیا۔

۵۵۸ء کے موسم گرما میں اونٹوں کا ایک قافلہ شہر بھرا میں پہنچا جو دمشق کے جنوب میں ملک شام کی سرحد پر واقع ہے۔ یہ کاروان مکہ سے آیا تھا اور جنوبی عرب کی گراں بہا پیداوار اپنے ساتھ لایا تھا کارواں سالار کا نام ابو طالب تھا جس کے ہمراہ اس کا ایک دوازدہ سالہ بھتیجا بھی تھا۔ چچا بھتیجے شہر کی نسواری خانقاہ میں اتارے گئے جہاں کے مہمان نواز راہبوں نے ان کی بہت کچھ خاطر مدارت کی۔

تک خانقاہ کے راہبوں کو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا خورد سال مہمان جس کا نام طیبی یا ختمہ تھا عربوں کے مقدس معبد کعبہ کے محافظ کا بھتیجا ہے۔ ان میں سے ایک راہب

بحیرہ نامی نے کوشش کی جس طرح ہو اس لڑکے کے دل سے اس بت پرستی کے اثر کو جو اس کا آبائی مذہب ہے زائل کیا جائے۔ بحیرہ نے دیکھا کہ لڑکا نہایت ہونمار اور غیر معمولی طور پر ذہین ہے اور مذہبی باتوں کو نہایت شوق اور توجہ سے سنتا ہے۔

محمدؐ کے اہل وطن یعنی مکہ کے باشندوں کا سب سے بڑا محبوب ملک ایک کالا پتھر اراقم شباب ثاقب تھا جو تین سو ساٹھ چوں کے ساتھ کعبہ میں رکھا ہوا تھا۔ یہ بت کالے پتھر کے توالیغ متصور ہوتے تھے اور چونکہ اس زمانہ میں ششی سلال تین سو ساٹھ دن کا محسوب ہوتا تھا لہذا ہر بت سال کے ایک دن سے منسوب تھا۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کلیسائی عیسوی کا شیرازہ پادریوں کے حب جاہ اور خباثت نفس کی وجہ سے پر اگندہ ہو رہا تھا۔ اجتماعات کو شان اجماع بخشے کے بہانے سے اکثر کوسلوں کے اجلاس منعقد ہوتے تھے لیکن اس انعقاد کا اصل مقصد پوشیدہ رکھا جاتا تھا۔ بسا اوقات ان کوسلوں میں جبر، ارتقا اور بدینائی کا ساں نظر آتا تھا۔ مغرب میں بطریقہ کا عمدہ دولت و تمول عیش و عشرت اور شکوہ و طعراق کی ایسی نیت آنا ترغیبات پیش کرتا تھا کہ اس عمدہ پر کسی پادری کے نامزد ہوتے وقت خوریز ہنگاموں کا واقع ہونا مساوات ہو گیا تھا۔ مشرق میں دربار قسطنطنیہ کے طرز عمل نے کلیسا کو مباحثوں مناقشوں اور مجادلوں کی جولا نگاہ بنا رکھا تھا۔ جو بے شمار فرقے ان مذہبی معرکہ آرائیوں نے پیدا کر دیئے تھے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ایرمین، سیلیڈین، کالیریڈن، یوٹیشن، ناسک، بیکوپائٹ، مارسیو نائٹ، نسورین، سیلن، ویلٹاشن، نمبلہ ان کے میروپائٹ فرقہ کا یہ عقیدہ تھا کہ تثلیث کے ارکان حسب ذیل ہیں باپ خدا بیٹا خدا اور مریم عذرا خدا۔ فرقہ کالیریڈن حضرت مریم کو خدا سمجھ کر پرستش کرتا تھا اور ان کی موت پر ملحائی کا چڑھاوا چڑھاتا تھا۔ فرقہ نسطوری جیسا کہ ہم کو معلوم ہی ہے اس عقیدہ سے انکار کرتا تھا کہ خدا کی بھی مان ہو سکتی ہے۔ اس فرقہ کو اس امر پر ناز تھا کہ وہ یونان قدیم کے علوم و فنون کا وارث و مالک تھا۔

یہ تمام فرقے اگرچہ عقائد میں ایک دوسرے کے حریف تھا لیکن ایک بات قدر مشترک کے طور پر ایسی بھی جس پر ان سب کا اتفاق تھا اور جس کے لحاظ سے یہ ایک دوسرے کے حلیف کہلا سکتے تھے اور وہ بات تھی ان کی باہمی نفرت اور عداوت جس نے ہر فرقہ کو دوسرے فرقہ کا دشمن جان بنا رکھا تھا۔ عرب جس کو اپنی حریت اور خود مختاری پر ناز تھا جس کو کسی کی کشور کشائی مغر نہ کر سکی تھی اور جس کی وسیع سرزمین بحر ہند سے لے

کر ریمستان شام تک پہنچی ہوئی تھی آڑے وقت میں ان میں سے ایک ایک کا بلجا دواوی بنا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ قدیم سے یہی ہوتا چلا آیا تھا۔ جب کوئی قوم مغلوب ہوئی اور فریق غالب نے اس کا قافیہ تنگ کر دیا تو اس نے بھاگ کر عرب ہی میں پناہ لی۔ چنانچہ جب رومیوں نے فلسطین کو فتح کیا تو یہودیوں کی ایک تعداد کثیر یہیں آکر پناہ گزین ہوئی۔ سینٹ پال اہل کلیسیا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ جب مشرف بہ اصطلاح ہو کر میں نے اپنے آپ کو ہر طرف سے مخالفین کے نزعہ میں گمرا ہوا پایا تو فوراً عرب چلا آیا۔ غرض عرب کی وادیوں اور صحراؤں میں عیسائی راہبوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ نظر آنے لگے۔ جنگی تبلیغی کوششوں نے عرب کو سرور آوردہ قبایل میں سے اکثر کو دائرہ مسیحیت میں داخل کر لیا۔ جا بجا گرجے بن گئے۔ اور عرب کا جنوبی حصہ جس میں حبش کے نسوری عقاید فرمانرواؤں کے قبضہ میں آگیا۔

بیمبر راہب نے بھرا کی خانقاہ میں حضرت محمد کو نسوری عقاید کی تعلیم دی اور اپنے مظالم کی داستان شروع سے آخر تک حرف بحرف کہہ سنائی۔ یہ انہیں ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلعم کے دل میں کلیسائے مشرق کی بت پرستانہ رسوں کی طرف سے عوام اور اوطان و اصنام کی پرستش کی طرف سے خصوصاً وہ نفرت بیٹھ گئی جس کو کوئی قوت مٹا نہ سکی۔ اور بیمبر راہب ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ آپ نے اس عجیب و غریب زندگی کے دوران میں جس کے کارناموں نے دنیا کو محو حیرت کر دیا حضرت مسیح کو کبھی خدا کا بیٹا کہہ کر نہ پکارا بلکہ ہمیشہ مسیح ابن مریم کے لقب سے یاد فرمایا۔ آپ کے تاریخیت یافتہ لیکن مستحکم و اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیقوں کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا نہایت گہرا اثر قبول کیا اور یہ وہ اتالیق تھے جنہیں ارسطو کے جانشین اور حکمت مشائے کے سبق آموز ہونے کے لحاظ سے اپنی ذات پر ناز تھا اور بجا ناز تھا۔ بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی صاف شہادت ملتی ہے کہ نسوریوں کے مذہبی عقاید نے آپ پر کہاں تک قابو پا لیا تھا چنانچہ اس ارادت و محبت کا جو آپ اس فرقہ کے ساتھ رکھتے تھے آپ نے متواتر ثبوت دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور ثبوت اس انس و عقیدت کا کیا ہو گا کہ آپ نے اپنی زندگی کو نسوریوں کے دینی عقاید کی توسیع و اشاعت کے لیے وقف کر دیا اور جب یہ مقصد پورا ہو چکا تو آپ کے جانشینوں نے ان کے علمی و مشائی اصول اختیار کر لیے اور نہایت سرگرمی سے ان کی اشاعت میں حصہ لیا۔

جب حضرت محمدؐ سن رشد کو پہنچے تو آپ نے ارض شام کے اور بھی سفر کیے۔ یہ خیال

کرنا بعید از قیاس نہ ہو گا کہ ان موقعوں پر آپ سُطوری خانقاہ میں جا کر اس کے مہمان نواز کینوں سے جنہیں آپ نے فراموش نہ کیا تھا ضرور ملے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک شام کی آپ کے دل میں بڑی وقعت تھی۔ مکہ کی ایک دولت مند بیوہ جن کا نام خدیجہؓ تھا اپنی شامی تجارت کا کل کاروبار آپ کے سپرد کر چکی تھی۔ آپ کی قابلیت اور ایمانداری نے جناب خدیجہؓ کو آپ کا کردیدہ بنا دیا اور چونکہ مبداء فیاض سے حسن کامل اور خلق عظیم آپ کے حصہ میں آیا تھا لہذا وہ آپ پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئیں۔ عورتوں کا دل ہر ملک اور ہر زمانہ میں اسی قسم کے جذبات کی جولا نگاہ بنا رہا ہے۔ غرض جناب خدیجہؓ نے ایک کنیز کے ذریعہ سے اپنے دل کا حال آپ پر ظاہر کیا اور دونوں کا عقد ہو گیا۔ اس کے بعد چوبیس سال تک جناب خدیجہؓ زندہ رہیں۔ اس مدت دراز میں آن حضرتؐ نے اپنے آپ کو ان کا وفادار شوہر ثابت کیا اور ایک ایسے ملک میں جہاں کثرت ازدواج کی رسم عام تھی آپ کبھی دل میں یہ خیال تک نہ لائے کہ دوسرا نکاح کر کے جناب خدیجہؓ کی توہین و دل آزاری کا موجب بنیں۔ کئی سال کے بعد جب آپؐ نیر اقبال نصف النہار پر تھا ایک دفعہ جناب عائشہ صدیقہؓ نے جو حسن و جمال کے لحاظ سے عرب بھر میں مشہور تھی آپ سے جناب خدیجہؓ الکبریٰ کا ذکر ان الفاظ میں کیا: ”کیا وہ بڑھیا نہ تھی؟“ کیا مجھے آپ کے حوالہ عقد میں لا کر خدا نے آپ کو اس سے اچھی بی بی عطا نہیں فرمائی؟“ آن حضرتؐ یہ سن کر بے قرار ہو گئے اور اس لہجہ میں جس سے بونے امتنان آتی تھی یہ جواب دیا ”واللہ خدیجہؓ سے بہتر بی بی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ جب اور لوگ مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے تو وہ مجھ پر ایمان لائی۔ جب میں کوڑی کوڑی کو محتاج تھا اور دنیا میرے درپے آزار تھی تو اس نے مجھے نہال کر دیا۔“

جناب خدیجہؓ سے عقد کرنے کی بدولت آپؐ معاش کی طرف سے فارغ البال ہو گئے اب آپ کو اس مذہبی غور و فکر کا پورا موقعہ ہاتھ آیا جس سے آپ کی طبیعت کو فطری مناسبت تھی۔ جناب خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی ورقہ نے جو یہودی تھا اس زمانہ میں دین عیسوی اختیار کر لیا تھا اور عیسائی ہونے کے بعد پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ بائبل کا ترجمہ عربی میں کر ڈالا۔ آنحضرتؐ کو مذہبی امور پر ورقہ سے گفتگو کرنے کا بارہا اتفاق ہوا اور ان مکالمات نے اس نفرت کو جو آپ کے دل میں بت پرستی کی طرف سے جاگزیں تھی اور زیادہ راسخ کر دیا۔

جس طرح تاریک دنیا مسیحی راہبوں نے صحراؤں میں آبادی سے دور اپنے جمونہ پرے

ڈال رکھے تھے جن میں وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے اسی طرح آنحضرتؐ نے کوہِ حرا کی ایک غار میں جو مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا عزالتِ گزین ہو کر خدا کی عبادت کرنی شروع کی آپ کا وقتِ مراقبہ و استغراق میں کٹنے لگا۔ اس عالمِ تجلی میں آپ نے خدائے قیوم و ذوالجلال کی صفاتِ جلالی پر غور و خوض کرتے کرتے ایشیائی مسیحیت کے عقاید پر نظر ڈالنی شروع کی۔ اقاہیمؑ کے عقیدہ کو جب سلجھانا چاہا تو یہ مشکل پیش آئی کہ ایک طرف تو حضرت مسیح کو نسبتِ ابوتِ قادرِ مطلق سے وابستہ کیے ہوئے ہے دوسری طرف حضرت مریم ہیں کہ ایک ہی وقت میں شانِ دو شیزگی بھی لیے ہوئے ہیں گو وہ بھی بھری ہوئی ہے اور آسمان کی ملکہ بھی ہیں۔ ان مشکلات نے آپ کے دل میں یہ سوال پیدا کیا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ انسان اس قسم کے عقاید اختیار کرے اور پھر بھی گناہ میں مبتلا نہ ہو یا کفر و شرک کے خطرات میں گرفتار نہ ہو۔

غارِ حرا میں مدتوں محوِ غور و فکر رہنے کے بعد حضرت محمدؐ اس نتیجے پر پہنچے کہ متضاد و متباہن عقاید کے بادلوں کا جو گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے اس میں ایک بڑی حقیقت یعنی توحیدِ باری کی روشنی نظر آسکتی ہے۔ چنانچہ ایک کجور کے درخت کے تنے سے پیٹھ کو ٹکا دے کر آپ نے اپنے خویش و اقارب کے سامنے اس بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے علی رؤس الاشهاد فرمایا کہ آپ اس حقیقت کی اشاعت کے لیے اپنی زندگی کو وقف فرمادیں گے۔ اپنے خطبوں میں اور نیز قرآن میں بار بار آپ نے ان الفاظ کو دہرایا ہے۔ ”میں تو محض ایک مناد ہوں اور خدا کی وحدانیت کی تلقین کرتا ہوں۔“ اپنی نبوت کے متعلق خود آپ کا خیال یہی تھا۔ چنانچہ اس دن سے اپنی وفات کے وقت تک آپ اپنی انگلی میں ایک انگوٹھی پہنے رہے جس کے گھینے پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ ”محمد الرسول اللہ“

الطہا اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو شخص صائم الدہر ہوتا ہے اور عرصہ تک دماغی پریشانیوں اور فکروں میں مبتلا رہتا ہے اسے التباسِ حواس کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے یعنی وہ چیزیں محسوس ہونے لگی ہیں جن کی خارجی اصلیت کچھ نہیں ہوتی۔ نفس کشِ راستباز اور مستقیم العزم اشخاص نے جن مذاہب کی بنیاد ڈالی ہے ان میں سے شاید ایک بھی مذہب ایسا نہ ہو گا جس میں فوق العادت آزمایشات و امتحانات اور فوق القدرت احکام و اوامر کی مثالیں نہ ملتی ہوں۔ پُر اسرار آوازیں عربی پیغمبر کو سنائی دیتی تھیں جس میں آپ کو استقامت کی ہدایت ہوتی تھی اور عجیب و غریب صورتوں کی پرچھائیاں آپ کے سامنے سے

مگر رتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں دور سے گھنٹی کے بجنے کی سی آواز ہوا کو چیرتی ہوئی آپ کے کانوں میں پڑتی تھی۔ ایک دفعہ رات کے وقت عالم خواب میں جبریل امین آپ کو مکہ سے بیت المقدس کی طرف لے گئے اور وہاں سے دونوں نے آسمان کا رخ کیا۔ چھ آسمانوں کی سیر میں جبریل نے آپ کی مشابہت کی لیکن ساتویں آسمان کی دلیلیز پر قدم رکھتے ہوئے ان کے بھی پر جلے۔ اس لیے آپ تن تنہا اس مہیب ہاول میں داخل ہوئے جس کا نقاب ہمیشہ قادر مطلق کے چہرے پر پڑا رہتا ہے۔ اور جب باری تعالیٰ کے سرد ہاتھ کا لمس آپ کو اپنے شانہ پر محسوس ہوا تو آپ کا دل دہل گیا۔

اول اول آپ کے مواظظ و نصائح کی لوگوں نے بہت مخالفت کی اور آپ کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ بت پرستوں نے آپ کو مکہ سے نکال دیا اور آپ کو مدینہ میں جہاں بہت سے یہودی اور نصرانی موجود تھے پناہ یعنی پڑی۔ نصرانیوں نے فوراً آپ کا مذہب قبول کر لیا جس سے فی الجملہ آپ کو تقویت ہو گئی۔ کفار کی ایذا رسانی سے مجبور ہو کر آپ نے اپنی صاحبزادی اور بعض صحابہ کو پہلے سے جش بھیج دیا تھا جہاں کا فرمانروا نصرانی المذہب عیسائی تھا۔ چھ سال کی مدت میں صرف پندرہ سو آدمی آپ کے مذہب میں داخل ہوئے۔ لیکن تین چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں جو بعد میں بدر، احد اور احزاب کے نام سے مشہور ہوئیں آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ کی سب سے زبردست دلیل تلواریں ہیں۔ چنانچہ اس خیال کو آپ نے ان فصیح الفاظ میں جو مشرق سے آپ کو میراث میں ملے تھے اس طرح ظاہر کیا ہے۔ ”جنت تلواریں کے سایہ کے نیچے ہے۔“ غزوات کے ایک کامیاب سلسلہ نے آپ کے دشمنوں کا استیصال کلی کر دیا۔ عرب کی بت پرستی نیست و نابود ہو گئی۔ اصول لا الہ الا اللہ کو جس کا آپ نے اعلا فرمایا تھا آپ کے اہلئے وطن نے یک زبان ہو کر تسلیم کر لیا اور آپ کی نبوت پر بھی ایمان لے آئے۔

آؤ اب ہم آپ کی طوفان انگیز زندگی کے متمم بالشان کارناموں سے قطع نظر کریں اور سنیں کہ جب آپ کے دولت و اقبال کا آفتاب بھد آب و تاب چمک رہا تھا اور آپ کی حیات مستعار کا آخری وقت قریب آچلا تھا تو آپ کا طرز زندگی کیا تھا اور آپ نے اس وقت کیا کیا خیالات ظاہر کئے۔

عقیدہ وحدت باری تعالیٰ کے امٹ نقش کو اپنی لوح ایتقان پر مرسم کئے ہوئے آپ اس حج کے قصد سے جن کے بعد پھر کوئی حج آپ نے نہیں کیا مدینہ سے مکہ کو روانہ ہوئے۔ ایک لاکھ چودہ ہزار مسلمانوں کا قافلہ آپ کے پیچھے پیچھے تھا۔ اونٹ پھولوں کے ہاروں سے آراستہ و مزین تھے۔ لہراتے ہوئے پرچموں سے اس پر شکوہ کاروان کی حج درج

دوبلا ہو رہی تھی۔ اس شان و شوکت کے ساتھ جب آپ کہ معظمہ کے قریب پہنچے تو آپ نے یہ دعا کی: ”الہی میں تیری عبادت کے لئے یہاں موجود ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ تجھی کو عبادت سزاوار ہے۔ تو ہی مالک الملک ہے۔ کونین کی سلطنت میں تیرا کوئی شریک و سیم نہیں۔“

آپ نے اپنے ہاتھ سے اونٹوں کی قربانی کی۔ اس قدیم رسم کی نسبت آپ کا یہ خیال تھا کہ نماز اور قربانی مساوی الفضائل ہیں۔ جو دلیل ایک کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہے اسی سے دوسری کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

کعبہ کے منبر پر چڑھ کر آپ نے فرمایا کہ اے مسلمانوں میں بھی تمہاری طرح محض ایک انسان ہوں۔ جب یہ الفاظ آپ کی زبان سے نکلے تو سننے والوں کو معاً وہ واقعہ یاد آ گیا جب ایک شخص ڈرتے ڈرتے آپ کے قریب آیا تھا اور آپ نے اس سے فرمایا تھا کہ ”جی اس قدر کیوں سے جاتے ہو میں کچھ بادشاہ تو ہوں نہیں۔ ایک غریب عرب عورت کا بیٹا ہوں جو اونٹ کا گوشت دھوپ میں سکھا کر کھایا کرتی تھی۔“

جج کر کے آپ نے مدینہ کو مراجعت کی۔ آپ کی زندگی کا مقصد مکمل ہو چکا تھا۔ اب وہ وقت آ گیا کہ آپ دنیا سے رحلت کریں۔ آخری تقریر جو آپ نے مسلمانوں کی جماعت کے سامنے کی اس کے الفاظ یہ تھے: ”ہر شے خدا کی مرضی کے تابع ہے۔ اور اس کے لئے ایک خاص وقت مقرر ہے جس میں نہ تقدیم کو دخل ہے نہ تاخیر کو۔ جس نے مجھے دنیا میں بھیجا تھا میں اس کی طرف مراجعت کرتا ہوں اور تم کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ بھائی بھائی ہو کر رہو۔ ایک دوسرے کے ساتھ عزت اور محبت کا برتاؤ کرو۔ وقت پر ایک دوسرے کے کام آؤ اور ایک دوسرے کو ایمان پر ثابت قدم رہنے اور نیک عمل کرنے کی ہدایت کرو۔ میں جب تک زندہ رہا تمہاری بھلائی کی تدبیریں کرتا رہا اب مرتے وقت بھی اگر مجھے کوئی خیال ہے تو تم لوگوں کی بہبودی کا۔“

حالت نزع میں آپ کا سر حضرت عائشہ کے زانو پر تھا۔ فرط کرب سے آپ رہ رہ کر اپنا ہاتھ پانی کے طشت میں جو پاس رکھا ہوا تھا ڈالتے تھے اور اپنا چہرہ تر کرتے تھے۔ آخر اس کی بھی طاقت نہ رہی۔ آپ کی نگاہیں عرش بریں کی طرف اٹھ گئیں اور ٹوٹے ہوئے لہجہ میں یہ آخری الفاظ آپ کے منہ سے نکلے: الہی — میرے گناہ معاف کر — آمین — میں آیا۔“

کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے شخص کا نام تعظیم و تکریم کے ساتھ نہ لیا جائے؟ یہ شخص وہ ہے جس کے اصول آج کے دن بنی نوع انسان کے ایک تہائی حصہ کے رہ نما و پیشوا ہیں۔

حضرت محمدؐ اپنے ملک کے قدم بت پرستانہ عقائد سے تو پہلے ہی ابا کر چکے تھے۔ ان اصول کے تسلیم کرنے سے بھی آپؐ نے انکار کر دیا جو اگرچہ آپؐ کے نسوری اساتذہ نے آپؐ کو سکھائے تھے لیکن آپؐ کا ضمیر اور عقل ان کی تائید نہ کر سکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کے ابتدائی صفحوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے ان صحابف آسمانی کو جو حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئے مخائب اللہ سمجھا اور ان دونوں انبیائے کرام کو بھی آپؐ نے واجب التعظیم خیال کیا لیکن باری تعالیٰ کی حمد و ثناء اور تعظیم و تکریم کا جلوہ خصوصیت کے ساتھ قرآن کی ہر سورت میں نظر آتا ہے۔ الوہیت مسیح کا مسئلہ آپؐ کو نہایت ہی قبیح و مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ خدا کی ماں کی حیثیت سے حضرت مریمؑ کی پرستش کو اور عام طور سے مورتوں اور تصویروں کی عبادت کو آپؐ ایک ذلیل درجہ کی بت پرستی تصور کرتے ہیں۔ آپؐ تثلیث کے قطعی منکر ہیں جس کی نسبت آپؐ کا یہ خیال ہے کہ اس مسئلہ کی بجز اس کے اور کوئی تامل ممکن نہیں کہ عن خدا علیہ رحمۃً لہ موجود ہیں۔

آپؐ کا مقصد خاص صرف اسی قدر تھا کہ مذہب کی اصلاح کی جائے اور جو خرابیاں اس میں پیدا ہو گئی ہیں انہیں دور کیا جائے یعنی عربوں کی بت پرستی کو مٹا کر اس وحیانہ فرقہ بندی کا خاتمہ کر دیا جائے جس نے عیسائیت کو فساد کا گھر بنا دیا تھا۔ یہ خیال کہ آپؐ ایک نیا مذہب قائم کرنا چاہتے تھے ایک بہتان تھا جو آپؐ پر قسطنطنیہ میں پاندھا گیا۔ جہاں آپؐ ویسے ہی برے سمجھے جاتے تھے جیسا کئی صدیوں کے بعد لو تھرردا میں سمجھا گیا۔

لیکن اگرچہ آپؐ نے فرقہ واریت سے ان تمام باتوں کو رد کر دیا جن سے مسئلہ وحدت باری تعالیٰ کی کچھ بھی نفی ہوتی تھی پھر بھی تجسسی تصورات کی قید سے آپؐ اپنے آپؐ کو آزاد نہ کر سکے۔ قرآن کا خدا بالکل انسان کے مشابہ ہے بلکہ اگر موزونی الفاظ اجازت دے تو کہا جاسکتا ہے کہ جسمانی اور دماغی ہر ایک اعتبار سے یہ خدا مثیل انسان ہے۔ لیکن مسلمان بہت جلد ان ادنیٰ درجہ کے خیالات کی پستی سے نکل کر ان رفیع الشان تصورات تک پہنچ گئے جن میں حکمت و اوراک کی لطائف اپنی جھلک دکھا رہی تھیں۔

اسلام کی ابتدائی صورت کا جو خاکہ یہاں کھینچا گیا ہے اس پر بڑے بڑے قابل فکرت سنج اہل آرا کا صاد ہے۔ سرولیم جوئس نے بہ اجماع لاک یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ”اسلام اور عیسائیت کا سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ مسلمان مسیح کو نہ تو ابن اللہ سمجھتے ہیں اور نہ بیٹے کو الوہیت کی حیثیت سے باپ کا ہم درجہ مانتے ہیں۔ خدا کی وحدانیت اور صفات کے متعلق ایسے ایسے خیالات رکھتے ہیں جن سے انسان کے قلب پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔“ اٹلی میں اکثر لوگوں کی یہی رائے ہے۔ ڈینی کا خیال تھا کہ اسلام عیسائیت کی محض کی ایک

نئی شاخ ہے اور مسلمانوں کو ایرئس کے پیروں کا ایک فرقہ سمجھنا چاہئے۔ انگلستان میں ویسٹلی اسلام کو عیسائیت کی ایک مسخ شدہ شکل سمجھتا ہے۔ لیکن ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اسلام نسوری مذہب کی ایک شاخ تھا جس کے مقاصد ابتدائی محدود تھے۔ جب تک کہ یونانی مسیحیت کو بہت سی نتیجہ خیز لڑائیوں میں نچا دکھا کر یہ مذہب بہ سرعت تمام ایشیا و افریقہ میں پھیل نہ لیا اور اپنی حیرت انگیز فتوحات کے نشہ میں چور نہ ہو لیا اس وقت تک اس نے اپنے ابتدائی مقاصد کو پس پشت نہ ڈالا اور ایک نئی شرع کے بانی ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔

حضرت محمدؐ کی قرباً ساری زندگی اپنے ہی وطن کا مذہب بدلنے یا اسے فتح کرنے میں بسر ہوئی۔ لیکن اخیر دنوں میں آپؐ کی قوت اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ مسلمانوں کو شام اور ایران پر حملہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو چلا تھا۔ چونکہ آپؐ نے سلطنت کو اپنے خاندان میں قائم رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا لہذا آپؐ کی جانشینی کا مسئلہ جھگڑے میں پڑ گیا۔ آخر بہت کچھ کشمکش اور جدوجہد کے بعد جناب عائشہؓ کے والد حضرت ابو بکرؓ جانشینی کے لئے نامزد ہوئے اور پہلے خلیفہ یا نائب رسول اللہ مقرر ہوئے۔

اشاعت اسلام و اشاعت مسیحیت میں ایک بہت بڑا اہم فرق ہے۔ مسیحیت کو کبھی بھی اتنی طاقت حاصل نہ ہوئی کہ دولت روم کی بت پرستی کا قلع قمع کر سکتی۔ جس قدر اس کو ترقی ہوئی اسی قدر بت پرستی کا عنصر اس میں زیادہ ملتا گیا۔ ایک مذہب کی قدیم شکلیں زندہ ہو کر دوسرے مذہب میں آلیں اور نتیجہ جیسا کہ گزشتہ اور اوراق میں بہ تفصیل بتایا جا چکا ہے یہ ہوا کہ مسیحیت بت پرستی کے ساتھ مخلوط ہو گئی۔

لیکن عرب میں حضرت محمدؐ نے قدیم بت پرستی کو ایسا مٹایا کہ اس کا نشان تک باقی نہ رکھا۔ جن عقائد کی آپؐ نے اور آپؐ کے جانشینوں نے تلقین کی ان میں بت پرستی کا ڈھونڈنے سے بھی سراغ نہیں ملتا۔ وہ حجر اسود جو آسمان سے گرا تھا اور وہ بت جو اس کے گرد حلقہ زن تھے سب نظر سے غائب ہو گئے۔ نئے مذہب کا اصل اصول یعنی لا الہ الا اللہ دنیا میں بغیر کسی قسم کی مشرکانہ آمیزش کے پھیل گیا۔ جنگی فتوحات نے قرآن کے مذہب کو دیوی اعتبار سے بہت کچھ نفع بخش ثابت کیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ مذہب کا اصل اصول خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جب تلوار کا زور ہوتا ہے تو بہت سے لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر نئے مذہب کی حلقہ بگوشی کے لئے تیار ہو ہی جاتے ہیں۔

اسلام کے باقی عقائد کو جو مشہور و معروف ہیں میں یہاں نظر انداز کرتا ہوں۔ جن ناظرین کو اس بحث سے دلچسپی ہو وہ میری کتاب ”ہسٹری آف دی انڈیپنڈنٹ ڈیولپمنٹ

آف یورپ“ (یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ) کا گیارہواں باب ملاحظہ فرمائیں جس میں میں نے قرآن پر تنقید کی ہے۔ اس مقام پر صرف اتنا لکھ دینا کافی ہو گا کہ مسلمانوں کی ہمت کی سات منزلیں ہیں اور ہر منزل گویا فرمانروایان مشرق کا ایک محل ہے جس میں ہر طرح کی جسمانی لذتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں سیاہ آنکھوں والی حوریں اور غلمان بھرے پڑے ہیں۔ اسلام کے خدا کی صورت شاید کفر آلودہ عیسائیت کے خدا کی شکل کی بہ نسبت زیادہ مہیب اور بارعب ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا کو انسانی صفات سے متصف کرنے کا خیال ان لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہو سکتا جو حکمت آشنا نہیں ہیں۔ ان کا خدا زیادہ سے زیادہ گویا ایک دیو پیکل انسان ہے جس کا سر آسمان سے لگا ہوا ہے اور ٹانگیں زمین پر ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی حسب ذیل اعلان شائع کیا :

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللہ جل شانہ کی حمد و ثناء کرنے اور محمد رسول اللہ پر درود بھیجنے کے بعد ابوبکر تمام مسلمانوں کے لئے دعا مانگتا ہے کہ ان پر خدا کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں اور ان کو صحت و عافیت کی نعمت میسر ہو۔ اس کے بعد تم لوگوں کو واضح ہو کہ میرا ارادہ مسلمانوں کو شام کی جانب روانہ کرنے کا ہے تاکہ یہ ملک کفار کے ہاتھوں سے لے لیا جائے۔ میں تم سب کو یہ جگہ دینا چاہتا ہوں کہ مذہب کی حمایت میں لڑنا خدا کی اطاعت کرنا ہے۔“

پہلی لڑائی میں جب عربی فوج کے سپہ سالار خالد کا قافیہ غنیمت لے نکلا تو اس نے اپنی سب فوج کے سامنے ہاتھ اٹھا کر ان الفاظ میں خدا سے دعا مانگی : ”بار الہایہ بد بخت مشرک بتوں کا نام لے لے کر دعا مانگتے ہیں اور تیرے سوا دوسرے خدا کی پرستش کرتے ہیں حالانکہ ہم تیری توحید کے قائل ہیں اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ تیرے سوا اور کوئی خدا نہیں۔ پس ہم نہایت عاجزی کے ساتھ تجھ سے التجا کرتے ہیں کہ اپنے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہماری مدد کر اور ہمیں ان بت پرستوں پر فتح دے۔“ عربوں نے فتح شام میں حرارت دینی کا حد سے زیادہ اظہار کیا۔ شامی عیسائیوں کے عقائد ان کے دلوں میں غیظ و غضب اور نفرت و حقارت کے طوفان پا کر کر دیٹے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر خالد کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے : ”میں اس کفر بکنے والے ہمت پرست کی کھوپڑی پھوڑ ڈالوں گا جو اللہ جل جلالہ کی شان میں یہ کہے گا کہ وہ بھی بیٹے والا ہے۔“ حضرت عترت قاتح بیت المقدس ہر قل قیصر روم کو خط لکھتے ہیں جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں : ”حمد ہو اللہ کی جو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے اور جس کے نہ بی بی ہے اور نہ بیٹا۔“ اہل عرب عیسائیوں کو مشرک کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ عیسائیوں نے مریم و عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ

جل شانہ کا شریک بنا رکھا تھا۔

حضرت ابو بکرؓ کا یہ قصد نہیں تھا کہ فوج کی کمان خود کریں۔ یہ خدمت نام کو ابو عبیدہ اور دراصل خالد کے سپرد کی گئی۔ رخصت کے وقت جب غلیظہ المسلمین نے فوج کا جائزہ لیا تو افسروں اور سپاہیوں کو تاکید کی کہ فریق مقابل سے انصاف اور رحم کا برتاؤ کریں اپنے عہد و بیان پر ثابت قدم رہیں۔ بیوہ گفتگو سے بچیں۔ شراب خوری سے پرہیز کریں۔ پانچوں وقت پابندی کے ساتھ نماز پڑھیں۔ جہاں جہاں گذریں عام لوگوں کے ساتھ یہ ملاہفت پیش آئیں مگر ان کے پادریوں پر ذرا رحم نہ کریں۔

دریائے ژردن کے مشرق کی جانب بھرا کا مضبوط شہر واقع ہے جہاں رسول عربیؐ کا اول اول اپنے نسوری معلموں سے ملتے تھے۔ دولت روم کے جو قلعے ارض شام میں جا بجا بنے ہوئے تھے انہیں میں بھرا کے قلعہ کا بھی شمار تھا۔ فوج عرب نے اس کے سامنے ڈیرے ڈال دیے۔ قلعہ بند فوج کی طاقت نفیم کے مقابلہ میں کچھ کم نہ تھی اور اس طاقت میں ان مقدس ملیوں اور حبرک جھنڈوں نے اضافہ کر دیا تھا جنہیں محصورین کی خوش اعتقادی نے فسیل پر بلند کر رکھا تھا۔ اہل قلعہ عرصہ دراز تک اپنی حفاظت کر سکتے تھے لیکن قلعہ دار رومینس کی نیت بدل گئی اور اس نے چپکے سے پھاٹک کھول دیے۔ اس کے اس طرز عمل سے ظاہر ہے کہ اہل شام کی حالت کیسی بری ہو رہی تھی۔ جب فوج محاصروہ شہر میں داخل ہو گئی اور رومینس نے قلعہ کی سبھیاں پہ سلاز عرب کے حوالہ کر دیں تو اہل قلعہ کو اس نے حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کیا: ”آج سے میں تم لوگوں سے جدا ہوتا ہوں۔ دنیا و عقبی دونوں جگہ میری تمہاری راہیں الگ الگ ہوں گی۔ مجھے اس خدا سے انکار ہے جو مصلوب ہوا تھا اور جو لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں میں ان سے بھی بیزار ہوں۔ میرا خدا آج سے خدائے واحد ہے۔ میرا مذہب آج سے مذہب اسلام ہے۔ میرا قبلہ آج سے مکہ معظمہ ہے۔ میرے بھائی آج سے مسلمان ہیں اور میرا رسول آج سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا اور جس نے علی رغم مشرکین اعلانِ عظمت الحق میں کامیابی حاصل کی۔“ ایران کے حملہ کے بعد ایشیائے کوچک، شام بلکہ فلسطین میں بھی تمک حراموں اور مرتدوں کا ایک گروہ کثیر ایسا پیدا ہو گیا تھا جو عربوں کے ساتھ مل جانے کے لئے صرف موقع کا بھٹھرتا تھا۔ رومینس کا شمار بھی ان ہزار ہا لوگوں میں تھا جو ایرانی فتوحات کی وجہ سے بد اعتقاد ہو گئے تھے۔

شام کا پایہ تخت دمشق بھرا سے صرف بہتر میل جانب شمال واقع تھا۔ فوج عرب بلا توقف اسی طرف روانہ ہوئی۔ اہل دمشق سے کہا گیا کہ تین باتوں میں سے جو چاہو اختیار

کرو یعنی یا تو اسلام لاؤ یا جزیہ دو یا مقابلہ کرو۔ شہنشاہ ہر قس اس وقت انطاکیہ میں مقیم تھا جس کا فاصلہ دمشق سے بہ سمت شمال صرف بقدر ڈیڑھ سو میل کے رہ گیا تھا۔ حملہ آوروں کی پیش قدمی کی خبر وحشت اثر سن کر ہر قس کے ہوش اڑ گئے اور اس نے فوراً "ستر ہزار فوج فقیم کا راستہ روکنے کے لئے روانہ کی۔ عربوں کو مجبوراً" دمشق کا محاصرہ چھوڑنا پڑا۔ اجنادین کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور رومی فوج شکست فاش کھا کر بحالت تباہ منتشر و پریشان ہو گئی۔ یہاں سے مظفر و منصور ہو کر خالد نے پھر دمشق کے سامنے اپنا علم جس پر سیاہ عقاب کا نشان بنا ہوا تھا بلند کیا اور ستر دن کے محاصرہ کے بعد اہل دمشق نے ہتھیار ڈال دیئے۔

عربی تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک افواج عرب کی حالت مذہبی خطیوں کی ایک بے قاعدہ جمعیت سے کچھ بہتر نہ تھی۔ بہت سے سپاہی ایسے ہوتے تھے جنہیں تن ڈھکنے کے لئے کپڑا تک میسر نہ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص فوج کی صف سے نکل کر میدان میں آکھڑا ہوتا تھا اور فریق مقابل سے مبارز طلب کرتا تھا اور دونوں اس وقت تک لڑتے رہتے تھے جب تک کہ ایک کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ مرد تو ایک طرف رہے عورتیں تک شریک جنگ ہوتی تھیں اور داد شجاعت دیتی تھیں۔ چنانچہ ان کے ان بہادرانہ کارناموں کی بہت سی دلچسپ روایتیں تاریخوں میں موجود ہیں۔

کوہستان لبنیس کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں اور دریائے اراٹس کے خوش سواد اور پر فضا کناروں کی رہ نمائی سے عربی فوج دمشق کے شمال کی طرف روانہ ہوئی۔ رستہ میں طبرک اور حمص دو شہر پڑتے تھے۔ دونوں کو یکے بعد دیگرے اس نے مسخر کیا۔ ہر قس کو پل پل کی خبریں ملتی تھیں۔ حملہ آوروں کی مزید پیش قدمی کا سدباب کرنے کے لئے اس نے ایک لاکھ چالیس ہزار کا لشکر جرا جمع کیا۔ یرموک کے میدان جنگ میں دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ پہلے حملہ میں عربی فوج کے سینہ کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن عرب عورتوں نے ہزیمت کھائے ہوؤں کے دلوں میں اپنے غیرت آفرین الفاظ سے نیا جوش پیدا کر دیا۔ وہ پلٹے اور اس بے جگری سے لڑے کہ لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ رومی فوج ان کے حملہ کی تاب نہ لا سکی اور اسے شکست فاش ملی۔ چالیس رومی قید ہوئے اور ہزاروں میدان جنگ میں کام آئے۔ اب تمام ملک فاتحوں کے قبضہ میں آ گیا۔ چونکہ انہوں نے دریائے ڈرون کے مشرق کی جانب پیش قدمی کی تھی لہذا صاف ظاہر تھا کہ ایشیائے کوچک پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے فلسطین کے مستحکم اور سربر آوردہ شہروں کا مسخر ہو جانا ضروریات سے ہے۔ سرداران فوج میں اس مسئلہ کے متعلق اختلاف رائے ہوا کہ اول قیصریہ پر حملہ کرنا چاہئے یا بیت

المقدس پر۔ جب بحث اس اختلاف کا تعقیب نہ کر سکی تو دربار خلافت سے استعفا کیا گیا۔
 خلیفہ کی عقل سلیم نے بیت المقدس کی فتح کے اخلاقی فوائد کو تغیر قیصریہ کے جنگی فوائد پر ترجیح دی چنانچہ عربی فوج کے سپہ سالار کے نام اس مضمون کا حکم پہنچا کہ بیت المقدس پر اول حملہ ہو اور جس طرح بن پڑے اسے سر کیا جائے۔ غرض اس شہر کا یہ سرگرمی تمام محاصرہ کیا گیا۔ یہاں کے باشندوں کو ایرانی حملہ کے وقت مزار مسیح کی توہین فراموش نہ ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے محافظت و مدافعت کی بہت بڑی تیاریاں کیں اور جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ لیکن چار مہینے کے محاصرہ کے بعد جب انہوں نے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی تو بطریق سفرائنس فصیل شہر پر آکھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اگر ہم کو امان دی جائے اور شرائط ملے ہو جائیں تو ہم لوگ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہیں۔ چونکہ فتح دمشق کے وقت سرداران فوج کی غلط فہمیوں کی وجہ سے باشندگان شہر کا قتل عام ہوا تھا لہذا سفرائنس نے یہ شرط پیش کی کہ بیت المقدس خلیفہ کی موجودگی میں مسلمانوں کے حوالے کیا جائے گا۔ یہ شرط منظور کر لی گئی اور حضرت عمرؓ جو اس وقت خلیفہ تھے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لئے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ آپ نے سفر اس حیثیت سے کیا کہ ایک سرخ رنگ کے اونٹ پر سوار تھے اور زادراہ کی قسم سے آپ کے ساتھ ایک قھیلے میں کچھ اناج تھا۔ ایک قھیلے میں کھجوریں تھیں۔ ایک لکڑی کی رکابی تھی اور پانی کے لئے ایک چمڑے کی چھال تھی۔ غرض اس شان کے ساتھ عرب فاتح عیسائی بطریق کی سواری کے ہمراہ بیت المقدس میں داخل ہوا اور مسیحیت کا صدر مقام بغیر کسی شور و شر اور بغیر کسی خونریزی کے پیشوائے اسلام کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ حکم دینے کے بعد کہ بیکل سلیمانی کی جگہ ایک مسجد تعمیر کی جائے خلیفۃ المسلمین نے مدینہ کو مراجعت کی۔

ہر قس سے یہ بات مخفی نہ تھی کہ جو تباہیاں اور مصیبتیں عیسائیت پر ہیمن نازل ہو رہی ہیں ان کا باعث متخالف العقاید مسیحی فرقوں کا تفرقہ ہے۔ اسی لئے جہاں اس نے سلطنت کی حمایت میں تلوار اٹھائی وہاں ان اختلافات کے مٹانے کی بھی بدل کوشش کی۔ اس غرض کو پیش نظر رکھ کر اس نے یہ اصول مسیحی دنیا میں شائع کرنا چاہا کہ چونکہ مسیح کی ربانی اور انسانی فطرتیں ایک دوسرے میں ضم ہو چکی ہیں اور جدا جدا نہیں لہذا مسیح کی مشیت بھی جس سے اس کے ربانی و انسانی افعال صادر ہوتے ہیں ایک ہیں اور وہ مشیت ایزدی ہے مشیت انسانی نہیں۔ لیکن یہ کوشش ہر قس نے اس وقت کی جب پانی سر سے گذر چکا تھا۔ بیت المقدس کی تعمیر کے بعد مسلمان ایشیائے کوچک کی طرف بڑھے اور حلب اور انطاکیہ پر قبضہ کیا۔ وہ برابر بڑھتے ہوئے چلے جاتے تھے اور کوئی طاقت ایسی نہ

تھی جو ان کی فتوحات کے سیلاب کو روک سکے۔ خود ہر قس کو جان بچانے کے لئے فرار ہوتا پڑا اور شام کا صوبہ جسے جوئس یزر کے رقیب پامی اعظم نے سات سو سال پہلے دولت رومہ الکبریٰ کے ساتھ ملحق کیا تھا جو عیسائیت کا زاد بوم تھا جہاں اس کی مقدس اور قیمتی یادگاریں موجود تھیں جہاں سے خود ہر قس نے ایک مرتبہ ایرانی حملہ آوروں کو نکال دیا تھا اب ایسا ہاتھوں سے نکلا کہ پھر واپس نہ آیا۔ کہتے ہیں کہ جس جہاز میں ہر قس سوار ہو کر قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا جب اس نے ٹکر اٹھایا تو ہر قس حسرت بھری نگاہوں سے پیچھے ہٹتی ہوئی پہاڑیوں پر ٹھنکی جما کر درود کرب کے لہجہ میں پکارا: ”الوداع اے شام ہمیشہ کے لئے الوداع۔“

فتوحات عرب کے باقی واقعات کی تفصیل اس مقام پر درج کرنی ضروری نہیں ہے۔ طرابلس اور ٹار (صور) کا خود اپنے ہی افسروں کی غداری سے مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جانا۔ قیصریہ کا فتح ہونا۔ کوستان لبیس کے درختوں اور فیثیا کے ملاحوں کی مدد سے ایک بیڑے کا تیار کیا جانا اور اس بیڑے کا روما کے جنگی بیڑے کو شکست دے کر ہیلپناٹ کی طرف بھاگنا۔ قبرس روڈس اور سلکیڈس کا تخت و تاراج ہونا اور کلاس کے مجسمہ کا جو عجائبات دنیا میں شمار ہوتا تھا ایک یہودی کے ہاتھ جو اس کے پتیل سے نو سوانٹ لاد کر لے گیا بکنا اور اسلامی فوج کا بحیرہ اسود کی طرف بڑھنا بلکہ قسطنطنیہ کی دیواروں کے سامنے ڈیرے ڈالنا۔ یہ تمام ایسی باتیں تھیں جن کی فتح بیت المقدس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔

فتح! اور وہ بھی بیت المقدس کی!! عیسائیت کے پایہ تخت کی!!! کس طرح ممکن تھا کہ لوگ اس واقعہ کو اسلام کے غلبہ اور مسیحیت کی شکست سے تعبیر نہ کریں۔ دونوں مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو سچا سمجھ کر اس یقین کے ساتھ کہ فتح سچائی کی ہوگی ایک دوسرے کا مقابلہ کیا تھا اور فیصلہ خدا پر چھوڑا تھا۔ خدا نے فتح اسلام کو عطا کی اور فتح کا تمغہ بیت المقدس کی شکل میں مسلمانوں کو دیا۔ اور اگرچہ حروب صلیبیہ کے دوران میں عیسائیوں کو تھوڑی دیر کے لئے کامیابی حاصل ہو گئی لیکن نتیجہ یہ ہے کہ ہزار سال کی جدوجہد کے بعد آج بھی وہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ دولت قسطنطنیہ کے مورخین پر وقایع نگاری کا جو طریقہ اختیار کرنے کا الزام لگایا گیا ہے اس کے لحاظ سے وہ ایک حد تک قابلِ مبالغہ ہیں۔ ”انہوں نے کلیسائے شرقی کی جہاں کے اہم مسئلہ کو چھوٹا کر دیا۔“ باقی رہا کلیسائے غربی۔ سو اس کی یہ حالت ہے کہ ازمہ وسطے یعنی دو حروب صلیبیہ کے ذیل اساقف تک کی رگ حیات پھرنے لگتی تھی جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ ہم روما کو اس جھوٹی

روایت کی بنا پر کہ سینٹ پیٹر نے یہاں قدم رنجہ فرمایا تھا مجبور ہو کر مسیحیت کا پایہ تخت قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ عیسائیت کا اصلی مرکز حکومت یعنی مسیح کی ولادت زندگی اور وفات کا عظیم الشان اور مقدس مقام کفار کے قبضہ میں ہے۔ یورپ کے مسیحی مصنفین نے ہر مضمون پر قلم اٹھاتے وقت خواہ اس کا موضوع تاریخ ہو یا مذہب یا سائنس جب اپنے عقائد مخالفین کا ذکر کیا ہے تو اسی طرح زہر افگنا ہے۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ جس چیز میں وہ کوئی منقبت کا پہلو نہ نکال سکیں اسے چھپائیں اور جس چیز کو چھپانہ سکتے ہوں اس کی تنقید کریں۔

قلت گنجائش اور نیز اس کتاب کا موضوع ہم کو اجازت نہیں دیتا کہ جس طرح فتح بیت المقدس کا ذکر ہم نے بہ تفصیل کیا ہے اسی طرح پوری وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کی دوسری فتوحات کے واقعات لکھیں جن کی بدولت آگے چل کر ایک ایسی عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم ہو گئی جو جغرافیائی وسعت میں اسکندر کی سلطنت بلکہ دولت رومہ الکبریٰ پر بھی بمراتب فوقیت لے گئی۔ لیکن اس مضمون پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے ہم اس قدر کہنا بے موقع نہیں سمجھتے کہ عیسائیت پر جو طمانچہ پڑا تھا مجوسیت نے اس سے بھی زور کا تھپڑ کھایا۔ قادیسہ کی جنگ نے ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ مدائن کے لئے پر خزانہ واسطہ شامی اور بے انتہا مال غنیمت عربوں کے ہاتھ آیا۔ معرکہ نہاند کو عرب مورخوں نے جو ”فتح الفتوح“ کا لقب دیا ہے وہ کچھ غیر موزوں نہیں۔ ایک طرف تو وہ بحیرہ خزر کی طرف بڑھے اور دوسری طرف جنوبی سمت میں وچلہ کے کنارے کنارے اصطخر کا رخ کیا۔ فرمانروائے ایران اس شہر کے میناروں اور پتھر کی صورتوں میں سے گذر کر جو اسکندر کی محفل سے نوشی کی رات سے اجڑا پڑا تھا صحرائے نمک میں سے ہوتا ہوا جان سلامت لے کر بھاگ گیا۔ عربی فوج کا ایک حصہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اس کو جیون عبور کرا آیا جہاں اسے ترکوں نے قتل کر ڈالا۔ اس کے بیٹے کو چین میں پناہ لینی پڑی جہاں وہ فقور چین کی فوج میں کپتان ہو گیا۔ جیون کے اس پار کا علاقہ بھی مسلمانوں کا مطیع و منقاد ہو گیا اور خراج میں دو لاکھ اشرفیاں دینی منظور کیں۔ غرض ایک طرف تو فقور چین اپنے پایہ تخت ہیکن سے مدینہ میں اپنا سفیر بھیج کر خلیفہ المسلمین سے التجائے صلح و آتش کر رہا تھا اور دوسری طرف علم نبوی دریائے انڈس کے کناروں پر لہرا رہا تھا۔

شام کی لڑائیوں میں جن سرداران فوج نے علم امتیاز بلند کیا ان میں سے ایک عمرو بن العاص بھی تھا جس کے مقدر میں فاتح مصر ہونا لکھا تھا۔ خلفاء نے اپنی شمالی و مشرقی فتوحات ہی پر قناعت نہ کی بلکہ اب مغرب کی طرف نگاہ اٹھائی اور افریقہ کے الحاق کی تیاریاں

شروع کیں۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی مذہبی فرقوں کا باہمی عناد و تفرقہ ان کی کامیابی کا باعث ہوا۔ فرقہ ”جیکو بائٹ“ نے مسلمانوں کو اپنا ذریعہ مخلصی سمجھ کر عرب فوج کا خیر مقدم صدق دل سے کیا۔ فرقہ منوفسطائیہ نے جو بقول پیروان مذہب سینٹ ایتھنسیس ذات ابن اللہ کی الوہیت و انسانیت کو مخلوق سمجھتا تھا اپنے سرگروہ مقوقس کے ذریعہ ہے اس امر کا اعلان کیا کہ ہم یونانیوں سے نہ دنیا میں تعلق رکھنا چاہتے ہیں نہ عقبی میں اور ظالم قیصر قسطنطینیہ اور اس کی کونسل سے جس کا مستقر جلیسیڈان ہے ہمیشہ کے لئے ابرا کرتے ہیں۔ غرض انہوں نے خلیفہ الاسلام کو خوشی خوشی خراج دینا قبول کیا۔ سڑکوں اور پلوں کی مرمت خود کردی اور حملہ آور فوج کو نہ صرف رسد بہم پہنچائی بلکہ اس کے لئے جاسوسی کی خدمت بھی انجام دینے میں دریغ نہ کیا۔

مفس پر جو فراعنہ کے زمانہ میں مصر کا پایہ تخت تھا مسلمانوں کا بہت جلد قبضہ ہو گیا اور اس کے بعد افواج اسلام نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا۔ چونکہ اسکندریہ کے پس پشت سمندر کی راہ کھلی تھی لہذا ہر قس کو محصورین کے لئے کمک بھیجنے کا موقع ملتا رہا۔ ادھر حضرت عمرؓ نے بھی جو اس وقت مسند خلافت پر متمکن تھے فوج محاصرہ کی امداد کے لئے شام کی جنگ آزمودہ سپاہ روانہ کی۔ محاصرین کی طرف سے بہت سے دھاوے ہوئے اور محصورین نے بہت دفعہ نکل نکل کر مسلمانوں پر حملے کئے۔ ایک دفعہ محصورین نے عمرو کو گرفتار کر لیا مگر وہ ایک غلام کی ٹہانازانہ عیاری سے بچ کر نکل آیا۔ غرض چودہ مہینے کے محاصرہ کے بعد جس میں مسلمانوں کی تیس ہزار فوج کام آئی اسکندریہ کو اسلام کے آگے سرسبز ہونا پڑا۔ عمرو بن العاص نے جب دوبار خلافت میں فتح اسکندریہ کا مژدہ بھیجا تو مغرب کے اس شہر کے شان و شکوہ اور جاہ و جلال کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ اس میں چار ہزار محل چار ہزار حمام چار سو تماشگا ہیں بارہ ہزار پھل ترکاری اور اناج کی دکانیں ہیں اور چالیس ہزار باج گذار یہودی آباد ہیں۔

اس طرح عیسائی دنیا کا دوسرا شہر بھی کشور کشایان اسلام کی سلک فتوحات میں منسلک ہو گیا اور جو حشریت المقدس کا ہوا تھا وہی اس اسکندریہ کا بھی ہو اس کو اپنے مسیحی آثار پر ناز تھا جس نے ایتھنسیس اور ایرئس اور سائرل کو گودیوں میں کھلایا تھا جس نے کلیسا کے عقائد کی شاخ میں اقامت ملے اور پرستش مریم کا پیوند لگایا تھا۔ ہر قس قسطنطینیہ میں تھا کہ یہ جانکاہ خبر پہنچی۔ اس صدمہ سے اس کی کمر ٹوٹ گئی اور دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا عیسائیت کے زوال سے اس کی حکومت کے ماتھے پر کلنگ کا امٹ چمکا گئے والا ہے۔ فتح اسکندریہ کے صدمہ نے اسے ایک مہینہ سے زیادہ زندہ نہ

رہنے دیا اور وہ اسی رنج میں گھل گھل کر مر گیا۔

اسکندریہ کا ہاتھ سے نکل جانا قسطنطینیہ کے لئے ایک دہرا دکھ تھا۔ اس لئے کہ مذہب کے مرکز ہونے کے علاوہ اس کا وجود روزمرہ کی رسد رسانی کے لحاظ سے بھی قسطنطینیہ کے لئے ضروریات سے تھا۔ مصر رومیوں کے لئے اناج کی منڈی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ زبردست جنگی بیڑوں اور جرار فوجوں کی مدد سے دو دفعہ اس مقام کو مسلمانوں سے چھین لینے کی کوشش کی گئی اور دونوں دفعہ عمرو کو یہ شہر گویا ازسرنو فتح کرنا پڑا۔ فاتح اسکندریہ نے جب یہ دیکھا کہ سمندر کے کنارے پر واقع ہونے کے باعث اس شہر پر غنیم باسانی حملہ آور ہو سکتا ہے جس کے دفعیہ کی ترکیب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ شہر پناہ کو ہی مسمار کر دیا جائے تو اس کے منہ سے بے اختیار یہ کلمات نکلے: ”قسم ہے خدائے قوم کی کہ اگر تیسری مرتبہ بھریبی کوشش اغیار کی طرف سے ہوئی تو میں اسکندریہ کو کسی طوائف کے دروازہ کی طرح تمام دنیا کے لئے کھول دوں گا۔“ یہ دھمکی پوری ہو کر رہی۔ عمرو نے جو کچھ کہا تھا اس سے زیادہ کر دکھایا۔ یعنی فوراً شہر کی فصیلوں اور دھون کو زمین کے برابر کر دیا جس سے اس کی قوت مزاحمت و مدافعت سلب ہو گئی۔

خلفائے اسلام کا قصد یہ نہ تھا کہ اپنے دائرہ فتوحات کو مصر ہی تک محدود رکھیں۔ حضرت عثمانؓ خلیفہ ثالث نے افریقہ کے کل شمالی ساحل کی تسخیر و الحاق کا عزم کیا۔ چنانچہ آپ کے سپہ سالار عبداللہ نے چالیس ہزار فوج کے ساتھ Memphis سے روانہ ہو کر صحرائے برقہ کو قطع کرتے ہوئے طرابلس کا جا محاصرہ کیا۔ لیکن چونکہ فوج میں وبا پھوٹ پڑی اس لئے اسے مجبوراً مصر کو واپس آنا پڑا۔

اس کے بعد بیس سال تک مسلمانوں نے کوئی پیش قدمی نہ کی لیکن تقریباً ”ریع صدی کا جوش کشور کشائی جو اندر ہی اندر کسی چشمہ کی طرح ابل رہا تھا کب تک رکا رہتا۔ آخر یہ جوش ظاہر ہوا اور فتوحات کا ایک سیلاب شمالی افریقہ پر چھا گیا۔ عقبہ وادی نیل سے آمد می کی طرح اٹھا اور کوہ و صحرا دشت و بیابان کو قطع کرتا شہروں اور ملکوں کو حلقہ بگوش خلافت بناتا ہوا بحر اوقیانوس کے ساحل تک جا پہنچا۔ اور جب سمندر کی موجوں نے اس کے اسپ مبارک کے سموں کو جزایر کنیری کے بالمقابل بوسہ دیا تو یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے: ”سبحان زلی الکبرياء والجبوت! اگر یہ سمندر میرا مزاحم نہ ہوتا تو میں مغرب کے نامعلوم ملکوں میں برابر بڑھا ہوا چلا جاتا اور خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت کا ڈنکا بجاتا ہوا ان تمام سرکش قوموں کو تلوار کے گھاٹ اتارتا جو خدائے واحد کے سوا کسی دوسرے خدا کی پرستش کرتی ہیں۔“

عربوں نے یہ چڑھائیاں ملک کے اندرونی علاقوں پر کی تھیں۔ اس لئے کہ ابھی تک بحیرہ روم پر فرمانروایان قسطنطنیہ کے اقتدار کا علم نہ لراتا تھا اور جو شہر ساحل پر واقع تھے وہ بحری قوت کی بدولت ان کے قبضہ میں تھے۔ آخر کار خلیفہ عبدالملک نے کارہنج کی تسخیر کا عزم کیا جو ان شہروں میں سب سے زیادہ آباد اور طاقتور تھا بلکہ گویا شمالی افریقہ کا دارالسلطنت تھا۔ اموی سپہ سالار حسن نے کنڈیس اور سیڑھیاں لگا کر ایک ہلہ میں اسے سر کر لیا لیکن چونکہ کارہنج والوں کو قسطنطنیہ سے کمک پہنچ گئی اور اس کے علاوہ سسلی اور گاتھ کی فوج بھی ان کی مدد کے لئے آگئی لہذا حسن کو پسا ہونا پڑا۔ لیکن یہ کامیابی چند روزہ ثابت ہوئی۔ حسن نے چند مہینے کے بعد سنبھل کر پھر حملہ کیا اور اس مرتبہ غلبہ پانے کے بعد کارہنج کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیا۔

بیت المقدس اور اسکندریہ پہلے ہی عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ کارہنج کی تسخیر سے عیسائی طاقت کا ایک اور زبردست مرکز کم ہو گیا۔ قسطنطنیہ کا فتح ہونا بھی صرف چند دن کی بات تھی۔ اس کے مسخر ہو جانے کے بعد عیسائیوں کے پاس لے دے کر ایک صرف رونا باقی رہ جاتا تھا۔

عیسائیت کے نشوونما میں کارہنج نے کچھ کم حصہ نہیں لیا تھا۔ اسی کی بدولت یورپ میں رومن کیتھولک مذہب نے رواج پایا۔ اسی کی خاک سے اس مذہب کے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں سینٹ آگسٹائن کے سے شہر آفاق پادری نے جنم لیا۔ جب ہم دنیا کے مذاہب کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سرعت و وسعت اشاعت میں کوئی مذہب اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اسلام کوہ الطائے سے لے کر بحر اوقیانوس اور وسط ایشیا سے لے کر افریقہ کی مغربی حدود تک کوس لن الملک الیوم بجا رہا تھا۔

اب خلیفہ ولید کا دور آیا اور اس نے فرمان صادر کیا کہ یورپ پر چڑھائی کی جائے اور اندلس یعنی مغرب الاقصیٰ کو سلطنت اسلام میں شامل کر لیا جائے۔ مذہبی تفرقہ اور ملکی نمک حرای ہمیشہ سے اسلامی حملہ آوروں کی اعانت کرتی چلی آئی تھی۔ اس موقع پر بھی مسلمانوں کے سپہ سالار موسیٰ کو بھی دو پرانے مفتی مجسم ہو کر ٹالینڈو کے اسقف اور گاتھ فوج کے سپہ سالار کاؤنٹ جولین کی شکل میں مل گئے۔ جنگ زیریں میں عین اس وقت جب کہ مسلمانوں اور مسیحیوں میں برابر کی چوٹیں چل رہی تھیں اور یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ فریقین میں سے شکست کون پائے گا اور فتح کس کو ہوگی مسیحی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ ٹالینڈو کے پادری اور کاؤنٹ جولین کی تحریک پر مسلمانوں کے ساتھ آلا۔ ہسپانیہ کے بادشاہ

کو میدان جنگ سے بھاگنا پڑا اور دریائے گواڈلکویور کی موجوں نے اسے غنیم کے تعاقب سے ہمیشہ کے لئے امان دے دی۔

موسیٰ کا نائب طارق بہ سرعت تمام ٹالیڈو کے میدان جنگ سے شمال کی طرف روانہ ہوا اور رستہ میں جو شہر ملا اسے فتح کرتا ہوا برق دبار کی طرح بڑھا چلا گیا۔ جب موسیٰ شمالی افریقہ سے جہاں وہ کچھ عرصہ کے لئے چلا گیا تھا واپس آیا تو طارق کی تلوار تمام جزیرہ نمائے اسپین کو مسخر کر چکی تھی اور گاتھ فوج کا بقیہ السیف بحال تباہ کوستان پر سبز سے گزر کر فرانس میں جا پناہ گزین ہوا تھا۔ تسخیر اسپین کو اپنی فتوحات کی پہلی منزل قرار دے کر طارق نے اپنا یہ عندیہ ظاہر کیا کہ فرانس کو فتح کرتا ہوا اٹلی میں جا پہنچے اور پوپ کے محل میں توحید کا قنارہ بجا کر قسطنطنیہ پر فوج کشی کرے۔ پھر دولت رومۃ الکبریٰ کو ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سلاتا ہوا دمشق پہنچ کر اپنی مظفر و منصور تلوار کو خلیفۃ المسلمین کے قدموں پر جا رکھے۔

مگر کار پروازان قضا و قدر کو یہ بات منظور نہ تھی۔ موسیٰ نے طارق کے ان روشن کارناموں کو رشک و حسد کی نظر سے دیکھ کر اسے طرح طرح کی ذلتیں دیں طارق کے بھی دربار خلافت میں بہت سے ہوا خواہ موجود تھے۔ انہوں نے موسیٰ کی اس بدسلوکی کی کیفیت کو خلیفہ سے خوب نمک مرچ لگا کر بیان کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق سے ایک سفیر روانہ ہو کر اسپین پہنچا۔ موسیٰ اپنے خیمہ میں تھا کہ سفیر نے آکر شاہی فرمان سنایا اور اسے گرفتار کر کے دمشق لے گیا۔ موسیٰ جب دربار خلافت میں پہنچا تو خلیفہ نے اس پر بے حد عتاب کیا اور حکم دیا کہ سب کے سامنے اسے کوڑے لگائے جائیں۔ اس بے عزتی نے موسیٰ کا دل توڑ دیا اور وہ اس صدمہ سے جان بر نہ ہو سکا۔

طارق کا منصوبہ تو بروئے کار نہ آ سکا لیکن بعض دوسرے اسلامی سپہ سالاروں نے فرانس پر ضرور فوج کشی کی۔ پہلی ہی لڑائی میں فرانس کا وہ علاقہ جو دریائے گیرون اور دریائے لار کے دہانوں کے درمیان واقع ہے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اس کے بعد اسلامی سپہ سالار عبدالرحمن نے فوج کو دو جماعتوں میں تقسیم کر کے ایک جماعت کو ہمراہ لیا اور مشرق کی طرف بڑھ کر دریائے رون کو عبور کرنے کے بعد آرس کا محاصرہ کیا۔ جو مسیحی فوج محصورین کی کمک کے لئے آئی تھی اسے سخت نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ اس کی فوج کے دوسرے ٹکڑے کو بھی جس نے مغرب کی طرف پیش قدمی کی تھی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس حصہ فوج نے دریائے ڈارڈون سے گزر کر ایک اور مسیحی فوج کو جو اس کا رستہ روکے پڑی تھی سخت شکست دی اور اس کا ایسا سخت نقصان ہوا کہ خود ان

لوگوں کا جو میدان جنگ سے جان بچا کر بھاگے یہ بیان ہے کہ ”مقتولوں کی تعداد کا خدا ہی کو علم ہے۔“ تمام وسط فرانس پر عرب ہی چھا گئے اور دریائے لار کے ساحل تک تمام علاقہ پر مسلط ہو گئے۔ گرجاؤں اور خانقاہوں کی برسوں کی جمع کی ہوئی دولت ان کی لوٹ میں آئی اور وہ مسیحی پیر اور ولی جو اپنے روحانی تصرفات کے کرشمے آئے دن بے وجہ و بلا ضرورت دکھایا کرتے تھے آج جب کہ ان کی کرامتوں کی ایسی سخت ضرورت تھی ایسی ہی بھولے کہ ایک بھی کرامت یا معجزہ نہ دکھا سکے۔

آخر کار ۷۳۴ء میں چارلس مارٹل نے حملہ آوروں کی پیش قدمی کو روک دیا۔ نواس اور ہانشیمرس کے درمیان ایک عظیم الشان جنگ ہوئی جو سات دن تک رہی۔ اس معرکہ میں عبدالرحمن شہید ہوا اور عرب پسپا ہوئے۔ اس کے بعد انہیں بہت جلد کوستان پر نیز سے گزر کر اسپین واپس آنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اس لحاظ سے گویا دریائے لار کا ساحل مغربی یورپ میں مسلمانوں کی پیش قدمی کی انتہائی حد ہے۔ مگر ان مہتمم بالشان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے حسب ذیل رائے ظاہر کرتا ہے: ”جبل الطارق سے لے کر تابہ ساحل لار عربوں نے فتح و نصرت کا ایک مسلسل خط کھینچ دیا تھا جس کی لمبائی ایک ہزار میل سے اوپر تھی۔ اگر اسی قدر فاصلہ وہ اور طے کرتے تو پولینڈ کی حدود تک اور دوسری طرف اسکاٹ لینڈ کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچ جاتے۔“

اسلام کے ان جنگی کارناموں پر ان واقعات کا اضافہ کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ بحروم میں اپنے فتح مند بیڑوں کو لے جا کر انہوں نے اول کرٹ کو فتح کیا پھر سسلی کو مغر کیا اس کے بعد روما کو ذلیل و رسوا کیا۔ البتہ اس امر کا تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی اطالیہ اور سسلی میں ان کے موجود ہونے کی وجہ سے یورپ کی عقلی و دماغی ترقی کو ایک بہت بڑی تحریک پہنچی۔

برسبیل تذکرہ ہمارے قلم سے یہ الفاظ نکل گئے ہیں کہ اسلام نے روما کو ذلیل و رسوا کیا۔ حقیقت میں ان واقعات سے زیادہ اور کیا امر اس کے لئے باعث ذلت و رسوائی ہو سکتا تھا جو ۸۳۶ء میں پیش آئے۔ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جمیعت دریائے ٹائبر میں سے ہوتی ہوئی روما کی دیواروں کے سامنے آتنگر انداز ہوتی ہے۔ اس قدر طاقت تو اس جماعت میں ہے نہیں کہ زبردستی شہر میں داخل ہو جائے لہذا وہ حوالی شہر ہی کو لوٹتی ہے۔ گرجاؤں اور خانقاہوں کی بے حرمتی کرتی ہے اور سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے مزاروں کو پاؤں تلے روندتی ہے۔ خود اگر شر کا تاخت و تاراج ہو جاتا تو اس کا اخلاقی اثر ایسا برا نہ ہوتا جیسا اس حالت میں ہوا۔ مسلمانوں نے سینٹ پیٹر کے گرجا سے اس کی چاندی کی قریانگاہ اکھیر

ڈالی اور اسے بطور یادگار غلبہ اسلام افریقہ بھیج دیا۔ مسیحیت کے جگر میں اس سے زیادہ ناسور اور کیا پڑ سکتا تھا کہ سینٹ پیٹر کی وہی قربانگاہ جو اس کی سب سے بڑی مذہبی علامت تھی یوں غارت ہو جائے۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ عرب پہلے ہی کئی دفعہ کر چکے تھے۔ اس کی تسخیر ٹل نہ سکتی تھی۔ صرف معرض التوا میں پڑی ہوئی تھی۔ روما کی ایسی سخت توہین ہوئی تھی کہ اس کے تصور ہے۔ نیکیوں کے اندام ارادت پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ایشیائے کوچک کے قدیم کلیسا معدوم ہو چکے تھے۔ کوئی مسیحی مسلمانوں کی اجازت کے بغیر بیت المقدس میں قدم تک نہ رکھ سکتا تھا۔ ہیکل سلیمان کی جگہ مسجد عمر کھڑی تھی۔ اسکندریہ کے کھنڈروں میں ”مسجد رحمت“ اس عرب سپہ سالار کی یاد کو تازہ کرتی تھی جس نے قتل عام سے سیر ہو کر رسول عربیؐ کے بچے کھچے دشمنوں کو جنسین ڈھونڈے سے بھی راہ فرار نہ ملتی تھی حقارت آمیز رحم کے ساتھ امان دی تھی۔ جہاں ایک زمانہ میں کارہنج کا پرور و نوق اور دلکش شہر آباد تھا وہاں اب بجز اس کے آگ میں جھلے ہوئے کھنڈروں کے اور کچھ باقی نہ تھا۔ دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور مذہبی سلطنت دفعہ پردہ عدم سے نکل کر منصفہ شہود پر جلوہ گر ہوئی تھی۔ اس سلطنت کا ایک سرا بحر اوقیانوس پر تھا تو دوسرا دیوار چین پر۔ ایک حد بحیرہ خزر کے کنارے سے ملتی تھی تو دوسری بحر ہند کے ساحل سے۔ اس پر بھی ایک لحاظ سے یہ سلطنت اپنے متہائے عروج پر نہ پہنچی تھی۔ اس لئے کہ ایک دن وہ آنے والا تھا جب وہ قیصرہ کے جانشینوں کو ان کے دارالحکومت سے نکال کر اور جزیرہ نمائے یونان پر اپنا پھریرا اڑا کر ایک طرف تو یورپ کے قبضہ کے لئے اس براعظم کے پھوپھو عیسائیت پر حملہ کرنے والی تھی اور دوسری طرف افریقہ کے آتش خیز صحراؤں اور دبا انگیز جنگلوں میں اپنے موحدانہ عقائد کی تلقین کرتی ہوئی ساحل بحر روم سے خط استوا کے پرلے سرے تک نقارہ اٹا ولاغیری بجانے والی تھی۔

اسلام کو اگرچہ ابھی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرنی باقی تھیں لیکن سلطنت خلفا نصف النہار کمال پر پہنچ چکی تھی۔ یورپ کو اسلام کی حلقہ گبوشی سے جس چیز نے بچایا وہ چارلس مارٹل کی تلوار نہ تھی بلکہ عربوں کی وسیع سلطنت کے اندرونی فسادات تھے۔ اگرچہ خلفائے بنو امیہ کی حکومت سے شام کے لوگ خوش تھے لیکن باقی ہر جگہ وہ غاصب اور جابر سمجھے جاتے تھے اور عام خیال یہ تھا کہ اصلی مستحق خلافت آل رسولؐ ہے۔ تین جماعتوں نے جو اپنے اپنے علموں کے رنگ سے ممتاز ہوئیں خلافت کو اپنے فسادوں اور نزاعوں سے پارہ پارہ کر دیا اور ان کے وحشیانہ مظالم سے اس کی وہ بے وقری اور بے حرمتی ہوئی کہ

بیان سے باہر ہے۔ بنی امیہ نے سفید رنگ اختیار کیا۔ بنی فاطمہ نے سبز اور بنی عباس نے سیاہ۔ آخر الذکر جماعت آن حضرتؐ کی اولاد عم تھی۔ ان خانہ جنگیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ دسویں صدی میں سلطنت اسلام کے تین حصے ہو گئے اور تین علیحدہ علیحدہ خلافتیں بغداد قاہرہ اور قرطبہ میں قائم ہو گئیں۔ مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کا اب خاتمہ ہو گیا اور مسیحیت کی جان میں جان آئی۔ لیکن مسیحیت کی سلامتی کا باعث تائید آسمانی نہ تھی بلکہ مسلمان فرماؤں کی رقابت اور باہمی نزاع۔ اندرونی فسادوں اور خانہ جنگیوں کو اغیار و اجانب کی دست اندازیوں نے اور زیادہ ملک بنا دیا اور جب ترک اور برسرِ اقتدار ہوئے تو اس عربی تحریک کا جس نے دنیا کی عقلی و دماغی ترقی میں اتنا بڑا حصہ لیا تھا خاتمہ ہو گیا۔

اپنی خانہ جنگیوں میں عرب اس درجہ منہمک ہو رہے تھے کہ انہیں یورپ کی مخالفت کی خس برابر بھی پرواہ نہ رہی تھی۔ آگلی اپنی تاریخ میں سچ کتا ہے کہ ”عربوں میں ایک بھی سپہ سالار یا جرنیل یا کپتان ایسا نہ تھا جو یورپ بھر کی متفقہ فوجوں سے اگر اپنی توہین کرا لیتا تو اسے اپنی بہت بڑی ذلت اور رسوائی نہ خیال کرتا اور اگر کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ کیا وجہ تھی کہ یونانیوں نے ان شورش چشم حملہ آوروں کے استیصال کے لئے جان نہ لڑا دی تو جو شخص ان لوگوں کی طبیعتوں سے واقف ہے اس کے لئے یہ جواب کافی ہو گا کہ عمرو بن العاص اسکندریہ میں برسرِ حکومت تھا اور معاویہ دمشق میں۔“

یورپ والوں کو مسلمان جس حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ جب نائسیفورس قیصر روم نے خلیفہ ہارون الرشید کو ایک خط لکھا جس میں خلیفہ کو دھمکی دی گئی تو اسے یہ جواب ملا :

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ امیر المومنین ہارون الرشید کی طرف سے نائسیفورس رومی کہتے کے نام۔ او بے ایمان ماں کے بیٹے میں نے تیرا خط پڑھا۔ تو اس خط کا جواب سنے گا نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھے گا۔“

تاریخ گواہ ہے کہ یہ جواب خون و آتش کے حروف میں فریجیا کے میدان جنگ کے صفحہ پر لکھا گیا۔

کسی قوم سے اگر ملک چھین لیا جائے تو وہ زندہ رہ سکتی ہے۔ اگر اس کے خزانے لوٹ لئے جائیں تو وہ پھر بھی پنپ سکتی ہے۔ بڑے سے بڑا تاوان جنگ ادا کرنے کے بعد بھی اس کی حالت کا سدھر ناممکن ہے لیکن جنگ کے اس نہایت ہی خوفناک عمل کے بعد یعنی اس کے بعد کہ اس کی قوم کی عورتوں کو فاتح اپنے تصرف میں لے آئے اس قوم کی بقا محال ہے۔ جب ابو عبیدہ نے فتح انطاکیہ کی خبر دربار خلافت میں بھیجی تو حضرت عمرؓ نے جو

اس وقت خلیفہ تھے ابو عبیدہ کو اس بات ملامت کی کہ کیوں اس نے فوج کے سپاہیوں کو عورتوں کی صحبت سے روکا۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں: ”اگر وہ شام میں شادی کرنا چاہیں تو کرنے دو اور لونڈیاں بھی جتنی رکھنی چاہیں رکھنے دو۔“ حقیقت یہ ہے کہ کثرت ازدواج کی رسم جس پر ممالک مفتوحہ کی عورتوں کو اپنے حوالہ تصرف میں لاتے وقت مسلمانوں نے عمل کیا اسلامی حکومت کے ثبات و قیام کی مدد ہوئی۔ ان شادیوں سے جو لولاد پیدا ہوئی اس کے لئے فاتحوں کی نسل سے ہونا مایہ فخر و ناز ہو گیا۔ اس حکمت عملی کے موثر و کارگر ہونے کا سب سے بڑا ثبوت شمالی افریقہ میں ملتا ہے جہاں کثرت ازدواج کا قوی اثر ملک کی سیاسی و عمرانی حالت کے بدلنے میں نہایت حیرت انگیز ثابت ہوا۔ ایک بھی نسل نہ گزرنے پائی تھی کہ اس علاقہ کے حکام نے خلیفہ کو اطلاع دی کہ خراج اب موقوف ہونا چاہئے اس لئے کہ یہاں جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں سب مسلمان ہیں اور سب کے سب عربی بولتے ہیں۔

اسلام کو جس صورت میں اس کا بانی چھوڑ گیا اس پر اگر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک تجسیم مذہب ہے۔ اس کا خدا محض ایک کوہ پیکر انسان تھا۔ اس کی بہشت جسمانی لذتوں کا ایک عیش آفرین محل تھی۔ لیکن ان ناقص خیالات کی قید سے ان مسلمانوں نے جو زیادہ فطین و فہیم تھے اپنے آپ کو آزاد کر لیا اور بجائے ان کے زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ صحیح خیالات قائم کئے۔ آخر کار لا اورت کے حکیمانہ عنصر کی آمیزش کی بدولت ان خیالات کو ان خیالات کے ساتھ مطابقت ہو گئی جنہیں آج کے دن پاپائے روم کی کونسل بھی صحیح سمجھتی ہے۔ چنانچہ امام غزالی کا قول ہے: ”خدا کا علم اس علم کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا جو انسان کو اپنے یا اپنی روح کے متعلق حاصل ہے۔ خدا کی صفات کو انسان کی صفات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی شائستگی اور آئین حکمرانی کا نہ مقابلہ ہو سکتا ہے اور نہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔“

لے تاریخ میں اس نام کے دو مشاہیر کا تذکرہ موجود ہے۔ اکبر و اصغر۔ یہاں پانچویں اکبر سے مراد ہے۔ جو نہ صرف دولت رومہ اکبری کے اراکین سلطنت میں ایک خاص درجہ رکھتا تھا بلکہ کثیر التعداد کتابوں کے مصنف ہونے کے لحاظ سے مصنفین عہد قدیم کی صف اول میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ ۴۴۳ء میں بھام دیونا پیدا ہوا۔ روم نے جب جرمنی پر فوج کشی کی تو اسے بھی فوج کے ایک دستہ کی کمان ملی۔ اس وقت اس کی عمر ۴۳ سال تھی۔ اس فوج کشی کی تاریخ اس نے

بیس جلدوں میں لکھی ہے۔ اس کے بعد سلطنت کے بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدوں پر اس کا تقرر ہوتا رہا لیکن باوجود اہمک مشاغل سرکاری وہ تالیف و تصنیف کے لئے بہت کچھ وقت نکالتا رہتا تھا۔ اس کی کتاب ”سٹوریا نیچرلیس“ (صحیفہ فطرت) اس کی علمی مستعدی کی سب سے بڑی یادگار ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ اس کتاب کی سینتیس ۳۷ جلدیں ہیں اور جیسا کہ مصنف مقدمہ کتاب میں لکھتا ہے اس میں بیس ہزار مسائل پر بحث ہے جن کا ماخذ دو ہزار مختلف المضامین کتابیں ہیں۔ پلاینی کی اس تصنیف کا ترجمہ یورپ کی قریب قریب ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ پلاینی کی موت کا واقعہ عجیب و غریب ہے۔ ۷۹ء میں جب وہ دولت روما کا امیر البحر تھا ایک دن اس نے مائسینم سے جہاں اس کا بیڑہ متعین تھا کوہ ویسوئس کی چوٹی سے دھواں اٹھتا دیکھا۔ اس کی ماہیت دریافت کرنے کے لئے وہ ایک ہنسوی پر سوار ہو کر پہاڑ کے قریب چلا گیا۔ اور ساتھ اپنی نوٹ بک بھی لیتا گیا تاکہ جو کچھ دیکھے اس پر درج کرتا جائے۔ قلعہ کوہ کی آتش افشانی کا منظر اور زیادہ قریب سے دیکھنے کی غرض سے وہ کشتی سے اتر کر دامن کوہ کی طرف بڑھا۔ دیکھتے ہوئے انگاروں اور الجتی ہوئی راکھ کا مینہ برسا شروع ہو گیا۔ اس کے نوکر تو جان بچا کر بھاگ گئے مگر وہ خود وہیں تلف ہو گیا۔ مترجم

سمہ ایک سریانی بادشاہ تھا جس کا زمانہ ۷۰۵ء سے ۶۸۱ قبل مسیح تک ہے۔ اس کی عظیم الشان فتوحات اور عالی شان محلوں کی تعمیر کا ذکر ان خشتی کتابوں کے مخروطی حروف میں موجود ہے جو کلدانی و سریانی آثار قدیمہ کی ذیل میں برآمد ہوئی ہیں۔ تورات سے پایا جاتا ہے کہ اس نے فیشیا۔ مصر اور جوڈیا پر چڑھائی کی تھی لیکن خدا کو اس کی سرکشی پسند نہ آئی اور اس پر عذاب آسمانی نازل کیا گیا چنانچہ ملائکہ کے جنود و مجندہ نے راتوں رات اس کے لشکر جبار کو تباہ کر ڈالا اور وہ بحالت تباہ اپنے پایہ تخت نیندہ لوٹ گیا۔ ہراڈولس یونانی مورخ ملائکہ کے بجائے چوہوں کی ایک عظیم الشان فوج کا ذکر کرتا ہے جو مصریوں کے مخالفین پر حملہ کر کے ان کی تیروں کمانوں اور ڈھالوں کو نکل گئی مگر اس طور پر وہ جب نیندہ رہ گئے تو مارے گئے۔ سناچرب اس لحاظ سے گویا یہودیوں کا ابرہہ ہے۔ مترجم

سمہ جناب رسالت مابہ مختلف اقطاب سے یاد فرمائے گئے ہیں۔ مخالفین و معاندین نے اگر ازراہ خبث نفس آپ کو ابو کبش یا راعی اتہر کہا ہے تو موافقین و معتقدین نے بقضائے اراوت امین مصطفیٰ اور مجتبیٰ کے لقب سے یاد کیا ہے لیکن کوئی روایت سند صحیح اس مضمون کی ہمارے علم میں موجود نہیں ہے کہ آپ حلیبی بھی پکارے جاتے ہوں۔ ”طیب“ اونٹنی کے دودھ یا دودھ دہنے والے کو کہتے ہیں۔ معلوم نہیں مصنف کو یہ نام کیسے ہاتھ آیا اور اس کی کیا اصلیت ہے۔

مترجم

لکھ عیسائی مصنفین جو نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور ان تعلقات کی مابیت کو نہیں جان سکتے جو خدا اور اس کے برگزیدہ مرسلین کے درمیان وقتاً فوقتاً قائم ہوتے رہے ہیں۔ عام طور سے جب ہمارے رسول مقبولؐ کا ذکر آتا ہے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ وہ لکھے پڑھے تھے یا انہوں نے تورات و انجیل کا بامعان نظر مطالعہ کیا تھا یا عیسائی راہبوں سے انہوں نے تعلیم پائی تھی اور اسی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے دنیا کے سامنے وہ متمم بالشان اور زندہ جاوید تحریک پیش کی جس کا نام اسلام ہے۔ یورپین مصنفین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کو اگر ایک چھوٹا سا واقعہ مل جائے تو اس سے سینکڑوں نتائج اپنے مفید مطلب بلا تامل نکالتے ہوئے چلے جاتے ہیں خواہ وہ نتائج مقدمہ کے صغریٰ و کبریٰ سے دور کی نسبت بھی نہ رکھتے ہوں۔ سوئی کا پھاؤڑا اور رائی کا پریت بنا دینا ان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ پنل کے مدھم سے خاکے پر ایسی ایسی رنگ آمیزیاں کرتے ہیں کہ دیکھنے والا جو سطح سے نیچے جانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا بے اختیار فریفتہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈرپر مصنف کتاب ہذا بھی باوجودیکہ اسلام اور بانی اسلام کا ذکر معقولیت سے کرتے ہیں اور ان کی تحریر سے اس تعصب کی بو نہیں آتی جو پادریوں کی تحریروں کا خاصہ ہے اس لغزش سے نہیں بچ سکے۔ فقط ایک اتنے سے واقعہ سے کہ رسول اللہ ﷺ گیارہ بارہ برس کی عمر میں غلام گئے تھے اور بحیرہ راہب سے ملے تھے اور یہ وہ متفق علیہ واقعہ ہے جو مسند ابن اسحق و ابن ہشام ہم تک پہنچا ہے ڈاکٹر ڈرپر نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ بحیرہ نے آپ کو نسوری عقائد کی تلقین کی اور آپ نے اس تلقین سے متاثر ہو کر نسوریت کو بالآخر بنام اسلام دنیا میں شائع کیا۔ بحیرہ کے علاوہ اور جس شخص کا اثر رسول اللہ ﷺ پر بقول ڈرپر پڑا وہ ورقہ ابن نوفل مترجم انجیل تھا جس سے آن حضرتؐ کو مذہبی امور پر گفتگو کرنے کا بارہا اتفاق ہوا۔

اسلامی تاریخوں اور روایتوں سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ بعثت سے قبل آنحضرتؐ کی رسم و راہ یہودیوں اور عیسائیوں سے رہی ہو اور آپ نے ان کے مذہبی پیشواؤں سے مذہبی تعلیم حاصل کی اور ایسی حالت میں جبکہ اسلام اور اس کے مقدس و محترم بانی کے متعلق مغربی مصنفین کی کل معلومات کا ماخذ اسلامی تاریخیں اور روایات ہی تھیں اس قسم کے نتیجہ پر پہنچ جانا جس پر کہ ڈاکٹر ڈرپر پہنچے ہیں ان کی قوت عقیدہ کی شگرف آفرینی پر ایک گواہ عادل ہے۔

اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ ایک گیارہ برس کا عرب لڑکا (کیونکہ رسول اللہ جب اپنے چچا کے ساتھ شام کو تشریف لے گئے ہیں تو آپ کی یہی عمر تھی) جو بت پرستی و جاہلیت کے حوالی سے گمراہ ہوا ہو اقامتِ ثلاثہ کی اس عجیب و غریب بحث کو سمجھنے کی قابلیت رکھ سکتا ہے جسے مسیحیت کا چھ صدیوں کا فلسفہ بھی سلجھا نہ سکا تھا تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس لڑکے

نے اسی پر اسرار بھول بھلیاں میں سے توحید کی وہ سیدھی اور سچی راہ کیوں کر ڈھونڈ نکالی جو فلسفہ و مذہب دونوں کی نگاہ سے اب تک پوشیدہ تھی۔ مسطوریت باوجود اس میلان کے جو اسے توحید کی جانب تھا پھر بھی شرک کے دائرہ کا مرکز تھی۔ مانا کہ وہ مسیح کے جسمانی حصہ ہی کو یلن مریم سے نسبت دیتی تھی لیکن مسیح کے ربانی حصہ سے تو اس کو انکار نہ تھا۔ یہ الفاظ دیگر وہ اس بات کی تو قائل تھی کہ خدا انسان کا روپ ایک طرح سے دھار سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مسیحیت کے دوسرے عقائد مثلاً "کفارہ جو اصل اصول نجات ہونے کے اعتبار سے مذہب عیسوی کا سنگ بنیاد ہے مسطوریت میں بلا کسی ترمیم کے داخل تھے۔ ورقہ کا اثر اگر رسول اللہ پر پڑا تو وہ بھی گویا زیادہ سے زیادہ ایک مسوری المذہب عیسائی کا اثر تھا۔ یہودیوں سے توحید کا خیال اگر رسول اللہ مستعار لیتے تو اس میں بھی انجسیت کے مادی عناصر شامل تھے۔ پھر وہ کون سی قوت تھی جس نے مکہ کے اس بنیم و بیریور اسی بچے کے قلب میں ابتدا ہی سے ان حقائق کو جمع کرنا شروع کر دیا جن کی روشنی میں اسے تمام ادیان و مذاہب موجودہ کی اچھائیاں اور برائیاں نظر آنے لگ گئیں اور جب ارتقا کے اس ہمہ گیر عمل نے جس سے پیغمبر بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا اس کے قوائے ذہنی کو ترقی دے کر مشاہدہ اور تجربہ کی مدد سے منتہائے کمال پر پہنچا دیا یعنی بحث کی ساعت قریب آئی تو اس نے اچھائیوں کو جن لیا اور انہیں ایک دلاویز و دل آرا شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اس زبردست اور فوق العادت تائید کی بدولت جو ہمیشہ اس کے شامل حال رہتی ہے درجہ معرفت و پرزواں شناسی پر خود بخود پہنچ جاتا ہے اور اس کی مثال بعینہ حضرت ابراہیمؑ کی سی مثال ہوتی ہے جن کی نسبت قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ جب انہوں نے ستارے کو چمکتا ہوا دیکھا تو ان کی قوت مدرکہ نے جو مائل بہ ایمان تھا ان کو یہ سمجھایا کہ ہو نہ ہو یہی ان کا معبود ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو ان کو "معا" یہ خیال پیدا ہوا کہ فنا ہو جانے والی چیز معبود و خالق نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح درجہ بدرجہ ان کو چاند اور سورج نظر آئے اور انہوں نے ان اجرام ساوی کے قرص کی عظمت و تجلی کو دیکھ کر پہلے کی طرح انہیں کو اپنا خدا سمجھا مگر جب یہ بھی غروب ہو گئے تو انہوں نے ان سے یہ کہہ کر ابا کیا کہ میں آفلین سے محبت نہیں رکھتا۔ استدلال و استنباط کے اسی روحانی زینہ کے ذریعہ سے وہ اس خالق ذوالجلال کے بام معرفت پر جا پہنچے جو آسمان و زمین و ثوابت و سیار و شر و فلک سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہمارے رسول اکرمؐ بھی تائید ایزدی سے خود بخود معراج عرفان پر پہنچے۔ اس منزل کے نلے کرنے میں نہ ان کو بحیرہ نے مد دی نہ ورقہ نے نہ زید بن عمر کی راست روی نے ہدایت کی نہ امیہ جھینپی کے دین حنیف تے۔ خدا خود ان کا رہبر تھا اور تائید ایزدی خود ان کی پیشوا تھی۔ بت پرستی سے ان کو نفرت دلائی تو خدا نے جیسا کہ قرآن کی یہ آیت پاک ظاہر کر رکھی ہے "ووجدک ضالاً فہدنی اور شرک اور

جس سے ان کے دل میں کراہت پیدا ہوئی تو خدا کی تحریک سے الم نشرح لک صدق و وضعنا
حنک و زدک النہی انقض۔ ظہر کہ رسول اللہ اگر بقول ڈرپہر منوریت کے اصول ہی کی تلقین
کرتے تو آج دنیا میں اقامتِ ثلاثہ کا ایک دوسری صورت میں راج ہوتا۔ وہ خالص توحید جو اسلام
کا خاصہ ہے مفقود ہوتی۔

اس کے علاوہ جیسا کہ پروفیسر ٹکسن نے اپنی ایک قابل قدر تصنیف میں جو حال ہی میں
شائع ہوئی ہے لکھا ہے اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ کے معاصرین میں متعدد اشخاص ایسے
تھے جو بت پرستی سے کارہ تھے اور حنیف کہلاتے تھے اور ممکن ہے کہ ان کا اثر رسول اللہ پر پڑا
ہو لیکن ان میں اور محمدؐ میں یہ فرق تھا کہ ان کو تو اپنی ہی نجات کی پڑی تھی اور انہوں نے ذاتی
اغراض کی حدود سے تجاوز ہو کر تمام دنیا کی منتقل جان میں نور ایمان کی چنگاری ڈال دی
گفت آن گہم خویش بدون آرد و زموچ دین جمدی کند کہ برآرد غریق را
مترجم

یعنی آخر معنف کو حقیقت کا اعتراف کرتے ہی بنی۔ یا تو اس پر اصرار تھا کہ رسول اللہ نے جو
کچھ حاصل کیا بجزہ سے حاصل کیا اور اپنی طرف سے جو کچھ کیا یہ کیا کہ منوریت کی اشاعت کر
دی اور یا اب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ رسول اللہ مدتوں محو غور و فکر رہ کر توحید باری کے
نکتہ پر پہنچے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بجزہ بت پرستی کا اثر رسول اللہ کے دل سے مٹا چکا تھا
اور منوریت کے تمام اسرار انہیں سمجھا چکا تھا تو پھر انہیں غار حرا میں مدتوں محو غور و فکر رہنے
کی کیا ضرورت تھی۔ آگے چل کر معنف نے اپنے اس خیال کی کہ رسول اللہ اسلام کی اشاعت
کے لحاظ سے منوریت کے شرمندہ احسان تھے صاف الفاظ میں یہ کہہ کر تردید کر دی ہے کہ
”ان اصول کے تسلیم کرنے سے بھی آپ نے انکار کر دیا جو اگرچہ آپ کے منوری اساتذہ نے
آپ کو سکھائے تھے لیکن آپ کا ضمیر اور عقل ان کی تائید نہ کر سکتی تھی۔“ مترجم

لے تو اے کبوتر ہام ہرم چہ ی دانی پسدن رگ مرغان رشتہ برپا را
کیا اہل ہام کو یقین دلا سکتے ہیں کہ مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ سے پاک نفس اور پاک سرشت
انسانوں کو جو حقیقتیں نظر آتی ہیں ان کا وجود ذہن میں بھی نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت اشیا کا راز ان
کی خارجی اصلیت ہی میں مرکوز ہے؟ روحانی کرشموں کو اہل چاہے التباس حواس سے تعبیر کریں
چاہے اختلالِ دماغ کہیں لیکن ان سے انکار نہیں ہو سکتا اور سچ تو یہ ہے کہ اس التباس حواس پر
جس کا نتیجہ قرآن کا سامعہ التزام کلام اور اسلام کی سی اخلاق آموز حقیقت آقا فائدہ رساں اور
ہمہ گیر تحریک ہو ہزار مثالی و اشراقی فلسفہ قربان ہیں۔ دنیا میں سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں محض
ایسے گزرے ہیں جنہوں نے روزے بھی رکھے ہیں ریاضتیں بھی کی ہیں۔ دماغی پریشانیوں اور
فکروں میں بھی مبتلا ہوئے ہیں لیکن باوجود ان تمام باتوں کے کسی میں محمدؐ کی شان نہ پیدا ہو سکی۔

مترجم

مجھ معلوم نہیں یہ لغو اور مہمل فقرہ کہاں سے ڈرپہر کو ہاتھ لگ گیا۔ معراج کے متعلق روایت کے امکان پر قرآن نے تو قاب قوسین اور ادنیٰ کا پردہ ڈال رکھا ہے لیکن آپ تجسیمیت کے درجہ سافل میں پہنچ کر انسان کی قوت لامہ کو خدا کے احساس کا شرف عطا کرتے ہوئے تامل نہیں فرماتے۔ غالباً اسی بنا پر آپ نے آگے چل کر اسلام پر تجسیمیت کا الزام لگایا ہے۔ مترجم

۸۸۔ افسوس ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول سے ناواقف اور ان واقعات سے بے خبر ہونے کے باعث جو غزوات نبوی کے محرک ہوئے یہ تھکمانہ اصول قائم کر دیا کہ اسلام کی سب سے زبردست دلیل تلواری ہے۔ اگر مصنف کے حین حیات میں پروفیسر آر نلڈ کی کتاب ”اشاعت اسلام“ ہی شائع ہو گئی ہوتی تو شاید یہ خیال ظاہر کرتے ہوئے اسے تامل ہوتا۔

اسلام تو اپنے مسلمہ حقوق کی حفاظت ہی میں تلواری اٹھانے کی اجازت دیتا ہے مگر وہ مذہب ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں جس کا اصول تو یہ ہے کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے مگر عمل یہ ہے کہ بے کسوں کو بھی پامال کر کے صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

مترجم

۸۹۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی نظر قرآن مجید کی اس آیت پر پڑ گئی ہوگی ”فصل لربک وانحر“ لیکن نماز اور قربانی کو مساوی الفضائل قرار دینا اور اس تساوی فضیلت کے خیال کو جناب رسالت ماب سے منسوب کرنا مصنف کی کئی معلومات پر مبنی ہے۔ مترجم

۹۰۔ اسلام پر جو چند سوقیانہ اعتراضات عیسائی پادریوں کے تعصب سے یورپین مصنفین کو ترکہ میں پہنچے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اسلام میں خدا کا تصور انسانی حیثیت سے کیا گیا ہے اور قرآن کا خدا گویا ایک دیوپیکر انسان ہے جس میں تمام عادات و خصائل وہی پائے جاتے ہیں جو عام طور سے بنی نوع انسان میں پائے جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر ڈرپہر جیسا نکتہ رس شخص بھی جو وسیع النظر ہونے کے علاوہ اسلامی تعلیم کو رواداری اور مسالمت کی آنکھ سے دیکھتا ہے اس اعتراض کو صحیح سمجھتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی بے مثل کتاب الکلام حصہ دوم میں اس مضمون پر ایک لطیف بحث لکھی ہے جس کی یہ عبارت ہمیں نہیں بھولنی۔

”دنیا اس عالمگیر تاریکی میں پڑی ہوئی تھی کہ دغہ اسلام نے آکر تمام غلط خیالات اور معتقدات کا پردہ چاک کر دیا۔ اس نے بتایا کہ خدا واحد محض ہے اور زمان و مکان جت و اشارہ تحت و فوق ہر قسم کے قیود و خصوصیات سے مبرا ہے۔ یہ وہ تقدیس و تنزیہ تھی جس پر یورپ نے بھی حیرت ظاہر کی اور گین نے کہا کہ جب زمان و مکان و جت و اشارہ تمام خصوصیتوں کو الگ کر لیا جائے تو خیال کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اسی تقدیس کی بنا پر اسلام نے ہر قسم کی بت پرستی

کا استیصال کر دیا کیونکہ اسلام نے خدا کی نسبت جو پاک اور منزہ خیال قائم کیا تھا وہ ایسا نہ تھا کہ خدا کا تصور جسمانی پیکر اور صورت کے بغیر دلوں میں نہ آ سکے۔ ہندو۔ مصری۔ صابی۔ رومن کیتھولک سب خدا کے تصور کے لئے جسمانی تمثیل کے محتاج تھے اور اس وجہ سے بت پرستی میں مبتلا تھے لیکن اسلام میں باوجود سینکڑوں ہزاروں فرقوں کے پیدا ہو جانے کے بھی کسی فرقہ کو آج تک بت پرستی کا کبھی خیال نہ آ سکا۔

اگر ڈاکٹر ڈرپر نے قرآن کی آیات کو بصیرت کی نظر سے دیکھا ہوتا تو جو اعتراض انہوں نے کیا ہے کبھی نہ کرتے۔ ہم مثال کے طور پر کلام مجید سے صرف چند مقامات کا استعما کرتے ہیں :

(۱) اللہ لا الہ الا ہو الحی القيوم لا تاخذه سنتہ ولا نوم لہ ما فی

السموات وما فی الارض من ذالنی یشفع عنده الا باذنه یعلم ما بین

ایدیبہم وما خلفہم ولا یحیطون بشی من علمہ الا بما شاء وسع

کرسیہ السموت والارض ولا یوردہ حفظہما فہو العلی العظیم

(۲) ہواللہ الذی لا الہ الا ہو الملک القدوس السلام المومن

المہیم العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون۔ ہواللہ

الخالق الباری المصور لہ الاسماء الحسنی یسبح لہ ما فی

السموت والارض فہو العزیز الحکیم۔

(۳) اللہ نور السموت والارض مثل نوره کمشکوۃ فیہا مصباح

المصباح فی زجاجہ الزجاجۃ کانہا کوکب دئی یوقد من شجرۃ

مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیتہ ولا غربیتہ یکادزیتہا فی فی فلولم تمسہ

نار نور علی نور یرہی اللہ لنورہ من یشاء ویضرب اللہ الامثال

للناس واللہ بکل شی علیم۔

(۴) لیس کمثلہ شی فہو السمیم العلیم۔

(۵) قل ہو اللہ احد ○ اللہ الصمد ○ لم یلد ○ فلم یولد ○ فلم

یکن لہ کفوا احد۔

اس قسم کے بیسوں خواہر ریڑے جن سے یہ تنج شایاں بھگا رہا ہے تنگک و الحاد کی نگاہ کو خیرہ کرنے کے لئے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی شخص جو ذرا بھی انصاف پسند ہے دعویٰ کر سکتا ہے کہ خدا کا وہ تصور جو ان آیات سے ذہن انسانی میں پیدا ہوتا ہے شانِ عظیم لئے ہوئے ہے۔ یا ان صفات میں سے جو ان آیات میں گنتائی گئی ہیں کوئی صفت ایسی ہے جو مطلقاً انسان میں پائی جاتی ہو۔

ڈاکٹر ڈرپر فرماتے ہیں کہ مسلمان ان ادنیٰ درجہ کے تصورات کی قید سے بہت جلد آزاد ہو کر

ان رفیع الشان تصورات تک پہنچ گئے جن میں حکمت و فلسفہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے بڑے سے بڑے حکیم اور فلسفی کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ مابعد الطبیعیات میں آیات قرآنی کا شارح ہے اور بس۔ ابن رشد۔ ابن تیمیہ ابن حزم غزالی۔ ابن عربی فخر رازی۔ جابی۔ بوعلی سینا۔ فارابی۔ شاہ ولی اللہ اور سر سید احمد خان وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت کے امام ہو گزرے ہیں اور آزاد خیالی میں ڈرپہر سے بھی دو قدم آگے ہی ہیں لیکن توحید رسالت اور معاد کی حقیقتوں کے متعلق جو کچھ ان مشاہیر نے لکھا ہے وہ یا تو قرآن کی تشریح ہے یا تاویل۔ پروفیسر ٹکسن جن کا حوالہ ہم ایک مرتبہ پہلے بھی دے چکے ہیں لکھتے ہیں کہ اس بیس سال کی مدت میں جو رسول اللہ کی بعثت اور آپ کے انتقال کے درمیان متغی ہوئی آئندہ نسلوں کے مسلمانوں کی سیاسی اور عقلی ترقی کی بنیاد قائم کی جا چکی تھی۔ دنیا میں محمد صلعم سے بڑھ کر اور کسی شخص نے اپنی قوم کے مقدر کو اپنے خاص اثر کے سانچے میں نہیں ڈھالا۔ اور اگرچہ مسلمان تمدن کی دوڑ میں بہت جلد آپ سے کوسوں آگے نکل گئے لیکن ہر منزل بلکہ ہر ہر قدم پر ہر مسئلہ کے حل کرنے میں وہ آپ ہی سے استناد و استشارہ کرتے رہے۔ مترجم

لے آج تک کسی اہل الرائے کو یہ دعویٰ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا تھا کہ آیہ الیوم اکملت لکم دینکم کی تنزیل کے بعد ان اصول میں جو اسلام دنیا کے سامنے علی روس الاشاد پیش کر چکا تھا یا ان مقاصد پر جن کا اظہار انسان کی اصلاح معاش و معاد کے متعلق قرآن میں علی الاعلان کیا جا چکا تھا کوئی اضافہ کیا گیا یا ان اصول و مقاصد میں کوئی تنسیخ یا ترمیم روا رکھی گئی۔ تعجب ہے کہ مصنف کو باوجود اس بات کے جاننے کے کہ اسلام کا دارومدار قرآن پر ہے اور حامل قرآن یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی حجت حق ختم ہو گئی جس میں نہ آج تک کوئی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہوگی اس عجیب و غریب دعوے کی جرات کیوں کر ہوئی کہ رسول اللہ کی وفات تک تو اسلام کے مقاصد محدود تھے لیکن ایشیا و افریقہ میں پھیلنے کے بعد بوجہ اس کے کہ وہ اپنی فتوحات کے نشہ میں چور ہو گیا تھا اس نے ان مقاصد کو پس پشت ڈال دیا اور ایک نئی شرع کی ترویج کا مدعی ہوا۔ اس قسم کے دعوای مسیحی جہلا کو خوش کر سکتے ہیں لیکن مسلمانوں سے اور مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ بالغ نظر و آزاد خیال مسیحی مستشرقین تک سے یہ توقع رکھنا کہ وہ انہیں پلاچون و چرا تسلیم کر لیں گے گویا دن دھاڑے ان کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کرنا ہے۔

اسلام اور اس کے مقاصد سے جو شخص تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہے وہ اس اصولی نکتہ سے انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کسی ایک قوم یا ملک یا زمانہ تک محدود نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے اس نے تمام دنیا کو اپنے آغوش اثر میں لینے کا ڈھنگ ڈال دیا تھا چنانچہ اس کی یہ شان ہمہ گیری آیہ کریمہ فما ارسلناک الا رحمتہ للعالمین میں نظر آ رہی ہے۔ ایسی حالت میں جو شخص یہ

خیال ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی مقاصد محدود تھے یعنی اس کا ظہور صرف عربوں کی بت پرستی کے استیصال کے لئے ہوا تھا وہ گویا اپنے آپ کو اس برادری میں داخل کرتا ہے جس کی جبین معلومات پر ”نہ داند ویداند کہ بداند“ کا قشعہ لگا ہوا ہے۔

یہ دعویٰ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب ہے کہ اسلام نے تمام دنیا میں پھیلنے اور نشہ فتح و نصرت میں سرشار ہونے کے بعد اس امر کا اودعا کیا کہ وہ ایک نئی شرع کا بانی ہے۔ اول تو سرے سے اس اودعا کو اس سے منسوب کرنا ہی غلطی ہے اس لئے کہ قرآن میں بار بار بتایا گیا ہے کہ جو دین محمد مصطفیٰ صلعم کے ذریعہ سے انسان کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا وہ محض اذیان سابقہ کا مصدق اور حقائق ماضیہ کا موبہ ہے۔ آیات قرآنی کے سیاق سے ہر مقام پر یہ نکتہ مترشح ہوتا ہے کہ اسلام نے ان سچائیوں کو جن کا اظہار ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے مرسلین نے اپنے اپنے وقت میں کیا تھا ان کدورتوں اور آلائشوں سے پاک کر کے جن سے وہ بوجہ امتداد روزگار آلودہ ہو گئی تھیں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ چاہتا اس نے اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ وہ معرفت اور یزداں شناسی کی وہی پرانی شراب ہے مگر نئی بوتل میں اور اخلاق و روحانیت کا وہی قدیم پیکر نورانی ہے مگر نئے لباس میں۔ ثانیاً ”اگر ڈاکٹر ذریعہ کی خاطر سے یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ مسلمانوں نے اس قسم کا تناقض دعویٰ ایشیا اور افریقہ کی تغیر کے بعد اپنی فتوحات کے نشہ میں چور ہو کر علی رغم دجی منطق و نص صریح کسی موقع پر کیا ہے تو اس کا اثر اسلام پر پڑ سکتا ہے۔ اسلام پر اگر کوئی الزام لگایا جاتا ہے تو آیات قرآنی کا حوالہ دے کر اسے ثابت کیا جائے ورنہ دعویٰ بے دلیل سمجھا جائے گا۔

ڈاکٹر ذریعہ کا یہ خیال بھی انوکھا ہے کہ اسلام نسطوریت کی ایک شاخ ہے۔ جیسا کہ ہم ایک گذشتہ نوٹ میں ظاہر کر چکے ہیں نسطوریت اور چھٹی صدی عیسوی کی مسخ شدہ عیسائیت میں بجز اس مسئلہ کے اور کسی بات میں فرق نہ تھا کہ نسطوری حضرت عیسیٰؑ کی ذات کے ربانی و جسمانی عناصر کو جدا جدا خیال کرتے تھے اور حضرت مریمؑ کو ان کے عنصر جسمانی کی والدہ تصور کرتے تھے۔ باقی ہر ایک لحاظ سے وہ ان کی الوہیت کے قائل تھے یعنی حضرت عیسیٰؑ کی فطرت ربانی و جسمانی کو متحدہ غیر منفصل سمجھتے تھے اور ان کا ایمان تھا کہ مسیح کے افعال جسمانی شان ربانی لئے ہوئے ہیں۔ اقامتِ یثرب کی بھی وہ اسی ترمیم کے ساتھ قائل تھے اور کفارہ و عثائے ربانی اور دوسرے غوامض مسیحیت سب ان کے عقائد کا جزو لاینک تھے اور یہی وہ باتیں تھیں جن کی نسبت ذریعہ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان اصول کے تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا جو اگرچہ آپ کے نسطوری اساتذہ نے آپ کو سکھائے تھے لیکن آپ کا ضمیر اور عقل ان کی تائید نہ کر سکتی تھی۔ ایسی حالت میں اسلام کو نسطوریت کی ایک شاخ قرار دینا مصنف کی خوش فہمی نہیں تو اور کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک پیغمبر اولوالعزم کی لوح بصیرت بمنزلہ ایک ذکی الحس آئینہ عکسی کے

ہوتی ہے جس پر اس کے اخلاقی حوالی کے باریک سے باریک نقوش شعاع اور اک سے اثر پذیر ہوتے ہی مرقم ہو جاتے ہیں۔ حقائق کے اس مرقع کو پیش نظر رکھ کر وہ اپنی قوت میترہ کی مدد سے جو فیضان باری کی مسطرع خاص ہوتی ہے ان صورتوں کا انتخاب کر لیتا ہے جن سے اقوام و امم فیض یاب ہو کر قدرت کے منشاء اخلاقی کی تعمیل کرتی ہیں۔

حضور سرور کائناتؐ جو انبیائے اولوالعزم کے سرسبز ہیں اس زمانہ میں مبعوث ہوئے جب کہ دنیا کی قومیں ارتقائے اخلاق کے تمام مدارج طے کر چکی تھیں لیکن ان کی روحانیت گون کے زاویۃ الراس سے گر کر مائل بہ قاعدہ فساد ہو رہی تھی۔ وحدت واجب الوجود۔ بقا و قدرت باری تعالیٰ۔ عدم تغیر قوانین ایزدی۔ بقائے روح۔ حیات اخروی۔ حسن اخلاق۔ اخوت جماعت انسانی۔ یہ تمام اصول انسان کو معلوم ہو چکے تھے اور ان کے فروغ ہند مت۔ بدھ مت۔ مجوسیت۔ موسیت۔ مسیحیت میں موجود تھے لیکن انسان کے طغیان و عصیان نے ان نورانی حقیقتوں پر شرک ورجس کا تاریک پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس پردہ کے اٹھانے کے لئے ایک ایسے مامور من اللہ ہادی کی ضرورت تھی جس کی زبردست شخصیت ان تمام مشکلات سے عمدہ برآ ہو سکے جن کا پیش آنا اس معرکہ میں لازمی تھا۔ دفعہ قدرت ایزدی کی شان آشکارا ہوئی اور محمد مصطفیٰ نے مسند رسالت پر جلوہ افروز ہو کر ایک مجدد اعظم و مصلح اکبر ہونے کی حیثیت سے ان تمام سچائیوں کا جو ادیان و مذاہب سابقہ میں پہلے سے موجود تھیں اقتباس و التقاط و انتخاب کر کے شیرازہ ہاندھا اور اس دلکش و دلاویز تالیف کو بنام اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مترجم

۱۲۔ یہ ایک اور مضحکہ انگیز الزام ہے جو اسلام پر لگایا جاتا ہے باوجودیکہ وہ لوگ جو اس قسم کی مین میک نکالنے کے عادی ہیں خود بہت بڑے ماہہ پرست ہیں اور ان کا بال بال اجزائے و ستراطیسی میں بندھا ہوا ہے جن کے ازلی وابدی اور ناممکن النفا ہونے پر انہیں ایسا ہی یقین ہے جیسا اپنی ہستی پر لیکن جب کبھی حیات اخروی کے عذاب و ثواب میں انہیں جسمانی شان نظر آتی ہے خواہ وہ برسیل تمثیل ہی کیوں نہ ہو تو ان کا ستون ثقاہت و متانت مرکز ثقل سے ہٹ جاتا ہے اور وہ ایسے بے سروپا اور لغو اعتراضات پر اتر آتے ہیں کہ ہم بے مجسم ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتے۔ ہم ان لوگوں سے جو بہشت کے اسلامی تصور پر یہ کہہ کر نکتہ چینی ہوا کرتے ہیں کہ اس میں ہر طرح کی جسمانی لذتیں پائی جاتی ہیں اور جن کو حوروں غلمانوں کے ذکر سے اس قدر چڑ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا آپ کے خرمن تقدس پر برق ظالم گریزی یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ خدا اور اس کی تنزیہ و تقدیس کے قائل ہیں تو آخر اس دنیا میں ناز و نیاز اور اس کی متعلقہ لذتوں کے پیدا کرنے سے اس کے دامن تقدس و تنزہ میں کون سا ایسا وجہ لگ گیا جو عقبی میں حوروں اور غلمانوں کی عدم موجودگی سے چھوٹ جائے گا۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ خدا اس دنیا میں کچھ اور ہے اور آنے والی دنیا میں کچھ اور ہو جائے گا وہ ایک انوکھی منطق سے کام لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے معترنین اصل حال سے تو بے خبر ہیں لیکن شوق نکتہ چینی قلم کو چین نہیں لینے دیتا۔

شاہ ولی اللہ صاحب اپنی کتاب نجمۃ اللہ الباغہ میں انبیاء کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے ان کی عقل و علم کے لحاظ سے خطاب کیا کرتے ہیں۔ اسی خیال کو امام فخر الدین رازی نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ قرآن کا روئے سخن عوام و خواص کی طرف یکساں ہے لیکن چونکہ عوام اکثر امور میں اپنے افتاد طبعیت کے لحاظ سے حقائق کے ادراک سے قاصر ہیں لہذا مصلحت یہ تھی کہ ایسے الفاظ میں انہیں مخاطب کیا جائے جو ان کے خیالات و تصورات کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں۔

قرآن کے ان مقامات کا مطالعہ کرتے وقت جن میں بہشت و دوزخ کی تصویریں کھینچی گئی ہیں اس حکیمانہ اصول کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ان پڑھ اور اکثر جملہ کے غیر نشوونما یافتہ دماغ کے پردہ پر اعمال حسہ کی جزا کی تصویر اگر کھینچی جاسکتی تھی تو صرف ان نعمتوں اور لذتوں کے تذکرہ سے جن کا احساس یا ادراک ان کے لئے ممکن تھا۔ بہشت کا وہ تصور جس میں حوروں اور غلاموں اور بہتی ہوئی نہروں اور لہلہاتے ہوئے بہمنوں کا عنصر شریک ہے تشبیلی پیرایہ میں عوام کا لانعام کو جادوانی مسرتوں سے روشناس کرنے کا فلسفیانہ ذریعہ ہے۔ ورنہ اس بہشت کا تصور بھی اسلام میں موجود ہے۔ جس میں داخل ہو کر بڑے سے بڑے مثالی یا اشرافی فیلسوف کو بھی یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی طبعیت کسی زمانہ میں اس کی خوشیوں سے اچھا ہو جائے گی۔ حیات اخروی کا وہ اصل الاصول اور غایت الغایات جس کے حصول کے لئے اسلام کے حکمائے عظام و صوفیہ کرام نے اپنی عمریں وقف کر دی ہیں قائم باری تعالیٰ یا وصال ذات ذوالجلال و الجلال ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی تشریح حضور سرور کائنات نے ایک صحابی کے اس استفسار پر کہ بہشت کی ماہیت کیا ہے ان الفاظ میں فرمائی تھی لا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر یعنی بہشت کی لذت وہ لذت ہے جس کا ادراک سامعہ و باصرہ تو ایک طرف رہے تصور و تخیل تک سے نہیں ہو سکتا۔ اسی حقیقت کا انکشاف قرآن پاک کی اس آیت سے ہوتا ہے یا ایہا النفس المطمئنة لرجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ ایک اور مقام پر جناب باری نے لذت نجات کی طاوت سے حقیقی معنوں میں بہرہ اندوز ہونے والوں کو ان الفاظ میں بشارت دی ہے کہ وہ آخر فیصلہ والے دن اپنے خدا کے جمال عالم آرا کا مشاہدہ کریں گے۔ اسی طرح ایک نص صریح اس مضمون کی موجود ہے کہ کسی نفس کو اس مسرت ابدی کا علم نہیں ہے جو پوشیدہ طور پر اس غرض سے تیار کی گئی ہے کہ ان اعمال حسہ کے انعام کے طور پر اس کو مرحمت کی جائے جو اس سے اس دنیا میں صادر ہوں۔ فلسفیانہ اصطلاح میں ان مضامین کو انجذاب یا وصال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ قرآن کا بہشت وہ بہشت ہے جس سے غامی و جاہل عالم و فلسفی اپنے

اپنے مذاق کے لحاظ سے یکساں لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ اگر ایک خدا شناس فلسفی اسی کو اپنی خوشیوں کی معراج تصور کرتا ہے کہ اس کی روح اس خالک ان کی قید سے آزاد ہونے کے بعد روح کائنات یعنی ذات باری تعالیٰ میں ضم ہو جائے تو یہ انتہائی خوشی بھی قرآن کے توسل سے اس کو حاصل ہو سکتی ہے اور اگر ایک ادنیٰ درجہ کا دین دار عالمی جس کی آرزو صرف اسی قدر ہے کہ حوروں سے ہم کنار ہو کر شراب طہور کے پیالے پیا کرے اور طوبی کے پھل توڑ توڑ کر کھلیا کرے تو ڈرپہر یا اس کے ہم خیال بزرگوں کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ اس خوشی سے اس بچارے کو محروم کرنے کے لئے جوڑ توڑ کریں۔ مترجم

لگہ یہ اندازہ اصل سے بقدر ایک لاکھ کے کم ہے۔ اس محرکہ میں مسلمانوں کی فوج چالیس ہزار تھی اور عیسائیوں کی دو لاکھ چالیس ہزار۔ مترجم

اللہ مصنف کو شاید یہ معلوم نہیں کہ امام غزالی کا یہ قول قرآن کی مشہور و معروف آیت لیس مکملہ شی کی شرح ہے جو علی روس الاشہاد اس الزام کی تردید کر رہی ہے کہ اسلام ایک تجسمیہ مذہب ہے۔ مترجم

سنہ ۴۱۳ء میں اس نے مورخ تھا جس نے پانچویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا ہے۔ ۴۱۳ء میں اس نے انسان کی ملاقات کی غرض سے افریقہ کا سفر اختیار کیا۔ اس کی مشہور کتاب ”تاریخ عالم“ اسی ملاقات کا نتیجہ ہے۔ انسان نے اس کتاب کی تصنیف کی فرمائش کرتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ اس میں اس بات کو ثابت کرنا چاہئے کہ دولت روم بت پرستی کے زمانہ میں بھی ویسی ہی مصیبتیں نازل ہوئیں جیسی مسیحیت کے زمانہ میں ہو رہی ہیں۔ کارٹیج سے اور دس بیس بیت المقدس گیا اور وہاں چند دن تک پطیس کی مخالفت میں اس کے حریفوں کا ہم صغیر و ہم آہنگ رہ کر وطن کو لوٹا۔ رستہ میں اسکندریہ پڑنا تھا۔ چند روز یہاں کی بھی میری۔ یہ زمانہ وہ تھا جب سینٹ ساریل کا سا متعصب اور دشمن علم پادری جس نے ہائی پیشیا کے وحشیانہ قتل سے علم و حکمت کے گلے پر الٹی چھری پھیر دی تھی اسکندریہ کا بطریق تھا۔ اول تو ساریل کا چچا تھیا فیلس ہی کتب خانہ اسکندریہ کی تمام بچی کچی کتابوں کو برباد کر چکا تھا اور بفرض محال اگر کچھ بچ رہی ہوں تو ضرور رہے کہ ہائی پیشیا کے وحشی قاتل نے انہیں ضائع کر ڈالا ہو۔ اور اس لئے اور دس بیس کی اس تاریخی شہادت کی سچائی میں کلام نہیں ہو سکتا کہ جب اس نے کتب خانہ کو جاکر دیکھا تو اس میں ایک کتاب بھی موجود نہ تھی۔ گویا حضرت عمرؓ کی خلافت سے دو سو بیس سال قبل کتب خانہ اسکندریہ عیسائی پادریوں کی جہالت اور تعصب کے ہاتھوں تمام و کمال برباد ہو چکا تھا۔ مترجم

سنہ کتب خانہ اسکندریہ کا بعد حضرت عمرؓ بحکم حضرت اقدس جلایا جانا ایک ایسا الزام ہے جس کی اصل حقیقت کا انکشاف علامہ شبلی کا سحر آفرین قلم کر چکا ہے۔ ہمارے ناظرین میں سے جن صاحب کو اس بحث کی تفصیل مطلوب ہو وہ علامہ ممدوح کی تصنیف ”رسائل شبلی“ کا پامعان نظر

مطالعہ کریں۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ باوجودیکہ ان تمام براہین و دلائل کے جو اس الزام کے جواب میں پیش کی جا سکتی تھیں ڈرپہر نے یہاں خود پیش کر دیا ہے پھر بھی اسے اصرار ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کتب خانہ کے جلا دئے جانے کا حکم ضرور نافذ فرمایا۔ ڈرپہر کو اس امر کا اعتراف ہے کہ فتح اسکندریہ کے وقت ”سرسپان“ یعنی فیلڈ انس کے کتب خانہ کی کوئی کتاب موجود نہ تھی اس لئے کہ تمام کتابیں کچھ تو جو لیس یزر کے عہد میں جل چکی تھیں اور جو باقی بچی تھیں وہ بچم شہشاہ تیموذو سیس بطریق تھیافلس کی نگرانی میں منتشر کی جا چکی تھیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اور سیس جو ایک مسیحی مورخ ہے اپنے چشم دید حالات کی بنا پر اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ شہشاہ تیموذو سیس کے حکم کی تعمیل کے بیس سال بعد جب اس نے کتب خانہ کو جا کر دیکھا تو ایک کتاب موجود نہ پائی۔ اس کے علاوہ مصنف ان اندرونی و ذیلی شہادتوں کا بھی مقرر ہے جو اس اصولی ثبوت کی موید ہیں۔ مگر بائیں ہمہ اس اصرار و استبداد سے کام لے کر جو معقولیت سے کوسوں دور ہے اور جس میں کسی سوفسطائی کی کٹھ جتنی کی شان نظر آ رہی ہے یہ کہے جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم سے کتب خانہ جلا دیا گیا اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ چونکہ وہ نوشت و خواندہ سے عاری تھے اور ان کے چاروں طرف تعصب اور جہالت کا بادل چھایا ہوا تھا لہذا اگر انہوں نے یہ حکم دیا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر ڈرپہر نے اس مقام پر ایسے جمل مرکب کا ثبوت دیا ہے جس کی ایسے عالم و فاضل شخص سے ہم کو ہرگز توقع نہ ہو سکتی تھی۔ حضرت عمرؓ کو نوشت و خواندہ سے عاری اور متعصب و جاہل سمجھنا تاریخ کی آنکھوں میں خاک جھونکتا ہے۔ جو شخص عربی میں ید طولی رکھنے کے علاوہ عبرانی زبان میں بھی دستگاہ دانی رکھتا ہو۔ جس نے فقہ یعنی علم اصول قانون جیسے دانش آزمائش فن کی بنیاد قائم کی ہو۔ جس کی مجتہدانہ عظمت تیرہ سو سال سے آئمہ فن کے دلوں میں جاگزیں ہو۔ جو شعرو سخن سے ایک خاص مذاق رکھتا ہو اور اشعار نفوذ لطیف کے سب سے بڑے نقاد ہونے کی حیثیت سے فنون لطیفہ کے اس شعبہ خاص کا بہت بڑا سرپرست مانا گیا ہو۔ جس کو علم الانساب موروثی طور پر ترکہ میں ملا ہو۔ جس نے تعلیم کو جن مضمون میں کہ یہ لفظ اسلام کے قرون اولیٰ میں مستعمل تھا عام بلکہ ایک حد تک جبری کر دیا ہو۔ جس نے سب سے اول قرآن کے جمع و مدون کئے جانے کی تحریک کی ہو۔ جس کو قرآن سے ”قل رب زدنی علماً“ اور حدیث سے ”اطلبوا العلم ولو کان بالبعین“ کا سبق ملا ہو۔ جو مدت العلم کے خرمن فیوض کا خویہ چیں اور باب العلم کا ہم چشم و ہم نشین ہو۔ جس کی مسالمت۔ رواداری۔ انصاف۔ سیاست و حکمت شہرہ آفاق ہو اسے جاہل و متعصب کہنا ڈاکٹر ڈرپہر ہی کا کام ہے۔

مصنف نے حضرت علیؑ کے اس قول کو کہ ”انسان عادات و خصائل میں اپنے آباء اجداد سے اتنی مشابہت نہیں رکھتا جتنی اپنے ہمعصروں سے“ حضرت عمرؓ کے جمل و تعصب کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ جہالت و تعصب کے حوالے میں زندگی بسر کرنے کے باعث اگر حضرت عمرؓ بھی اپنے معاصرین کی طرح جاہل و متعصب تھے تو پھر انہیں حوالے میں سے حضرت علیؑ کا سا حکیم اور فلسفی کس طرح پیدا ہو گیا جس کی حکمت کا خود ڈرپہر کو بھی اعتراف ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ مہمات الامور میں حضرت عمرؓ کو صلاح و مشورہ دیا کرتے تھے اور کوئی اہم مسئلہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں حضرت علیؑ کی رائے نہ لی جاتی ہو۔ پس اگر حضرت عمرؓ نے اس کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا حکم دیا جس کا وجود بدلائل قاطع و براہین ساطع متعصب پادریوں اور ان کے حق ناشناس ہم صفیروں کے دماغ ہی میں ممکن ہونا ثابت ہے تو اس الزام میں حضرت علیؑ بھی حضرت عمرؓ کے برابر کے سامجی ہیں۔ لیکن شاید ڈرپہر کو حضرت علیؑ پر بھی جاہل و متعصب ہونے کا الزام لگاتے ہوئے تامل ہو گا۔ مترجم

سلسلہ کتب خانہ اسکندریہ والے قصہ میں تو ہم نے ثابت کر دیا کہ مبالغہ مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ پادریوں کی طرف سے ہے لیکن سبھی مورخ اس واقعہ کی تکذیب و تردید نہ کر سکیں گے کہ حروب ملیہ کے جاہل و وحشی سوراؤں نے کتب خانہ طرابلس کو اس وقت جلایا جب کہ اس میں لاکھوں کتابیں جمع تھیں۔ کتب خانہ اسکندریہ کا تو حضرت عمرؓ کے عہد میں سرے سے وجود ہی نہ تھا مگر جب عیسائی سورا طرابلس پر حملہ آور ہوئے تو کتب خانہ طرابلس اپنی پوری علی شان کے ساتھ موجود تھا۔ یہ واقعہ مسلم و منتقم ہے کہ پندرہویں صدی تک مسیحیت مجتہدانہ جہالت اور مجتہدانہ تعصب کی مترادف تھی جس کا خیاڑہ علوم و فنون کو رہ رہ کر کھینچا پڑا بخلاف اس کے مسلمان علم و حکمت کے علم بردار اور خلعت کدہ تمدن کی شمع تھے۔ ایسی حالت میں اگر وحشی و خونخوار مسیحیوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے کئی لاکھ کتابیں جو مسلمانوں نے جمع کی تھیں جلا دیں تو ان کے حامیوں کا یہ فرمانا کہ کئی لاکھ نہیں بلکہ صرف چند ہزار کتابیں جلائیں واقعہ آتش زنی کی سنگینی اور مسیحیوں کے تعصب و وحشیانہ پن کے اشداد کو کم نہیں کر سکتا۔ مانا کہ کتب خانہ طرابلس میں کئی لاکھ نسخے نہ تھے بلکہ کئی ہزار تھے لیکن اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے کہ حروب ملیہ کے مسیحی سوراؤں نے ان سب کو آگ میں جھونک دیا۔ بجائے کئی ہزار کے اگر کئی لاکھ نسخے ہوتے تو کیا ان کی بے محابا آتش زنی سے بچ جاتے۔ مترجم

لکھ اسلام کی تعریف مولوی سید امیر علی صاحب اپنی کتاب ”اسپرٹ آف اسلام“ میں ہاں الفاظ کرتے ہیں: ”اسلام مادہ سلم سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی اطمینان قلب۔ سکون نفس۔ بجا آوری فرض۔ ادائے دین۔ کمال آشتی دامن اور بالاخر اپنے آپ کو اس ذات پاک کے تئیں سونپ دینے کے ہیں جس کے ساتھ رشتہ آشتی و امن قائم کیا جائے۔ جو اسم اس مادہ سے مشتق

ہے اس کے معنی امن تلافی سلامتی اور نجات کے ہیں۔ عام طور پر اس لفظ سے مطلقاً "راضی بہ رضائے الہی ہو نامراد لیا جاتا ہے مگر یہ مفہوم درست نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کے معنی ہیں نیک بننے کی کوشش کرنا۔ حرجم

۱۔ کلام مجید میں اگرچہ بکثرت ایسی آیات موجود ہیں جن سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے چنانچہ (۱) لا تتحرک ذرة الا باذن اللہ (۲) هو القاهر فوق عباده (۳) وما تشاؤون الا ان يشاء اللہ (۴) قل کل من عند اللہ کا مطلب ہادی النظر میں یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے انسان کو کچھ اختیار نہیں دیا گیا لیکن یہ مطلب ان آیات سے وہی لوگ نکالتے ہیں جو ظاہر میں ہیں اور سطح کے نیچے جانے کی زحمت اپنے دماغ کو نہیں دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کائنات مجموعہ اعضاء ہے یعنی ہر نیکی کے لئے ایک بدی کا ہونا لازم ہے ہر بلندی ایک پستی کو چاہتی ہے ہر نور ایک ظلمت کا محتاج ہے غرض دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا تصور اس کی ضد کے بغیر ممکن ہو اسی طرح مسئلہ جبر بھی اپنی ضد یعنی مسئلہ اختیار کا مستلزم ہے۔ یہ فلسفیانہ نکتہ قرآن کی ان بظاہر متعارض مگر بہ باطن متوافق آیات میں مضمر ہے جن میں سے کسی میں اگر یہ کہا گیا ہے کہ تم کسی بات کو نہ چاہو گے جب تک کہ خدا نہ چاہے تو کسی میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ جبر و اختیار کی یہ آمیزش اس اٹل اور ازلی قانون کے مقتضیات میں سے ہے جس کی تشریف ان الفاظ میں کی گئی ہے (۱) لا تبديل لخلق اللہ (۲) خلق کل شیء فقده تقدیرا (۳) فلن تجد لسنة اللہ تبديلا اس سے زیادہ حکیمانہ توجیہ کائنات کے کسی ارادی یا غیر ارادی حادثہ کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اسباب و علل کے ایک محکم و متین سلسلہ کے ذریعہ سے اس مدبر اعظم کی ذات پر جلتی ہو تا ہے جو مدد العال اور مظاہر عالم کا سبب اولین ہے۔ لیکن مقدرات کے اس جبریہ عنصر میں مدد العال نے جس کی حکمت آفرین شان پر "والہی خلق فستوی" گواہ ہے ارادہ انسانی کا اختیاری عنصر بھی ایک خاص حد تک شامل کر دیا ہے جس کا اندازہ "والہی قدر فہمی" سے کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کی رو سے انسان نہ مجبور محض ہے نہ مختار مطلق۔ وہ ان حدود کے اندر جو فطرت انسانی کے ارتقائی عقلی و روحانی و اخلاقی کے لئے مقرر کر دی گئی ہیں اپنے افعال کا مختار ہے لیکن ان حدود سے آگے بڑھنے پر قادر نہیں۔ اسلام کی نسبت یہ سمجھنا کہ اس نے اپنے پیروؤں کو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کی تلقین کی ہے اور یہ سکھایا ہے کہ اگر مریض کو مرنا ہے تو طبیب سے رجوع کرنا فضول ہے اس لئے سرے سے علاج ہی نہ کرنا چاہئے اس کی تعلیم کا ایک جہان اور متعصبانہ اندازہ کرتا ہے۔ جس کی نفی نہ صرف قرآن کی آیات بلکہ شارح علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قرون اولی کے ان مسلمانوں کی زندگیوں کر رہی ہیں جن سے زیادہ شریعت کا رازدان اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ جبر و اختیار کے معنی کو معارف و ستغابہ مولانا نے

روم نے ان سادہ الفاظ میں حل کر دیا ہے۔

گفت پیغیر بہ آواز بلند بر تو کل زانوائے اشترہ بند
ہم کو اپنی طرف سے متعدد بحر کوشش کرنی چاہئے اور نتیجہ کے لئے اس لیلیٰ غیبی کا بھر رہنا
چاہئے جو مل بہ حکمت و پابند قانون غیر ممکن التعمیر ہے۔ مترجم

لے خدا کی شان وہ لوگ جو عربی کا ایک حرف تک نہیں جانتے جن کی کل معلومات قرآنی کا مافذ
وہ ذیل لفظی ترجمے ہیں جو سیل جیسے متعصب اور نااہل پادریوں نے کئے ہیں اس بات کے مدعی
ہوں کہ وہ قرآن کے حقیقی معانی کے سمجھنے کی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔

مصنف کا تو انتقال ہو چکا ہے اس لئے ہمارا روئے سخن ان کی طرف نہیں ہو سکتا البتہ جو
لوگ ان کے ہم خیال ہیں ان کی خدمت میں ہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تحریف شدہ
انجیل کی طرح قرآن نے اس قسم کا لغو دعویٰ کیس نہیں کیا کہ زمین ایک سطح مرلج ہے جس کے
چاروں طرف پہاڑ ہیں یا یہ کہ زمین غیر متحرک ہے جس پر آسمان لٹکا ہوا ہے یا یہ کہ بہشت آسمان
پر ہے اور سب سے اونچے آسمان پر خدا ایک انسان کی شکل میں تخت پر بیٹھا ہے جس کے دونوں
طرف پر دار بیل کھڑے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے پہلے ہی دن مذہب اور سائنس کی حدود کو الگ الگ کر دیا تھا۔
رسول کے مبعوث ہونے کا فضا ہے تھا کہ لوگوں کو اخلاق حسنہ سکھائے اور ایک آنے والی زندگی کے
حقائق سے آگاہ کرے نہ یہ کہ انہیں جغرافیہ و ہیئت اور فلسفہ و طب کا سبق دیتا پھرے۔ حضور
رسالت پناہ نے صاف صاف یہ فرما دیا ہے کہ انتم اعلم بعلوم الدنیا کم۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں جابجا ایسی آیات پائی جاتی ہیں جس میں آسمان زمین بہشت
عرش کرسی کا ذکر ہے لیکن افلا یبظرون الی الارض کیف سطحت سے یہ معنی لینا کہ زمین ایک
سطح مرلج ہے یا ہم نجعل الجبال اعتدا کی یہ تاویل کرنا کہ پہاڑ زمین میں میخوں کی طرح ٹھکے
ہوئے ہیں اور اسے اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیتے۔ یا ثم استوی علی العرش کا یہ مفہوم سمجھنا کہ
ہاری تعالیٰ باعتبار جہت و اشارہ و لحاظ تحت و فوق سب سے اونچے آسمان پر تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ یا
مقرئ فی خلق الرحمن من تفلیت فلرجع البصر هل تری من فطور کا یہ مطلب سمجھنا کہ آسمان
ایک بلوریں گنبد ہے جو بغیر کسی دراڑ کے اپنی جگہ قائم ہے فن بلاغت کے اس اصول کی گردن پر
الئی چھری پھیرنا ہے جس میں خطابیات کے تنہی اثر کا راز چھپا ہوا ہے۔

علامہ شبلی "الکلام" میں تحریر فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ انبیاء
تمدن اخلاق اور تزکیہ نفس کے سوا اور قسم کے مباحث اور مسائل اور حقائق سے معرض نہیں
ہوتے اور اس قسم کے امور کے حلق کچھ بیان کرتے ہیں تو انہیں کی روایات اور خیالات کے
مطابق اور اس میں بھی استعارات اور مجازات سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے

مجتہد اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ انبیاء کے اصول میں سے ایک یہ بات ہے کہ جو امور تہذیب نفس اور سیاست قوی سے تعلق نہیں رکھتے ان میں وہ دخل نہیں دیتے مثلاً "کائنات الجوی یعنی بارش کسن ہالہ کے پیدا ہونے کے اسباب۔ نباتات اور حیوانات کے عجائبات۔ چاند سورج کی رفتار کی مقدار۔ حوادث یومیہ کے اسباب۔ انبیاء سلاطین اور ممالک کے قصے وغیرہ۔ ان چیزوں سے وہ بحث نہیں کرتے۔ مگر ہاں چند معمولی باتیں جن سے لوگوں کے کان مانوس ہو چکے ہیں اور ان کی عقلوں نے باتوں کو قبول کر لیا ہے اور ان باتوں کو بھی وہ لوگ خدا کی شان اور قدرت کے ذکر میں ضمنی طور پر اجالا بیان کرتے ہیں اور اس میں حجاز اور استعارہ سے کام لیتے ہیں اور اسی اصول کی بنیاد پر جب لوگوں نے آنحضرتؐ سے چاند کے گھٹنے بڑھنے کا سبب پوچھا تو خدا نے اس کے جواب سے اعراض کیا اور اس کے بجائے مہینوں کا فائدہ بیان کر دیا چنانچہ فرمایا *وہیسلونک من الالہتہ قل ہی مواہبت للناس والحبج*۔ اکثر لوگوں کا مذاق ان فنون (یعنی ریاضیات وغیرہ) کے اشتغال کی وجہ سے خراب ہو گیا ہے تو یہ لوگ انبیاء کے کلام کو خلاف حقیقت محمل پر محمول کرتے ہیں۔ مترجم

کچھ کیا ڈاکٹر ڈسپر علی رغم آیہ کریمہ "قل رب زدنی علماً" ہم کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اسلام مانع اکتساب علم و حکمت تھا؟ کیا وہ اس کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں کی تلوار نے مشرق و مغرب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تو اس تحدی کا زور جو "فان کنتم فی ریب ممفلزلنا علی عبنا فلتو بسورۃ من مثله رادعو شہداء کم ان کنتم صادقین ولن لم تفعلوا ولن تفعلونا نقوالنلر اللی فقولہا الناس والحجرۃ اعدت للکافرین" کے حرف حرف میں ساری دواہر تھی کم ہو گیا تھا؟ کیا ڈاکٹر ڈسپر حضرت علیؑ کی مداحی کا دم بھی سمجھ کر بھرتے ہیں کہ باوجودیکہ قرآن ادب و انشا اور حکمت و فلسفہ کا مزام تھا پھر بھی انہوں نے لوگوں کو ہر طرح کے علمی مشاغل کا شوق بطور خود دلایا؟ کیا ڈاکٹر ڈسپر کے ہم خیال "قربا" ساڑھے تیرہ سو سال کے گزرنے کے بعد بھی کوئی ایسی کتاب دکھا سکتے ہیں جو فصاحت و بلاغت میں قرآن کی بگڑی ہو؟ مترجم

۵۔ ایک یونانی الاصل ریاضی دان تھا جو چوتھی صدی عیسوی کے خاتمہ پر اسکندریہ میں پیدا ہوا۔ جبر و مقابلہ کے بعض ابتدائی مسائل کی دریافت اس سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کی قبر کی لوح پر چند اشعار بیزان یونانی کندہ تھے جو ہم تک پہنچے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ۳۳ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ اس کا بیٹا شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوا کہ ۲۴ سال کی عمر میں اس سے چار سال پہلے مر گیا اور اس حساب سے اس کی عمر ۸۴ سال ہوئی۔ یہ اطلاع جبر و مقابلہ کی ایک شکل میں قلمبند کی گئی ہے۔ ارسطاطق (علم حساب) پر اس نے ایک کتاب تیرہ مقالوں میں لکھی تھی جس میں سے صرف چھ مقالے اس وقت موجود ہیں۔ مترجم

چوتھا باب

جنوب میں سائنس کا احیا

نسوریوں اور یہودیوں کے اثر کی وجہ سے عرب اکتساب علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تضاد قدر اور سرنشت ازلی کے متعلق ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور کائنات کی ہیئت ترکیبی کا ان کو صحیح علم ہو جاتا ہے۔ وہ زمین کی جسامت اور شکل کی تحقیق کرتے ہیں۔ ان کے خلفاء عظیم الشان کتب خانوں کی بنا ڈالتے ہیں علوم و فنون کے ہر شعبہ کی سرپرستی کرتے ہیں اور رصد گاہیں قائم کرتے ہیں۔ وہ فن ریاضی کو ترقی دیتے ہیں الجبرا ایجاد کرتے ہیں اور فن ہندسہ و فن مثلث پر بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ فنون ریاضی و ہیئت کے متعلق قدیم یونانی تصانیف کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں اور ان کا عربی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ ارسطو کے طریقہ استقراء پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ بہت سے دارالعلم قائم کرتے ہیں اور نسوریوں کی مدد سے موجودہ وضع کے مدارس کھولتے ہیں۔ عربی سیاق و ابعاد اور فن حساب کو رواج دیتے ہیں اور ستاروں کی فہرستیں مرتب کر کے ان کے نام رکھتے ہیں۔ موجودہ فنون ہیئت و کیمیا و طبیات کی بنیاد رکھتے ہیں اور فلاح و صنعت و حرفت کو بہت کچھ ترقی دیتے ہیں۔

خلیفہ چہارم حضرت علیؑ کا قول ہے کہ میں نے اپنی طول طویل زندگی میں اکثر یہ بات دیکھی ہے کہ انسان عادات و خصائل میں اپنے آباء اجداد سے اتنی مشابہت نہیں رکھتا جتنی اپنے ہمعصروں سے۔ رسول عربیؐ کے داماد کا یہ حکیمانہ مقولہ نہایت درست ہے اس لئے کہ گو کسی شخص کے جسمانی طبع سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فلاں نسل سے ہے لیکن اس

کی ترکیب دماغی اور اس لحاظ سے اس کے خیالات کا رجحان ان حوالی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے جن میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔

جب حضرت عمرؓ کے نائب عمرو بن العاص نے مصر کو فتح کر کے عربی سلطنت میں شامل کیا تو اسکندریہ میں اس کی ملاقات یومنا عرف فلپس ایک یونانی نحوی سے ہوئی۔ فلپس ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی محنت پسند کے ہیں۔ رفتہ رفتہ عمرو اور یوحنا میں دوستی ہو گئی اور اس دوستی کے بحروے پر محنت پسند نے عمرو سے درخواست کی کہ کتب خانہ اسکندریہ کی جو کتابیں حوادث جنگ۔ مرور ہو اور مذہبی تعصب کی پیچیدہ دستبرد سے بچی بچائی باقی چلی آتی ہیں وہ اسے دے دی جائیں۔ عمرو نے اس بارہ میں خلیفہ سے استصواب کیا۔ وہاں سے یہ جواب آیا کہ اگر یہ کتابیں کلام الہی یعنی قرآن مجید سے مطابق ہیں تو ان کا رکھنا فضول ہے اور اگر نہیں مطابق ہیں تو ضرور ساں ہیں لہذا انہیں ضائع کر دو۔ اس فرمان کی بنا پر سب کتابیں اسکندریہ کے حماموں میں تقسیم کر دی گئی اور بچان کیا جاتا ہے کہ ان کے جلنے میں چھ مہینے کی مدت لگی۔

اگرچہ اس واقعہ سے انکار کیا گیا ہے لیکن اس میں مطلق شک نہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم ضرور دیا۔ وہ نوشت و خواند سے عاری تھے ان کے چاروں طرف تعصب اور جہالت کا بادل چھایا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اگر انہوں نے یہ حکم دیا تو کون تعجب کی بات ہے۔ عمرؓ کے اس فعل نے گویا علیؓ کے قول کی تصدیق کر دی۔

لیکن یہ نہ قیاس کرنا چاہئے کہ وہ کتابیں جو یوحنا سے محنت پسند کو اس درجہ عزیز تھیں وہ کتابیں تھیں جو تاجداران سلسلہ بطلیموسیہ کے مشہور کتب خانہ یا یومینز شاہ پرگنیس کے کتب خانہ کا سرمایہ اعتبار تھیں۔ فلپس کو کتب خانہ قائم کئے ہوئے ایک ہزار سال کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اس کتب خانہ کی آدمی کتابیں تو جو یس یسر نے جلا دی تھیں اور باقی اسکندریہ کے پادریوں نے اپنے اہتمام سے ضائع کرا دی تھیں۔ اور دیکھیں نے صاف الفاظ میں جن کی کوئی دوسری تاویل نہیں ہو سکتی بیان کیا ہے کہ سینٹ سائرل کا چچا تھیافیلس جب شہنشاہ تھوڈیوسیوس سے کتب خانہ کی بربادی کا فرمان حاصل کر کے تمام کتابوں کو ضائع کر چکا تو اس کے بیس سال بعد اس نے کتابوں کی الماریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ سب کی سب خالی تھیں اور ان میں ایک کتاب باقی نہ تھی اور اگر بغرض محال یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ایسی وحیانشہ بربادی کے بعد بھی یہ عظیم الشان کتب خانہ بچ رہا تو ہزار سال کی فرسودگی اور شاید تصرف بچا کے اثر کا مقابلہ کرنے کے بعد اس کی تعداد کتب بہت ہی کم

رہ گئی ہوگی۔ اس کے علاوہ یوحنا کو اس کے عرف کی مناسبت سے مستعدی اور مشغولیت کا خواہ کیا ہی بڑا تمنہ کیوں نہ عطا کیا جائے لیکن یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک اکیلے یوحنا کی محنت پسندی کیوں گر پانچ لاکھ کتابوں کی نگہداشت اور اہتمام سے عمدہ برآ ہو سکتی تھی اور کس طرح ایک اپنی درجہ کا غریب نحوی اس عظیم بالشان کتب خانہ کو قائم رکھنے اور چلانے کے مصارف کا منکفل ہو سکتا تھا جس پر بطلیموسیوں کے شاہانہ محاصل کا ایک بیش قرار حصہ صرف ہوا کرتا تھا۔ کتب خانہ کے جلنے کی جو مدت بتائی گئی ہے اس سے بھی کتابوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جہلی کے کاغذ سے زیادہ برے ایندھن کا ہونا ممکن نہیں۔ کاغذ اور پٹیل اگرچہ اچھی طرح جل سکتا ہے۔ لیکن ان کتابوں میں سے زیادہ تر ایسی تھیں جو جہلی پر لکھی ہوئی تھیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکندریہ کے حامیوں نے دوسرا ایندھن چھوڑ کر چری اور اق جلانے پسند کیے ہوں جن کی آٹھ جیسی تیز ہو سکتی ہے وہ تو ظاہر ہے البتہ چراغ کے ہر طرف پھیل جانے میں کچھ شک نہ تھا۔

پس اس میں شک نہیں کہ حضرت عطر نے یا تو یہ سمجھ کر کہ کتابیں کسی مصرف کی نہیں اور یا اس خیال سے کہ ان کے پڑھنے سے لوگ بد اعتقاد ہو جائیں گے اس کتب خانہ کے جلانے کا حکم ضرور دیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حروب صلیبہ کے دوران میں بھی پیش آیا جب کہ عیسائی مجاہدوں نے کتب خانہ طرابلس کو جس کے نسخوں کی تعداد اڑھارہ مبالغہ تیس لاکھ بیان کی گئی ہے آگ لگا دی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب عیسائی کتب خانہ طرابلس کے پہلے کمرہ میں داخل ہوئے تو انہیں بجز قرآن کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ اس سے انہوں نے قیاس کر کے کہ باقی کتابیں بھی آن حضرتؐ ہی کی تصانیف ہوں گی تمام کتب خانہ کو آگ میں جمونک دیا۔ ان دونوں قصوں میں کس قدر اصلیت اور بہت کچھ مبالغہ ہے۔ لیکن مجنونانہ تعصب نے ہمیشہ اس قسم کی حرکتوں سے اپنا نام کیا ہے۔ ہسپانیہ کے عیسائیوں نے جب میکسیکو پر حملہ کیا تو ڈھیر کے ڈھیر ان کتابوں کے جن میں امریکہ کے قدیم تمدن کی داستان بھٹکتی تصویر محفوظ تھی کمال وحشیانہ پن سے جلا دئے اور یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی طاعنی زمانہ نہیں کر سکتا۔ ہسپانیہ کے ایک متعصب پادری زامیز نے غرناطہ کے چوک میں عربی زبان کے اسی ہزار قلمی نسخوں کا ڈھیر لگا کر آگ لگا دی۔ ان میں سے بہت سے نسخے مشاہیر معتقین زمانہ قدیم کی تصانیف کے عربی تراجم تھے۔

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ اسکندر کی ایرانی فتوحات نے فن انجینری کے متعلق یونانیوں کی قابلیت کو ترقی دے کر فرمانروایان سلسلہ بطلیموسیہ کی سرپرستی میں سائنس کے

نشوونما میں حیرت انگیز حصہ لیا۔ یہاں ہم تاریخ کے سبق کو دہرا کر یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ عربوں کے فنی کارناموں سے بھی اسی طرح کے نتائج مترتب ہوئے۔

فاتح مصر عمرو بن العاص اور یوحنا نامی نحوی کی باہمی دوستی صاف ظاہر کرتی ہے کہ عربی دماغ ترقی کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ کعبہ کی بت پرستی سے محمد صلم کی وحدانیت تک پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو ادب و انشا اور فلسفہ و حکمت کے بہارستان کی سیر کے لئے تیار پایا۔ عربوں کی اس ترقی کے اسباب پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو دو اثرات نمایاں نظر آتے ہیں یعنی ۱۔ شام میں نصرانیوں کا اثر اور ۲۔ مصر میں یہودیوں کا اثر۔

گذشتہ باب میں ہم نے ان سختیوں کا ذکر کیا ہے جو نصرانوں اور اس کے پیروؤں کو مخالفین کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑیں۔ اگرچہ ان کو طرح طرح کے عذاب دئے گئے اور ان میں سے بہت سے مارے گئے لیکن وحدت باری تعالیٰ کے اصول سے انہوں نے کبھی منہ نہ موڑا۔ اولپس کے دیوتاؤں اور دیویوں سے انہوں نے ہمیشہ نہایت سختی کے ساتھ اور قطعی طور پر اپنا کیا۔ ان کا قول ہے کہ ”آسمان کی ملکہ کو ہمارا دور ہی سے سلام ہے۔“

ان خاص مقاصد کی وجہ سے نصرانیوں کو اپنے عرب فاتحوں کے ساتھ مل جانے میں کچھ بھی دقت پیش نہ آئی۔ مسلمان ان کا حد سے زیادہ ادب و احترام کرتے تھے اور سلطنت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر انہیں نہایت فراخ دلی سے مقرر کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنی امت کو بہ تنقید تمام ہدایت کی ہے کہ ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہ کیا جائے۔ نصرانیوں کے استغف اعظم جوسپاس کے ساتھ خود آنحضرتؐ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ نے معاہدے کئے اور آگے چل کر خلیفہ ہارون الرشید نے اپنی سلطنت کے تمام مدارس کا ناظم ایک نصرانی المذہب عالم مہان ماس کو مقرر کیا۔

نصرانیوں کے اثر کے ساتھ یہودیوں کا اثر بھی شامل ہو گیا۔ جب عیسائیت میں بت پرستی کی آمیزش کے آثار شروع ہوئے تو یہودیوں نے مذہب عیسوی میں داخل ہونا ترک کر دیا۔ اور جب عیسائیت میں اقاہیم میں کا عمل ہوا تو یہ مذہب تبدیلی مطلقاً موقوف ہو گئی۔ مصر اور شام کے شہروں میں یہودی کثرت سے آباد تھے۔ ایک فقط اسکندریہ ہی میں جب عمرو بن العاص نے اسے فتح کیا ہے چالیس ہزار یہودی ایسے تھے جو حکومت کو خراج ادا کرتے تھے۔ صدیوں تک وقف مظالم و مصائب رہنے کی وجہ سے وہ اپنے عقیدہ وحدت ذات باری میں اور زیادہ راسخ ہو گئے تھے اور بت پرستی کی طرف سے اس قلبی نفرت کا اشتداد اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا جسے وہ اپنے سینہ میں بائبل کی اسیری کے زمانہ سے امانت کے

طور پر جبکہ دئے چلے آتے تھے۔ نظریوں کے ساتھ شریک ہو کر انہوں نے فلسفہ کی بہت سی یونانی و لاطینی کتابوں کا شاہی زبان میں ترجمہ کیا اور اس شاہی ترجمہ کا پھر عربی میں ترجمہ ہوا۔ ان دونوں فرقوں کو اسلامی تمدن کے ساتھ دو مختلف حیثیتوں کا تعلق رہا۔ نظریوں نے مسلمان امراء کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ لیا اور یسودی طبیب بن کر ان گھرانوں تک پہنچے۔

ان اثرات سے مسلمانوں کا تعصب کم ہو چلا۔ ان کے اخلاق پسندیدہ ہو گئے ان کے خیالات میں شکی آگئی۔ جس سرعت سے انہوں نے دولت روم کے صوبوں کو تاخت و تاراج کر ڈالا تھا اسی سرعت سے فلسفہ اور سائنس کی مملکتوں کو مسخر کر لیا اور اسلام کی عامیانہ غلطیوں کو چھوڑ کر سائنس کی حقیقتوں کو تسلیم کر لیا۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں چاروں طرف بت ہی بت بچ رہے تھے عربوں کی تگوار خدائے ذوالجلال کے توحید کی حمایت میں چمکی اور تعدد کو مٹا کر رہی۔ اس کامیابی کا سرا تقدیر کے اس مسئلہ کے سر رہا جس کی تلقین قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے: ”کوئی شخص اپنے مقدر کو ٹال نہیں سکتا۔ تقدیر کی ساعت نہ گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے۔ اگر ہم بدوج مشیدہ میں بھی محفوظ ہوں تو موت سے نہیں بچ سکتے۔ خدا نے ہر شخص کی موت کا مقام ازل سے مقرر کر رکھا ہے۔“ رسول اللہ کا قول ہے کہ ”کوئی شخص بھاگ کر اپنی تقدیر سے بچ نہیں سکتا۔ شہسواران قضا و قدر رات کے وقت اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے ہیں۔۔۔۔۔۔ خواہ تم بستر پر سوتے ہو خواہ میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہو ملک الموت کی آنکھ سے نہیں بچ سکتے۔“ حضرت علیؓ جن کی دانش و حکمت کا ذکر ہم پیش کر چکے ہیں کہتے ہیں کہ ”مجھے یقین ہے کہ معاملات انسانی میں ہمارے انتظام کو دخل نہیں بلکہ خدا کے فیصلہ کو دخل ہے۔“ غرض مسلمان وہ ہیں جو راضی برضائے الہی ہو کر خدا کے آگے گردن تسلیم جھکا دیں۔ وہ جبر و اختیار میں یہ کہہ کر توافق پیدا کرتے ہیں کہ نقاش قضا نے ہمیں خاکہ کھینچ کر دے دیا ہے اس میں رنگ آمیزی ہم اپنے اختیار اور مرضی سے کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ قوانین قدرت پر غالب آنے کے لئے ہمیں ان کا مقابلہ نہیں بلکہ موازنہ کرنا چاہئے۔

اس سبب عقیدے نے مسلمانوں کو ان کارہائے نمایاں کے لئے تیار کر دیا جو بظاہر انسانی کوشش کی رسائی سے باہر تھی لیکن جن کو عربوں نے انجام دے کر دکھا دیا۔ اسی عقیدے نے مایوسی کو مہل بہ رضا و تسلیم کر کے انسان کو امید سے مستغنی ہونا سکھا دیا۔

عروں میں ایک مثل تھی کہ مایوسی ح رہے اور امید عہد۔

لیکن جگ میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے صاف طور سے ثابت کر دیا کہ تقدیر ایک بڑی حد تک تابع تدبیر ہے۔ تجربہ سے عروں کو معلوم ہو گیا کہ دوا سے درد کم ہو سکتا ہے مرہم پٹی کرنے سے زخم بھر سکتا ہے اور جو شخص دم توڑ رہا ہو اور بظاہر اس کے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو طبیب کی سیمائی سے گویا از سر نو زندہ ہو سکتا ہے۔ اعلیٰ ہود قرآن کے مسئلہ تقدیر کی تردید کی زندہ مثال بن گئے۔ رفتہ رفتہ قسمت اور تقدیر کے مسئلہ کی سچی کم ہو گئی اور عام طور پر یہ بات تسلیم کی جانے لگی کہ انفرادی حیثیت سے انسان کے افعال کے نتائج مطابقت اختیار ہوتے ہیں اور خاص خاص حدود کے اندر جو افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں ان کی ذمہ دار خود اسی کا ارادہ یا مرضی ہوتی ہے۔ لیکن اقوام چونکہ ذاتی یا شخصی طور پر خدا کے آگے اپنے افعال کی جواب دہ نہیں ٹھہر سکتیں بلکہ ان کی اجتماعی حیثیت خدا کے بلا واسطہ احتساب سے بالا ہے لہذا وہ قدرت کے غیر تغیر پذیر قانون کے تابع ہیں۔

اس بارہ خاص میں مسیحی اور مسلم اقوام میں بین فرق تھا۔ مسیحی کو محاطات انسانی میں خدا کی مسلسل دست اندازی پر پورا ایمان تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ انتقام کائنات میں قائم قانون کوئی چیز نہیں۔ دعاؤں اور التجاؤں سے انسان خدا کو صورت محاطات کے بدلنے پر آمادہ کر سکتا ہے اور اگر خدا کی بارگاہ میں اس کی دعا مقبول نہ ہو تو پھر مسیح یا مریم کی توجہ اس کی مطلب بر آئی کے لئے کافی ہے اور اگر یہاں سے بھی وہ محروم رہا تو پھر بزرگان دین کی شفاعت یا ان کے حرکات اور ہڈیوں کا اثر حیثیت ایزدی کا رد عمل کر سکتا ہے۔ اگر خود اس کی منت و ساجت یا معجز و الحاج سے کام نہ چلے تو حلقہ کے پادری یا کلیسا کے دوسرے مقدس پیشواؤں کی سفارش خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس کی طرف سے کوئی چڑھاوا چڑھایا گیا ہو یا بندھی رقم بطور نذرانہ پیش کی گئی ہو اس کی حاجت روائی کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ غرض مسیحی دنیا کو یقین تھا کہ فوق الانسان ہستیوں پر اثر ڈال کر وہ محاطات دنیوی کے دہارے کو جس رخ میں چاہے بدل سکتی ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کا دامن دار اس اصول پر تھا کہ خدائی حیثیت قابل تغیر نہیں ہے انسان کو لازم ہے کہ اس کے آگے تسلیم و رضا کا سر جھکا دے۔ عیسائی کی دعا آلہ جلب منفعت ہوتی تھی جس کے ذریعہ سے وہ بعد معجز و الحاج خدا سے اپنی مرادیں مانگتا تھا اور مسلمان کی دعا ان نعمتوں کا امتنان آمیز شکر یہ ہوتی تھی جن سے وہ قانز و برہ اندوز ہو چکا تھا۔ دونوں نے گویا دعا کو ہندوؤں

کے گیان اور دھیان کا قائم مقام قرار دے رکھا تھا۔ عیسائی کی نظروں میں ترقی دنیا غیر مربوط حادثوں اور ناگہانی حیرتوں کا ایک سلسلہ تھی۔ مسلمان کے نزدیک اس ترقی میں کچھ اور ہی عالم نظر آتا تھا۔ وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ ہر جسمانی حرکت کسی حرکت سابقہ سے وابستہ ہے۔ ہر خیال کسی خیال سابق کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ہر تاریخی واقعہ کسی گزشتہ تاریخی واقعہ سے ماخوذ ہے۔ ہر انسانی فعل کسی گزشتہ ہوئے اور انجام پائے ہوئے فعل کا نتیجہ ہے۔ بنی نوع انسان کی تاریخ میں جو قرنا قران پر محیط ہے آج تک ایک بھی واقعہ ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جو یکایک ظہور میں آگیا ہو۔ علت و معلول اور سبب و مسبب کے سلسلہ کی ہر کڑی دوسری کڑی سے اس ترتیب و تدریج کے ساتھ ملی ہوئی ہے کہ کہیں فضل نظر نہیں آتا۔ مقدر ایک آہنی زنجیر ہے جس کے حلقے واقعات ہیں۔ ہر حلقہ اسی جگہ نصب ہے جہاں حد و تضاد و قدر نے اسے قائم کر دیا تھا۔ ایک حلقہ بھی اپنی جگہ سے آج تک نہ ہلا ہے اور نہ علیحدہ کیا گیا ہے۔ جب انسان عالم میں آتا ہے تو اسے اس کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ جب وہ یہاں سے رخصت ہو گا تو شاید اپنی مرضی کے خلاف رخصت ہو گا۔ پس کیا وجہ ہے کہ وہ جامہ تسلیم و رضا پہن کر نہایت ٹھنڈے دل سے اپنی قسمت کے فیصلہ کا انتظار نہ کرے۔

انسان کی محض زندگی کے تابع مقدر ہونے کے متعلق جب خیالات میں یہ تبدیلی پیدا ہوئے تو دنیا کی ہیئت ترکیبی کے بارہ میں بھی خیالات نے پلٹا کھلایا۔ قرآن کی رو سے زمین ایک سطح مربع ہے جس کے کناروں پر بڑے بڑے پہاڑ واقع ہیں اور ان پہاڑوں کا یہ دھرا فائدہ ہے کہ ایک تو ان کی وجہ سے زمین اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور دوسرے آسمان ان پر ٹکا ہوا ہے۔ اس وسیع بلوریں گنبد کو جو بغیر کسی فتور یا صدمہ کے اپنی جگہ قائم ہے دیکھ کر ہمیں خدا کی طاقت و حکمت کے لحاظ سے اس کی حمد و ثناء کرنی چاہئے۔ آسمان کے اوپر برشت کی بنیاد ہے جس کی سات منزلیں ہیں۔ سب سے اونچی منزل خدا کا مسکن ہے جہاں وہ دیوبکر انسان کی شکل میں ایک تخت پر بیٹھا ہے اور اس تخت کے دونوں طرف اسی طرح کی ذوالجناح بتل ہیں جیسے قدیم سریانی بادشاہوں کے محل میں ہوتے تھے۔

یہ خیالات کچھ اسلام ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ ہر قوم نے اپنے دفاعی نشوونما کے ایک خاص درجہ پر پہنچ کر انہیں وحی آسمانی سمجھا ہے۔ لیکن جو مسلمان زیادہ ترقی یافتہ تھے انہوں نے ان کے بجائے وہ خیالات قائم کر لئے جو از روئے سائنس درست و صحیح تھے۔ پھر بھی عیسائی ممالک کی طرح اسلامی ملکوں میں بھی حامیان مذہب کی مخالفت کے بغیر یہ ترقی نہ ہو سکی۔ مثلاً جب المامون کو زمین کا کردی شکل ہونا معلوم ہوا اور اس نے اپنے

مندسوں اور بیت دانوں کو ایک درجہ ارضی کی پائنش کا حکم یا تو علامہ تقی الدین نے جو اس زمانہ کے مشاہیر علمائے دین میں تھے خلیفہ کے اس فعل کو بدعت قرار دے کر ظاہر کیا کہ مسلمانوں کو ایک جموں اور مشرکانہ فلسفہ کی اشاعت سے گمراہ کرنے کی پاداش میں خدا یقیناً المامون پر عذاب نازل کرے گا۔ لیکن المامون نے اس فتوے کی کچھ پروا نہ کی اور اپنے حکم کی تعمیل کرا ہی کر رہا۔ بحیرہ قلزم کے ساحل پر شکار کا میدان اس پائنش کے لئے تجویز کیا گیا۔ ایک اضطراب کی مدد سے دو مقامات پر جو ایک ہی خط نصف النہار پر واقع تھے اور جن کا باہمی فاصلہ پورا ایک درجہ تھا افق سے قطب کے ارتفاع کا اندازہ قائم کیا گیا۔ ان دونوں مقامات کے درمیانی فاصلہ کی جب پائنش کی گئی تو معلوم ہوا کہ دو لاکھ ہاشمی گز ہے۔ اس حساب سے گویا کل زمین کا دور چوبیس ہزار انگریزی میل ہوا جو صحت سے بہت زیادہ دور نہیں۔ چونکہ زمین کی کرویہ اس قسم کی ایک ہی پائنش سے قطعی طور پر مستبعد نہ ہو سکتی تھی لہذا خلیفہ نے حکم دیا کہ ایک درجہ کی پائنش کوفہ کے قریب کی جائے۔ شاہی مندس دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے اور ایک نقطہ سے مختلف سمتوں میں روانہ ہو کر ایک جماعت نے بجانب شمال اور دوسری نے بجانب جنوب ایک درجہ ارضی کے قوس کی پائنش کی۔ اس پائنش کا نتیجہ گزوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اگر یہ گز وہی ہیں جو ہاشمی یا شاہی گز کے نام سے مشہور ہیں تو ایک درجہ کے طول کی صحیح مقدار میں اور اس مقدار میں جو انہیں معلوم ہوئی صرف سہرا میل کا فرق ہے۔ ان پائنشوں سے خلیفہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین کا کروی شکل ہونا مسلم ہے۔

ہمیں رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ عربوں کا وحیانشہ تعصب کیوں کر اس قدر جلد تحصیل علوم و فنون کی زبردست خواہش کی شکل میں بدل گیا۔ اول اول قرآن ادب و انشا اور حکمت و فلسفہ کا مزاج تھا۔ آنحضرتؐ نے اسے تمام تصانیف کا گل سرسبد ظاہر کر کے اس کی بھی خلل فصاحت و بلاغت کو اپنی مامور من الہی کے ثبوت میں پیش کیا تھا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد بیس سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ گزرا تھا کہ وہ تجربہ جو مسلمانوں کو شام ایران ایشیائے کوچک اور مصر میں حاصل ہوا اپنا رنگ لایا اور یہ واقعہ مسلم ہے کہ حضرت علیؑ نے جو اس وقت سریر آرائے خلافت تھے ہر طرح کے علمی مشاغل کا لوگوں کو خود شوق دلایا۔ امیر معاویہ نے جو بانی خاندان بنو امیہ ہیں ۶۳۸ء میں برسر اقتدار ہوتے ہی آئین حکومت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ پہلے حکومت انتظامی تھی اب موروثی ہو گئی۔ انہوں نے مدینہ کے بجائے دمشق کو جس کا موقع زیادہ مرکزی تھا دار الخلافہ بنایا اور عیش و عشرت اور

شان و شوکت کی زندگی اختیار کی۔ انہوں نے استناد قصب کے سلاسل کو کھڑے کھڑے کر دیا اور علوم و فنون کی سرپرستی شروع کی۔ یہ حیرت انگیز انقلاب تیس سال کے اندر اندر پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں ایک ایرانی گورنر جب دربار خلافت میں آداب بجالانے کو حاضر ہوا تو اس نے امیر المومنین کو مسجد نبویؐ کی بیڑیوں پر فقیروں کے ساتھ سوئے ہوئے پایا لیکن چھٹے خلیفہ امیر معاویہ کے دربار میں دول فیر کے جو سفیر باریاب ہوئے وہ خلیفہ کے روبرو ایک عالیشان محل میں پیش کئے گئے جو نقش و نگار سے مزین اور بہنوں اور فواروں سے آراستہ تھا۔

آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد پوری ایک صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ مشاہیر حکمائے یونان کی تصانیف کا ترجمہ عربی زبان میں ہو گیا اور ”ایڈ“ اور ”آکسی“ جیسی قلموں کو جو بوجہ اپنی بت پرستانہ تسمیحات کے موجب گمراہی تصور کی جاتی تھیں علم دوست اور ہنر پرور لوگوں کے شوق نے شامی زبان کا لباس پہنا دیا۔ المنصور نے اپنے عہد خلافت ۷۷۵ء-۷۷۳ء میں حکومت کا مرکز دمشق سے بغداد میں منتقل کیا اور نئے درالحکامہ کو عروس البلاد بنا دیا۔ اس کا بہت سا وقت علم ہیئت کے مطالعہ اور اس فن شریف کے ترقی دینے میں صرف ہوتا تھا اس کے علاوہ اس نے سلطنت میں جامعہ طب اور قانون کے مدارس قائم کئے۔ اس کا پوتا ہارون الرشید ۷۸۶ء میں بھی اسی کے نقش قدم پر چلا چنانچہ اس کے حکم سے دولت عباسیہ کی ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ لیکن علم و حکمت کا سب سے زیادہ روشن زمانہ جو ایشیا کے لئے سرمایہ مد افکار و تازش ہے المامون کا عہد خلافت ہے ۸۳۲ء-۸۳۳ء اس نے بغداد کو سائنس کا مرکز بنا دیا۔ عظیم الشان کتب خانے قائم کئے اور اپنے دربار کو علا و فضلا کی مجلس بنا دیا۔

یہ اعلیٰ درجہ کا علمی مذاق اس وقت تک بھی بدستور قائم رہا جب کہ اندرونی تنازعات و فسادات کی وجہ سے عربی سلطنت تین جداگانہ حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ بنی عباس ایشیا میں بنی فاطمہ مصر میں اور بنی امیہ اندلس میں ایک دوسرے کے سیاسی رقیب تو تھے ہی لیکن علم و حکمت اور ادب و انشا کی سرپرستی میں بھی ہر ایک کی یچی کوشش تھی کہ دوسروں پر فوق لے جائے۔

شعرو سخن میں عربوں نے ہر دلچسپ و نتیجہ خیز مضمون پر کتابیں لکھیں۔ ان کو اس امر پر ناز تھا کہ ایک اکیلے عرب نے جس قدر شاعر پیدا کئے ہیں وہ تعداد میں دنیا بھر کے شاعروں سے زیادہ ہیں۔ سائنس میں ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اکتساب

میں انہوں نے یورپ کے یونانیوں کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ اسکندریہ کے یونانیوں کی روش کا اتباع کیا۔ ان کی عقل سلیم نے انہیں یہ بات سمجھا دی تھی کہ سائنس کی ترقی محض محفلِ محفل سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس ترقی کا صحیح اور یقین ذریعہ صحیفہ فطرت کا معنی مطالعہ ہے۔ وہ حکمت نظری پر حکمت عملی کو ترجیح دیتے تھے یعنی ان کے علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر تھی۔ فنِ ہندسہ و ریاضیات کو وہ استدلال و استنباط کے آلات تصور کرتے تھے۔ فنِ جبرِ مثل۔ توازنِ ایجات۔ نئے مناظر و مرایا پر جو کثیر التعداد کتابیں انہوں نے لکھی ہیں ان میں یہ دلچسپ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ہر مسئلہ کسی تجربہ یا کسی آلہ مشاہدہ کے ذریعہ سے حل کیا گیا ہے۔ یہی خصوصیت تھی جس نے ان کو فنِ کیمیا کا موجد بنا دیا جس نے ان سے تقطیر (عرق کھینچنے) تقعید (بخار اڑا کر منجمد کرنے) تسبیح (پکھلانے) اور ترویق (چھاننے) کے آلات ایجاد کرائے۔ جس نے فنِ ہیئت میں ان کو آلات منقسمہ مثلاً "بند و اصطرباب سے کام لینے کی ترغیب دلائی۔ جس نے فنِ کیمیا میں ان سے ترازو کا استعمال کرایا جس کے اصول سے وہ بخوبی واقف تھے۔ جس نے ان سے بغداد اندلس اور سمرقند میں اجسام کے اوزان کی میزائیں اور ہیئت کے نقشے تیار کرائے۔ جس نے ان کو علمِ ہندسہ۔ علمِ مثلث۔ علمِ جبر و مقابلہ اور ہندی طریقہ اعداد نویسی میں نئے نئے ہتھ پدا کرنے کے قابل بنایا۔ یہ وہ نتائج ہیں جو ارسطو کے عملی و استقرائی طریقہ کو اللاطون کی خیال آرائی پر ترجیح دینے کی بدولت ان کی کوششوں نے پیدا کئے۔

کتب خانجات عامہ کے قیام و توسیع کے لئے کتابوں کے جمع کرنے میں نہایت اہتمام کیا جاتا تھا۔ خلیفہ مامون عباسی کی نسبت روایت ہے کہ اس کی کوششوں سے صد ہا اونٹ جو قلمی کتابوں کے پتاروں سے لدے ہوئے تھے بغداد میں داخل ہوئے۔ جو معاہدہ اس نے یونانی فرمانروا میکال ثالث کے ساتھ کیا تھا اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ قسطنطنیہ کا ایک کتب خانہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔ جو علمی خزانے اس طرح المامون کے ہاتھ آئے ان میں بطلمیوس کی اس مشہور تصنیف کا ایک نسخہ بھی تھا جو اس نے سیار و ثوابت کی مہندسانہ ساخت پر لکھی تھی۔ اس کا ترجمہ خلیفہ کے حکم سے فوراً عربی زبان میں کیا گیا اور ترجمہ کا نام الجملی رکھا گیا۔ جو کتابیں اس طور پر جمع ہو گئیں۔ ان کی کثرت تعداد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاہرہ کے کتب خانہ قاطیہ میں ایک لاکھ نسخے جن کا خط نہایت پاکیزہ اور جلدیں نہایت خوشنما تھیں موجود تھے۔ ان میں سے چھ ہزار پانچ سو نسخے فقط ہیئت اور طب پر تھے۔ اس کتب خانہ کے قواعد کے بموجب ان طالب العلموں کو جو قاہرہ

میں سکونت پذیر تھے کتابیں مستعار مل سکتی تھیں۔ کتب خانہ میں زمین کے دو کمرے بھی تھے۔ ایک تو ٹھوس چاندی کا تھا۔ دوسرا پتیل کا تھا۔ پتیل کے کمرے کی نسبت مشہور تھا کہ اسے بظلمت نے بنایا تھا۔ چاندی کے کمرے پر تین ہزار دینار لاگت آئی تھی۔ خلفائے اندلس کے عظیم الشان کتب خانہ کے نسخوں کی تعداد رفتہ رفتہ چھ لاکھ ہو گئی۔ اس کی فرست ہی چوالیس کتابوں پر مشتمل تھی۔ اس شاہی کتب خانہ خاص کے علاوہ اندلس میں ستر سرکاری کتب خانے ایسے تھے جن میں ہر شخص جا کر اپنی معلومات پڑھا سکتا تھا۔ خاص خاص اشخاص کے پاس بعض دفعہ کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہوتا تھا۔ ایک طبیب کی نسبت روایت مشہور ہے کہ جب سلطان بخارا نے اسے بلا بھیجا تو اس نے وہاں جانے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اس کی کتابوں کی باربرداری کے لئے چار سو اونٹوں کی ضرورت تھی۔

ہر بڑے کتب خانہ میں ایک سررشتہ نقل اور ترجمہ کا ہوتا تھا۔ تراجم بھی بجا اوقات بعض اشخاص اپنے ذاتی اہتمام سے مرتب کراتے تھے۔ چنانچہ ایک نسوری طبیب حنین نامی نے اس قسم کا ایک دفتر بغداد میں قائم کر رکھا تھا ۸۵۰ء۔ یہ شخص ارسطو الفلاطون بقراط جالینوس اور دوسرے مشاہیر یونان کی تصانیف کے تراجم شائع کرتا تھا۔ تراجم کے علاوہ جدید تصانیف کا بازار بھی ہر طرف گرم تھا۔ تصنیف کا طریقہ یہ تھا کہ دارالعلوم کے حکام اساتذہ کو مقررہ موضوع پر کتابیں لکھنے کے لئے مامور کرتے تھے۔ ہر خلیفہ کے دربار کا وقایع نویس علیحدہ ہوتا تھا۔ قصص و حکایات کے متعلق الف لیله جیسی کتابوں کا وجود عربوں کی قوت تخیل کا پتہ دیتا ہے۔ قصوں اور افسانوں کے علاوہ انواع و اقسام کے دوسرے مضامین پر بھی کتابیں تصنیف کی جاتی تھیں مثلاً "تاریخ"۔ اصول فقہ۔ سیاست۔ فلسفہ و سیر۔ سوانح عمریان نہ صرف جلیل القدر اشخاص بلکہ مشہور گھوڑوں اور اونٹوں تک کی لکھی جاتی تھیں۔ کتابوں کی اشاعت میں کسی قسم کی مزاحمت یا ممانعت من جانب حکومت نہ ہوتی تھی اور نہ ان کے مضامین میں مصلحت عامہ کے بہانے سے کسی قسم کی حک و اصلاح کی جاتی تھی۔ البتہ اخیر اخیر میں دینیات کی کتابوں کی اشاعت کے لئے مصنفوں کو سرکاری اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ واقفیت عامہ کے متعلق علمی حوالجات کی کتابیں کثرت سے لکھی گئیں۔ جغرافیہ۔ شمار و اعداد۔ طب۔ تاریخ غرض ہر مضمون کی ایک جامع لغات موجود ہو گئی یہاں تک کہ ان کے لمحات بھی تیار کر لئے گئے۔ چنانچہ محمد ابو عبد اللہ کی تصنیف "دائرة المعارف" اس صنعت کی ایک ممتاز مثال ہے۔ کتابوں میں جو کاغذ لگایا جاتا تھا اس کی صفائی اور سفیدی کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا۔ رنگ رنگ روشنیوں کی تیاری

میں بہت کچھ اہتمام کیا جاتا تھا اور کتابوں کے عنوان کو ملا و مذہب کرنے اور ان کو طرح طرح کے نقش و نگار سے زینت دینے میں نہایت دیدہ ریزی و ہنر آفرینی اور کمال خوش سلیکی کا ثبوت دیا جاتا تھا۔

غرض دنیائے اسلام میں علوم و فنون کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ منگولیا۔ سہار۔ ایران۔ عراق۔ شام۔ مصر۔ شمالی افریقہ۔ مراکش۔ فیض اور اندلس میں کثرت سے مدرسے اور درسگاہیں موجود تھیں۔ دولتِ روم کا رقبہ با آن ہمہ عظمت و جہوت اتنا نہ تھا جتنا اس عربی سلطنت کا۔ اس عظیم الشان سلطنت کے ایک کنارہ پر تو سمرقند کا مشہور مدرسہ اور رصدگاہ تھی اور دوسرے کنارے پر اندلس کا شہر آفاق ہنارہ تر صد آسمان سے ہم کلام تھا۔ مسلمانوں کی اس سرپرستی علوم و فنون کا ذکر کرتے ہوئے گبن لگتا ہے: ”مسکویوں کے خود مختار امیر بھی علم و ہنر کی سرپرستی میں شاہانہ اقتدارات برتتے تھے اور ان کی رقیبانہ مسابقت نے مذاق علمی کی ترویج میں غیر معمولی حصہ لے کر سائنس کے نور کو سمرقند و بخارا سے لے کر فیض اور قرطبہ تک پھیلا دیا۔ ایک سلطان کے وزیر نے ایک دفعہ ایک لاکھ اشرفیاں اس غرض سے وقف کر دیں کہ اس سرمایہ سے بغداد میں ایک کالج قائم کیا جائے اور اس کالج کے مصارف کے لئے پندرہ ہزار دینار سالانہ کا دواوی عطیہ مقرر کر دیا۔ تعلیم کے فیضان سے عوام و خواص کو یکساں بہرہ اندوز ہونے کا موقع دیا جاتا تھا۔ وزیر کا بیٹا اور ایک ادنیٰ درجہ کے موچی کا بیٹا پہلو بہ پہلو بیٹھ کر استاد سے سبق لیتے تھے۔ طالب العلموں کی تعداد ایک ایک دارالعلم میں چھ چھ ہزار تک پہنچی ہوئی تھی۔ جن کی جماعتوں کو باوقات مختلف تعلیم دی جاتی تھی۔ نادر طلبہ کے لئے معقول و خالیف مقرر تھے اور اساتذہ کو پیش قرار تمغواہیں ملتی تھیں۔ ہر شہر میں عربی زبان کی نادر تصنیفات کے نقل اور جمع کرنے کے لئے طالبان علم کا شوق اور اہل دول کا نمود ہر وقت سرگرمی سے مصروف تھا۔“ ان مدارس و مکاتب کی عمرانی فراخ حوصلگی کے اقتضا سے بعض دفعہ نسطوریوں اور بعض دفعہ یہودیوں کے سپرد کی جاتی تھی۔ کسی شخص کو کسی خدمت جلیلہ پر سرفراز کرتے وقت حکومت کو یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ وہ کس قوم سے تعلق رکھتا ہے یا اس کے مذہبی عقائد کیا ہیں بلکہ محض اس کی علمی قابلیت کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ ”حمد النلس من ینفع النلس“ کے اصول کو پیش نظر رکھ کر خلیفہ اعظم المامون نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ”اہل علم و فضل خدا کے برگزیدہ اور بہترین بندے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اپنے قوائے عقلی و اداری کی ترقی کے لئے وقف رکھی ہے۔ وہ اپنے ایمانے جنس کو حکمت و دانش کے نکتے سکھاتے ہیں اس لئے وہ

نظام دنیا کے شیرازہ بند اور محفل کون و فساد کی شمع ہیں۔ اگر ان کی ہدایت چراغ راہ نہ ہو تو اہل دنیا پر اسی جہالت اور وحشیانہ پن کی ظلمت پھر چھا جائے جو پہلے چھائی ہوئی تھی۔“
 مدرسہ یہ قاہرہ کے طرز عمل کی تقلید نے دوسرے طبی مدارس میں بھی یہ قاعدہ جاری کرا دیا کہ زمانہ تعلیم کے اختتام پر طلبہ کا نہایت سختی کے ساتھ امتحان لیا جائے۔ اور کامیاب ہونے پر انہیں مطلب کرنے کی سند دی جائے۔ یورپ کا پہلا طبی مدرسہ وہ تھا جسے عربوں نے اٹلی کے شہر سلونو میں قائم کیا اور پہلی رصدگاہ جو یورپ کو نصیب ہوئی وہ تھی جو اموی خلفا کی سرپرستی میں بمقام اشیلیہ (اسپین) قائم ہوئی۔

اگر ہم اس مہتمم بالشان علمی تحریک کی جزئیات سے بحث کریں تو اس کتاب کا حجم حد سے زیادہ بڑھ جائے گا۔ لہذا ہم صرف اس اجمال پر اکتفا کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے قدیم علوم و فنون میں بہت کچھ اضافے کئے اور نئے نئے علوم ایجاد کئے۔ انہوں نے حساب کے ہندی طریقہ کو رواج دیا جس میں تمام رقوم نہایت خوبصورتی کے ساتھ دس اعداد کے ذریعہ سے اس طرح ظاہر کی جاتی ہیں کہ ہر عدد کی اول تو ایک قیمت مطلق مقرر کر دی گئی ہے اور اس کے بعد ایک قیمت اعتبار ہے جو بلحاظ موقع یا مرتبہ پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ہر طرح کے اندازے کے لئے سہل اور سادہ قاعدے بنا دئے گئے ہیں۔ جبر و مقابلہ یا بالفاظ دیگر ہمہ گیر ریاضی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے مقادیر غیر معینہ کی تحسین یعنی ان تعلقات کی دریافت ہو سکتی ہے جو ہر قسم کی مقادیر کے درمیان قائم ہوں خواہ ان مقادیر کا تعلق علم حساب سے ہو خواہ علم ہندسہ سے۔ اس طریقہ کا موبوم سا خیال ڈیوینٹس کو پیدا ہوا تھا جسے عربوں نے ترقی دے کر اس حد کمال تک پہنچایا۔ جبر و مقابلہ میں محمد بن موسیٰ نے مساوات درجہ چہارم اور عمر بن ابراہیم نے مساوات درجہ سوم کے حل کرنے کا عمل دریافت کیا۔ عربوں ہی کی مساعی سے علم مثلث نے موجودہ شکل اختیار کی۔ انہوں نے اوتاد کے بجائے جس کا اول استعمال ہوتا جب مستوی کو اس فن میں داخل کیا۔ اور اسے ترقی دے کر ایک مستقل فن کی حیثیت عطا کی۔ موسیٰ نے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں علم مثلث کو ہی پر ایک رسالہ لکھا اور ابفدادی کا ایک رسالہ مساحت پر موجود ہے جس میں اس فن کے متعلق یہاں تک داد نکلتے سخی دی گئی ہے کہ بعض لوگ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اس موضوع پر اقلیدس کا جو مقالہ گم ہو گیا تھا ابفدادی کا رسالہ اسی کی نقل ہے۔

علم ہیئت میں انہوں نے نہ صرف ستاروں کی فہرستیں تیار کیں بلکہ اس حصہ آسمان کے نقشے بھی تیار کئے جو ان کے پیش نظر تھا۔ بڑے بڑے ستاروں کے انہوں نے عربی نام

بھی رکھے اور آج کے دن تک یہ ستارے انہیں ناموں سے مشہور ہیں۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے انہوں نے سطح زمین کے ایک درجہ کی پائش کر کے اس کی جسامت دریافت کی۔ طریق الشمس کا اوجاج معلوم کیا۔ آفتاب و ماہتاب کی صحیح میزانیں شائع کیں۔ سال کی مدت مقرر کی۔ استقبال اعتدالین کی توثیق و تصدیق کی لیبلس نے ایتانی کے ”رسالہ علم کواکب“ کا ذکر ادب و احرام کے ساتھ کیا ہے اور حاکم بامر اللہ خلیفہ مصر ۱۱۰۰ھ کے دربار کے مشہور ہیئت دان ابن یونس کی ایک عالمانہ تعنیف کے بعض بچے بجائے اجزا کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں المنصور عباسی کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک کے مختلف مشاہدات فلکی مثلاً ”کسوف و خسوف۔ نقاط اعتدال لیل و نہار۔ نقاط انقلاب صیفی و مشوی۔ قران سیارگان و احتجاب کواکب کے نتائج مندرج ہیں۔ ان رصدی نتائج نے نظام عالم کے بڑے بڑے تغیرات پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ہیئت دانان عرب نے آلات ہیئت کی ترکیب و تکمیل پر بہت سا وقت صرف کیا۔ وقت کا اندازہ لگانے کے لئے مختلف قسم کی پانی اور دھوپ کی گھڑیاں ایجاد کیں اور سب سے پہلے اس مقصد کی تکمیل کے لئے ”پنڈلم“ یعنی رقاص ساعت انہیں نے ایجاد کیا۔

عملی علوم میں جن کا دارومدار تجربہ پر ہے علم کیمیا کی ایجاد کا سرا انہیں کے سر ہے۔ انہوں نے اس فن کے بعض نہایت ہی اہم معیار دریافت کئے مثلاً ”گندھک کا حیزاب۔ شوربے کا حیزاب اور الکحل۔ اس فن سے انہوں مطب میں بھی کام لیا اور سب سے اول ادویات مفردہ و مرکبہ کی قراہ و زمین شائع کیں اور ان میں معدنی نسخہ جات بھی شامل کیے۔ علم جبر ثقل میں انہوں نے گرتے ہوئے اجسام کے قوانین دریافت کئے۔ قوت کشش ثقل کی ماہیت سے بھی وہ نااہل نہ تھے۔ جبر ثقل کی قوتوں کے مسئلہ کا انہیں اچھی طرح علم تھا۔ علم توازن ماعت میں جو ترقی انہوں نے کی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اجسام کے اوزان مخصوص کی میزانیں مرتب کر کے پانی میں اجسام کے ڈوبنے اور تیرنے کے مالہ و ماعلیہ پر انہوں نے مبسوط بحثیں لکھیں۔ فن مناظر و مریا میں انہوں نے یونانیوں کی اس غلط فہمی کو درست کیا کہ شعاع نور آنکھ سے نکل کر شی مرئی پر پڑتی ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے اس مسئلہ کو رواج دیا کہ شعاع شے سے چل کر آنکھ میں داخل ہوتی ہے۔ واقعہ انعکاس و انعطاف ضیا کی ماہیت کا انہیں پورا علم تھا۔ ابن حزم سے یہ مشہور تحقیقات منسوب ہے کہ شعاع نور کہہ ہوا کو بہ شکل قوس قزح قطع کرتی ہے اور اس سے اس نے یہ ثابت کیا کہ ہم آفتاب و ماہتاب کو قبل طلوع و غروب دیکھتے ہیں۔

اس علمی مستعدی کا اثر اس ترقی میں صاف نظر آتا ہے جو صنعت و حرفت کے متعدد فنون میں جلد جلد ہونی شروع ہوئی۔ فنِ فلاحت میں آپاشی کے طریقے پہلے سے بہتر ہو گئے۔ کھاد کا استعمال ہنر اور سلیقہ کے ساتھ کیا جانے لگا۔ چوپایوں کی افزائش نسل کے متعلق قیمتی نکتے معلوم ہو گئے۔ دسی قوانین کا ضابطہ کاشتکاروں اور مزارعین کے حقوق کے لحاظ سے بہت زیادہ کامل و مکمل ہو گیا۔ جن کھیتوں میں پہلے دہان کی کاشت نہ ہوتی تھی وہاں اب اس کی لہلہائی فصلیں نظر آنے لگیں۔ جہاں ایکہ اور قوہ کا نام و نشان نہ تھا وہاں اب ان کی پیداوار بھی ہونے لگی۔ سلطنت میں جا بجا ریشم روئی اور ان کے کپڑوں کے کارخانے قائم ہو گئے۔ قریبہ اور مراکو میں چرم سازی و کافذ سازی کا کام شروع ہو گیا۔ معدنوں پر کام ہونے لگا۔ مختلف دھاتیں دھلنے لگیں۔ ٹائلڈو میں ایسے ایسے فولادی مخمر اور تلواریں تیار ہونے لگیں کہ ایک دنیا ان کا لوہا مان گئی۔

شاعری اور موسیقی پر عرب فریفتہ تھے۔ ان کا جو وقت فکر معاش سے بچتا تھا ان فنونِ لطیفہ کی نذر ہوتا تھا۔ طہریج کا کھیل یورپ نے عربوں سے سیکھا اور قصص و حکایات اور خیالی مضامین کا شوق بھی جو اہل یورپ میں اس قدر پایا جاتا ہے عربوں ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ فنِ ادب کی ان شاخوں میں جو محض تفریح اور دلہنگی ہی کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ شانِ ثبات و متانت لئے ہوئے ہیں ان کی فکر سلیم واد نکتہ آفرینی دیتی تھی۔ دنیا کی ناپائنداری۔ لامذہبی کے نتائج۔ قسمت کی گردش۔ عالم کی ابتدا۔ اس کی میناد اور اس کا خاتمہ وہ مضامین ہیں جن پر انہوں نے لطیف اور نتیجہ خیز کتابیں لکھی ہیں۔ بعض دفعہ ہمیں تعجب ہوتا ہے جب ہماری نگاہ ایسے خیالات پر جا پڑتی ہے جن کی نسبت ادراہ تقاخر ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان خیالات کے موجد ہونے کا شرف ہمیں کو حاصل ہے۔ مثلاً ”ایک مسئلہ ارتقائی کو لپچے جسے ہم اکتشاف جدید سمجھتے ہیں۔ اس مسئلہ کی تعلیم ان کے مدارس میں دی جاتی تھی۔ اور ہم تو خیر پھر بھی اس کے محدود معنی لیتے ہیں۔ وہ ہم سے بھی ایک قدم آگے بڑھے ہوئے تھے اور غیر عضوی اجسام یعنی جمادات تک کو اس کے جزِ عمل میں داخل سمجھتے تھے۔ رساین یعنی کیمیا سازی کا اصلی راز قزواتی اجسام کے ارتقائے فطری میں مرکوز تھا۔ الخواصی جس نے بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا ہے لکھتا ہے: ”جب عوام الناس فلاسفہ طبعین کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ سونا ایک جسم ہے جو درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے تو انہیں کامل یقین ہو جاتا ہے کہ سونا ایک ایسی چیز ہے جو اور دھاتوں کی شکل یکے بعد دیگرے اختیار کرتا ہوا ایک زمانہ دراز کے بعد اس حالت کمال کو پہنچا ہے یعنی ابتدا میں یہ

سید تھا پھر رانگ ہو گیا اس کے بعد پتیل ہوا پھر چاندی ہوا اور چاندی سے ترقی کر کے سونا بن گیا۔ ان جملہ کو یہ معلوم نہیں کہ فلاسفہ طبعیہ کا یہ قول کہ سونا ایک ترقی یافتہ جسم ہے قریب قریب ان کے اس قول کے ہم معنی ہے کہ انسان اپنی فطرت اور ترکیب جسمانی کے لحاظ سے قدرت کی قوتوں کے اعتدال کا مرکز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ان کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آدمی پہلے تیل تھا۔ یہ گدھے کی شکل میں تبدیل ہوا۔ پھر گھوڑا بن گیا اس کے بعد بندر کے قالب میں ظاہر ہوا اور سب سے آخر میں انسان بن گیا۔“

پانچواں باب

نزاع مذہب و سائنس دربارہ ماہیت روح مسئلہ انفصال و انجذاب

روح کی ماہیت کے متعلق قدیم اہل یورپ کے خیالات۔ یعنی روح جسم کے مشابہ ہے۔

اہل مشرق کے فلسفیانہ خیالات۔ ہندو مذہب اور بدھ مذہب مسئلہ انفصال و انجذاب کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی مذہب ارسطو کا بھی ہے جس کی تقلید پیروان فلسفہ اسکندریہ اور بعد میں یسودی اور عرب کرتے ہیں۔ یہی مسئلہ اریحینا کی تصانیف میں بھی پایا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا تعلق مسئلہ بقا و تناسب قوت کے ساتھ جسم اور روح کے آغاز و انجام کی باہمی مماثلت۔ روح انسانی کا قیاس روح حیوانی پر۔

فلسفہ ابن رشد جو انیس واقعات پر مبنی ہے اسپین اور سسلی ہوتا ہوا مسیحی دنیا میں پہنچتا ہے۔

فلسفہ ابن رشد کے استیصال کی تاریک اسلام کا اس سے اہا کرنا۔ یہودیوں کے مذہبی طبقہ کی مخالفت۔ پاپائے روم کا اس فلسفہ کے منہ دینے پر کرباندہنا۔ ”انکوینیشن“ (حکمہ احتساب مذہبی) کا اسپین میں قائم ہونا۔ اس حکمہ کے وحشیانہ مظالم اور ان کے نتائج۔ یہودیوں اور عربوں کا اخراج۔ یورپ میں فلسفہ ابن رشد کی پائمانی۔ ”وینیکن کونسل“ کا فیصلہ۔

بت پرست یونانیوں اور رومیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کی روح اس کی جسمانی صورت کے مشابہ ہے۔ جسم بڑھتا ہے تو یہ بھی اس کے ساتھ بڑھ جاتی ہے اور گھٹتا ہے تو گھٹ جاتی ہے۔ غرض تغیرات جسمانی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان مشاہیر عصر کو جنہیں مرنے کے بعد ہیڈیز کے طبقہ سافل میں داخل ہونے کی کارپردازان دینائے تختانی کی طرف سے اجازت ملتی تھی اپنے پرانے رفیقوں کے پچانے میں کوئی دقت نہ پیش آتی تھی۔ نہ صرف ان باشندگان عالم عقبی کی جسمانی صورت ہی بدستور قائم رہتی تھی بلکہ اس لباس تک میں جسے وہ اس دنیا میں پہنا کرتے تھے کسی قسم کی تبدیلی نہ واقع ہوتی تھی۔

قدیم مسیحیوں نے جن کے خیالات حیات اخروی اور بھشت و دوزخ یعنی نیکوکاروں اور گناہ گاروں کے مساکن کے متعلق اپنے بت پرست پیش روؤں کے تصورات کے مقابلہ میں بت زیادہ واضح و نمایاں تھے انہیں قدیم تصورات کو تسلیم کر کے ان پر اپنی طرف سے بت کچھ حاشے چڑھا دیے۔ ان کو ذرا شک نہ تھا کہ آنے والی دنیا میں وہ اپنے احباب و اقارب سے اسی طرح مل کر باتیں کریں گے جس طرح اس دنیا میں کرتے ہیں اور ان کی یہ امید فطرت انسانی کے مقتضیات کے لحاظ سے چنداں بھانہ تھی اس لئے کہ جب کوئی عزیز دوست ہمیشہ کے لئے جدائی کا جانکاہ داغ دے جاتا ہے تو اس خیال سے کہ دوسری زندگی میں اس سے ہماری ملاقات ہو ہی جائے گی ہمارے دل کو تسکین ہو جاتی ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق کہ روح جسم سے جدا ہونے کے بعد روز جزا تک کس حالت میں اور کہاں رہتی ہے صحیح صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے خیالات مختلف تھے۔ ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ روح قبر کے گرد و پیش منڈلایا کرتی ہے۔ دوسرا گروہ یہ سمجھتا تھا کہ مرنے کے بعد روح بحالت سراستگی و پریشانی فضائے بیہوش میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہے۔ عام عقیدہ یہ تھا کہ سینٹ پیٹر بھشت کا دربان ہے۔ اور اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس کو چاہے دروازہ میں گھسنے دے اور جس کو چاہے روک دے۔ وہ انسانوں کی روحوں کو اپنی مرضی سے بھشت میں داخل کرتا ہے یا وہاں سے نکال دیتا ہے۔ لیکن بت پرستوں سے لوگ اس کے ان اقتدارات کے منکر تھے جس کی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ جب روز جزا سے پہلے ہی سینٹ پیٹر نے روحوں کو بھشت میں داخل کر دیا یا وہاں سے نکال دیا تو پھر روز جزا کی کیا ضرورت باقی رہی۔ پاپائے گریگوری کے زمانہ کے بعد یہ عقیدہ عام طور پر رائج ہو گیا کہ قید عصری سے آزاد ہو کر روحوں ایک مقام پر رکھی جاتی ہیں جہاں ان کا

تزکیہ ہوتا ہے یعنی بدوں کو اپنی بدی کی طاقی کا موقع دیا جاتا ہے۔

مردوں کی روحوں کا وقتاً فوقتاً زندوں سے آکر ملنا اور اپنے دیرینہ مساکن میں بودبہاش اختیار کرنا ایک ایسا خیال ہے جسے یورپ کے تمام ممالک میں ہر زمانہ کے نہ صرف جملہ بلکہ عقلا بھی تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ جاڑے کے موسم میں غروب آفتاب کے بعد دہکتے ہوئے تابدان کے سامنے بیٹھ کر جب بھوت پریت سایہ کی کہانیاں دہرائی جاتی ہیں تو سننے والوں پر ایک دل کو بھلا معلوم ہونے والا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں اہل روم تین قسم کی ارواح کے قائل تھے۔ یعنی نیکیوں کی روحمیں، بدوں کی روحمیں اور ان لوگوں کی روحمیں جن کے اعمال مکھوک تھے۔ اگر اس بارہ میں انسانی شہادت کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ قدیم الایام سے اس قسم کی صدہا روایتیں جن کے راوی نہایت ثقہ اور معتبر سمجھے گئے ہیں اس مضمون کی ہم تک پہنچتی ہیں کہ مردوں کی روحمیں یا تو قبرستانوں میں جمع ہوتی ہیں یا ویران قلعوں کے تنگ و تاریک حجروں میں اقامت پذیر ہوتی ہے۔ یا چاندنی رات میں تن تنہا خاموشی کے ساتھ چل قدمی کیا کرتی ہیں۔

ادھر یورپ میں تو اس قسم کے خیالات مقبول خاص و عام ہوئے لیکن ایشیا میں اس کے برعکس دوسرے قسم کے خیالات جو تخیل کے طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے عام طور پر پھیل گئے۔ پیشوایان مذہب نے سولہویں صدی میں ان کو اگرچہ دبا دیا لیکن ان کا استیصال کلی کبھی نہ ہو سکا۔ خود ہمارے زمانہ میں بھی ان کی اشاعت ایک نہایت وسیع پیمانہ پر یورپ بھر میں اس خاموشی کے ساتھ ہوتی رہی کہ پیائے روم نے مناسب سمجھا کہ ان کی صاف صاف طور پر قلعی کھول دی جائے۔ چنانچہ پایا کا دینی فرمان جب ”وہیکن کونسل“ میں پڑھا گیا تو کونسل نے بالاتفاق ان خیالات کو موجب ضلالت و گمراہی قرار دے کر ایک فتویٰ جاری کیا جس میں ان لوگوں کو طعون ٹھہرایا گیا جو ان کو صحیح سمجھتے ہوں۔ اس فتوے کا ایک فقرہ یہ ہے :

”بلغت ہو اس پر جو یہ کہتا ہے کہ روحانی اشیاء کا انفصال یا خروج ذات باری سے ہوا ہے یا یہ کہ ذات باری اپنے مظاہر کے ذریعہ سے یا نشوونما پانے کے بعد تمام چیزوں کی شکلیں قبول کر لیتی ہے۔“ چونکہ روم کی مذہبی کونسل نے ان عقائد کی تکفیر میں اپنے اقتدار کا پورا زور صرف کیا ہے لہذا ضرور ہوا کہ ان کے مالہ و ماعلیہ پر تاریخی پہلو سے نظر ڈالی جائے۔

ماہیت ذات باری کے تصورات سے ماہیت روح کے تصورات کا اثر پذیر ہونا لازمی ہے۔ ذات باری کے تصورات سے مشرقی ایشیائیوں نے غنیمت کا خیال خارج کر دیا تھا جس کا

لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ روح کے متعلق ان کے ہاں مسئلہ انفصال و انجذاب رواج پا گیا۔
 ویدانت میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ایک روح تمام کائنات میں ساری دائر
 ہے۔ اس روح کل یا خدا کی ماہیت وہی ہے جو روح انسانی کی ہے۔ نہ صرف ویدوں میں
 بلکہ منو کی سمریتوں میں بھی یہ دعویٰ موجود ہے کہ روح شعلہ مثل کل کی ایک چنگاری ہے
 جو اس سے جدا ہو گئی ہے اور ایک زمانہ موقت کے بعد اس میں پھر مل جانے والی ہے۔
 اسی کا نام اصول انفصال یعنی جدائی و انجذاب یعنی ملاپ ہے۔ ویدوں اور سمریتوں میں
 روح کی کوئی شکل نہیں مانی گئی۔ مظاہر قدرت کو جن کی رعنائیاں اور رنگینیاں آنکھ اور دل
 کو لہجائی ہیں خدا کا محض ایک سایہ تصور کیا گیا ہے۔

ویدوں کے مذہب نے ترقی کرتے کرتے بدھ مذہب کی شکل اختیار کر لی جو بنی نوع
 انسان کے جزو غالب کا ایمان ہے۔ اس مذہب کو ایک طاقت عالیہ کے وجود کا تو اعتراف
 ہے لیکن کسی ہستی عالیہ کے موجود ہونے سے انکار ہے۔ بدھوں کا عقیدہ یہ ہے کہ قوت کا
 وجود اصلی و حقیقی مادہ کو اپنا مظہر بن کر عالم شہود میں لاتا ہے۔ وہ مسئلہ انفصال و انجذاب
 کے قائل ہیں۔ ایک جلتی ہوئی شمع ان کے نزدیک گویا انسان کی صورت ہے جس میں مادہ
 مجسم ہو کر قوت کے عمل ارتقا کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر ہم ان سے سوال کریں کہ روح کا کیا
 حشر ہو گا تو وہ ہم کو یہ الزامی جواب دیتے ہیں کہ جب شعلہ بجھا دیا گیا تو اس کا کیا حشر ہوا
 اور جب مشعل جلی نہ تھی تو شعلہ کہاں تھا کیا وہ اس وقت معدوم تھا اور اب فنا ہو گیا
 ہے؟ بدھ مذہب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ذات یعنی اتانیت کا خیال جس نے ہمیں عمر
 بھر دھوکے میں ڈالے رکھا ہے شاید مرتے کے ساتھ ہی تو زائل نہ ہو لیکن رفتہ رفتہ ضرور
 جاتا رہتا ہے۔ اسی عقیدہ پر مسئلہ تنازع بنی ہے۔ شخصیت یا اتانیت کے بتدریج مٹنے کے بعد
 واقعہ انجذاب یعنی مثل کل کے ساتھ روح کا اتحاد ظہور میں آتا ہے۔ اس حالت میں جس
 کو حالت نروان کہتے ہیں روح پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور یہ ایک ایسا عالم
 ہے جس میں مادہ فضا اور زمانہ کے اعتبارات کا کبھی نشان نہیں ہوتا۔ جس میں مجھی ہوئی
 مشعل کا شعلہ چلا گیا ہے اور جس میں انسان پیدا ہونے قبل موجود تھا۔ یہی وہ انجام ہے
 جس کی انسان کو امید رکھنی چاہئے۔ یعنی وہ حالت ہے جس میں روح قوت کل کی لذت
 وصال سے بہرہ اندوز ہو کر سرمایہ سرور بے پایاں و راحت جاودان حاصل کرتی ہے۔

مشرقی یورپ میں ان خیالات کی ترویج کا پہلا ذریعہ ارسطو ہوا اور آگے چل کر وہ ان
 کا بانی مہانی سمجھا جانے لگا۔ کتب خانہ اسکندریہ نے اپنے دور آخر میں جو حکما پیدا کئے ان

پر ان خیالات کا نہایت گہرا اثر ہوا۔ قلو نامی ایک یہودی شہنشاہ کیلکیولا کے زمانہ میں رہتا تھا۔ اس کے تمام فلسفہ کا دارومدار ہی مسئلہ انفصال پر ہے۔ پلائینس نے نہ صرف اس مسئلہ سے حقیقت روح انسانی کا معاملہ کرنا چاہا بلکہ اقلانم میں کی سمجھی کو بھی اسی کی مدد سے سلجھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کا یہ خیال تھا کہ جس طرح نور کی ایک شعاع آفتاب سے نکلتی ہے اور جس طرح شعاع کے اجسام مادی پر پڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے اسی طرح باپ سے بیٹا اور بیٹے سے روح القدس نکل سکتی ہے۔ ان خیالات کی بنیاد پر قائم کر کے پلائینس نے اس پر ایک مکمل مذہبی عمارت تعمیر کی اور ارہاب زہد و ریاضت کو عالم قاتل سے عالم حال میں آنے کے طریقوں کی تعلیم دے کر یہ بتانا شروع کیا کہ عالم حال وصال عقل کل یا ذات باری کی پہلی منزل ہے اور اس عالم میں روح پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح فروریوس نے بھی انجذاب یا وصال باری کو معاد کے انتہائی مقصد سے تعبیر کیا۔ فروریوس نائر میں پیدا ہوا تھا۔ روم میں اس نے حلقہ درس قائم کیا اور عیسائیت کے روم میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ یوں تو یوسیس اور سینٹ جروم نے بھی ان کتابوں کے جواب میں رسائل تصنیف کئے لیکن سب سے بڑی حجت قاطع شہنشاہ تھوئوسیس کے جواب میں مضمون تھی جس نے فروریوس کی تصانیف کے تمام نغے ہی جلوہ دئے۔ فروریوس اپنی ناقابلیت پر افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے عالم حال میں خدا کے قرب سے چھیالیس سال کی عمر میں صرف ایک دفعہ شرف ہونے کا موقع ملا حالانکہ میرے استاد پلائینس نے کل ساٹھ برس کی عمر پائی اور اس عرصہ میں چھ مرتبہ وصال باری تعالیٰ کی نعمت سے شرف اندوز ہوا۔ پراکلس نے بھی مسئلہ انفصال و انجذاب کی بنا پر ایک مکمل ضابطہ دینیات مرتب کر کے طریقہ انجذاب سے بہت کچھ بحث کی ہے یعنی آیا روح قالب سے نکلتے ہی ثانی اللہ ہو جاتی ہے یا کچھ عرصہ تک اپنی ذات کے ادراک میں مقید رہ کر بتدریج وصال کامل حاصل کرتی ہے۔

فتح اسکندریہ کے بعد یہی خیالات مسلمانوں میں پھیل گئے اور انہوں نے بہت جلد خدا اور روح انسانی کے متعلق اپنے تجسمیہ عقائد کو ادانی و اقامی کے لئے چھوڑ دیا۔ جب عربی فلسفہ نے ایک مستقل بالذات فن کی حیثیت اختیار کی تو مسئلہ انجذاب و انفصال اس کے معرکہ الارا مباحث میں شریک ہو گیا۔ ان عقائد کے ترک کر دینے میں جو مسلمانوں کے طبقہ جلا میں مقبول عام تھے حکمائے اسلام نے ایک بڑی حد تک یہودیوں کا متبع کیا۔ یہودیوں نے اپنے آباء اجداد کی تجسمیت کو ترک کر دیا تھا اور اس معبود کے بجائے جو

سابق میں معبد کے اندر نقاب اسرار اوڑھے رہا کرتا تھا ایک ایسے خدا کی پرستش شروع کر دی تھی جو عقل مطلق اور طاقت غیر محدود ہونے کے لحاظ سے کائنات کے ہر رگ و ریشہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اور چونکہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ کیوں کر ایک ایسی شے جو دغدغہ عدم سے وجود میں آئی ہو غیر فانی ہو سکتی ہے لہذا وہ اس عقیدہ پر راسخ ہو گئے کہ روح انسانی کا تعلق ایک طرف تو اس ازل سے ہے جس کی کوئی ابتدا نہ تھی اور دوسری طرف اس ابد سے ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

عربوں کی دماغی ترقی کی ہر منزل میں عرب اور یہودی ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی پولیٹیکل تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تب بھی یہودی اور مسلمان دوش بدوش نظر آئیں گے۔ شام مصر اسپین جس ملک میں دیکھو دونوں ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ مغربی یورپ نے ان دونوں سے اپنے فلسفیانہ خیالات اخذ کئے اور ان خیالات کو امتداد روزگار نے مسلک ابن رشد کی شکل میں بدل دیا۔ اسلام کو اگر فلسفیانہ رنگ میں دیکھنا چاہو تو ابن رشد کے مذہب کا مطالعہ کرو۔ اہل یورپ عام طور سے ابن رشد ہی کو ان ضلالت آفرین عقائد کا بانی خیال کرتے تھے اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے اسی اعتبار سے اس کو مورد مطالعہ و ملامت قرار دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان خیالات کا محض جامع اور شارح تھا اور بس۔ اس کی تصنیفات نے عیسائی دنیا پر دو طرف سے حملے کئے۔ یعنی ایک طرف تو اسپین سے براہ جنوبی فرانس انہوں نے اٹلی کے شمال میں پہنچ کر رستہ میں بہت سے عقائد کو بدل ڈالا۔ اور دوسری طرف سسلی سے روانہ ہو کر شہنشاہ فریڈرک ثانی کی حمایت میں وہ نیپلز ہوتی ہوئیں جنوبی اٹلی میں جا پہنچیں۔

لیکن اس زبردست عقلی حملہ سے مدتوں پہلے یورپ میں بعض مستشرقین بطور خود مشرقی خیالات کی اشاعت میں حصہ لے چکے تھے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہم ایک برطانوی حکیم جان اریسٹو (۱۸۰۰ء) کے خیالات درج ذیل کرتے ہیں۔ اریسٹو مشائی المذہب تھا اور ارسطو کے فلسفہ کی تعلیم دیتا تھا۔ وہ ازراہ ارادت یونان کے اس نامور فلسفی کے مولد کی زیارت بھی کر چکا تھا۔ اس کی یہ آرزو تھی کہ فلسفہ اور مذہب میں ان مسیحی پادروں کے طریقہ مجوزہ کے موافق اتحاد پیدا کیا جائے جو اندلس کی اسلامی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے۔

اکیسویں صدی نے ایک چٹھی میں جو اس نے شاہ چارلس الملتب بہ اسلحہ کے نام لکھی ہے اریسٹو کے تعمیری اور فکر دقیقہ سنج کا ذکر کرتے ہوئے ان الفاظ میں اپنا تحیر ظاہر کیا

ہے: ”سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسا وحشی جو دنیا کے دوسرے کنارے سے آیا ہے اور دانشمند و فرزانه اشخاص کی صحبت سے بے بہرہ ہے کیوں کر بڑے بڑے اوق علمی مسائل کے سمجھنے اور انہیں اس خوبی کے ساتھ ایک غیر زبان میں ترجمہ کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔“ ار یحیٰنا کی تصانیف کا عام مقصد جیسا کہ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں یہ تھا کہ قلفہ اور مذہب میں اتحاد پیدا کرے لیکن اس موضوع پر قلم اٹھانا تھا کہ پادریوں نے اس پر لے دے شروع کر دی اور اس کی اکثر تصانیف جلا دی گئیں۔ اس کی سب سے مشہور کتاب کا نام ”تقسیم قدرت“ ہے۔

ار یحیٰنا کا قلفہ مشاہدہ اور تجربہ کے اس نچوڑ پر مبنی ہے کہ ہر ایک زندہ شے کسی ایسی شے سے پیدا ہوتی ہے جو پہلے زندہ تھی۔ عالم مرنی چونکہ دنیائے حیات ہے لہذا لازمی طور پر اس کا انفصال یا خروج کسی وجود اولین سے عمل میں آیا ہے اور وہ وجود خدا ہے جو ہم سب کا پیدا کرنے والا اور محافظ ہے۔ ہر وہ شے جو ہمیں نظر آتی ہے اپنے وجود کو بحیثیت ایک شے مرنی کے اس قوت کے ذریعہ سے قائم رکھتی ہے جو خدا سے ماخوذ ہے اور اگر یہ قوت ہٹا دیا جائے تو ضرور ہے کہ شے معدوم ہو جائے۔ اس طور پر خدا کے متعلق ار یحیٰنا کا یہ خیال ہے کہ وہ قدرت کے ہر عمل میں علی التوالی و التواتر حصہ لیتا ہے یعنی وہ قدرت کا بچانے والا، قائم رکھنے والا اور سنبھالنے والا ہے۔ اور اس لحاظ سے گویا یونانیوں کی ہمہ گیر روح یا عقل فصال کے مشابہ ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ افراد کی زندگی وجود عام یعنی روح عالم کا ایک جزو ہے۔

اگر وہ قوت جس پر تمام اشیا کے وجود کا مدار ہے ہٹا لی جائے تو ان اشیا کا رجوع اپنے مبداء اصلی کی طرف لازمی ہے یعنی ضرور ہے کہ وہ ذات باری کی طرف راجع ہو کر اس میں ضم یا جذب ہو جائیں۔ اس طور پر کل مظاہر کائنات کا انجام کار عقل فصال میں پیوست ہو جانا لازمی ہے۔ ار یحیٰنا کا قول ہے کہ ”جسمانی موت جسم کی اصلی یا ہیئت قدیمی کی طرف عود کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ جیسے کہ اصوات فنا ہو کر ہوا میں جا ملتی ہیں جو ان کا مبداء و فضا اور مدار علیہ ہے اور پھر ستانی نہیں دیتیں۔ کسی شخص کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا کیا حشر ہوا۔ اس آخری اور انتہائی انجذاب کی حالت میں جو ایک ميعاد موت کے بعد لازمی طور پر ظہور پذیر ہونے والی ہے صرف خدا ہی کی ذات موجود ہوگی۔ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا۔“ ایک اور مقام پر بحث ذات باری میں وہ لکھتا ہے: ”میں اسے کل کائنات کا مبداء اول اور علت العلل سمجھتا ہوں۔ تمام وہ اشیا

جو ہیں اور نیز تمام ایسی اشیاء جو نہیں ہیں۔ مگر ایک زمانہ میں تھیں اسی سے پیدا ہوئیں اسی نے پیدا کیں اور اسی میں پیدا ہوئیں۔ اس کے علاوہ میں اس کو کل کائنات کی انتہا اور ساعت موقت خیال کرتا ہوں جس کا ٹلنا ممکن نہیں۔ کائنات کے تصور کی چار شکلیں ہیں۔ اول میں سے دو اشکال یعنی آغاز و انجام کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے اور دو کا تعلق بطور سبب و سبب یا علت و معلول موجودات ترکیبی یا طبیعی سے۔ باقی اور غیر فانی بجز خدا کے اور کوئی نہیں۔“

عقل کل کی طرف روح کی اس رجعت کو ارجحینا نے جس لفظ سے تعبیر کیا ہے وہ فنا فی الہی کا مترادف ہے۔ مقام فنا میں داخل ہو کر روح کو اپنے سابقہ تجربے مطلقاً فراموش ہو جاتے ہیں اور اس کی وہی حالت ہو جاتی ہے جو جسم میں داخل ہونے سے پہلے تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے عقائد کو اہل مذہب کس طرح استحسان کی نظر سے دیکھ سکتے تھے۔ ارجحینا پر کلیسا کا عتاب نازل ہوا اور پادری اس کے درپے آزار ہو گئے۔

سب سے اول جس قوم کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ قوت غیر فانی اور ابدی ہے وہ ہندوؤں کی قوم تھی۔ اس حقیقت کا مفہوم اس اصول سے ملتا جلتا ہے جسے علمی اصطلاح میں ہم ”تناسب و میانت قوت“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ نظام عالم کا قیام و ثبات بھی اس اصول کی حقیقت کا موجد ہے اس لئے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر کائنات کی مجموعی مقدار قوت میں کچھ بھی کمی یا بیشی ہو جائے تو نظام عالم کا شیرازہ بکھر جائے۔ پس یہ واقعہ کہ کائنات میں توانائی یا قوت کی ایک معین اور غیر خفیر مقدار موجود ہے ایک علمی حقیقت ہے جس کے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ جو تغیرات ہمیں اس دنیا میں نظر آتے ہیں ان کی وجہ محض اس قوت کی تقسیم ہے۔

لیکن چونکہ روح ایک قوت فعال ہے لہذا ایک بالکل نئی روح کا عدم سے وجود میں آنا اس کا مستلزم ہو گا کہ جو قوت کائنات میں پہلے سے موجود تھی اس میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آج تک جتنے انسان پیدا ہوئے ہیں ہر ایک کی پیدائش کے وقت دنیا کی قوت میں بقدر ہر انسان کی روح کے اضافہ ہوتا رہا اور آئندہ بھی جتنے انسان پیدا ہونے والے ہیں ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسی عمل کا اعادہ ہوتا رہے گا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ قوت کی مجموعی مقدار ہر وقت بڑھتی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ اکثر زاہد و مرتاض لوگ اس خیال پر کراہت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قادر مطلق اپنے بندوں کے کمون اور شہوائے نفسانی کا تابع ہے کہ نطفہ کے استقرار

کی کچھ مدت کے بعد اسے جنین کے لئے ایک نئی روح پیدا کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ انسان کی شخصیت روح و جسم دو اجزا سے مرکب ہے لہذا ایک کے تعلقات دوسرے کے پوشیدہ اور غیر معلوم تعلقات پر بہت کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ اجزا جن سے جسم نے ترکیب پائی ہے اس عام مادہ سے ماخوذ ہیں جو ہمارے گرد و پیش موجود ہے اور مرنے کے بعد اسی مادہ میں جا کر مل جاتے ہیں۔ اس مشاہدہ سے یہ بدیہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا صالح قدرت نے شخصیت انسانی کے مادی حصے کے آغاز و انقلاب و انجام کی شکل میں ہماری آنکھوں کے سامنے ایسا عقدہ تو پیش نہیں کیا جس کے حل کرنے سے ہمیں جسم کے رفیق یعنی روح کے آغاز و انجام کا علم حاصل ہو سکے؟ آؤ دیکھیں ایک بہت بڑے زبردست مسلمان فلسفی امام غزالیؒ (۴۰۵ھ) کا قول اس بارہ میں کیا ہے :

”خدا نے انسان کی روح کو اپنے نور کے ایک قطرے سے پیدا کیا ہے اور اس قطرے کی خلقت کا منشا یہ ہے کہ جس سمندر سے نکلا تھا آخر کو اسی میں جا کر مل جائے۔ اپنے نفس کو اس خیال لایعنی سے دھوکا نہ دو کہ جسم کے فنا ہوتے ہی روح بھی فنا ہو جائے گی۔ جب تم دنیا میں آئے تھے تو تمہاری شکل کچھ اور تھی اب کچھ اور ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ چونکہ تمہارا جسم ہلاک ہو گیا ہے لہذا روح بھی ہلاک ہو جائے۔ تمہاری روح اس دنیا میں ایک تازہ وارد مسافر کے طور پر آئی ہے اور چند دن کے لئے گویا ایک سرائے میں مقیم ہے۔ اس زندگی کی مصیبتوں اور بلاؤں سے ہماری پناہ خدا کے ہاں ہے۔ سکون جاودانی ہم کو اسی وقت حاصل ہو گا جب ہم وصال جناب باری کی نعمت سے مستفیض ہوں گے اور یہ حالت مطمتہ جب حاصل ہو جائے گی تو ہم کو وہ راحت ملے گی جس میں رنج کی آمیزش نہیں۔ وہ طاقت نصیب ہو گی جو کمزوری سے مبرا ہے۔ وہ علم حصہ میں آئے گا جو شک سے پاک ہے۔ اور حیات و نور کے اس سرچشمہ ابدی کا دیدار میسر ہو گا جو ہمارا مبداء و منشاء ہے۔“

پھر میں چونکہ مادہ کے ذرات متجز ہو کر بحالت اعتدال قائم ہیں لہذا وہ ہمیشہ تک برقرار رہ سکتا ہے لیکن حیوان کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ مادہ کی ایک نہر کے مسلسل بہاؤ کی ایک خاص شکل ہے۔ اس کو ادھر غذا ملتی ہے اور ادھر فضلہ خارج ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حیوان ایک آبشار یا ندی یا شعلہ کے مشابہ ہے۔ یعنی آبشار یا ندی یا شعلہ کی طرح ان ذرات کو جس سے یہ مرکب ہے مطلق قرار نہیں کیونکہ یہ ذرات ہر

وقت بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے تسلسل یا حیات کا دارومدار خارجی اجزاء کے شمول پر ہے۔ اس کی عمر طبعی کی ایک میعاد مقرر ہے اور ایک نہ ملنے والی ساعت ایسی آتی ہے جب اسے چاروناچار مرنا پڑتا ہے۔

ایک ہی واقعہ کو پیش نظر رکھنے سے فلسفہ روح کا عقدہ مشکل حل ہونا دشوار ہے۔ ہمیں چاہئے کہ جس قدر واقعات سے مدد لے سکیں لیں۔ روح انسانی کی کتنی اس وقت تک پوری طرح سے نہیں سلجھ سکتی جب تک روح حیوانی کی حقیقت پر بھی ساتھ ہی ساتھ غور نہ کیا جائے۔ ہمیں ڈیکارٹ کے طریقہ سے کام لے کر یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا انسانوں کی روحمیں حیوانوں کی روحوں سے کوئی قربت رکھتی ہیں اور آیا نشوونما کے لحاظ سے ان دونوں کا تعلق ایک ہی سلسلہ سے ہے جس کا حصہ فوقانی روح انسان ہے اور حصہ تحتانی روح حیوان۔ چوٹی کی فہم و فراست سے نتائج ہم اخذ کریں ان پر بھی ہمیں ایسا ہی غور کرنا چاہئے جیسا انسان کی عقل و بصیرت کے کرشموں پر۔ اعضاء انسان کی تشریح کا علم آج اس درجہ کمال کو پہنچا ہوا نہ ہوتا اگر اس پر علم تشریح اعضاء حیوانات کی روشنی نہ پڑتی۔

بروڈی نے واقعات پر نظر غائر ڈالنے کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ روح انسان اور روح حیوانی کی ماہیت ایک ہے۔ جو شخص کتے کی عادات و خصائل سے اچھی طرح واقف ہے اسے یہ بات ماننی پڑے گی کہ کتا نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے اور جب کوئی خطا کرتا ہے تو جانتا ہے کہ اس سے یہ خطا ہوئی۔ بہت سے پالتو جانوروں میں قوت استدلال موجود ہوتی ہے اور وہ حصول مقاصد کے لئے مناسب تدابیر عمل میں لاتے ہیں۔ کون ہے جس نے ہاتھی اور بندر کے ارادی افعال و حرکات کی بے تعداد مثالیں نہیں سنیں اور ان جانوروں کے یہ عاقلانہ افعال کچھ تقلید جامد یا انسان سے میل جول رکھنے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان کی فطری سرشت کا لازمہ ہیں اس لئے کہ جنگلی جانور بھی جنہیں انسان کی صحبت کا اتفاق نہیں ہوا اسی قسم کے اوصاف سے متصف پائے گئے ہیں۔ مختلف انواع کے حیوانوں میں ذہنی قابلیت اور عادات و خصائل کے لحاظ سے بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً ”کتا نہ صرف بلی کی بہ نسبت زیادہ سمجھدار ہوتا ہے بلکہ اس میں وہ عمرانی و اخلاقی صفات بھی پائی جاتی ہیں جو بلی میں موجود نہیں ہیں۔ کتے کو اپنے آقا سے محبت ہوتی ہے اور بلی کو اپنے گھر سے۔“

ڈیوڈا ریمان کا یہ قول ہمیں نہیں بھولنا: ”کارگاہ ہستی کے عجائبات پر ایک ہمہ گیر اور سہری نظر ڈالو۔ اور ننھی سی چوٹی کے اس دماغ کو دیکھو جو مقدر میں جزو لا تجزئی سے کچھ ہی زیادہ ہو گا۔ مادہ کے اس مبہمی ذرہ میں اس روح کو کرشمہ سنج دیکھ کر تم پر رعب

اور حیرت طاری ہو جائے گی جس میں محنت و استقلال۔ اختراع و ایجاد۔ ترتیب و تناسب۔ وفا کشی و جان سپاری اور شجاعت و دلادری کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر ہیں۔ غور تو کرو کہ چوٹی کو یہ ترقی کتنے زمانہ میں جا کر نصیب ہوئی ہے۔ بے تعداد لسلوں نے شبانہ روز محنت کی ہے تب کہیں جا کر خدا کی یہ منہی سی مخلوق اس درجہ کمال کو پہنچی ہے۔

ہیوڈر جس نے چوٹی کے حالات پر ایک نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز رسالہ لکھا ہے بیان کرتا ہے کہ ”اگر تم کسی چوٹی کے طرز عمل کو اس وقت جب کہ وہ کام کر رہی ہو بغور دیکھو تو تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ وہ آگے چل کر کیا کرے گی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جب میں چوٹیوں کے ایک گروہ کو اپنا گھر بناتے دیکھ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک داروغہ نے آکر عمارت کا معائنہ کیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ مستروں نے دیوار کی بلندی جتنی رکھنی چاہئے تھی نہیں رکھی اور چھت ڈالنی شروع کر دی ہے تو اس نے فوراً چھت اودھڑوا ڈالی اور دیواروں کو کافی بلند کر کے پرانی چھت کے مسالے سے نئی چھت از سر نو ڈلائی۔“ کیا اس بیان کے بعد بھی شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ یہ کیڑے محض کلیں ہیں جن سے تمام افعال بر سبیل اضطراب سرزد ہوتے ہیں۔ مشیت۔ ارادہ۔ اختیار کون سی ایسی صفت ہے جو ان میں نہیں پائی جاتی؟ چوٹیاں جب اپنی پرانی سیلیوں کو کئی میحوں کے بعد دیکھتی ہیں تو انہیں فوراً ”پچان لیتی ہیں اور اس ملاقات پر خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کا منہ سے منہ ملا کر باتیں کرنا دیکھو۔ اس طریقہ سے یہ بہت سے خیالات ظاہر کر سکتی ہیں۔ یہ طریقہ اظہار خیالات ان کے گھر کے لئے جس کے اندر چاروں طرف اندھیرا گھپ چھایا ہوا ہے ہر طرح سے موزوں ہے۔

اکیلے رہنے والے کیڑوں کی اتنی عمر نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش کر سکیں لیکن اکٹھے مل کر رہنے والے کیڑوں کی زندگی زیادہ ہوتی ہے۔ ان میں اخلاقی خواہشیں موجود ہوتی ہیں اور وہ اپنے بچوں کی تربیت اور پرورش خاص اہتمام سے کرتے ہیں۔ یہ بیچ میرز جاندار جو محنت و استقلال کی زندہ تصویریں ہیں سولہ سولہ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ حالانکہ بہت کم آدمی ایسے ہوں گے جو دماغی محنت ایک وقت میں مسلسل چار پانچ گھنٹے سے زیادہ کر سکیں۔

نتیجہ کی یکسانی اسباب کی یکسانی پر دلالت کرتی ہے اور افعال کی مشابہت اعضا کی مشابہت کو مظہر ہے۔ ہمارے وہ ناظرین جو جانوروں کی عادات و خصائل سے عموماً اور نیونی کے تمدن سے خصوصاً پوری واقفیت رکھتے ہیں اگر ہماری کتاب ”یورپ کی دماغی ترقی

کی تاریخ کا انیسواں باب ملاحظہ فرمائیں گے تو انہیں ملک پیرو واقع امریکا کی وحشی قوم ان کے تمدن کی کیفیت معلوم ہوگی۔ ظاہر ہے کہ چوٹی ایک ذرہ ناچیز ہے اور انسان اشرف المخلوقات لیکن چوٹی کے تمدن اور قوم انکا کے تمدن کا موازنہ کرنے کے بعد اور ان خصوصیات رسم و رواج و عادات و خصائل کو میزان تقابل میں تولنے کے بعد جو ان دونوں میں پائی جاتی ہیں ناظرین کو شاید ہم سے اس رائے میں اتفاق ہو گا کہ شہد کی مکھوں اور بھڑوں اور چوٹیوں اور پرندوں اور ان تمام چھوٹے درجے کے حیوانات سے جنہیں انسان حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اسے ایک دن یہ سبق سیکھنا ہے کہ خود اس کی حقیقت اور ہستی کیا ہے۔

ڈیکارٹ تمام کیڑوں کو خود بخود چلنے والی کلیں تصور کرتا ہے۔ لیکن یہ خیال بہت کچھ ترمیم کا محتاج ہے۔ کیڑے محض اس اضطراری حرکت کے لحاظ سے تو متحرک بالذات کلیں سمجھے جاسکتے ہیں جو ان کے خطا بطن اور سلاہ الراس کے اس حصہ سے سرزد ہوتی ہے جن کو ایک ہی وقت میں مختلف احساسات سے اثر پذیر ہونے سے تعلق ہے ورنہ باقی ہر اعتبار سے وہ متحرک بالارادہ اور فاعل مختار ہیں۔

جس مادہ سے اعصاب محفوظ مرکب ہیں اس کا ایک کام یہ بھی ہے کہ حواس کے ذریعہ سے جو نقوش اشیائے خارجی کے اس پر مرتسم ہوں ان کے آثار و باقیات کو محفوظ رکھے۔ اس لحاظ سے سلاہ الاعصاب کو جو اسی مادہ سے بنا ہے گویا نظام تصور کا محکمہ اندراج نقوش سمجھنا چاہئے۔ نظام عصبی کے عمل میں اس کی وجہ سے زمانہ کا عنصر بھی داخل ہو جاتا ہے یعنی وہ نقش جو سلاہ الاعصاب کے موجود نہ ہونے کی حالت میں فوراً منقرض ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر تک حالت اصلی پر قائم رہتا ہے اور اس قیام کی وجہ سے وہ تمام اہم نتائج مترتب ہوتے ہیں جنہیں بہت سے قدیم و جدید نقوش کے باہمی تعامل نے پیدا کیا ہے۔

کوئی خیال خود بخود نہیں پیدا ہو سکتا۔ ہر عقلی فعل کسی فعل سابق کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک کہ کوئی شے جو پہلے گزر چکی ہے اس کے وجود میں آنے کا باعث نہ ہو چکی ہو۔ دو دماغ جن کی ساخت میں سرمو فرق نہیں اگر یکساں حوالی میں ہوں گے تو ان سے ایک ہی سا خیال پیدا ہو گا۔ اس مشابہت عمل یا یکسانی خیال کو تمیز مشترک کا نام دینا چاہئے جس سے مراد فہم و شعور کی وہ عام قابلیت ہے جو دماغ میں بطور قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ خیال کے پیدا ہونے کی دو جداگانہ حالتیں ہوتی ہیں یعنی

ایک تو دماغ کی وہ حالت جو نقوش یا تصورات ماضی پر منحصر ہے اور دوسری وہ حالت جس کا دارودار موجودہ طبیعی حالات پر ہے۔

کیڑوں کے سلسلہ الراس میں ان نقوش کے آثار کا خزانہ جمع رہتا ہے جو معمولی اعصاب بیرونی پر مرتسم ہوتے ہیں اور باصرہ و شامہ و سامعہ کے ذریعہ سے جو احساسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں وہ ان اعصاب میں رکھی رہتی ہیں۔ دونوں کا تعامل اضطراری حرکات کو مبدل بہ افعال اختیاری کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کیڑوں کو خود بخود حرکت کرنے والی کلوں پر جن میں انتقالش فوری رد عمل کا مستلزم ہے فوقیت حاصل ہے۔

ہر مرکز عصبی کا فعل عام اس سے کہ وہ مرکز ترقی کے درجہ اعلیٰ میں ہو یا ادنیٰ میں ایک اصول حالت کیسادی کے تابع ہوتا ہے جسے اکساد سے تعبیر کرتے ہیں۔ خود انسان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ خون جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے ایک لمحہ کے لئے روک دیا جائے تو نظام عصبی کی طاقت زائل ہو جاتی ہے اور اگر کم کر دیا جائے تو مقدار کم شدہ کی مناسبت سے کم ہو جاتی ہے لیکن اگر بڑھا دیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ آکسیجن سے ملی ہوئی ٹائٹروجن تنفس کے ذریعہ سے ہیمہٹوں میں پہنچائی جائے تو اعصاب کی عملی قوت اسی نسبت سے بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدل ماتیحل کی ضرورت واقع ہوتی ہے اور مکان اور بیداری کے بعد آرام کرنا اور سونا لازمی ہے۔

اشیائے خارجی کے ہر ادراک کے ساتھ دو اصولی خیالات لازمی طور پر وابستہ ہیں۔ یعنی زمان و مکان۔ ان دونوں تصورات کے لئے نظام عصبی میں ابتدا ہی سے جب کہ وہ ناقص و غیر مکمل ہوتا ہے گنجائش رکھ دی جاتی ہے۔ آنکھ سے مکان کا احساس ہوتا ہے اور کان سے زمان کا اور ان دونوں اعضا کی مکمل ساخت نے ادراک زمان و مکان کو اس قدر صحیح کر دیا ہے کہ اگر صرف قوت لامہ ہی سے کام لیا جاتا تو ہرگز اتنا صحیح ادراک نہ ہو سکتا۔

سلسلہ الاعصاب کی لوح پر ارتسام نقوش کی کیفیت چند سادہ تجربوں سے واضح ہو سکتی ہے۔ اگر کسی سرد مجلہ و آبدار دھات مثلاً "ایک نئے استرے کے پھل پر کوئی شے مثلاً" ایک قرص رکھ دیا جائے اور سانس کی بھاپ دے کر نمی کے خشک ہو جانے کے بعد قرص کو اٹھا لیا جائے تو اگرچہ نہایت غور سے دیکھنے پر بھی استری کی آبدار سطح پر کوئی شکل نظر نہ آئے گی لیکن اگر منہ سے پھر بھاپ دی جائے گی تو قرص کا دھندلا سا سایہ نمودار ہو جائے گا اور یہ عمل ایک دفعہ نہیں بلکہ مکرر کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اگر استرے کو بحفاظت تمام بند

کر کے ایسی جگہ رکھ دیا جائے جہاں اس کے پھل کی آب و تاب میں فرق نہ آنے پائے تو کئی مہینے کے بعد جب پھر اس کو منہ سے بھاپ دی جائے گی تو قرص کا سایہ موہوم پہلے کی طرح نظر آنے لگے گا۔

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناچیز سے ناچیز نقش اس طور پر قائم ہو کر محفوظ رہ سکتا ہے۔ پس ایک ایسی جمادی و غیر عضوی سطح پر ایک امٹ نقش نمودار ہو سکتا ہے تو اس لوح اعصابی پر تو اسے بدرجہ اولیٰ مرتسم ہونا چاہئے جسے صانع قدرت نے تیار ہی اسی مقصد سے کیا ہے۔ کوئی سایہ بھی دیوار پر ایسا نہیں پڑتا جو اپنا مستقل نشان وہاں نہ چھوڑ جاتا ہو اور اگر مناسب تدابیر عمل میں لائی جائیں تو یہ نشان ظاہر ہو سکتا ہے۔ عکسی تصاویر کا عمل اس دعوے کا ثبوت ہے۔ ہمارے احباب و اقارب کی تصویریں اور مناظر قدرت کے نقشے آئینہ عکسی کی ذکی الحس سطح پر گو ہمیں آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے لیکن جب مناسب ادویہ کا استعمال کیا جائے تو وہ جھٹ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ گویا ایک پری ہے جو ہمارے عمل سے شیشہ میں اتر آتی ہے اور وہ پیکر جمالی جو پہلے جلباب خفا اوڑھے ہوئے تھا چہرے سے نقاب الٹ دیتا ہے۔ ہمارے مخفی سے مخفی خلوت کدہ میں جہاں ہم یہ سبھے بیٹھے ہیں کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا اور کسی ناعزم کی نظر وہاں تک نہیں پہنچ سکتی ہمارے تمام افعال و اعمال کے نشانات و آثار موجود ہوتے ہیں اور جو کچھ ہم نے کیا ہے اس کی ایک دھندلی سی تصویر سیاہ سایہ کی شکل میں نقش دیوار بنی ہوئی پائی جائے گی۔

اگر کچھ دیر تک پلکیں بند رکھنے کے بعد مثلاً ”صبح کو جاگتے وقت ہم یکایک عکسی بانہہ کر کسی روشن چیز کی طرف دیکھتے رہیں اور پھر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں تو جس غیر مہرود تاریکی کا میدان ہمارے سامنے پھیلا ہوا ہو گا اس میں اس چیز کا سایہ ہمیں نظر آئے گا۔ یہ سایہ کوئی خیالی شے نہ ہو گا بلکہ فی الحقیقت موجود ہو گا اس لئے کہ اصل شے کی جن باریکیوں پر چشم زدن میں ہمیں غور کرنے کا موقع نہ ملا تھا وہ ہمیں اس سایہ میں نظر آ سکتی ہیں۔ مثلاً ”جاگتے وقت جس چیز پر اول اول ہماری نظر پڑی وہ اگر جالی کا پردہ تھا جس میں پھولدار لیس نکلی ہوئی تھی یا درخت کی شاخیں تھیں جو ہماری خوابگاہ کے درپچہ کے باہر اگا ہوا تھا تو پلکیں بند کرنے کے بعد پردے یا شاخ درخت کی پوری تصویر بلا کم و کاست ہماری آنکھوں میں پھر جائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ تصویر دھندلی ہوتی جاتی ہے اور ایک دو منٹ میں بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر موج خلا میں تیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اگر ہم آنکھ کی پتلی کو حرکت دے کر اس صورت طلسمی کا پیچھا کرنا چاہتے ہیں تو وہ

یک بیک نگاہ سے غائب ہو جاتی ہے۔

منسحبہ یعنی آنکھ کے پہلے پردے پر نقوش کے اس امتداد سے ثابت ہوتا ہے کہ اعصاب منقوط پر خارجی اثرات کا عارضی و آئی ہونا کچھ ضروری و لازمی نہیں ہے۔ آنکھ کے ان نقوش اور عکسی تصاویر کے نقوش میں امتداد و انجلا و انغلا کے لحاظ سے پوری مطابقت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہم نے میکسکو کے مناظر و اماکن کی ایسی عکسی تصویریں دیکھی ہیں جن کی نسبت عکاسوں کا بیان ہے کہ شیشہ عکسی پر مینوں بعد نیویارک میں یہ ادویہ کا عمل کیا گیا اور جب اس سفر طویل اور مدت مدید کے بعد تصویریں شیشہ پر ابھر کر کاغذ پر اتریں تو خط و خال اور نوک پلک کے لحاظ سے اصل اور نقل میں سرمو فرق نہ تھا۔ گویا شیشہ عکسی نے اپنی ودیعت کو پوری طرح سے ادا کر دیا۔ ہمیشہ قائم رہنے والے سربلٹک پہاڑوں کا ڈیل ڈول اور ڈاکوؤں کے کسی گروہ کے الاؤ کا کچھ دیر میں غائب ہو جانے والا دھواں کوئی تفصیل ایسی نہ تھی جو تصویر میں رہ گئی ہو۔

ان واقعات کے مشاہدہ کے بعد یہ سوال پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آلات حس نے جن نقوش کو خارجی اشیا سے فراہم کیا ہے آیا ان کے آثار جس طرح منسحبہ میں عارضی طور پر قائم رہتے ہیں دماغ میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوتے ہیں؟ کیا قوت حافظہ کے منفی بھی ہیں کہ روح حوادث گزشتہ و واقعات ماضیہ کی ان تصاویر کو جو اس کے سپرد کر دی گئی ہیں مستحضر رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں؟ کیا اس کے نگار خانہ میں جہاں خاموشی کا عالم طاری ہے زندوں اور مردوں کی منفی منفی تصویریں اور دیکھے ہوئے مناظر اور آزمائے ہوئے واقعات کے نقشے لٹکے ہوئے ہیں؟ کیا یہ مستقل اور دریا نقوش کسی کتاب کے حروف کی طرح محض وہ علامتیں ہیں جو دماغ میں خیال پیدا کرتی ہیں یا اشیائے خارجی کی ایک نہایت ہی چھوٹے پیمانہ پر حقیقی شبیہیں ہیں جن کو خرد بین کی مدد سے دیکھ کر ہمیں اتنی سی جگہ میں جو سوئی کے سوراخ سے زیادہ نہیں پورے کتبہ کا مربع ایک نگاہ میں نظر آ جاتا ہے؟

منسحبہ پر جو خیالی تصاویر نقش ہوئی ہیں وہ دن کی روشنی میں نظر نہیں آ سکتیں۔ اسی طرح وہ تصاویر جو پردہ حس مشترک پر اتری ہوئی ہیں اس وقت تک ہماری توجہ کو اپنی طرف مائل نہیں کرتیں جب تک کہ آلات حس اپنے کام میں چلتی اور مستعدی سے مصروف رہ کر نئے نئے نقش حس مشترک کے لئے جمع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب یہ آلات تھک کر سست پڑ جاتے ہیں یا جب ہمیں سخت فکر و انگیزہ ہوتی ہے یا بحث پٹے کے

وقت ہم بیٹھے ہوئے کسی سوچ میں محو ہوتے ہیں یا جب ہم سو رہے ہوتے ہیں تو یہ غفلت صورتیں اپنے نامخانہ سے نکل آتی ہیں اور چونکہ اس وقت ان کا اختیار بوجہ تقابل و تضاد نمایاں ہو جاتا ہے اس لئے یہ صاف صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بخار کی حالت میں جب ہم پر ہریان طاری ہوتا ہے یا موت کے وقت جب ہم عالم سکرات میں ہوتے ہیں تو یہ چھپی چھپائی تصویریں ہمارے ساتھ آکھڑی ہوتی ہیں۔ ہماری زندگی کا ایک تنائی حصہ نیند میں گذرتا ہے اور اس زمانہ میں ہم پر عالم خارجی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سامعہ باصرہ اور دوسرے قوا معطل ہوتے ہیں لیکن وہ کبھی نہ آنکھ جھپکنے والی اور ہر وقت فکر میں ڈوبی رہنے والی نقاب پوش ساحرہ یعنی روح اپنے کج تنہائی سے ان تصویروں پر نظر ڈالتی رہتی ہے جو اس نے جمع کی ہیں۔ یہ تصویریں نہ مٹ سکتی ہیں اور نہ ان کا نور سنبھالا جاسکتا ہے اور ان کو طرح طرح سے ترکیب دے دے کر وہ اس د لکشا اور حیرت انگیز مرقع کی تیاری کا سامان کرتی ہے جسے خواب کہتے ہیں۔

اس طور پر قدرت نے انسان کی جسمانی ساخت کا ڈھنگ ہی کچھ ایسا ڈالا ہے کہ بقائے روح اور حیات اخروی کے تصورات بے اختیار اس کے دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ غیر مذہب و وحشی کو بھی جس کی روح پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی ہے عالم رویا میں وہ سارے جنگل اور دلفریب مرغزار نظر آتے ہیں جو اس کی یاد کا سب سے زیادہ خوشگوار حصہ ہیں۔ ان غیر حقیقی اور مبہوم تصاویر سے وہ بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکال سکتا ہے کہ وہ سایہ ہیں اس د لکشا حقیقت کا جو اسے ایک آنے والی زندگی میں نظر آئے گی۔ کبھی کبھی خواب میں اسے ان گذرے ہوئے لوگوں کی صورتیں بھی نظر آ جاتی ہیں جن میں سے زندگی کی حالت میں کوئی اس کا دوست رہ چکا ہے اور کوئی دشمن۔ ظاہر ہے کہ عالم خواب کے ان مظاہر کو وہ روح کے وجود و بقا کی محبت قاطع سمجھتا ہے۔ خود ہم بھی جن کی تہذیب و تمدن کا آفتاب نصف النہار پر ہے اس قسم کے واقعات سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتے اور جو نتائج ہمارے غیر مذہب آباء اجداد نے ان سے اخذ کئے تھے وہی ہم بھی نکالتے ہیں۔ ہماری اعلیٰ درجہ کی تہذیب و شائستگی جس طرح ہمیں کمزوریوں اور بیماریوں سے نہیں بچا سکتی اسی طرح متعقبات فطرت کی قید سے بھی آزاد نہیں کر سکتی۔ ان اعتبارات سے روئے زمین کے کل انسان مساوی الحیثیت ہیں۔ ہم خواہ وحشی ہوں خواہ تہذیب یافتہ لیکن اس سے ہم کو کسی طرح مفر نہیں کہ ہماری فطرت فنا اور بقا کی ان پیچیدگیوں کو جن سے زیادہ متمم بالشان اور قلب کو مرعوب کرنے والی حقیقت اور کوئی نہیں ہو سکتی ایک نہ ایک

وقت ہمارے سامنے پیش کر کے رہتی ہے۔ ان حقیقتوں کے انکشاف کے لئے فطرت انسانی کسی موزوں موقع کی منتظر رہتی ہے اور یہ موقع اس وقت آتا ہے جب ہم انفرادی یا بیماری کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ہماری فطرت اپنا پورا عمل کرتی ہے اور ہم بھی اس وقت اس کی حقائق آموزیوں سے متنبہ ہونے کے لئے پوری طرح تیار ہوتے ہیں۔ اس فطرت کا عمل سب پر یکساں ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک غریب یا امیر جاہل عالم سب برابر ہیں۔ مغرور سے مغرور اور متکبر سے متکبر شخص اس کی سرزنش اور نصیحت سے نہیں بچ سکتا اور مسکین سے مسکین اور عاجز سے عاجز شخص کو بھی حقیقت عقبی کی معرفت کی تسکین سے یہ محروم نہیں رکھتی۔ اس پر کسی کی سازش یا خود غرضی کا جادو نہیں چلتا۔ انسانی کوشش کی خارجی تائید کی اس کے نہ ٹلنے والے اثر کو پرواہ نہیں۔ ہر انسان کے ساتھ خواہ وہ کیسے بھی کیوں نہ جائے یہ برابر سایہ کی طرح لگی رہتی ہے۔ گزشتہ تصورات کے آثار و باقیات سے حیرت انگیز صفائی کے ساتھ عالم عقبی کی آنے والی حقیقتوں کی ناممکن التردد شہادتوں کا استخراج اس کا کام ہے۔ یہ اس سرچشمہ سے سیراب ہوتی ہے جو ظاہر بین نگاہوں کو خشک نظر آتا ہے۔ اور ان وہی و خیالی شبیہوں سے جو ظاہر ہوتے ہیں غائب ہو جاتی ہیں ہمارے صورت کردہ ایقان کے لئے ان لعنتوں کو تیار کرتی ہے جو فنا و زوال کی رہیں منت نہیں ہیں۔

کیڑے اور کل میں یہ بڑا فرق ہے کہ ایک متحرک بالذات ہے اور ایک متحرک بالارادہ۔ بالفاظ دیگر کل میں خارجی تحریک کے پہنچنے ہی حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور کیڑے پر ان تحریکات کا بھی اثر ہوتا ہے جن کا داخلہ دماغ میں موجود سے یعنی جو پہلے سے دماغ پر نقش ہو چکی ہیں۔ حیوانیت کے طبقہ اعلیٰ میں اس تسبیل نقوش کا عمل زیادہ کامل و مکمل ہوتا ہے اور قوت حافظہ زیادہ کمال کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی خارجی شکل میں اور اس کے اس نقش میں جو نوع السلطہ پر مرتسم ہو کوئی مشابہت پائی جائے اس لئے کہ اس پیغام تار ہتی کے الفاظ میں جو تار گھر میں داخل کیا جاتا ہے اور ان علامات میں بھی تو کوئی مشابہت نہیں ہوتی جن کے ذریعہ سے یہ پیغام ایک مقام سے دوسرے مقام دور دراز تک پہنچایا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کسی چھپی ہوئی کتاب کے حروف اور ان افعال یا مناظر میں بھی کوئی تطابق شبیہ نہیں پایا جاتا جن کا اظہار بذریعہ حروف کیا گیا ہے۔ البتہ حروف سے واقعات و مناظر کی تصویر پڑھنے والے کے پردہ ذہن پر صفائی سے اتر آتی ہے۔

آلات حفاظت نقوش سے جو حیوان محروم ہو اس کی حقیقت محرک بالذات کل سے زیادہ نہیں۔ اس میں قوت حافظہ نہیں ہو سکتی۔ ان آلات کا ابتدائی مواد نہایت ہی بے حقیقت و غیر متیقن ہوتا ہے لیکن اسی مواد سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے یہ آلات درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ ترقی کی بڑھتی رفتار کے ساتھ فہم و شعور اور ادراک کی قابلیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ انسان کے آلات تحفظ و تسجیل نقوش متبادل کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اس کے گزشتہ و موجودہ نقوش اس کے لئے دستور العمل کا حکم رکھتے ہیں۔ وہ تجربہ کو اپنا رہنما قرار دیتا ہے اور اس کے افعال عقل کی ہدایت سے صادر ہوتے ہیں۔

جب کسی حیوان میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ان نقوش کا علم جن کا ذخیرہ اس کے مراکز عصبی میں جمع ہے اسی نوع کے دوسرے حیوان پر منتقل کر سکتا ہے تو ترقی کی ایک بہت بڑی منزل طے ہو جاتی ہے۔ یہ ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ انفرادی زندگی نے اجتماعی یا عمرانی زندگی کی شکل اختیار کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ کیفیات ذہنی کے انتقال کی قابلیت یعنی تعلیم و تربیت کے لئے لازمی ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے کیڑے اپنے خیالات کا اظہار ایک دوسرے پر سربلحہ الحس لاسہ روشنیوں کے تماس سے کرتے ہیں اور انسان کا ذریعہ اظہار معلومات تکلم ہے۔ بنی نوع انسان اپنے ابتدائی دور یعنی زمانہ جاہلیت میں اپنی معلومات کا اظہار اپنے اہنائے جنس پر صرف باہمی گفتگو کے ذریعہ سے کر سکتے تھے۔ اس طور پر ایک نسل کے افعال اور خیالات دوسری نسل کو ترکہ میں پہنچتے تھے اور اس کے افعال و خیالات پر اپنا اثر ڈالتے تھے۔

لیکن زبانی روایت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ قوت گویائی کی بدولت انسان مل جل کر رہنے کے قابل ہو جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ تمدنی ترقی نہیں کر سکتا۔

قوت گویائی کے سلسلہ ارتقا کا مشاہدہ خالی از دلچسپی نہیں۔ فن تحریر کی ایجاد نے نقوش کے اندراج و تسجیل کو شان و وسعت و دوام عطا کی۔ جو نقوش اب تک صرف ایک انسان کے دماغ میں جمع تھے ان سے تمام نوع انسان ہر زمانہ میں مستفید ہونے کے قابل ہو گئی۔ اس قابلیت نے تمدن کو ممکن کر دیا اس لئے کہ تحریر یا کسی ایسے ذریعہ کے بغیر جس سے واقعات کسی نہ کسی شکل میں محفوظ رہ سکیں تمدن کا وجود ممکن نہیں۔

اس فلسفیانہ پہلو سے اگر ہم غور کریں تو ہمیں چھاپے کی ایجاد کی اصلی قدر و منزلت معلوم ہو گی۔ چھاپے تحریر کے ارتقا کا وہ درجہ ہے جو خیالات کو روز بہ سرعت کے ساتھ شائع کرنے اور انہیں بیشہ کے لئے قائم و برقرار رکھنے سے بنی نوع انسان کی ترقی تہذیب

اور اتحاد و ارتباط باہمی کا باعث ہوتا ہے۔

ذرات عصبی کی لوح پر نقوش کے ارتسام اور ان کی تسجیل اور ان کے نتائج کے متعلق جو کچھ میں نے گذشتہ فہروں میں بیان کیا ہے وہ دراصل ان خیالات کا خلاصہ ہے جو میری کتاب ”ہومن فریالوئی“ (ترکیب اعضائے انسانی) میں بوضاحت درج ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ جن ناظرین کو تفصیل مطلوب ہو وہ اس کتاب کی وہ فصل ملاحظہ فرمائیں جس کا عنوان ”بصارت مقلوب یا دماغی بینائی“ ہے۔ اس کے علاوہ مقالہ اول کی فصل چہارم اور مقالہ دوم کی فصل ہشتم کا مطالعہ بھی خالی از فائدہ نہ ہو گا۔

روح انسانی کی صحیح ماہیت کا اگر سراغ لگ سکتا ہے تو اس کی شکل یہی ہے کہ اس کا مقابلہ روح حیوانی سے کیا جائے۔ یہ طریقہ اگرچہ وقت طلب ہے اور بہت کچھ وقت اور محنت اس پر خرچ کرنی پڑتی ہے لیکن اس کے نتائج کی صحت میں بھی کلام نہیں۔ ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر کیا ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ مادہ کی طرح روح کا بھی ایک عظیم الشان وجود کائنات کی رگ و پے میں ساری دواہر ہے اور یہ روح ایک بہت بڑے جرمن فلسفی کے قول کے مطابق ”پتھروں میں سوتی ہے جانوروں کے قالب میں آکر خواب دیکھتی ہے اور انسان کے جسم میں داخل ہوتے ہی جاگ اٹھتی ہے؟“ کیا جسم کی طرح جو مادہ سے بنتا ہے روح بھی روحانی وجود سے پیدا ہوتی ہے؟ کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں؟ کے بعد اپنے اپنے مختارج کو لوٹ جاتے ہیں یعنی جسم مادہ میں جا ملتا ہے اور روح روح میں جا شامل ہوتی ہے؟ اگر حقیقت حال یہی ہے تو پھر ہم وجود انسانی کی تاویل کر سکتے ہیں اور یہ تاویل حقایق علمی کے ساتھ تطابق کلی رکھ سکتی ہے یعنی ہمارا یہ خیال کہ نظام کائنات دائم و قائم اور غیر تغیر پذیر ہے اس تاویل سے باطل نہیں ہونے پاتا۔ عربوں نے دوسری مشرقی اقوام کی تقلید کر کے اس ہمہ گیر روحانی وجود کا نام ”مصل فعال“ رکھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جس طرح مینہ کا قطرہ سمندر سے نکل کر کچھ دیر بعد پھر اسی میں جا ملتا ہے اسی طرح انسان کی روح مصل فعال یعنی خدا سے صادر ہو کر ایک مدت معینہ کے بعد اسی کے ساتھ واصل ہو جاتی ہے۔ اس طور پر مسلمانوں میں مسئلہ انفصال و انجذاب کا ظہور ہوا۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ہندوستان میں ساکی مٹی نے اس مسئلہ کو ایک صورت میں مسلم اثبات قابلیت کے ساتھ رواج دے کر مذہب بدھ کا مدار علیہ بنایا۔ اسی مسئلہ کو دوسری شکل میں ابن رشد نے عربوں میں رائج کیا۔ لیکن ساکی مٹی کا طریقہ تعلیم

ابن رشد کے مقابلہ میں زیادہ استادانہ تھا۔

لیکن یہ رائے شاید زیادہ تر قرین صواب ہوگی کہ اہل یورپ ابن رشد ہی کو اس مسئلہ کا بانی قرار دیتے ہیں اس لئے کہ ان کی نظروں سے وہ سلسلہ اسناد جو ابن رشد کو مسئلہ مذکور کے موجدوں سے ملاتا ہے پوشیدہ تھا۔ یورپ والے چاہے ابن رشد کو کیسی ہی وقت کی نظر سے کیوں نہ دیکھیں لیکن مسلمانوں نے مقدم کا سرا اس کے سر نہیں رہنے دیا۔ وہ ان کے نزدیک محض شارح ارسطو تھا اور اس کی حیثیت ان کے نزدیک اس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ مدرسہ اسکندریہ اور اپنے زمانہ تک کے دوسرے فلسفیانہ مسالک کا ناقل تھا۔ ذیل کا اقتباس مونیورٹان کے اس تاریخی مضمون سے ہے جو اس نے فلسفہ ابن رشد پر لکھا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کا خیال اس کے فلسفہ کی نسبت وہی تھا جو اوپر مذکور ہوا۔

اس مذہب (فلسفہ ابن رشد) کے پیروؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کا جو ہر عقلی یعنی روح جداگانہ طور پر قائم نہیں رہتی بلکہ اس عالمگیر روح یا عقل فعال یا روح کائنات یعنی خدا کی طرف رجوع کر کے اس میں جذب ہو جاتی ہے جس سے ابتدا" اس کا صدور یا خروج یا انفصال ہوا تھا۔

عقل کل یا عقل فعال یا عقل موجود فی الخارج نہ مخلوق ہے نہ اس میں کسی شے کا نفوذ ممکن ہے۔ نہ وہ فساد پذیر ہے۔ نہ اس کی ابتدا و انتہا ہے اور نہ اس میں انفرادی ارواح کی تعداد کی زیادتی سے زیادتی واقع ہوتی ہے۔ وہ مادہ سے بالکل منزه ہے۔ وہ گویا نظام کائنات کا جوہر یا طاقت ہے۔ عقل فعال کا یہ توحد ابن رشد کے فلسفہ کا اصل اصول ہے اور اسلام کے اصولی و انتہائی عقیدے یعنی وحدت واجب الوجود کے ساتھ توافق و تطابق رکھتا ہے۔

عقل منفرد یا عقل انفصالی یا عقل موجود فی الذہن عقل کل سے صادر ہوئی ہے اور انسان کی روح پر مشتمل ہے۔ ایک اعتبار سے تو یہ عقل فانی ہے اور اس کا خاتمہ جسم کے ساتھ ہو جاتا ہے مگر دوسرے اعتبار سے یہ غیر فانی بھی ہے اس لئے کہ موت کے بعد اس کی رجعت عقل کل کی طرف ہوتی ہے جس میں یہ ضم یا جذب ہو جاتی ہے اور اس طور پر تمام ارواح انسانی کے ہمہ گیر روح میں ملنے سے آخر میں صرف ایک روح یعنی یکی ہمہ گیر روح باقی رہ جاتی ہے جو سب کا مجموعہ ہے۔ زندگی کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں بلکہ اس کی مالک قدرت ہے۔ انسان کی زندگی کا مقصد انتہائی یکی ہے کہ عقل فعال کے ساتھ اس کا

اتحاد شان اکملت لئے ہوئے ہو۔ یہی اتحاد یا انضمام یا وصال روح کے لئے مایہ سرور جادوانی ہے۔ کاتب تقدیر نے ہماری لوح مقدر کا عنوان سکون و طمانیت قرار دیا ہے اور اسی کے حصول کے لئے ہم کو کوشش کرنی چاہئے۔ ابن رشد کا خیال یہ تھا کہ روح کے جسم سے جدا ہوتے ہی عقل منفرد عقل کل میں جذب ہو جاتی ہے لیکن بدھ مذہب والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ فنائے کامل یعنی نروان کے مقام تک پہنچنے میں روح کو کچھ مدت لگتی ہے اور اس اثنا میں انسان کی شخصیت برقرار رہتی ہے لیکن اس میں انحطاط و زوال شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ گھٹتے گھٹتے بالکل فنا ہو جاتی ہے۔

فلسفہ نے نظام کائنات کی توجیہ کے پیش دو پہلو اختیار کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک معنی خدا ہے جس کا وجود سب سے علیحدہ ہے اور اس کا ضمیر ایک انسانی روح ہے جسے خدا نے پیدا کیا ہے اور جو حدوث کے بعد غیر فانی ہو جاتی ہے۔ دوم یہ کہ ایک غیر معنی عقل یا غیر معین خدا ہے جس میں سے روح نکلتی ہے اور ایک مدت مقررہ کے بعد اسی میں جا کر مل جاتی ہے۔ موجودات کی تکوین کے متعلق بھی دو متضاد خیالات ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عدم سے وجود میں لائی گئی۔ دوسرے یہ کہ وہ اشکال و صور سابقہ سے نشوونما پا کر موجودہ حالت میں پہنچی۔ مسئلہ پیدائش نظریہ اول سے متعلق ہے اور مسئلہ ارتقا نظریہ ثانی سے تعلق رکھتا ہے۔

اس طور پر عرب فلسفہ کی اسی شاہ راہ پر چلے جس پر اہل چین و اہل ہند غرض مشرق کی تمام قومیں چلی تھیں۔ اس فلسفہ کے معرکہ الارا مسائل کا انحصار اس واقعہ کے اعتراف پر تھا کہ مادہ اور قوت کو فنا نہیں۔ اس نے جب دیکھا کہ قدرت میں جو بے پایاں ذخیرہ مادہ کا موجود ہے اس سے انسان کا جسم ترکیب پاتا ہے اور فنا ہونے پر اسی میں جا کر مل جاتا ہے تو لامحالہ اسے یہ نتیجہ نکالنا پڑا کہ انسان کی روح بھی عقل کل یا ذات باری تعالیٰ سے صادر ہوتی ہے اور بالاخر اس میں جا کر جذب ہو جاتی ہے۔

مسئلہ انفصال و انجذاب کی فلسفیانہ خصوصیات پر کافی وضاحت کے ساتھ نظر ڈالنے کے بعد ہم اب اس کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ یورپ میں اس مسئلہ نے اندلسی عربوں کی بدولت رواج پایا۔ اسپین وہ مرکز تھا جہاں سے اس کی شعاعیں نکل نکل کر یورپ کے علمی و عقلی حلقوں میں پھیلیں اور اسپین ہی میں اس کا حسرت ناک خاتمہ ہوا۔

خلفائے اندلس نے مشرقی عیش و عشرت کے کل لوازم فراہم کر رکھے تھے۔ ان کے قعر و ایوان شان و شوکت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے۔ ان کے دلچسپ باغوں کی

فضائیں دیکھ کر آنکھوں میں طلسمات کا نقشہ پھر جاتا تھا۔ ان کی حرم سراؤں میں ایسی ایسی نازنیں موجود تھیں جن کا حسن چاند اور سورج کو شرمتا تھا۔ یورپ کی تہذیب آج کے دن بھی اس سلیقہ اس قریبہ اور اس لطافت مذاق سے معرا ہے جو اندلسی عربوں کے پایہ تخت میں اپنی جھلک دکھاتی تھی۔ ان کے شہروں میں کوئی سڑک ایسی نظر نہ آتی تھی جس پر کنکر کٹے ہوئے نہ ہوں اور جو رات کے وقت قدیلوں سے نہ جگمگاتی ہو۔ ان کے مکانات نقش و نگار سے مزین اور قالینوں کے پر تکلف فرش سے آراستہ ہوتے تھے۔ جاڑوں میں انہیں دیکھتے ہوئے تابان گرم رکھتے تھے اور گرمیوں میں معطر اور معبر ہوا جو پھولوں کی کیاریوں سے چل کر زمین دو زنبوں میں سے ہوتی ہوئی آتی تھی انہیں خوشگوار ٹھنڈک پہنچاتی تھی۔ نفیس حمام۔ شاندار کتب خانے۔ کھانا کھانے کے فرحت افزا کمرے۔ پانی اور سیماب کے دربارہ فوارے ان کے تمدن کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ ہر شہر اور ہر قریہ میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ بانسری اور چنگ کی تال پر جابجا محفل رقص و نشاط گرم نظر آتی تھی۔ لیکن ان پر لطف صحبتوں میں اس بد مستی و بد تمیزی کا رنگ نظر نہ آتا تھا جو مسلمانوں کے پھوڑ اور گنوار شمالی ہمسایوں کے جلسوں میں عام طور سے پایا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے ہاں شراب قطعاً ممنوع تھی۔ اندلس کی دلفریب چاندنی راتوں کا لطف مسلمان امرا طرح طرح سے اڑاتے تھے۔ کوئی چمن میں بیٹھا ہوا داستان گویوں کے افسانوں سے جی بسلاتا تھا۔ کوئی باغ کی روشوں میں دوست احباب کے ساتھ ٹھٹھا ہوا فلسفیانہ مباحث میں اپنا وقت گزارتا تھا۔ غرض ان کا وقت نہایت لطف سے کستا تھا اور اگر کبھی انہیں اس زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کا خیال آتا تھا تو یہ سوچ کہ ان کو تسکین ہو جاتی تھی کہ نیکی کا اجر اسی دنیا میں مل جائے تو عالم عقبی بیکار ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے کبھی نہ گھبراتے تھے بلکہ اس خیال سے دل کو تشفی دے لیتے تھے کہ گو اس دو دن کی زندگی میں ہم محنت اور تکلیف اٹھا رہے ہیں لیکن موت کے بعد جب ہم دوسری زندگی کی سرزمین میں قدم رکھیں گے تو وہ آرام ہمارے حصہ میں آئے گا جس کے بعد کوئی محنت نہیں۔

دسویں صدی میں خلیفہ حاکم ثانی نے اندلس کو فردوس عالم بنا دیا تھا۔ عیسائی مسلمان اور یہودی بے روک ٹوک آپس میں ملتے تھے اور ایک عالمگیر برادری قائم ہو گئی تھی جس کا شیرازہ مساوات سلوک نے باندھ رکھا تھا۔ اس زمانہ کے جن مشاہیر کے نام ہم تک پہنچے ان میں جربرٹ کا نام بھی شریک ہے جو آگے چل کر پاپائے اعظم ہو گیا۔ پیٹر الملقب بہ مقدس اور دوسرے بہت سے عیسائی حیوایان مذہب بھی اسی عہد کے خرمن فضل و کمال

کے خوش چین تھے۔ پیٹر کا بیان ہے کہ میں نے ایسے علما کو یہاں دیکھا جو فنِ بیت کی تحصیل کے لئے برطانیہ سے چل کر آئے تھے۔ ارباب فضل و کمال کا عام اس سے کہ وہ کہیں کے ہوں یا کیسے ہی مذہبی عقائد کیوں نہ رکھتے ہوں نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ خود خلیفہ کے محل میں کتابوں کا ایک بہت بڑا کارخانہ موجود تھا جس میں کتابوں جلد سازوں اور نقاشوں کی ایک جماعت کثیر ملازم تھی۔ ایشیا اور افریقہ کے ہر بڑے شہر میں خلیفہ کے گماشتے مقرر تھے جن کا یہی کام تھا کہ جو نادر کتاب ملے فوراً "خرید لیں۔ اس کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں موجود تھیں جن کے منقش اوراق اور پر تکلف جلدیں بصارت کے لئے سرمہ کا حکم رکھتی تھیں۔

لیکن ایشیا کے تمام اسلامی ممالک اور نیز افریقہ و اسپین کے اپنی طبقہ کے مسلمان، علم کے جانی دشمن تھے۔ جن کا زہد و اتقا ذرا زیادہ بڑھا ہوا تھا اور جنہیں پابندی شرع کا دعویٰ شدد کے ساتھ تھا انہیں تو خلیفہ المامون تک کی نجات میں شک تھا۔ چنانچہ ان کا یہ قول تھا کہ اس شریر خلیفہ نے ارسطو اور دوسرے یونانی کفار کی تصانیف کو رواج دے کر نہ صرف خلق خدا میں ایک ہل چل ڈال دی ہے بلکہ بہشت اور دوزخ کے وجود کو بھی یہ کہہ کر کہ زمین گول ہے اور ناپی جا سکتی ہے وہی و خیالی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان لوگوں کی تعداد چونکہ بہت زیادہ تھی لہذا وہ انتظام سلطنت میں بھی دخل ہو گئے تھے۔

المنصور نے جو حاکم کے بیٹے کو بے دخل کر کے خلافت خود غصب کر بیٹھا تھا۔ خیال کیا کہ اگر میں مذہبی جماعت کا ساتھ دوں گا تو میرے قدم جم جائیں گے۔ لہذا اس نے حکم دیا کہ حاکم کے کتب خانہ میں جتنی علمی یا فلسفیانہ کتابیں پائی جائیں سب ضائع کر دی جائیں۔ چنانچہ ہزارہا کتابیں شارع عام پر جلادی گئیں۔ یا محل کے حوضوں میں ڈبو دی گئیں اور اس طور پر علم و حکمت کا وہ نادر ذخیرہ جو حاکم ثانی کے مذاق سلیم نے سالہا سال کی محنت اور لاکھوں روپیہ کے خرچ سے جمع کیا تھا منصور کی خود غرضی اور جلا کے تعصب کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ اسی طرح کے ایک دربانی انقلاب کے باعث ابن رشد (المتوفی ۱۱۹۸ء) بدھاپے میں اسپین سے ملک بدر کیا گیا۔ مذہبی جماعت نے فلسفی جماعت پر فح پائی اور ابن رشد دشمن مذہب قرار دیا گیا۔ تمام اسلامی دنیا میں فلسفہ کی مخالفت کی جانے لگی۔ ایک بھی فلسفی اس زمانہ میں ایسا نہ تھا جسے سزا نہ ملی ہو۔ بعض سزایاب ہوئے بعض جان سے مار ڈالے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ دنیائے اسلام ریاکاروں سے بھر گئی۔

اٹلی۔ جرمنی اور انگلستان میں ابن رشد کا فلسفہ چپکے چپکے پہنچ گیا تھا۔ فرانسن فرقہ کے پادریوں نے اس فلسفہ کو خاص وقت کی نظر سے دیکھا اور پیرس کی یونیورسٹی اس کا مرکز بن گئی۔ بہت سے لوگوں نے جنہیں مبداء فیاض سے جو ہر فکر سلیم عطا ہوا تھا اسے تسلیم کر لیا اور اس کا حلقہ اثر وسیع ہو چلا۔ لیکن آخر کار فرقہ ڈائمنکن نے جو فرقہ فرانسن کا رقیب تھا اس کی مخالفت شروع کی۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ ابن رشد کا فلسفہ ذات اور شخصیت کے تصور کو مٹا دیتا ہے جبرہ خیالات کی اشاعت کرتا ہے اور عقول منفردہ کے اختلافات مدارج اور ترقی کی کوئی توجیہ نہیں پیش کر سکتا۔ یہ دعویٰ کہ کائنات میں صرف ایک عقل کا وجود ہے غلط محض ہے اس لئے کہ اس سے اولیا کی کرامت اور تصرفات روحانی کی نفی ہو جاتی ہے اور انسانوں کے مدارج میں کوئی فرق قائم نہیں رہتا۔ کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ پیٹر کی مقدس اور یودا کی طعون روح میں کوئی فرق نہ ہو بلکہ دونوں کا درجہ برابر ہو؟ ابن رشد کا یہ لہدانہ مسلک پیدائش۔ تائید ایزدی۔ الہام۔ اقامت اللہ۔ استجابہ دعا۔ ثواب خیرات اور قبولیت استغفار کا منکر ہے۔ حشر اجسام اور بھائے روح کو باطل قرار دیتا ہے اور محض حظ نفس کو موجب سعادت و ابرین خیال کرتا ہے۔

اسی طرح یہودیوں میں بھی جو اس زمانہ میں صدر نشینان بزم اور اک منصور ہوتے تھے فلسفہ ابن رشد عام طور سے پھیل گیا تھا۔ مشہور یہودی فیلسوف موسیٰ بن میمون نے اسی فلسفہ کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور اس کے شاگرد اسے دنیا کے ہر حصہ میں پھیلائے جاتے تھے۔ لیکن دفعہ یہودیوں کے اس طبقہ نے جس کا میلان مذہب کی طرف تھا اس فلسفہ کی مخالفت بڑے زور و شور سے شروع کی۔ میمون کو پہلے وہ ازراہ فقر ”راس العلماء۔ فرزاندہ دوران۔ مایہ نازش سرزمین مغرب۔ آفتاب ارض مشرق“ کا لقب دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ انسانوں میں اس کا درجہ اگر کسی سے کم ہے تو صرف حضرت موسیٰ سے۔ لیکن اب انہوں نے کہنا شروع کیا کہ میمون دین ابراہیم چھوڑ بیٹھا ہے۔ پیدائش کے امکان سے منکر ہے۔ دنیا کی ابدیت کا منکر ہے۔ دہریت کے عقائد کی اشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر چکا ہے۔ خدا کو اس کی صفات سے محروم کئے دیتا ہے اور خدا کو غلایا جوف قرار دے کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ نہ دعا کو سن سکتا ہے اور نہ اسے انتظام عالم میں دخل ہے۔ مانٹ ہلیئر بارسلونا اور ٹالیڈو میں یہودیوں کی جو دینی مجلس قائم تھیں انہوں نے میمون کی تصانیف کو آگ میں جلا دیا اور اس طور پر فلسفہ ابن رشد کو ایک اور بہت بڑا صدمہ اٹھانا پڑا۔

فرڈیننڈ اور اسایلا کی فتوحات نے عربوں کی حکومت اندلس کا خاتمہ کیا ہی تھا کہ پاپا نے ان فلسفیانہ عقائد کے استیصال کی تدابیر اختیار کرنی شروع کیں کیونکہ پیشوایان مذہب عیسوی کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ عقائد یورپ میں مسیحیت کی جڑ کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

پاپا الو سنٹ چارم (۱۲۳۳ء) کے عہد تک لٹھوں کی سزا دی کے لئے اساتف کی دینی عدالتوں کے علاوہ کوئی خاص محکمہ موجود نہ تھا۔ لیکن جب مذہبی قوت ایک مرکز پر آگئی تو ایک محکمہ احتساب عقائد بنام ”انکویزیشن“ قائم کیا گیا۔ اس محکمہ نے جسے پاپا کی صدر عدالت فوجداری کہنا چاہئے قدیم مقامی عدالتوں کو مٹا کر خود ان کی جگہ لے لی۔ چونکہ اس محکمہ نے اساتف کے اقتدارات سلب کر لئے تھے لہذا انہوں نے اسے نہایت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ مگر پاپا کی طاقت کے مقابلہ میں ان کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی بے اثر محض تھی۔ اس نئی عدالت کے مرکز اٹلی۔ اسپین۔ جرمنی اور فرانس کے جنوبی صوبوں میں قائم کئے گئے۔

دعویٰ فرمانرواؤں نے ”انکویزیشن“ کو اپنی ملکی اغراض کی تکمیل کا آلہ بنانا شروع کر دیا۔ یہ بات دینی فرمانرواؤں یعنی پاپاؤں کو سخت ناگوار گذری اور ہر پاپا نے اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ وہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ یہ طاقت پادریوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔

فرانس کے جنوبی صوبوں میں ”انکویزیشن“ کا قیام استیصال اللہ زندہ کے لئے نہایت موثر ثابت ہوا تھا۔ ایریگان کے صوبہ میں بھی یہ عدالت قائم کی جا چکی تھی۔ اب یہودیوں کا قلع و قمع کرنے کی خدمت اس کے سپرد ہوئی۔

قدیم زمانہ میں جب قوم و زبانتھ کے فرمانرواؤں کا دور دورہ تھا یہودی بہت خوشحال تھے لیکن جب وزبانتھوں نے ایرکس کا وہ موحدانہ مسلک جس کی تلقین یہودیوں نے کی تھی چھوڑ کر خالص مسیحیت پرستی اختیار کی تو یہودیوں کے ساتھ بجائے ترقی کے نہایت سختی کا برتاؤ ہونے لگا اور ان کے بے ہوئے گھرانے اجڑنے لگے۔ یہودیوں کے لئے نہایت ظالمانہ اور وحشیانہ قوانین وضع کئے گئے۔ چنانچہ ایک قانون اس مضمون کا نافذ کیا گیا کہ ہر ایک یہودی غلام سمجھا جائے گا اور اسے آزادی کا کوئی حق حاصل نہ ہو گا۔ پس مقام تعجب نہیں ہے کہ جب عربوں نے اسپین پر حملہ کیا تو یہودیوں نے دل و جان سے حملہ آوروں کی مدد کی۔ عربوں کی طرح وہ بھی مشرقی نسل سے تھے۔ دونوں کا نسب حضرت ابراہیمؑ سے جو ان

کے مورث اعلیٰ تھے ملتا تھا۔ دونوں خدا کی وحدانیت کے معتقد تھے۔ اور اسی مسئلہ کی حمایت نے ان کے درمیان آقاؤں کو ان کا دشمن بنا دیا تھا۔

مسلمانوں کے عہد میں یہودیوں کے ساتھ نہایت ہی عمدہ برتاؤ کیا گیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اپنی دولت اور علم کی وجہ سے مشہور ہو گئے۔ ان میں سے اکثر ارسطو کے مقلد تھے۔ انہوں نے بہت سے مدرسے اور کالج قائم کئے۔ چونکہ ان کے تجارتی تعلقات ہر ملک کے ساتھ تھے لہذا دنیا کے ہر حصہ میں ان کو سفر کرنے کا موقع ملتا رہا۔ علم طب کی تحصیل کا انہیں خصوصیت کے ساتھ شوق تھا۔ ازمندہ وسطیٰ میں یورپ کے طبیب اور مہاجن ہر جگہ یہودی ہی تھے۔ معاملات انسانی کو فلسفیانہ انتقاد کی نظر سے جانچنے کا شرف انہیں ہی کو حاصل تھا۔ طب اور فلسفہ کے علاوہ وہ ریاضی اور ہیئت میں بھی دستگاہ دانی رکھتے تھے۔ الفانسو کی زچین انہیں کی مرتب کی ہوئی ہیں اور ڈی گاما کو سفروئے زمین کا خیال انہیں نے دلایا۔ فن ادب میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ دسویں سے لے کر چودھویں صدی تک وہ انشا پردازی میں یورپ کے استاد سمجھے جاتے رہے۔ سلاطین کے درباروں میں وہ طبیب کی حیثیت سے باریاب ہوتے تھے اور سرکاری خزانوں کے انتظام کے لئے بطور صدر محاسب یا افسر اعلیٰ مامور ہوتے تھے۔

مملکت یسوع کے کٹر پادریوں نے عوام الناس کو یہودیوں کے برخلاف بہت کچھ بھڑکایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص نے ان بچاروں کی ایذا دہی پر کربا بندھ لی۔ ان مظالم سے بچنے کے لئے بہت سے تو بظاہر عیسائی ہو گئے لیکن عیسائیت قبول کرنے کے بعد پھر اپنے آبائی مذہب کی طرف عود کر آئے۔ پایا کے سفیر متینہ دربار کیسٹیل نے محکمہ ”ایکویزیشن“ کے قائم کئے جانے پر بہت کچھ زور دیا۔ غریب اور غیر مستطیع یہودیوں پر تو یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ عیساؑ کی تقریب پر واقعہ تصلیب کی تنہیک کے لئے عیسائی بچوں کی قربانی دیتے ہیں اور دو تین یہودیوں سے یہ جرم منسوب کیا جاتا تھا کہ وہ ابن رشد کے پیرو ہیں۔ ڈا۔ نیکن فرقہ کا ایک راہب ٹارکوئی میڈا نامی ملکہ اسمایلا کا پادری تھا۔ اس کی ترغیب سے ملکہ نے پایا کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ احتساب عقائد کا مقدس محکمہ دولت اسپین میں قائم کرنے کی اجازت اسے عطا فرمائی جائے۔ چنانچہ نومبر ۱۴۷۸ء میں پایا کا فرمان صادر ہوا کہ کفر و زندہ کی سراغ برآری اور استیصال کی غرض سے ”ایکویزیشن“ کی مقدس عدالت قائم کی جائے۔ اس عدالت کی پہلے سال یعنی ۱۴۸۱ء کی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہزار اشخاص اندلس میں زندہ جلائے گئے اور ان کے علاوہ کئی ہزار مردے قبروں سے نکال

کر جلائے گئے اور سترہ ہزار اشخاص کو جرمانہ یا جس دوام کی سزا دی گئی۔ مظلوم یہودیوں میں سے جس سے بن بڑا جان سلامت لے کر بھاگ گیا باقی تختہ مشق ستم بنائے گئے۔ ٹاکوئی میڈا نے جواب کیسٹیل اور لیان کا صدر منتخب مقرر ہوا داد احتساب وحشیانہ خونخواری سے دی۔ گمنام شکایات کی بنا پر ملزم کو پکڑ بلایا جاتا تھا۔ اس کے موجد میں کوئی شہادت نہیں لی جاتی تھی۔ اسے گواہوں پر جرح کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ اقبال جرم کے لئے ملزم کو کھنبہ میں دے دیا جاتا تھا۔ اور کھنبہ کا جانلرما عذاب زمین دوز نہ خالوں میں پہنچایا جاتا تھا جہاں سے پھارے ستم رسیدوں کی چیخ پکار کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ رحم کا منہ اس طرح چڑایا جاتا تھا کہ حکم دے دیا جاتا تھا کہ مجرم کو کھنبہ میں دوسری مرتبہ نہ کسا جائے۔ فیاضی کی نقل اس طرح اتاری جاتی تھی کہ ملزم سے کہہ دیا جاتا تھا کہ آج تمہاری ہڈیوں کا چورا اچھی طرح نہیں ہوا اس لئے کل تک کے لئے کھنبہ کی سزا ملتی کی جاتی ہے۔ بد نصیب مجرموں کے تباہ شدہ خاندانوں کی مصیبت کا اندازہ کرتے ہوئے داغ لرزتا ہے۔ لارنٹ نے جو "انکویزیشن" کا مورخ ہے اندازہ لگایا ہے کہ ٹاکوئی میڈا اور اس کے شرکا نے اٹھارہ سال کی مدت میں دس ہزار دو سو بیس اشخاص کو زندہ جلایا۔ چھ ہزار آٹھ سو ساٹھ اشخاص کی موتیں بنا کر جلائیں اور ستانوے ہزار تین سو اکیس اشخاص کو دوسرے طریقہ سے مختلف سزائیں دیں۔ اس مخبوط الحواس پادری نے انجیل کے عبرانی نسخے جہاں کہیں طے ضائع کرا دیے اور سیلیٹکا میں علوم مشرقیہ کی چھ ہزار کتابیں یہ کہہ کر آگ میں جمونک دیں کہ ان میں یہودی مذہب کی تعلیم درج ہے۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم یہ سنتے ہیں کہ پاپا کی حکومت دولت مند یہودیوں سے روپیہ لے کر انہیں "انکویزیشن" کے احتساب سے مستثنیٰ کر دیتی تھی اور تزکرات انفران کی فروخت سے بہت کچھ روپیہ پیدا کرتی تھی تو ہماری نفرت اور حقارت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

لیکن اس خوفناک ظلم اور وحشیانہ جبر کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بہت کم یہودی ایسے تھے جنہوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر مذہب عیسوی قبول کیا۔ لہذا ٹاکوئی میڈا نے اس بات پر زور دیا کہ ہر غیر اصطبار یافتہ یہودی فوراً "ملک بدر کیا جائے۔ حکومت سے اس نے یہ بات بھی منوا کر چھوڑی۔ بتاریخ ۳۰ مارچ ۱۸۹۳ء یہودیوں کے اخراج کے فرمان پر دستخط ہو گئے۔ تمام یہودیوں کو جو اصطبار یافتہ نہ تھے بلا لحاظ عمر یا جنس یا حالت حکم دیا گیا کہ آئندہ جولائی کی آخری تاریخ تک ملک سے نکل جائیں۔ اور اگر واپس آئیں گے تو سزائے موت پائیں گے۔ اس فرمان قبر تو امان کی رو سے اگرچہ وہ اس کے مجاز کئے گئے تھے کہ اپنا مال

اور املاک فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے ساتھ لیتے جائیں لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی گئی تھی کہ یہ قیمت نقدی کی شکل میں نہ ہو بلکہ یا تو سامان تجارت یا ہنڈی کی شکل میں ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی مال یا جائداد کی بازار میں کیا قیمت اٹھ سکتی تھی جن کے سر پر قضاے مہرم کی طرح یہ حکم سوار تھا کہ تین مہینے کے اندر اندر ملک سے نکل جائیں اور ملک بھی وہ ملک جو ان کا زادبوم تھا جہاں وہ پلے اور بڑھے تھے جس میں ان کے آبائے اجداد صدہا سال سے بستے چلے آئے تھے۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ اس مال کو جو جولائی کے مہینے کے بعد کوڑیوں کے داموں بلکہ مفت ملنے والا تھا روپیہ دے کر خریدے۔ جب بیکس اور مظلوم یہودیوں کی جلاوطنی کی دردناک گھڑی قریب آئی تو ایک طرف تو گلی کوچوں میں ان کے نالہ و بکا کی جگر خراش آوازیں امید اور انصاف کی مرہیہ خوانی کرتی ہوئی ہوا میں رہ رہ کر گونجتی تھیں دوسری طرف ناخدا ترس پادری سڑکوں اور گلی کوچوں میں کھڑے ہوئے اپنی جوش فصاحت کو اس بد نصیب قوم کی سیہ کاریاں اور بد اعمالیاں گنانے میں صرف کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ مسیحی تماشاخی تک اس دردناک اور زہرہ گداز نظارہ کو دیکھ کر روتے تھے لیکن کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا اس لئے کہ ٹارکوئی میڈا کی قسادت قلبی اس فرمان کی تعمیل کرا کر رہی کہ یہودیوں کو کوئی شخص کسی طرح کی مدد نہ دے۔

جو یہودی اس طور پر جلاوطن ہوئے ان میں سے کچھ تو افریقہ اور کچھ اٹلی چلے گئے۔ جو جماعت اٹلی گئی تھی وہ اپنے ساتھ جمہازی بخاری کی وبالیتی گئی جس نے پھیلنے کے بیس ہزار باشندوں کو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا کر اس جزیرہ نما کو ویران کر دیا۔ کچھ یہودی ترکی کو بھی ہجرت کر گئے اور علی ہذا القیاس ان کی ایک جماعت نے انگلستان میں جا بودباش اختیار کی۔ سفر کی گوناگوں مصیبتوں کی تاب نہ لا کر ہزاروں رستہ میں مر گئے جن میں زیادہ تر شیرخوار بچے اور ان کی مائیں۔ کم سن بچے اور سن رسیدہ ضعیف اشخاص تھے۔ بہت سے ایسے تھے جنہوں نے پانی کے میسر نہ آنے سے تشنہ لہی کی حالت میں تڑپ تڑپ کر جان دی۔

یہودیوں کی اس بے یاری کی باری آئی۔ ماہ فروری ۱۸۵۴ء میں ایک فرمان بمقام اشبیلہ صادر ہوا جس میں اس تمہید کے بعد کہ دشمنان خدا کو ملک سے نکال دینا ہر مسیحی کا مقدس فرض ہے یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہر غیر اصطبلغ یافتہ عرب جس کی عمر سن شیرخوارگی سے تجاوز ہو مملکت کسٹیل دلیان سے اواخر ماہ اپریل تک ملک سے نکال دیا جائے۔ یہودیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی اپنا مال و متاع فروخت کرنے کی اگرچہ اجازت

تھی لیکن جائداد فروخت شدہ کی قیمت سونے چاندی کی شکل میں ہمراہ لے جانے کی ممانعت تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممانعت کی گئی کہ کوئی مسلمان اسلامی ممالک کو ہجرت نہ کرے اور یہ جتلا دیا گیا کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائے موت دی جائے گی۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کی حالت یہودیوں سے بھی بدتر تھی۔ کیونکہ یہودیوں کو تو پھر بھی یہ اجازت دی گئی تھی کہ جہاں ان کے سینک سائیں چلے جائیں لیکن مسلمان اس حق سے بھی محروم کر دیے گئے۔ ہسپانوی مسیحیوں کی شیطنت آمیز سفاکی اسی حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ یہ تک کہتے ہوئے خدا سے نہ ڈرتے تھے کہ مسلمانوں کی بے غیرتانه بے دینی کی پاداش میں اگر حکومت ان سب کی گردن مار دے تو کچھ بے جا نہ ہو۔

افسوس مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں عیسائیوں کے ساتھ جس رواداری اور مسالمت کا سلوک کیا تھا اس کا معاوضہ ناپاس اور حق ناشناس عیسائیوں نے ان کو دیا تو یہ دیا!! مظلوم مسلمانوں کے ساتھ سخت بدعہدی اور بے ایمانی روا رکھی گئی۔ غرناطہ کی اسلامی حکومت نے جب ہتھیار ڈالے تھے تو عیسائیوں سے یہ اقرار صالح لے لیا تھا کہ ان کے تمدنی اور مذہبی حقوق میں کسی طرح کی دست اندازی نہ کی جائے گی۔ لیکن پادری زمیندار کے اغوا پر یہ وعدہ توڑ دیا گیا اور آٹھ سو سال تک آباد رہنے کے بعد مسلمان اس ملک سے نکالے گئے۔

اندلس میں تین مذاہب یعنی عیسائیت موسیت اور اسلام کے پہلو بہ پہلو موجود ہونے سے فلسفہ ابن رشد کو نشوونما پانے کا موقع ملا تھا۔ یہ گویا اسی واقعہ کا عادی تھا جو کئی صدی پہنچر روم میں اس وقت پیش آیا تھا جب کہ ممالک مفتوحہ کے تمام دیوتا اور دیہیان پایہ تخت قیصر میں لا کر جمع کر دی گئی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ان کی طرف سے عام بد اعتقادی پھیل گئی تھی۔ خود ابن رشد پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اول مسلمان تھا پھر عیسائی ہوا پھر یہودی بنا اور انجام کار دہریہ ہو گیا۔

ازمنہ وسطیٰ میں دو تصانیف اپنے لہذا مضامین کے لحاظ سے شہرہ آفاق تھیں۔ ایک کا نام ”دی ایور لاسٹنگ گا پل“ (انجیل لازوال) تھا اور دوسری کا ”ڈی ٹرانس امپاشاریس“ (جماعت کا ذہین)۔ ثانی الذکر کتاب کے مصنف کے متعلق مختلف اقوال تھے۔ بعض لوگ اس تصنیف کو پاپائے جوہرٹ سے منسوب کرتے تھے بعض فریڈرک ٹانی سے اور بعض ابن رشد سے۔ چونکہ ڈامینیک فرقہ کے پادریوں کو ابن رشد سے قلبی عداوت تھی لہذا اس زمانہ کے ہر لہذا عقیدہ کو وہ بلا تامل اس کے سر تھوپ دیتے تھے۔

چنانچہ مسئلہ مشائے ربانی کی تحقیر و تنحیک کا ذکر ان کے حلقوں میں جب آتا تھا تو ابن رشد کے نام پر سینکڑوں گالیاں پڑ جاتی تھیں۔ ابن رشد کی تصانیف کا علم مسیحی یورپ کو اول اول تیرھویں صدی کے شروع میں میکائل اسکات کے تراجم کی وساطت سے ہوا۔ لیکن ایشیا کی طرح یورپ میں بھی اس قسم کے خیالات مدتوں پہلے سے شائع ہو چکے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ارجینیا کا فلسفہ انہیں کس شرح و وسط کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔ عربوں پر مذاق فلسفہ سے آشنا ہوتے ہی ان خیالات کا اثر پڑنے لگا تھا اور تینوں خلافتوں کے دارالعلوم میں بھی فلسفہ رائج تھا۔ اگر ان خیالات پر اس پہلو سے نظر نہ ڈالی جائے کہ عقلی نشوونما کے ایک خاص مقام تک پہنچنے کے بعد ہر انسان کا ان سے خود بخود متاثر ہو جانا یقینی ہے بلکہ ارسطو کو ان کا مبداء و منشا قرار دیا جائے تو تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ ہر اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ طبقہ نے ان کو بہ نظر استحسان دیکھا۔ ان خیالات کی جھلک ہمیں رابرٹ گراٹھ۔ راجر بیکن اور اسپینوزا کی تصانیف میں نظر آتی ہے۔ ابن رشد ان خیالات کا موجد نہ تھا بلکہ محض شارح اور مفسر تھا۔ تیرھویں صدی کے یودیوں کو استاد کی مسند پر صرف شاگرد بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ ارسطو کی جگہ فلسفہ مشائے کے شارح اعظم ابن رشد نے لے لی تھی۔ مسئلہ انفعال و انجذاب کے مسیحی ماننے والوں کی تعداد یورپ میں اس قدر بڑھ گئی کہ پاپائے انگریز راول (۱۸۵۵ء) کو مجبوراً ”مداخلت کرنی پڑی۔ چنانچہ اس کے حکم سے البرٹس میکسن نے ایک کتاب مسئلہ وحدت عقل کل کے رو میں لکھی۔ اصلیت و ماہیت روح پر بحث کرتے ہوئے اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ”یہ مسئلہ کہ ایک عقل مجرد اپنے نور سے افراد انسانی کو ان کے پیدا ہونے سے پہلے متور کرتی ہے اور ان کے فنا ہونے کے بعد قائم رہتی ہے ایک قابل ترین غلطی سے آلودہ ہے۔“ لیکن ارسطو کے زندہ جاوید شارح کا سب سے بڑا مخالف سینٹ ٹامس اکیویناس تھا جس نے وحدت عقل کل۔ انکار توفیق ایزدی۔ عدم امکان پیدائش اور اسی قسم کے دوسرے عقائد کو جو طردانہ سمجھے جاتے تھے شہود کے ساتھ تردید اور اپنے ہم صغیروں یعنی ڈامینیکن فرقہ کے پادریوں کی رائے میں گویا ان الحادات کا قلع و قمع کر ڈالا۔ سینٹ ٹامس نے جب اپنے مسیحی بھائی بندوں کو ابن رشد کے عقائد اختیار کرتے ہوئے دیکھا جو اس کی نظر میں مسلمانوں سے بھی بدتر تھا تو اس کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی اور ڈامینیکن پادریوں کے قول کے مطابق اس ”فرشتہ خصال عالم جید“ نے اپنے مخالف پر وہ نمایاں قلمی فتوحات حاصل کیں جن کی یادگاریں فلارنس اور پاپائے کے نقاشوں نے پردہ تصویر پر چھوڑی ہیں۔

ڈامینیکن پادریوں کے سند طیش پر یہ خیال تازیانہ باری کرتا تھا کہ فرانسکن فرقہ کے پادری جن سے انہیں رقابت تھی ابن رشد کے عقائد رکھتے تھے۔ چنانچہ ڈینی نے جو فرقہ ڈامینیکن کا طرف دار تھا ابن رشد کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ایک نہایت خطرناک مذہب کا بانی ہے۔ غرض ابن رشد پر تینوں بڑے مذاہب کی طرف سے متفقہ تکفیر کا فتویٰ جاری کیا گیا اور یہ خطرناک قول اس سے منسوب کیا گیا کہ ”تمام مذاہب اگرچہ غالباً“ مفید ہیں لیکن ان کے باطل ہونے میں شک نہیں۔“ دین کی کونسل میں بالاتفاق یہ قرار پایا کہ اس کی تفسیفات کی اشاعت مطلقاً“ روک دی جائے اور تمام عیسائیوں کو ان کے مطالعہ کی ممانعت کی جائے۔ ڈامینیکن فرقہ کے پادریوں کو ”انکوژیشن“ کا سامبب آلہ ہاتھ آگیا تھا اور ان کے سفاکانہ جروتشد سے تمام یورپ کانپ رہا تھا۔ اس زمانہ میں جو بے دینی پھیلی ہوئی تھی اس کا ذمہ دار یہ فرقہ ابن رشد ہی کے فلسفہ کو قرار دیتا تھا۔ لیکن مخالفوں کے مقابلہ میں اس کے طرفداروں کی بھی ایک جماعت موجود تھی۔ نہ صرف پیرس بلکہ شمالی اٹلی کے تمام شہروں میں فرانسکن فرقہ کے عیسائی اس کے پیرو تھے اور کل مسیحی دنیا میں ان مناقشوں کی وجہ سے ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔

ڈامینیکن فرقہ کے پادریوں کی زبان ابن رشد کے کافرانہ و ملحدانہ کارناموں کا ذکر سننے سننے اٹلی کے نقاشوں اور مصوروں کی نظروں میں وہ بیدینی کی مجسم علامت بن گیا تھا۔ اٹلی کے اکثر شہروں اور قریوں میں روز قیامت اور دوزخ کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ ان میں ابن رشد کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا ہے۔ چنانچہ پایا کے ایک اسی طرح کے مرقع میں جہاں حضرت محمدؐ اور ایرنئیس اور دجال کی تصاویر ہیں وہاں ابن رشد بھی موجود ہے۔ ایک اور مرقع میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ابن رشد زمین پر گرا ہوا ہے اور سینٹ ٹامس اس کی چھاتی پر سوار ہے۔ سینٹ ٹامس کی فتح اور ابن رشد کی شکست لازم و ملزوم ہو گئی تھی۔ اٹلی کے مصوروں کی مذہبی تصاویر سولہویں صدی تک ابن رشد کے بغیر مکمل نہ سمجھی جاتی تھیں اور اس کے فلسفیانہ عقائد پیڈوا کی یونیورسٹی میں سترہویں صدی تک بدستور قائم رہے۔

فلسفہ ابن رشد کے اسپین سے اٹھ کر یورپ پر حملہ آور ہونے کی داستان ہم بالا جمال سنا چکے۔ اب صرف اتنا بیان کرنا باقی رہتا ہے کہ فریڈرک ٹانی کی سرپرستی میں اس فلسفہ نے سسلی میں بھی سر اٹھایا لیکن اس طرف سے اس کی پیش قدمی زیادہ کامیاب نہ ثابت ہوئی۔ فریڈرک ٹانی نے اسے پوری طرح سے تسلیم کر لیا تھا۔ اپنی کتاب ”سیسلین

کونسنسس" (مسائل سلسلی) میں اس نے ابدیت عالم اور ماہیت روح پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان مسائل کے متعلق اس کے تمام شکوک ابن سینا کے جوابات سے رفع ہو گئے جو دین رشد کا پیرو تھا۔ لیکن فریڈرک ٹائی کی یہ آزاد خیالی چند روزہ ثابت ہوئی۔ وہ پاپائے اعظم کی مخالفت کی تاب نہ لا سکا اور اس کے مغلوب ہونے پر اس فلسفیانہ خیالات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اٹلی کے شمالی حصہ میں فلسفہ ابن رشد مدتوں قائم رہا۔ وینس کے طبقہ اعلیٰ میں اس کا اثر یہاں تک تھا کہ ہر وضع و شریف اس کے اتباع پر مجبور تھا۔ آخر کار کلیسا نے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ یعنی لیٹرن کونسل نے ۱۵۱۳ء میں یہ فتویٰ صادر کیا کہ جو شخص ان قابل فہم عقائد کی حمایت کرے گا وہ لحد و بے دین سمجھا جائے گا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں وہ ٹیکن کونسل نے بھی اپنے گزشتہ اجلاس میں ان عقائد کو مورد سب و شتم ٹھہرایا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام مطاعن و ملامن کے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ خیالات بنی نوع انسان کے ایک جزو غالب کے نزدیک صحیح ہیں۔

۱۔ فرانس کا سب سے زیادہ مشہور فلسفی ہے جس کے فحیل نے مابعد الطبیعیات پر ایک غیر ممکن الموقع چھوڑا ہے۔ عقلیات میں اس کا اصل اصول یہ نکتہ ہے کہ میرے وجود پر میری قوت غور و فکر گواہ ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ کی تائید کو وہ موجودات کی حقیقت کی تصدیق کے لئے ضروری نہیں خیال کرتا بلکہ ذہنیات ہی کو حق مطلق کے انکشاف کا ذریعہ اولی سمجھتا ہے۔ ڈیکارٹ کا سن ولادت ۱۵۹۶ء اور سن وفات ۱۶۵۰ء ہے۔ مترجم

۲۔ سر رینن کالن بروڈلی انگلستان کا ایک مشہور طبیب ہے جسے فن جراحی سے دستگاہ کامل حاصل تھی۔ ۱۷۸۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۳ء میں ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے دربار کا سرجن مقرر ہوا۔ اس کی تاریخ انتقال ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۲ء ہے۔ علم الامراض۔ علم الاعصاب اور علم النفس پر اس کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔ مترجم

۳۔ فرنسوا ایپور (المتوفی ۱۸۸۱ء) سوئزرلینڈ کا ایک مشہور ماہر علم خواص الاشیاء ہے۔ اگرچہ آخر آخر میں بصارت سے محروم ہو گیا تھا لیکن اپنی بی بی اور ایک وفادار ملازم کی مدد سے اس نے شد کی کمیوں اور چوٹیوں کے حالات کے متعلق نہایت قیمتی مواد فراہم کیا اور اپنی معلومات کو ۱۷۹۶ء کو بصورت کتاب شائع کیا۔ مترجم

۴۔ الفانسو دہم شاہ لیان ویسٹیل سے مراد ہے جو ۱۳۵۲ء میں تخت پر بیٹھا۔ فن ہیئت سے اسے ایک خاص لگاؤ تھا۔ چالیس ہزار اشرفیوں کی لاگت سے اس نے ہیئت کی وہ شہر آفاق زنجیل تیار کرائیں جن کا حوالہ متن میں دیا گیا ہے۔ ان زنجیوں کو میڈرڈ کی اکاڈمی نے نظر ثانی کر کے ۱۸۰۷ء میں ازسرنو مرتب کیا۔ مترجم

۱۵۰۰ سالہ زمانہ سابق میں ایک مستقل بادشاہت تھی۔ آج کل اسپین کا ایک صوبہ ہے جس کی شمالی سرحد فرانس ہے۔ اس کا رقبہ کوئی چار ہزار چوالیس میل ہو گا۔ مترجم

۱۶۰۰ بنی اسرائیل کے فراعنہ مصر کی غلامی سے آزاد ہونے کی خوشی میں جو تہوار یہودی ہر سال مناتے ہیں اس کا نام عید الفصح ہے۔ مترجم

نزاع مذہب و سائنس دربارہ ماہیت عالم

ماہیت عالم کی نسبت مذہبی خیال یعنی زمین چھٹی ہے۔ ہشت اور دوزخ۔ اہل سائنس کا خیال یعنی زمین گول ہے۔ زمین کی جسامت کی دریافت۔ نظام شمسی میں اس کا درجہ اور نظام شمسی کے دوسرے اعضا کے ساتھ اس کے تعلقات۔ کولبس۔ ڈی گاما اور میگیلین کے تین بڑے بحری سفر۔ سیاحت گرد زمین۔ ایک درجہ کی پیمائش اور راقص ساعت کے ذریعہ سے کریمت زمین کی تعین۔ کوپرنیکس کے اکتشافات۔ دورین کی ایجاد۔ گلیلیو "اکویریشن" کے اجلاس میں حاضر کیا جاتا ہے۔ اس کی سزایابی۔ سائنس کی فتح کلیسا پر۔

جسامت نظام شمسی کی تحقیق کی کوشش۔ سیارہ زہرہ کے مورد منطقہ البروج کی بنا پر آفتاب کے زاویہ اختلاف منظر کی تعین۔ کہ زمین اور انسان کی پیچ میرزی۔

خیالات دوبارہ جسامت کائنات۔ زوایا سے اختلاف مناظر کو اکب۔ برونیہ دعوی کرتا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی آباد دنیا میں موجود ہیں۔ محکمہ "اکویریشن" اسے گرفتار کر کے قتل کر دتا ہے۔

اب ہم ان مباحث کو حیطہ تحریر میں لانا چاہتے ہیں جو فلسفہ کے تیرے متمم بالشان مسئلہ یعنی ماہیت عالم کے متعلق پیدا ہوئے۔ اگر ہم صحیفہ قدرت کا مطالعہ بنظر انتقاد نہ کریں۔ تو ہمیں بظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ زمین ایک وسیع چھٹی سطح ہے جو قہر آسمان کو سارے ہوئے ہے اور یہ قہر نیلگوں فوقانی و

تختانی دریاؤں کے مابین حد فاصل ہے۔ اجرام فلکی یعنی آفتاب ماہتاب اور ستارے مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ ان کے قامت کی کستری اور غیر متحرک زمین کے گرد ان کا حرکت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا درجہ زمین سے براتب حقیر اور بدارج کم ہے۔ جو حیوانات رونے زمین پر موجود ہیں ان میں علوشان کے لحاظ سے ایک بھی انسان کا مد مقابل نہیں اور اس لئے اس کا یہ قیاس حق بجانب ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کے فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے۔ آفتاب اس مقصد سے پیدا کیا گیا ہے کہ دن کے وقت اسے روشنی پہنچائے۔ چاند اور ستارے اس غرض سے بنائے گئے ہیں کہ اندھیری راتوں میں ان کا اجالا اس کی رہبری کرے۔

مختلف ادیان و مذاہب کی روایات کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم نے ہر منزل عقل و ادراک میں قدم رکھتے وقت مظاہر فطرت کے متعلق یہی تصورات قائم کئے ہیں۔ تمدن کے دور اول میں انسان نے زمین کو اکبر و اعظم موجودات سمجھ کر مرکز کائنات خیال کیا ہے اور انسان کو افضل و اشرف المخلوقات مان کر زمین کی مرکزی ہستی سمجھا ہے۔ اور یہ نتیجہ انسان نے دنیا کو ایک سرسری نظر سے دیکھ کر بلا غور و تعمق ہی قائم نہیں کیا بلکہ مختلف آسمانی صحائف بھی جو وقتاً فوقتاً انسان پر نازل ہوئے ہیں من حیث التقلید اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ان الہامی صحائف نے انسان کو یہ بھی بتایا ہے کہ آسمان کے بلوریں گنبد کے اوپر نور لازوال اور عیش خلد کا ایک عالم ہے جسے بہشت کہتے ہیں۔ اس عالم میں خدا تعالیٰ اور ملائکہ رہتے ہیں اور ممکن ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو بھی یہی جگہ رہنے کو ملے۔ زمین کے نیچے ابدی تاریکی اور عذاب کا مستقر ہے جہاں بدوں کو رکھا جائے گا۔ اس طرح عالم مرنے کے پردہ میں گویا عالم غیر مرنے کی تصویر دکھا دی گئی ہے۔

ترکیب عالم کے اس تصور کی بنا پر بڑے بڑے مذاہب کی عمارتیں قائم کی گئی ہیں اور چونکہ اس کے قیام کے ساتھ بہت سی زبردست مادی اغراض وابستہ تھیں لہذا اس کے استحکام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ جو کوششیں پیروان سائنس کی طرف سے اس کی مسلمہ غلطیوں کی تصحیح کے لئے عمل میں لائی گئیں ان کی مخالفت بعض دفعہ یہاں تک ہوئی ہے کہ خونی ریزی تک نوبت پہنچی ہے اور یہ مخالفت محض اس خیال سے کی گئی ہے کہ اگر مخالفین کو کامیابی ہوئی تو بہشت و دوزخ کے مواقع کی تحسین کا ستون مرکز ثقل سے ہٹ جائے گا اور اس افضلیت و اکملیت کو جو کائنات کے موضوع اعظم ہونے کے لحاظ سے انسان سے منسوب کی جاتی ہے بہت بڑا صدمہ پہنچے گا۔

لیکن اس قسم کی کوششوں کا عمل میں آنا ایک یقینی اور لازمی امر تھا۔ جب انسان اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے قابل ہو گیا تو اس کو اس دعوے کے تسلیم کرنے میں تامل ہونے لگا کہ زمین ایک سطح غیر محدود ہے۔ کسی شخص کو اس امر میں کلام نہیں ہو سکتا کہ جو آفتاب آج ہمارے دیکھنے میں آیا ہے یہ وہی آفتاب ہے جسے ہم نے کل دیکھا تھا۔ اس کے نورانی قرص کا ہر صبح از سر نو نمودار ہونا یہ خیال پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ زمین کے نیچے سے گذرا ہے۔ لیکن اگر یہ خیال صحیح ہو تو وہ دوسرا مفروضہ کہ زمین کے نیچے ہمیشہ تاریکی چھائی رہتی ہے باطل ہوا جاتا ہے۔ غرض آفتاب کا زمین کے نیچے سے ہو کر گزرتا شکل زمین کی کرویہ کا خیال کم و بیش وضاحت کے ساتھ ضرور پیدا کرتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ زمین کا پھیلاؤ سمت تحتانی میں غیر محدود نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آفتاب کا نفوذ اس کے جرم میں ممکن نہیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی ایسا سوراخ یا منفذ زمین میں موجود ہو جس کی راہ سے آفتاب نکل آتا ہو اس لئے کہ سال کے مختلف موسموں میں اس کے طلوع و غروب کے مقامات مختلف ہوتے ہیں۔ علی ہذا القیاس ستارے بھی زیر زمین مختلف اطراف میں حرکت کرتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ زمین کے نیچے ایک صاف رستہ موجود ہو۔

آیات الہامی کو اس جدید استقرا کے ساتھ تطبیق دینے کے لئے اس قسم کی توجیہات سے وقتاً فوقتاً کام لیا گیا جن کی مثال کا ساس انڈو کا ہیلو سٹیز کی کتاب ”کریمین ٹاپو گریفی“ (جغرافیہ مسیحی) میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں۔ اس کتاب میں جیسا کہ ناظرین کو یاد ہو گا یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ زمین ایک چپٹی سطح ہے جس کے شمالی حصوں میں ایک بہت بڑا پہاڑ واقع ہے۔ آفتاب جب اس پہاڑ کے پیچھے چلا جاتا ہے تو رات ہو جاتی ہے۔

ایک نہایت دور دراز تاریخی زمانہ میں انسان کو کسوف و خسوف کی حقیقت کا علم ہو چکا تھا۔ چاند گمن کے مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ زمین کا سایہ ہمیشہ مدور ہوتا ہے۔ اس مشاہدہ سے یہ بدیہی نتیجہ نکلا کہ زمین کی شکل بھی گول ہو گی اس لئے کہ جو جسم ہر حالت میں گول سایہ ڈالتا ہو وہ خود بھی گول ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ دوسرے قرائن و دلائل سے بھی جن کو آج کل پچہ پچہ جاتا ہے یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی کہ زمین کروی شکل ہے۔

لیکن شکل زمین کی تحسین اسے اس مسند عظمت سے ہٹا نہ سکی جس پر ظاہر ہیں

آنکھوں نے اسے بٹھا رکھا تھا۔ چونکہ وہ بظاہر تمام دوسری اشیاء کے مقابلہ میں برائے بڑی نظر آتی تھی اور کسی محسوس ہو سکنے والی شے کی اس کے سامنے کوئی ہستی نہ تھی لہذا ظاہر بیوں نے نہ صرف اسے مرکز عالم بلکہ خود عالم تصور کیا۔

اگرچہ ان نتائج نے جو زمین کو کروی شکل ماننے سے پیدا ہوئے مروجہ مذہبی عقائد پر نہایت گہرا اثر ڈالا لیکن جو نتائج جسامت زمین کی تحمین سے مرتب ہوئے وہ کہیں زیادہ اہم تھے۔ علم ہندسہ کا مبتدی بھی اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ زمین کی جسامت کا صحیح حال سطح زمین کے ایک درجہ کی پیمائش سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے غالباً نہایت قدیم زمانہ میں متعدد کوششیں المائے ہیت کی طرف سے ہوئیں جن کے نتائج ضائع ہو گئے ہیں۔ لیکن اتنا ہم کو تحقیق کے ساتھ معلوم ہے کہ ایرانیان ستھین نے مصر میں اسکندریہ اور سین کے درمیان یہ سمجھ کر کہ سین ٹھیک خط سرطان کے نیچے واقع ہے ایک درجہ ارضی کی پیمائش کی کوشش کی تھی۔ لیکن چونکہ یہ دونوں مقامات نصف النہار کے ایک ہی خط پر واقع نہ تھے لہذا ان کے باہمی فاصلہ کا صرف اندازہ لگا لیا گیا۔ پیمائش نہیں کی گئی۔ اس کے دو صدی بعد ہلسٹونٹیس نے اسکندریہ اور اوڈس کے درمیان اس قسم کی دوسری کوشش کی۔ سہیل ثانی روشن ستارہ مقام ثانی الذکر پر افق کو مس کرتا تھا اور اسکندریہ میں افق سے ساڑھے سات درجہ اونچا تھا لیکن اس مرتبہ بھی ان دونوں مقامات کے درمیان سمندر کا حامل ہونا پیمائش کو مانع آیا اور فاصلہ کا صرف تخمینہ قائم کر لیا گیا۔ بالآخر جیسا کہ ہم سابق میں بیان کر آئے ہیں خلیفہ المامون نے درجہ ارضی کی دو پیمائشیں کرائیں۔ ایک ساحل بحر قزقم پر دوسری عراق عرب میں شہر کوفہ کے قریب۔ ان مختلف تجربوں کا عام نتیجہ یہ نکلا کہ زمین کا قطر سات اور آٹھ ہزار میل کے درمیان ہے۔

جسامت زمین کے اس تخمینہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عظمت و جہوت کے اس درجہ سے جس پر وہ ابھی تک خوش عقیدہ لوگوں کے نزدیک فائز تھی گر گئی اور دینیات میں اس کی وجہ سے ایک بل چل پڑ گئی۔ اس بل چل میں ارشاد کس حوٹن سیماس کی تحقیقات نے بہت بڑا حصہ لیا۔ ارشاد کس مدرسہ اسکندریہ کا قبر ہیت دان تھا جس نے ۲۸۰ قء کا زمانہ پایا ہے۔ شمس و قمر کی مقادیر و احوال پر اس نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں وہ اس قائل تعریف مگر ناقص طریقہ کو بوجہ نجات بیان کرتا ہے جس کے ذریعہ سے اس نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے بھی کئی قرن پہلے نیشا غورث کے ذریعہ سے ایک نیا خیال ہندوستان سے یورپ میں پہنچ چکا تھا۔ اس خیال کے مطابق آفتاب مرکز کائنات تھا۔

آفتاب کے گرد اگر د عطارد۔ زہرہ۔ زمین۔ مریخ۔ مشتری اور زحل اپنے اپنے محوروں پر گھومتے ہوئے درجہ بدرجہ گردش کرتے تھے۔ بقول سیروسٹاسیس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے تو گردش فلک کی ناقابل خیال سرعت کی وجہ سے جو مشکل پیش آتی ہے وہ رفع ہو جاتی ہے۔

قیاس چاہتا ہے کہ ارشاد کس کی تصانیف جو کتب خانہ اسکندریہ میں موجود تھی جو یس یزید کی آتش زنی میں جل گئی ہوں۔ اس کی صرف ایک تصنیف ”مقادیروا بعداد و شمس و قمر“ جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے دستبرد روزگار سے بچی بچائی ہم تک پہنچی ہے۔

ارشاد کس نے نظام نیشا غورث کو ایک حقیقت نفس الامری سمجھ کر تسلیم کر لیا۔ آفتاب کا حیرت انگیز فاصلہ اور اس لحاظ سے اس کا عظیم الشان جرم اس اعتراف کا مدار علیہ تھا۔ نظام نیشا غورث نے آفتاب کو مرکز کائنات قرار دے کر زمین کا درجہ بہت ہی گھٹا دیا اور اسے ان چھ نواخ کے زمرہ میں شریک کر دیا جن کا کام یہ ہے کہ آفتاب کے گرد گردش کیا کریں۔

لیکن ارشاد کس نے فن ہیئت کی ایک یہی خدمت نہیں کی۔ یہ دیکھ کر کہ زمین کی حرکت سے کواکب کے ظاہری یا اعتباری مقامات و مواقع پر کوئی نمایاں اثر نہیں پڑتا۔ اس نے یہ استدلال کیا کہ ان کا اور زمین کا باہمی فاصلہ سورج اور زمین کے باہمی فاصلہ سے بھی بدرجہ زیادہ ہے۔ لہٰذا کواکب کا قول ہے کہ کائنات کے جلال و عظمت کا صحیح خیال جیسا ارشاد کس کو تھا ویسا مند سین زمانہ قدیم میں سے اور کسی کو نہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فاصلہ ثوابت کو مد نظر رکھنے کے بعد زمین کی حقیقت ایک ذرہ ٹائجز سے زیادہ باقی نہیں رہتی۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے اوپر بجز فضائے بسیط اور کواکب کے اور کچھ نہیں ہے۔

لیکن اجسام فلکی کے مقامات حقیقی و اعتباری کے متعلق ارشاد کس کے خیالات کو قدما نے تسلیم نہیں کیا بلکہ نظام بطلمیوسی جس حیثیت سے کہ اس کی تصریح المصلیٰ میں کی گئی ہے عام طور پر رائج ہو گیا۔ اس زمانہ کا فلسفہ طبعی نہایت ناقص و غیر مکمل تھا۔ مثلاً ”نظام نیشا غورث پر بطلمیوس کا ایک اعتراض یہ تھا کہ اگر زمین متحرک ہو تو وہ اور دوسرے لطیف اجسام کو پیچھے چھوڑ جائے۔ اسی لئے اس نے زمین کو مرکز کائنات قرار دے کر یہ ظاہر کیا کہ قمر۔ عطارد۔ زہرہ۔ شمس۔ مریخ۔ مشتری اور زحل درجہ بدرجہ اس کے گرد گھومتے ہیں اور زحل کے مدار کے بعد منفعت الثوابت ہے۔ ایک خیال اس زمانہ میں یہ بھی تھا کہ

ٹھوس پلوریں کرے ہیں جن میں سے ایک مشرق سے مغرب کی طرف اور دوسرا شمال سے جنوب کی طرف حرکت کرتا ہے لیکن یہ محض ایک فرضی خیال تھا جو یوڈا کس کا پیدا کیا ہوا تھا اور اس کا بطلیموس حوالہ تک نہیں دیتا۔

اس لحاظ سے نظام بطلیموسی گویا ارضی المرکز ہے اس نے زمین کا تقوُّق قائم رکھا اور اس لئے مسیحی یا اسلامی عقائد کو برا فروختہ ہونے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بانی کی مسلمہ شہرت اور اس غیر معمولی قابلیت نے جو اس کی تصنیف متعلقہ ساخت آسانی پر صرف کی گئی ہے۔ نظام بطلیموس کو چودہ سو سال یعنی دوسری سے لیکر سولہویں صدی تک پایہ اعتبار سے ساقط نہ ہونے دیا۔

مسیحی دنیا میں اس زمانہ دراز کا زیادہ تر حصہ ماہیت ذات باری کے مباحث اور مذہبی اقتدارات کے حصول کی غرض سے پادریوں کی رقیبانہ کشمکش میں کٹا۔ مسیحی بزرگان دین کے اجتہاد نے اس عام عقیدہ کے ساتھ شامل ہو کر کہ انجیل جملہ علوم و فنون کی مخزن ہے۔ مشاہدہ و تجربہ اور علمی اکتشافات کا رستہ روک دیا۔ اگر ہیئت کے کسی مسئلہ کی تحقیق کا شوق اتفاق سے کسی کو کچھ دیر کے لئے پیدا ہو بھی گیا تو ثوابت و سیار کے مندرسانہ مشاہدہ کے بجائے آگسٹائن یا کلسٹیس کے سے بزرگوں کی تصانیف کی ورق گردانی سے مسائل کی تفسی کر دی گئی۔ روایت کو درایت پر یہاں تک ترجیح دی گئی کہ عیسائیت نے باومیکہ اسے وجود میں آئے ہوئے پندرہ صدیاں گزر چکی تھیں ایک بھی ہیئت دان پیدا نہ کیا۔

لیکن اسلام کی حالت اس بارے میں مسیحیت سے بہت بہتر ہے۔ مسلمانوں کے اکتساب علوم و فنون کا دور فتح اسکندریہ کی تاریخ یعنی ۶۳۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جناب رسالت ماب کو رحلت فرمائے ہوئے صرف چھ سال کی مدت منقضي ہوئی تھی۔ دو صدیوں کے اندر اندر مسلمان نہ صرف یونان کے حکمائے طبعین کی تصانیف سے واقف ہو گئے بلکہ ہر علمی مسئلہ کے مالہ و ما علیہ پر نظر انتقاد ڈالنے کے قابل ہو گئے جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں اس معاہدہ کی رو سے جو میکائیل ثالث شہنشاہ یونان اور المامون عباسی میں ہوا تھا۔ مامون نے بطلیموس کی تصنیف ”سنکسس“ کا ایک نسخہ حاصل کر کے اہل کا ترجمہ الجہلی کے نام سے عربی میں کرایا تھا۔ یہ کتاب ہیئت دانان عرب کے لئے مستشار اعظم بن گئی اور اس کو اپنے علم کی بنا قرار دے کر انہوں نے سائنس کے بعض نہایت ہی اہم مسائل حل کئے۔ انہوں نے زمین کی جسامت دریافت کی۔ ان تمام

ستاروں کی فہرستیں تیار کیں جو اس حصہ آسمان پر نظر آئے جو ان کے مقابل تھا اور بڑے بڑے ستاروں کے نام رکھے جو آج تک تبدیل نہیں ہوئے۔ انہوں نے سال کی صحیح مدت کا اندازہ لگایا۔ انعطاف ضیائے کوکبی کے اصول کی تحقیق کی۔ ”ہندلم“ (رقاص) والی گھڑی ایجاد کی جن آلات سے ستاروں کی روشنی کا اندازہ کیا جاتا ہے ان کو بہت کچھ ترقی دی۔ یہ اصول دریافت کیا کہ شعاع نور ہوا میں بشل قوس گزرتی ہے۔ چاند اور سورج کے افق پر نظر آنے کی توجیہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اجرام قبل از طلوع و بعد از غروب کیوں نظر آتے ہیں۔ کہ ہوا کی بلندی کو ناپا اور یہ بلندی اٹھاون میل قرار دی جمٹ پٹے کی اصلی کیفیت اور ستاروں کے جھلکانے کی صحیح وجہ بیان کی۔ یورپ میں اول اول جو رصد گاہ قائم ہوئی وہ مسلمانوں ہی کی بنائی ہوئی تھی۔ اجرام فلکی کے نقل و حرکت کے متعلق ان کی باریک بینی و دقیقہ سنجی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ زمانہ حال کے قاتل سے قاتل مہندسوں نے ان کے رصدی نتائج سے استناد کیا ہے۔ مثلاً ”لیپلیس اپنی کتاب ”نظام عالم“ میں لبتانی کے مشاہدات کی سند اس امر کے قطعی ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے کہ مرکز آفتاب اور مرکز مدار ارض کا درمیانی فاصلہ کم ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ مسئلہ اعوجاج طریق الشمس اور مشتری و زحل کی عدم مساوات ہائے اکبر کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے ابن یونس کے مترتبہ نتائج سے مدد لیتا ہے۔

عقدہ ماہیت عالم کے حل کرنے میں بیست و اٹان اسلام نے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں ہم نے ان کا عشر عشر بھی بیان نہیں کیا۔

بہر حال اس زمانہ میں سائنس کو جو کچھ ترقی حاصل ہوئی مسلمانوں کی بدولت ہوئی۔ عیسائی دنیا پر جمل و ادہام کی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ مسیحوں کو علمی مسائل کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ وہ مجسمہ پرستی۔ گور پرستی۔ عشائے ربانی۔ کرامات اولیا۔ معجزات۔ تعرفات ارواح اور خوش عقیدگی کے اسی طرح کے دوسرے گورکھ و عندوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

اس خواب غفلت سے مسیحی دنیا پندرہویں صدی کے خاتمہ تک بیدار نہ ہوئی۔ اس وقت بھی شوق علم اس کے جاگنے کا باعث نہ ہوا۔ بلکہ اسباب ترغیب کچھ اور ہی تھے یعنی اقوام یورپ میں تجارتی رقابت پیدا ہو گئی اور کولبس ڈی گاما اور فرڈیننڈ میکیل کی جہاز رانی مسئلہ شکل زمین کے تصفیہ کا اخیر باعث ہوئی۔

مشرقی ایشیا کی تجارت نے ان مغربی اقوام کو جو اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں ہمیشہ مالا مال کیا ہے۔ ازمندہ وسطی مین اس تجارت کا مرکز اٹلی کا شمالی حصہ تھا۔ یہ

تجارت شمال و جنوب دو طرف سے ہوتی تھی اور اس کے مرکز علی الترتیب جنوا۔ اور وینس تھے۔ جنوا سے مال تجارت جہازوں میں بحر کر براہ بحیرہ اسود و بحیرہ خزر ایران کے شمالی ساحلوں پر اتارا جاتا تھا اور وہاں سے اونٹوں پر بار کر کے آگے بھیجا جاتا تھا۔ جنوبی صدر مقام یعنی وینس سے جو مال روانہ ہوتا تھا وہ یا تو شامی اور مصری بندر گاہوں پر اتار کر براہ خشکی اندرون ملک میں بھیج دیا جاتا تھا یا بحیرہ قلزم اور بحر عرب کی راہ سے مشرقی ممالک کی طرف روانہ کر دیا جاتا تھا۔ جن سوداگروں کا صدر مقام وینس تھا انہوں نے دوران حروب سلیبیہ میں ذرائع باربرداری کی بہر سانی سے بہت بڑی دولت کمائی تھی۔

اہل وینس کی زمانہ شناسی نے ان کے تعلقات کو چونکہ شام اور مصر کی اسلامی دولتوں کے ساتھ بگڑنے نہ دیا تھا لہذا ان کو اسکندریہ اور دمشق میں اپنے سفارت خانے قائم رکھنے کی اجازت تھی اور باوجودیکہ ان ممالک میں جدال و قتال کے ہنگامے آئے دن پھا ہوتے رہتے تھے پھر بھی وینس کی تجارت ترقی پر تھی۔ لیکن شمالی شاخ تجارت جس کا صدر مقام جنوا تھا کچھ تو تباہیوں اور ترکوں کی حملہ آوری اور کچھ ان ممالک کے اندرونی فسادات کی وجہ سے جن میں سے اس کے مال کو گزرتا پڑتا تھا ویران ہو چلی تھی اور وہ وقت قریب آگیا تھا کہ یہ تجارت بالکل ہی مٹ جائے۔

افنی ظاہری کی مدور شکل۔ سمندر میں اس کا ڈوبا ہوا نظر آتا۔ جہازوں کا کھلے سمندر میں بتدریج نمودار ہونا اور رفتہ رفتہ غائب ہو جانا یہ تمام ایسے واقعات ہیں جن کے مشاہدہ سے وہ جہازران جن کو مبداء فیاض سے جوہر فکر سلیم عطا ہوا ہے اس نتیجہ کی طرف مائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ زمین کروی شکل ہے۔ مسلمان مہندسین و فلاسفہ کی تصنیفات نے اس خیال کو مغربی یورپ میں عام طور سے شائع کر دیا تھا لیکن دین مسیحی کے پیشواؤں نے اسے کبھی استحسان کی نظر سے نہ دیکھا اور ان سے بجز اس کے توقع بھی اور کیا ہو سکتی تھی۔ جب جنوا کی تجارت تباہی کے قریب پہنچ گئی تو یہاں کے بعض جہاز رانوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر زمین حقیقت میں گول ہو تو ممکن ہے کہ جنوا کا آفتاب تجارت جو لب بام ہے پھر نصف النہار پر چمکتا ہوا نظر آئے۔ اس لئے کہ جو جہاز آہٹائے جبل الطارق میں سے ہوتا ہوا بحراوقانوس کے پھونچ سمت مغرب ناک کی سیدھ چلا جائے وہ ضرور ہے کہ ہندوستان کے مشرقی ساحل پر پہنچ جائے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑا فائدہ اس میں یہ بھی تھا کہ مال تجارت جہازوں کے ذریعہ سے خشکی کے سفر کی محنت شاقہ اور مصارف کثیر کے بغیر منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا۔

جنوا کے جن ناخداؤں کو یہ خیال پیدا ہوا ان میں کرسٹوفر کولبس بھی شریک تھا جس کے مقدر میں ایک عظیم الشان حقیقت کا عملی انکشاف لکھا تھا۔

کولبس بیان کرتا ہے کہ اس مسئلہ کی طرف اس کی توجہ ابن رشد کی تحریرات نے منعطف کی اس کے علاوہ اس کا ایک دوست ٹلسنلی ٹائی فلارنس کا رہنے والا تھا جس کو فنِ ہیئت کے مطالعہ کا بدرجہ غایت شوق تھا۔ ٹاسلی مسئلہ کریت شکل زمین کا بہت بڑا حامی تھا اور کولبس کے خیالات پر اس کی تعلیم کا بھی قوی اثر پڑا۔ لیکن جنوا میں کولبس کی حوصلہ افزائی بہت کم ہوئی۔ کئی سال تک وہ مختلف ممالک کے فرہانواؤں اور امرا کو اپنے مجوزہ ارادہ کی تکمیل کی سرپرستی پر آمادہ کرتا رہا لیکن اس کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ اسپین کے پادریوں کو اس کے ارادہ میں کفر اور زندہ کی ڈراؤنی صورت نظر آئی اور سلیمنا کی مسیحی کونسل نے اس پر بدعت سینہ کا فتویٰ لگایا۔ چاروں طرف سے پادریوں کی یہ آوازیں آنے لگیں کہ جو شخص زمین کو گول مان کر اس کے گردا گرد سفر کرنے کی لہذا نہ کوشش کرتا ہے وہ عہدِ عتیق، عہدِ جدید، زور، رسولوں کی پیشین گوئیوں اور سینٹ کریسٹم۔ سینٹ آگسٹائن سینٹ جروم۔ سینٹ گرگوری۔ سینٹ ہیل اور سینٹ امبروز کے نوشتات و ملفوظات کو جھٹلاتا ہے۔

لیکن اس کی مسامی جلیلہ آخر کار پار آور ہو کر رہیں۔ اسپین کی ملکہ آسایلا نے اس کی ہمت بڑھائی اور ناخدا یان پیملاس کے ایک دولت مند خاندان ہنرمان ٹائی نے روپیہ سے اس کی مدد کی۔ اس خاندان کے کچھ لوگ اس کے ساتھ چلنے کے لئے بھی آمادہ ہو گئے۔ شاہ فرڈیننڈ نے اسے تاتار کے خان اعظم کے نام ایک چٹھی اپنے خاص دستخط سے لکھ کر دی اور ایک بحری نقشہ جو ٹاسلی کے مرتبہ نقشہ کی بنا پر تیار کیا گیا تھا اپنی رہنمائی کے لئے اس نے ساتھ لیا۔ غرض کیل کانٹے سے پوری طرح لیس ہو کر اس نے ۳ اگست ۱۴۹۲ء کو تین چھوٹے چھوٹے جہازوں کے بیڑے کے ساتھ نکلر اٹھایا۔ سوا دو مہینے کے مسلسل سفر کے بعد ۱۱ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو آدمی رات سے ذرا دیر پہلے اس نے اپنے جہاز کے سلوٹھ سے کچھ فاصلہ پر ایک متحرک روشنی دیکھی۔ دو گھنٹے کے بعد دوسرے جہاز سے توپ کے دھننے کی آواز آئی جو اس بات کی علامت تھی کہ اہل جہاز نے خشکی کو دیکھ پایا ہے۔ جب آفتاب طلوع ہوا تو جہاز ساحل پر پہنچ گئے اور کولبس نے نئی دنیا میں قدم رکھا۔

جب وہ یورپ واپس آیا تو سب نے یہی خیال کیا کہ جس ساحل پر وہ نکلر انداز ہوا وہ ایشیا کا مشرقی حصہ تھا اور اس لحاظ سے اس کا سفر علی سبیل انظر کامیاب رہا۔ خود کولبس کو

مرتے دم تک اسی بات کا یقین رہا۔ لیکن متعدد بحری سفر جو بعد میں کئے گئے ان سے ساحل امریکہ کی عام حدود بہت جلد معلوم ہو گئیں اور جب بلبوآ نے براعظم جنوبی کو دریافت کیا تو اصل حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا وہ مٹا گیا اور وہ غلطی رفع گئی جس میں ٹاسلی اور کولبس دونوں کے دونوں جہلاتھے یعنی مغربی بحری سفر میں یورپ اور ایشیا کا درمیانی فاصلہ اس فاصلہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا جو اٹلی سے خلیج گنی تک جانے میں طے کرنا پڑتا ہے اور یہ سفر کولبس نے بارہا کیا تھا۔

کولبس نے اپنے پہلے سفر میں ۳ ستمبر ۱۴۹۲ء کو رات کے وقت جب کہ وہ مجمع الجزائر ازورس کے ایک جزیرہ کورود سے ۲۱/۲ درجہ مشرق کی جانب تھا یہ بات مشاہدہ کی کہ جہازوں کی کمپاس کی سوئیوں کا رخ حسب معمول مائل بہ شمال و مشرق نہیں ہے بلکہ مائل بہ مغرب ہے جوں جوں جہاز آگے بڑھتے گئے یہ انحراف بھی نمایاں ہوتا گیا۔ اگرچہ کولبس ہی پہلا وہ شخص نہیں ہے جس کی نظر اس انحراف پر پڑی لیکن اس میں شک نہیں کہ خط عدم انحراف کو سب سے اول اسی نے دریافت کیا۔ اس سفر سے واپس آتے وقت اس کے برعکس حالت پائی گئی یعنی کمپاس کی سوئی کا مغربی میلان کم ہوتا گیا۔ تا آنکہ اس خط نصف النہار پر پہنچ کر جہاں انحراف باقی نہیں رہتا سوئی کا رخ پھر شمال کی طرف ہو گیا۔ اس کے بعد جوں جوں یورپ کا ساحل قریب آتا گیا سوئی کا مشرقی میلان بڑھتا گیا۔ اس سے کولبس نے یہ نتیجہ نکالا کہ خط نفی میلان یا عدم انحراف ایک مقررہ جغرافیائی خط ہے جو نصف کرہ مشرقی و نصف کرہ مغربی کے درمیان بمنزلہ حد فاصل ہے۔ جب اسپین اور پرتگال میں مقبوضات خارجہ کے متعلق جھگڑا ہوا تو پاپائے اگرمڈر سادس نے اس نزاع کے تصفیہ کی غرض سے ایک فرمان ماہ مئی ۱۴۹۳ء میں جاری کیا۔ جس میں یہ خط ان دونوں اقوام کے مقبوضات کی دوائی حد فاصل قرار دیا گیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خط بتدریج مشرق کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ چنانچہ ۱۴۹۳ء میں لندن کے خط نصف النہار پر منطبق ہو گیا۔

پاپا کے فرمان کی رو سے پرتگال کے مقبوضات کی حدود خط عدم انحراف کا مشرقی حصہ قرار دی گئی تھیں۔ بعض مصری یہودیوں کی زبانی دولت پرتگال کو معلوم ہوا کہ براعظم افریقہ کے گردگرد جہاز پر سفر کرنا باسانی ممکن ہے۔ اس لئے کہ براعظم مذکور کے مشائے جنوب میں ایک راس ہے جس کا عبور آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اس اطلاع کی بنا پر تین جہازوں کا ایک مختصر سا بیڑا سرکردگی واسکوڈی گاما ۹ جولائی ۱۴۹۷ء کو پرتگال سے روانہ ہوا اور بتاریخ ۲۰ نومبر اس امید کو قطع کرنے کے بعد ۱۹ مئی ۱۴۹۸ء کو کالی کٹ میں لنگر انداز

ہوا جو ہندوستان کے ساحل پر واقع ہے۔ پیپا کے اس فرمان کی رو سے جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے مشرق کے اس سفر کی بدولت اہل پر نکال کو ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔

راس امید کا چکر کاٹنے سے پہلے واسکوڈی گاما کے چماڑوں کا رخ عموماً "جنوبی سمت میں تھا۔ بہت جلد یہ بات اہل جہاز کے دیکھنے میں آئی کہ سطح افق سے قطب ستارے کا ارتفاع کم ہو رہا ہے اور خط استوار پر پہنچنے کے بعد تو یہ ستارہ نظر سے بالکل ہی غائب ہو گیا مگر اور ستارے جن میں سے بعض شاندار بروج کی شکل میں تھے نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔ یہ وہی ستارے تھے جن کا تعلق نصف کرہ جنوبی کے آسمان سے ہے۔ تمام واقعات سے ان نظری قیاسات کی تائید ہوتی تھی جو شکل زمین کی کرویئت کے متعلق قائم کئے گئے تھے۔

ان جدید اکتشافات کے سیاسی نتائج نے پیپاے روما کو گرداب تشویر و تذبذب میں ڈال دیا۔ جن مذہبی روایات اور ملکی مصالح پر پیپا کی حکومت کا انحصار تھا وہ کسی طرح اس کے مقتضی نہ تھے کہ زمین کی کوئی اور شکل بجز شکل مسطح کے جس کا ذکر کتب الہامی میں تھا تسلیم کیا جائے۔ اخفائے واقعات ممکن نہ تھا اور سوفسطائیہ تالیفیں بیکار تھیں۔ وغیرہ اور جہاز کی تجارت کا چراغ گل ہو گیا۔ یورپ کی شکل تبدیل ہو گئی۔ بحری طاقت ان ممالک سے جو بحر روم کے سواحل پر واقع تھے رخصت ہو گئی اور وہ ملک جو بحر اوقیانوس کے اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے تھے جہاز رانی کے مرکز بن گئے لیکن دولت اسپین نے اپنے تجارتی رقبہ کی اس کامیابی کے آگے ہاتھ پاؤں مارے بغیر سر تسلیم خم کرنا گوارا نہ کیا۔ فرڈیننڈ میکیل نامی ایک اولوالعزم ناخدا نے اراکین دولت سے یہ عرض کیا کہ اگر اس نئی دنیا میں جو اب براعظم امریکہ کے نام سے موسوم ہے کسی نئی آہنائے کا پتہ معلوم ہو جائے تو مغربی سمندروں کو قطع کرنے کے بعد ہندوستان اور "اسپانکس آئیلنڈس" (جزائر الاقواج) تک پہنچ جانا ممکن ہے اور اگر یہ ہم ملے ہو جائے تو پیپا کے فرمان کی رو سے اسپین کو بھی ہندوستان کی تجارت میں اسی قدر حصہ مل سکتا ہے جس قدر پر نکال کو میکیل کی ان باتوں کو حکومت اسپین نے دل کے کانوں سے سنا اور پانچ جہازوں کی ایک مہم جس کے ساتھ دو سو مہتیں آدمی تھے اس کی سرکردگی میں ۱۰ اگست ۱۴۹۲ء کو ایشیہ سے روانہ کی گئی۔

میکیل نے سیدھا جنوبی امریکہ کے ساحل کا رخ کیا اور تن بہ تقدیر اس امید پر بڑھا چلا گیا کہ اسے کوئی قدرتی آبی منہد براعظم میں سے مل جائے گا جس کے ذریعہ سے وہ بحر اعظم جنوبی میں داخل ہو سکے گا۔ خط عدم انحراف پر پہنچ کر ہوا چلنی بند ہو گئی اور کامل دو

ہینے دس دن تک بند رہی۔ جہاز کے ملاحوں کو یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں وہ ایسے منظر میں نہ چلے آئے ہوں جہاں ہوا کبھی چلتی ہی نہ ہو اور ان کا بیڑا اس خوفناک سمندر کی ساکن و غیر متحرک موجوں سے کبھی پار ہی نہ ہو سکے۔ یہ خوف بغاوت سے مبدل ہو گیا اور جب خدا خدا کر کے ہوا کے جموں کے سمندر کے طلسم خموشی کو توڑا تو جھک چلنے لگا۔ اور ایسا طوفان اٹھا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ لیکن سمندر کا سکون، طوفان کا جوش، ملاحوں کی بغاوت۔ اہل جہاز کی بیوفائی اس کی جبین استقلال پر بل تک نہ ڈال سکی۔ ایک سال سے زیادہ کی بحر نوردی کے بعد اس نے وہ آبنائے دریافت کی جو اب اس کے نام سے منسوب ہے۔ اٹلی کا ایک باشندہ پگاٹی جو اس کے ہمراہ تھا بیان کرتا ہے کہ جب میکیل کی نظر بحر جنوبی یعنی بحر الکابل کی عظیم الشان پہنائی پر پڑی تو فرط مسرت سے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اس خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے اس محیط اعظم کے نامعلوم خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے آخر یہاں تک پہنچا دیا۔“

قطب کی شدت کا یہ عالم تھا کہ روٹی کے بجائے اسے چمڑے کے وہ ٹکڑے چبانے پڑے جن کی پھٹے ہوئے بادبانوں میں گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ پانی اسے ایسا پینا پڑا جس میں کیڑے پڑ گئے تھے اور بو آنے لگی تھی۔ اس کے جہاز کے ملاح بھوک سے جان بلب اور مرض احراق خون میں مبتلا تھے مگر یہ کوہ وقار شخص جسے زمین کے کروی شکل ہونے کا کامل یقین تھا ان جان فرسا مصائب سے مطلق متاثر نہ ہوا۔ وہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے جہاز کو برابر سمت شمال و مغرب میں بڑھاتے چلا گیا اور چار مہینے تک کسی آبادی پر اس کی نظر نہ پڑی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ بحر الکابل کی سطح پر اس نے بارہ ہزار میل سے کم مسافت نہ طے کی ہوگی۔ خط استوا سے گزرنے کے بعد اسے قطب ستارہ بھی دکھائی دیا اور آخر کار جزائر لیڈرونس کے ساحل پر اس نے ننگر ڈالا۔ یہاں اس کی ملاقات سائرا کے بعض باشندوں سے ہوئی جو قسمت آزمائی کے لئے وطن سے نکلے تھے لیکن افسوس اس کے مقدر میں یہ نہ لکھا تھا کہ اس عظیم الشان بحری مہم کو اپنے ہاتھوں انجام تک پہنچائے۔ انہیں جزائر میں یا تو یہاں کے وحشیوں نے یا خود اس کے ہمراہیوں نے اسے مار ڈالا۔ اس کے بعد اس کے مددگار سہائین ڈلکانو نے جہاز کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور راس امید کا رخ کیا۔ رستے میں جو مصیبتیں اسے جھیلنی پڑیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے راس امید آئی جس سے گزر کر اس نے چوتھی مرتبہ خط استوار کو عبور کیا۔ ۷ ستمبر ۱۵۲۲ء کو تین سال سے زیادہ کے بحری سفر کے بعد اس کا جہاز سین وٹوریا نامی سینٹ بوکر کے بندرگاہ میں جو ایشیہ کے

متصل واقع ہے لنگر انداز ہوا۔ اس جہاز کا سفر بنی نوع انسان کی تاریخ میں سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس لئے کہ زمین کے گرد اگرد سفر کرنے کا پہلا شرف اسی کو حاصل ہوا۔

سین دثوریا مغرب کی سمت میں سفر کرتے رہنے کے بعد اسی نقطہ پر پہنچ گیا تھا جہاں سے چلا تھا۔ اس سے زیادہ ناممکن التزید ثبوت زمین کے گول ہونے کا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اب مسیحیت کو یہ مجال نہ رہی کہ یہ دعوے کرے کہ زمین چٹی ہے۔ تصور اسطرح ارض انسانی دماغ سے پیشہ کے لئے محو ہو گیا۔

میکیل کے بحری سفر کی تکمیل کے پانچ سال بعد مسیحی دنیا نے تحقیق جسامت ارض کے متعلق پہلی کوشش کی جو ایک فراہمی طیب فرئل کے حصہ میں آئی۔ فرئل نے اول حساب لگایا کہ پیرس میں ارتفاع قطب کس قدر ہے۔ اس کے بعد وہ شمال کی طرف روانہ ہوا تا آنکہ وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا۔ جہاں پیرس کے مقابلہ میں ارتفاع قطب ایک درجہ زیادہ تھا ان دونوں مقامات کے درمیان جس قدر فاصلہ تھا اس کی پیمائش اس نے اپنی گاڑی کے ایک پہیے کے چکروں کے ذریعہ سے کی جس کے ساتھ اس نے ایک معیاس المسافت لگا دیا تھا۔ جب ایک درجہ کا فاصلہ اس طریقہ پر معلوم ہو گیا تو اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین کا دور حسب پیمانہ اٹلی بقدر چوبیس ہزار چار سو اسی میل کے ہے۔

اس کے بعد مختلف ممالک میں باضیاط تمام پیمائش کی گئی۔ اسٹیل نے ایک درجہ ارضی کی پیمائش ہالینڈ میں کی۔ ناروے نے لندن اور یارک کے درمیان انگلستان میں پکارڈ نے ”فرنج اکاڈمی آف سائنسز“ (مجلس ترقی علوم و فنون) کی سرپرستی سے فرانس میں۔ پکارڈ کی ترکیب یہ تھی کہ مثلثوں کے ایک سلسلہ کے ذریعہ سے دو نقطوں کو باہم ملا کر دائرہ نصف النہار کے اس قوس کو جو ان نقطوں میں حائل ہو ٹاپ لیا جائے اور اس کا مقابلہ عرض البلد کے اس اختلاف کے ساتھ کیا جائے جو مشاہدات فلکی سے حاصل ہو۔ اتصال نقاط کے لئے جو مقامات اس طور پر تجویز کئے گئے وہ بوازن اور سرودن تھے۔ اول الذکر نواح پیرس میں واقع ہے۔ اور ثانی الذکر امینس کے قریب۔ اختلاف عرض البلد کی محسین برج ذات الکری کے بعد سمت الراس کے مشاہدہ سے کی گئی۔ پکارڈ کے طرز عمل میں دو امور خاص طور سے توجہ کے قابل ہیں۔ اول تو اس طریقہ کے عمل میں لاتے وقت جو آلات استعمال کئے گئے ان میں دوربین بھی شامل تھی۔ ثانیاً اس سے جو نتائج مستنبط ہوئے انہوں نے جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہو گا نیوٹن کے لئے اصول کشش ثقل کی ہمہ گیری کا ثبوت بہم پہنچایا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اصول علم الحركات خصوصاً "ان اصول نے جو نیوٹن کے دریافت کئے ہوئے تھے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ چونکہ زمین ایک جرم دوار ہے لہذا اس کی شکل کمال کروی نہیں ہو سکتی بلکہ مثل کروی یا مسطح الارضین ہونی چاہئے یعنی ضرور ہے کہ وہ قطبین پر چپٹی ہو۔ اس سے لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک درجہ کا طول خط استوا کے اطراف و جوانب کے مقابلہ میں قطبین کے قریب زیادہ ہونا چاہئے۔

"فرنج اکاڈمی" نے فیصلہ کر لیا کہ پکارڈ کے عمل کو وسعت دی جائے اور پیمائش کا سلسلہ ہر طرف قائم کر کے فرانس کا ایک ایسا نقشہ تیار کیا جائے جو نسبت زیادہ صحیح ہو۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل جزالتوا میں پڑی رہی اور کہیں ۱۷۹۸ء میں جا کر فرانس کی شمالی حد یعنی ڈنکرک سے لے کر جنوبی حد تک کی پیمائش ختم ہوئیں۔ ان پیمائشوں کی تاویل اختلاف آرا کا باعث ہوئی۔ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ان پیمائشوں سے کہہ زمین کا مستطیل الارضین ہونا پایا جاتا ہے لیکن بعض کی رائے اس کے خلاف تھی وہ ان پیمائشوں کو زمین کے مسطح الارضین ہونے کا ثبوت سمجھتے تھے۔ شکل اول کو عام طور پر نیمبو سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور شکل ثانی کو نارنگی سے۔ اس اختلاف کا تعفیہ کرنے کے لئے حکومت فرانس نے "اکاڈمی" کی مدد سے دو علمی نقائص دائرہ نصف النہار کے ایک ایک درجہ کی پیمائش کے لئے خط استوا اور شمال کی طرف روانہ کئے۔ پہلا نفیفہ پیرو کو گیا اور دوسرا سویڈن و لپ لینڈ کی طرف دونوں جماعتوں کو بہت کچھ دقیق اور زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن شمالی جماعت نے جو لپ لینڈ کو گئی تھی اپنا کام پیرو والی جماعت سے جو نو سال تک اپنے فرائض منوحہ کی انجام دی میں مصروف رہی بہت پہلے ختم کر لیا۔ بہر حال دونوں جماعتوں کے نتائج کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ کہہ زمین مسطح الارضین یعنی قطبین پر چپٹا ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس پیمائش کا نہایت وسیع اور صحیح پیمانہ پر بار بار اعادہ ہوتا رہا ہے۔ انگریزوں نے انگلستان اور ہندوستان میں پیمائش کی اور فرانسیسیوں نے اوزان و پیمائش کے طریقہ مطربیہ کو جاری کرتے وقت جو پیمائش کی وہ اپنی دقیقہ سنجی اور مویشکانی کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس پیمائش کو ڈلاہر اور مشائن نے ڈنکرک سے شروع کر کے بارسلونا تک پہنچایا اور وہاں سے ہائیت اور اراگون نے اس کے سلسلہ کو جزیرہ فار مشیرا تک وسعت دی جو مئارکا کے قریب واقع ہے۔ اس پیمائش کا طول ساڑھے بارہ درجہ تھا۔

پکائش کے اس بلا واسطہ طریقہ کے علاوہ زمین کی شکل مختلف عروض البلد میں ایک معینہ طول کے رقبہ ساخت کے اتہزازات کی اختلاف تعداد سے معلوم ہو سکتی ہے۔ ان اتہزازات سے اگرچہ نتائج سابقہ کی تصدیق و توثیق ضرور ہوتی ہے لیکن پکائش درجات کے مقابلہ میں ان کے ذریعہ سے زمین کی بیضیت زیادہ بڑھی ہوئی قرار پاتی ہے۔ جوں جوں خط استوا قریب آتا جاتا ہے رقبہ کے اتہزاز یا ارتعاش میں آہستگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا فاصلہ زمین کے مرکز سے قطبین کے مقابلہ میں خط استوا پر زیادہ ہے۔

سب سے زیادہ معتبر و موثق پکائش کی بنا پر زمین کی جسامت حسب ذیل اعداد میں ظاہر کی جاسکتی ہے۔

قطر اکبر یا قطر استوائی ۷۹۵۰ میل
قطر اصغر یا قطر قطبی ۷۸۹۹ میل
دونوں کا فرق یعنی انضغاط قطبین ۲۶ میل

یہ وہ نتائج ہیں جو اس بحث سے پیدا ہوئے کہ زمین کی شکل کیسی ہے اور جسامت کس قدر ہے۔ ابھی یہ بحث ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک اور بحث جس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ اہم نتائج وابستہ تھے۔ پیدا ہو گئی۔ یہ بحث اس مسئلہ کے متعلق تھی کہ آفتاب اور دوسرے سیاروں کے مقابلہ میں زمین کا درجہ اور حیثیت کیا ہے۔

پروشیا کے ایک مندرس کوہنہکس نے ۱۵۰۷ء میں ایک کتاب ”ادوار اجرام فلکی“ کے عنوان سے لکھی تھی۔ جوانی کے زمانے میں اس نے اٹلی کا سفر کیا تھا اور فن ہیت کی تحصیل کے بعد روما میں ریاضیات کا درس بھی ایک عرصہ تک دیا تھا۔ نظام بطلمیوس و نظام نیشا غورث کا بہ احسان نظر مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ نظام ثانی الذکر صحیح ہے اور اس کی تصنیف کا مقصد اسی کی تائید و توثیق تھا۔ چونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے خیالات و حقائق الہامی کی نفی مطلق کرنے کے لحاظ سے اس مورد عتاب کلیسائے عیسوی بنائیں گے۔ لہذا اس نے اپنی کتاب کا مقدمہ جس کا روئے خطاب پاپائے پال ثالث کی طرف ہے حزم و احتیاط کی راہ سے معذرت کے پیرائے میں اس طرح شروع کیا ہے۔ ”میں نے صرف بطور تجربہ اس بات کے تحقیق کرنے کی جرات کی ہے کہ اگر زمین کو متحرک فرض کر لیا جائے تو آیا یہ ممکن ہے کہ اجرام سماوی کی گردش کو جو توجیہات قدامت کی ہیں ان سے کوئی زیادہ تر معقول توجیہ ہمارے ہاتھ آجائے۔ قیاسات کے قائم

کرنے کا حق ایک ایسا حق ہے جو دوسروں کو بھی اس سے پہلے عطا کیا جا چکا ہے۔ اور میں نے بھی اس کتاب کی تصنیف میں اسی حق سے فائدہ اٹھایا ہے۔“

اس ڈر کے مارے کہ خدا جانے کتاب کے شائع ہوتے ہی کیا آفت اس پر ٹوٹ پڑے اس نے چھتیس سال تک اس کی اشاعت نہ کی اور اسی شش و پنج میں رہا کہ ممکن ہے کہ مصلحت اسی میں ہو کہ جس طرح نیشا غورٹ اور دوسرے حکما اپنے معلومات کو سینہ سینہ منتقل کرتے چلے آئے ہیں اور ان کے عقائد بجز ان کے خاص خاص احباب کے اور کسی کو معلوم نہیں ہوئے اسی طرح میں بھی اپنے اصول کی تلقین کا حلقہ اپنے دوستوں تک ہی محدود رکھوں اور آئندہ نسلوں تک انہیں بذریعہ روایت ہی پہنچا دوں لیکن آخر کار اپنے دوست پادری شوہرگ کے بے حد اصرار پر اس نے اسے ۱۵۴۳ء میں شائع کیا۔ جب مطبع سے اس کا ایک نسخہ چھپ کر اس کے پاس پہنچا تو وہ بستر مرگ پر پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ کتاب کا حشر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ ”اکویڑیشن“ نے اسے لمبھانہ قرار دیا اور اس حکم امتناعی میں جس کی رو سے اس کتاب کا پڑھنا جرم قرار دیا گیا نظام کوہونیکس کی نسبت یوں در افشائی کی گئی۔ ”یہ وہ باطل نیشا غورٹی مذہب ہے جو کتب مقدسہ کی ضد ہے۔“

ہیت دانوں کا یہ قول بالکل درست ہے کہ کوہونیکس کی کتاب نے علم ہیت کی شکل ہی بدل ڈالی۔ اس نے نظریہ ششی مرکز کے حق میں قول فیصل بن کر آفتاب کو نظام اجرام کا مرکز قرار دیا اس نے ثابت کر دیا کہ ثوابت کا فاصلہ زمین سے اس قدر ہے کہ ہمارا وہم و گمان بھی وہاں نہیں پہنچ سکتا اور زمین فضائے غیر متناہی میں بمنزلہ ایک چھوٹے سے نقطہ کے ہے۔ نیوٹن پر کوہونیکس کو یہ تقدیم حاصل ہے کہ اس نے آفتاب قمر اور دوسرے اجرام سماوی میں کشش ثقل کا موجود ہونا تسلیم کیا۔ اگرچہ اس لایات کے فرض کرنے سے وہ غلطی میں پڑ گیا کہ اجرام سماوی کی حرکت بشكل دائرہ ہونی چاہئے۔ یہ خیال کوہونیکس کو دور مرغ کے مشاہدہ سے یہ دیکھ کر کہ مختلف اوقات میں اس کے قطر کا طول مختلف ہوتا ہے پیدا ہوا تھا۔

نظام کوہونیکس پر اس الزام کے لگانے میں کہ وہ کتب مقدسہ کے الہامی حقائق کی نفی کرتا ہے پیشوایان دین نے غالباً ”منطقیانہ استدلال سے کام لیا انہوں نے یہ سوچا کہ اگر زمین کو جواب تک مرکز و مدار کائنات سمجھی جاتی تھی عظمت و جلال کی اس مسند سے نیچے اتار دیا جائے گا اور ایسے کثیر التعداد اجرام فلکی کا وجود تسلیم کر لیا جائے گا جن میں سے

بیشتر اس کے ہم درجہ اور اکثر اس پر فوقیت رکھتے ہیں تو اس کے گویا یہ معنی ہوں گے کہ زمین عنایات ایزدی کی مورد خاص نہیں ہے۔ بیشمار ثوابت میں سے اگر ہر ایک بمنزلہ آفتاب ہو اور اس کے گرد سیارے گھومتے ہوں جن میں ہمارے جیسی مکتھ اور ذمہ دار ہستیاں آباد ہوں تو اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ ہم کو تو خیر بعد ہیوط خدا کے بیٹے کی قیمتی قربانی کے کفارہ کے ذریعہ سے نجات مل گئی لیکن ان بچاروں کا کیا حشر ہوا ہو گا؟ کیا ان میں کوئی ایسی قوم نہیں جو ہماری طرح گناہ میں مبتلا ہوئی ہو یا ہو سکتی ہو؟ اور اگر ہے تو اس کے لئے نجات دہندہ کہاں سے آئے گا؟

۱۶۰۸ء میں ہالینڈ کے ایک باشندے پرشی نامی نے دریافت کیا کہ اگر بلور کے دو گزروں کو ایک خاص طریقہ پر باہم ملایا جائے اور ان میں سے دیکھا جائے تو دور کی چیزیں بڑی ہو کر بہت صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ اسی ایجاد کا نام دوربین ہے۔ دوسرے سال فلارنس کے ایک باشندے گلیلیو کو جس نے ریاضیات اور علوم طبیعیہ پر کتابیں لکھ کر بہت بڑا نام پیدا کیا تھا۔ یہ واقعہ معلوم ہوا۔ پرشی کے ایجاد گئے ہوئے آلہ کی ترکیب کا اگرچہ اس کو مطلق علم نہ تھا لیکن اس نے اپنے لئے اسی قسم کا ایک نیا آلہ اپنی ترکیب سے ایجاد کیا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی ایجاد کو ترقی دی۔ یہاں تک کہ سب سے آخر میں جو دوربین اس نے بنائی اس میں اشیاء تیس حصے بڑی ہو کر نظر آتی تھیں۔ جب اس کے ذریعہ سے اس نے چاند کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ سطح قمر پر زمین کی طرح وادیاں اور پہاڑ موجود ہیں۔ چنانچہ پہاڑوں کا سایہ بھی اسے نظر آیا۔ زمانہ سابق میں یہ کہا جاتا تھا کہ عقد ثریا میں پہلے سات ستارے تھے۔ لیکن ایک ستارہ نامعلوم طور پر غائب ہو گیا۔ دوربین لگا کر جب گلیلیو نے اس برج کو دیکھا تو بجائے سات کے چالیس ستارے نظر آئے۔ غرض جس طرف اس کی نظر پڑتی تھی نئے ستارے جو مجرد آنکھ کو نظر نہ آ سکتے تھے دکھائی دیتے تھے۔

۷ جنوری ۱۶۱۰ء کی رات کو اس نے تین چھوٹے چھوٹے ستارے ایک خط مستقیم میں سیارہ مشتری کے نزدیک دیکھے اور کچھ دن بعد ایک چوتھا ستارہ اور دیکھا ان ستاروں کو اس نے مشتری کے گرد گردش کرتے ہوئے پایا۔ اور جب اس کو یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ ایک چھوٹے سے پیمانہ پر نظام کوہونمکس کا نمونہ پیش کرتے ہیں تو اس کی خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی۔

ان عجائبات کا مشہر ہونا تھا کہ تمام دنیا ادھر جمک پڑی۔ پادریوں کے گھر میں بھی ان اکتشافات نے ہل چل ڈال دی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے اس مذہبی اصول کا

اب خدا ہی حافظ ہے کہ کائنات محض انسان کے فائدہ کی غرض سے پیدا کی گئی ہے۔ ممکن نہ تھا کہ وہ بے شمار ثابت جواب تک نظر سے مخفی تھے انسان کے دل میں یہ خیال نہ پیدا کریں کہ ان کے پیدا کرنے سے خدا کا مقصد یہی نہیں ہے کہ انسان کو شب کے وقت روشنی پہنچائی جائے بلکہ اور ہی کچھ ہے۔

نظام کوہرنیکس پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ اگر عطارد اور زہرہ آفتاب کے گرد دور زمین کے اندر گردش کرتے ہوں تو ضرور ہے کہ ان میں قمر کی طرح تبدلات نظر آئیں اور زہرہ میں تو جس کی روشنی اور چمک دمک اس درجہ نمایاں ہے یہ تبدیلیاں اور بھی بین ہونی چاہئیں۔ خود کوہرنیکس نے اس اعتراض کی معقولیت کو تسلیم کیا تھا اور اس سے اس کا کوئی شافی جواب نہ پڑا تھا۔ کلیلو نے جب دوربین لگا کر زہرہ کو دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ تبدلات مترقہ حقیقت میں موجود ہیں یعنی ایک وقت میں یہ سیارہ ہلال تھا پھر ماہ نیم ماہ ہوا اس کے بعد محدب الاستویر ہوا یعنی اس کا تین چوتھائی حصہ روشن ہو گیا۔ اور بالآخر بدر کامل بن گیا۔ کوہرنیکس کے زمانہ سے پہلے یہ خیال تھا کہ سیارے بذات خود روشن ہیں لیکن زہرہ اور مریخ کے تبدلات یعنی مدارج تغیر نے ثابت کر دیا کہ وہ مستحضر ہیں یعنی ان کی تابانی آفتاب کی روشنی کا عکس ہے۔ ارسطو اور اس کے پیروں کے اس عقیدے کو کہ اجسام ساوی اجسام ارضی کی طرح فساد پذیر نہیں ہیں۔ کلیلو کے ان اکتشافات نے سخت صدمہ پہنچایا کہ زمین کی طرح چاند میں بھی پہاڑ اور وادیاں ہیں اور آفتاب بے عیب نہیں ہے بلکہ اس کا چہرہ داغدار ہے اور بجائے اس کے کہ وہ شان و وقار کے ساتھ ایک جگہ قرار پذیر ہو اپنے محور کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ نئے ستاروں کے منظر نے بھی اس عقیدے کو بہت کچھ متزلزل کر دیا تھا۔

ان دلفریب دوربینی اکتشافات نے اور بہت سی تحقیقاتوں کے ساتھ مل کر نظام کوہرنیکس کی صحت کو پایہ ثبوت پر پہنچا دیا اور کلیسائے عیسوی کی تشویش و اضطراب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ادنیٰ درجہ کے جاہل پادری ان اکتشافات کو مکرو زور اور فریب والتباس سے تعبیر کرتے تھے۔ بعض کا یہ قول تھا کہ دوربین پر اجسام ارضی کے متعلق تو اعتبار کیا جا سکتا ہے لیکن اجرام ساوی کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان اجرام کا جو علم ہمیں بذریعہ دوربین ہوتا ہے وہ محض فریب نظر ہے۔ ایک گروہ ایسے بزرگ پادریوں کا بھی تھا جو یہ ارشاد فرماتے تھے کہ دوربین کی ایجاد ارسطو کے اس قول کی دوسری شکل ہے کہ ستارے روز روشن میں ایک گہرے کنوئیں کی تہ سے نظر آسکتے ہیں۔

گلیلو گلیو پر اس مقدس برادری نے التباس بدعت الحاد اور زندقہ کا الزام لگایا۔ اس پر علی سبیل ابراء اس نے ایک خط پادری کسٹھلی کے نام لکھا جس میں یہ ظاہر کیا کہ کتب مقدسہ کی تہذیب کا خنثا یہ نہیں ہے کہ علمی مسائل میں ان سے استناد کیا جائے بلکہ ان کا مقصد انسان کی اخلاقی رہبری ہے۔ مخالفت کی جو آگ پہلے ہی بھڑک رہی تھی اس پر اس خط نے اور تیل دال دیا۔ مقدس محکمہ احتساب عقائد یعنی ”انکوئزیشن“ نے وارنٹ گرفتاری جاری کر کے گلیلو کو پکڑ بلوایا۔ اس حکم نامہ میں اس پر الزام یہ لگایا گیا تھا کہ وہ اس اصول کی تعلیم دیتا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ کتب مقدسہ کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ جب وہ اس دینی عدالت کے اجلاس میں حاضر ہوا تو اس سے کہا گیا کہ اپنے لٹھرانہ عقیدہ سے توبہ کرے ورنہ قید کر دیا جائے گا۔ اس کو یہ حکم دیا گیا کہ کوپر نیکس کے اصول کی تائید اور تلقین سے باز آ جائے اور آئندہ کے لئے عہد کرے کہ ان اصول کی حمایت و اشاعت میں حصہ نہ لے گا۔ چونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ سچائی خود بخود ظاہر ہو کر رہتی ہے اور اسے شہدا کی ضرورت نہیں جو اپنی جان اس پر قربان کریں لہذا اس نے انکوئزیشن کے جابرانہ احکام کی تعمیل کا اقرار کر لیا اور وعدہ کیا کہ جو کچھ اس کو ہدایت کی گئی ہے اس پر عمل کرے گا۔

اس کے بعد سولہ سال تک گلیسا کو چین سے سونا نصیب ہوا۔ لیکن ۱۶۳۲ء میں جب گلیلو سے نہ رہا گیا تو اس نے اپنی کتاب موسوم بہ نظام عالم شائع کر دی۔ اس کتاب کا مقصد کپوپنکس کے اصول کی تصدیق و توثیق تھا۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ”انکوئزیشن“ کے پیادے پھر دوڑے اور اس الزام میں کہ اس نے آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا دعویٰ کیا ہے اور مکرر ”انکوئزیشن“ کے اجلاس میں حاضر کیا گیا۔ اور اس مقدس عدالت کے صدر نشین نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ ملزم نے جرم الحاد و زندقہ کے ارتکاب سے اپنے آپ کو ان تعزیرات کا مستوجب قرار دیا ہے جو اس جرم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسے مجبور کیا گیا کہ گھنٹوں کے بل کھڑے ہو کر اصول حرکت زمین کے قائل ہونے سے توبہ کرے اور اس پر لعنت بھیجے۔ اللہ اکبر! کس درجہ عبرت ناک نظارہ ہے کہ ایک واجب التعظیم بزرگ کو جو علم و فضل میں اپنے اقران و امثال کا سر تاج ہے موت کی دھمکی دے کر ان واقعات کے انکار پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ جنہیں وہ خود تو صحیح سمجھتا ہے مگر طرہ یہ ہے کہ خود اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تک درست خیال کرتے ہیں۔ اس کے بعد گلیلو قید میں ڈال دیا گیا جہاں اپنی زندگی کے باقی دس سال اس نے طرح طرح کی

موتوں اور سختیوں کے ساتھ کالے اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی لاش تک کو مسکی قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا گیا۔ اس واقعہ کی یاد سے ہماری آنکھوں میں خون اتر اتر آتا ہے۔ اس عقیدے کے باطل ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے جسے اپنی تائید کے لئے اس قدر کمزور فریب اس درجہ سفاکی اور وحشیانہ پن سے کام لیتا پڑے۔ وہ عقائد جن کی حمایت ”اکوریشن“ نے اس حدود کے ساتھ کی تھی آج کے دن تمام مذہب دنیا میں استحقار و استہزاء کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

زمانہ حال کے ایک بہت بڑے مندس نے اس واقعہ پر نظر اٹھا ڈالتے ہوئے بیان کیا ہے کہ امرابہ النزاع اس بحث میں ایسا تھا جس کے ساتھ انسان کو حد درجہ کی دلچسپی ہے۔ اس لئے کہ اس امر کے تصفیہ پر اس کہ کے مرتبہ اور حیثیت کا انحصار ہے جس میں ہم آباد ہیں۔ اگر زمین کائنات کے وسط میں ایک جسم غیر متحرک و قائم ہو تو انسان کو یہ حق ہر طرح سے حاصل ہے کہ اپنے آپ کو صالح قدرت کی توجہ کا مہبط اکبر مان لے۔ لیکن اگر زمین کی حقیقت اس سے زیادہ نہ ہو کہ وہ محض ایک سیارہ ہے جو آفتاب کے گرد گھومتا ہے اور نظام شمسی کے ارکان میں بھی اس کا درجہ کچھ بہت زیادہ قابل وقعت نہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ افلاک کی اس غیر محدود عظمت میں جہاں یہ نظام شمسی بھی باہر ہمہ درخشی و پرشائی بمنزلہ ایک نقطہ غیر محسوس کے ہے بالکل ہی غائب ہو جائے گی۔

نظام کوہونمکس کی مسلمہ کامیابی کا دور تاریخ ایجاد دورین سے شروع ہوتا ہے۔ اس ایجاد کے بعد زیادہ زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ یورپ کے ہر بیت دان نے اس نظریہ کو بطور اصول موضوعہ تسلیم کر لیا کہ آفتاب مرکز عالم ہے اور زمین اس کے گرد گردش کرنے کے علاوہ اپنی محور پر بھی گھومتی ہے۔ آفتاب کے گرد زمین کے گردش کرنے کے واقعہ کی تصدیق کے لئے اگر کسی مزید ثبوت کی ضرورت تھی تو وہ بریڈلی کے عظیم الشان اکتشاف اختلال ثوابت سے بہم پہنچ گیا۔ ثوابت کے اس اختلال کا انحصار کچھ تو حرکت نور کے تدرج یا تسلسل پر ہوتا ہے اور کچھ زمین کی گردش پر۔ بریڈلی کا اکتشاف بلحاظ اہمیت استنبال اعدالین کی دریافت سے کم نہ تھا۔ تدرج حرکت نور کی تحقیقات جو ہمہ کی دقت نظر کا نتیجہ ہے اگرچہ اول اول غلط سمجھی گئی۔ چنانچہ فائیل نے اس کو فریب نظر سے تعبیر کیا اور کیکینی جیسے شخص نے اسے تسلیم نہ کیا لیکن رفتہ رفتہ تمام دنیا نے اس کی صداقت و حقیقت کے آگے سر جھکا دیا۔

اس کے بعد ہیئت دانوں کو ابعاد نظام شمسی کے متعلق صحیح حالات دریافت کرنے کا

خیال پیدا ہوا۔ بلکہ اس مسئلہ کو اگر محدود شکل میں پیش کیا جائے تو یہ کتنا درست ہو گا کہ انہوں نے یہ دریافت کرنا چاہا کہ زمین سے آفتاب کا فاصلہ کس قدر ہے۔

کوپرنیکس کے زمانہ میں ہندسین کا یہ خیال تھا کہ آفتاب کا فاصلہ پچاس لاکھ میل سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بعض کی رائے میں تو یہ اندازہ بھی بہت کچھ مبالغہ آمیز تھا۔ لیکن ٹائیگوبیری کے ارتصادات پر نظر ثانی کرتے ہوئے کھلو نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ اندازہ بہت کچھ اضافہ کا محتاج ہے اور آفتاب کا فاصلہ ایک کروڑ تیس لاکھ میل سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتا۔ ۱۶۷۰ء میں کیپسنی نے ظاہر کیا کہ یہ اعداد بھی اصل سے بالکل مقارنت نہیں رکھتے۔ اصلی فاصلہ آٹھ کروڑ پچاس لاکھ میل ہے۔ علمائے ہیئت یہ پیشین گوئی کر چکے تھے کہ ۳ جون ۱۷۵۹ء کو سیارہ زہرہ کا مرور روئے آفتاب پر ہو گا اور بعد شمس کے اس اصولی مسئلہ کے حل کرنے میں مرور زہرہ سے جو مد ملنے والی تھی اس سے بھی وہ ناواقف نہ تھے۔ یورپ کی مختلف سلطنتوں نے قابل تحسین مستعدی سے کام لے کر اس عظیم الشان واقعہ فلکی کے ارتصاد میں سرکاری طور پر مدد دی۔ چنانچہ یورپ میں پچاس ایلیا میں چھ اور امریکہ میں سترہ مقامات رصد بینی کے لئے تجویز کئے گئے۔ انگریزی حکومت نے کپتان لگ کو اس مقصد کی تکمیل کے لئے مامور کیا اور اس نے وہ پہلا بحری سفر اختیار کیا جس کی شہرت کبھی نہ مٹے گی۔ کپتان لگ کی منزل مقصود اوٹاہیٹ تھی جہاں پہنچ کر اس نے ترصد کی تیاریاں کرنی شروع کیں۔ اس کا سفر پوری طرح سے کامیاب ثابت ہوا اس لئے کہ آفتاب جب طلوع ہوا تو مطلع بالکل صاف تھا اور دن بھر صاف رہا۔ مرور کا وقت صبح کے ساڑھے نو بجے سے شروع ہو کر سہ پہر کے ساڑھے تین بجے ختم ہوا اور لگ نے اپنی رصدگاہ سے تمام ارتصادات قابل اطمینان پر انجام دئے۔

لیکن مختلف مقامات کے رصدی نتائج کا جب مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تقابلی جو ان سب میں موجود ہونا چاہئے تھا مفقود ہے یعنی کم سے کم فاصلہ ۸ کروڑ اسی لاکھ اور زیادہ سے زیادہ فاصلہ دس کروڑ نو لاکھ میل قرار پاتا ہے اس تفاوت کی تنقید کے لئے مشہور و معروف ہندس انک نے ۳۳-۱۸۲۲ء میں ان مختلف ارتصادات پر نظر ثانی کی اور یہ نتیجہ نکالا کہ آفتاب کا زاویہ اختلاف نظرائفی یعنی اس مثلث کا زاویہ الراس جس کا قاعدہ نصف قطر ارض ہے اور دونوں ساقین آفتاب پر جا کر ملتی ہیں بقدر ۵۷۶ ثانیہ کے ہے اور اس لئے زمین سے آفتاب کا فاصلہ نو کروڑ باون لاکھ چوتھ ہزار میل ہے۔ اس کے بعد انہیں ارتصادات کا تبصرہ ہنس نے کیا اور نتیجہ نو کروڑ سولہ لاکھ اٹھ ہزار میل نکالا۔ ہنس

کے بعد لیوی نے اپنے پیشرو کے نتیجے پر ایک لاکھ میل کا اضافہ کیا۔ ایٹری اور اسٹون ایک دوسرے طریقہ سے اس نتیجے پر پہنچے کہ فاصلہ آفتاب نو کروڑ چودہ لاکھ میل ہے۔ البتہ اسٹون نے ارتصادات سابقہ کی تصحیح سے یہ رائے قائم کی کہ حقیقی فاصلہ نو کروڑ سترہ لاکھ تیس ہزار میل ہے۔ سب سے آخر میں فوکا اور فیرو نے طبعی تجربات سے جو سرعت رفتار نور کے اندازہ پر مبنی تھے اور اس لئے بلحاظ نوعیت ان مشاہدات سے بالکل مختلف تھے جن کا انحصار مرور ذرہ پر تھا یہ نتیجہ نکالا کہ فاصلہ آفتاب نو کروڑ چودہ لاکھ میل ہے۔ تاؤنٹیکہ سال آئندہ ۱۸۷۳ء کے مرور کے نتائج معلوم نہ ہوں یہی تسلیم کرنا چاہئے۔ کہ آفتاب سے زمین کا فاصلہ نو کروڑ بیس لاکھ میل سے کسی قدر کم ہے۔

اس فاصلہ کے معلوم ہو جانے کے بعد نظام شمسی کے ابعاد و مقادیر کا اندازہ آسانی اور صحت کے ساتھ لگایا جاسکتا ہے۔ صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہو گا کہ نیچوں جو نظام شمسی کا بعید ترین سیارہ معلوم ہے آفتاب سے بمقابلہ زمین تیس گنا زیادہ دور ہے۔ ان اعداد کی مدد سے ہم اس مسئلہ کے حلق صحیح رائے قائم کرنے کی قابلیت پیدا کر سکتے ہیں کہ کائنات انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ آفتاب پر سے اگر دیکھا جائے تو زمین ایک نقطہ مبہوم رہ جاتی ہے گویا خاک کا ایک ذرہ بے مقدار ہے جو اس کی شعاعوں میں رقص کر رہا ہے۔ اگر ناظرین اس بارہ میں زیادہ تر صحیح اندازہ قائم کرنا چاہتے ہوں تو وہ اس کتاب کو نگاہ سے گز بھر کے فاصلہ پر رکھ کر اس کی عبارت کے کسی نقطہ کو دیکھیں۔ یہ نقطہ زمین کی اس سطح سے جو دیکھنے والے کو آفتاب پر سے نظر آئے گی۔ مقدار میں کئی سو حصہ بڑا ہے۔

پس کیا حقیقت ہو سکتی ہے ایک ایسے جزو و مقراطیسی ایک ایسے ذرہ بے مقدار کی اس ان گنت دنیاؤں کی غیر محدود کائنات میں جس کی پستائی کا اندازہ کرتے ہوئے دماغ دیوانہ ہو جاتا ہے؟ اگر یہ ذرہ ناچیز اپنی جگہ سے ہٹا بھی دیا جائے بلکہ معدوم بھی ہو جائے تاہم کوئی فرق موجودہ حالت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیا ہستی ہے ان انسانی اجزائے لاجبجری کی جو دس ارب سے بھی زیادہ کی تعداد میں اس قریب نہ نظر آنے والے ذرہ خاک پر آباد ہیں جن میں سے لاکھوں صفحہ روزگار سے ایسے مشین گے کہ گویا ان کا کبھی نام و نشان ہی نہ تھا؟ کیا حقیقت ہے انسان کی یا اس کے رنج و راحت کی؟

جب نظام کو ہینکس کے اصول کی عام طور سے اشاعت ہوئی تو موافقین و مخالفین بھی نے اس پر طرح طرح کے اعتراض کئے۔ چنانچہ ایک اعتراض ہالیڈ کے مشہور مینٹ

دان ٹانگو بریکی نے بھی کیا جو دراصل ارشار کس نے نیشا غورٹ کے مذہب پر کیا تھا یعنی اگر زمین حقیقت میں سورج کے گرد گھومتی ہو تو مناظر ثوابت کی سمت میں تغیر پیدا ہونا چاہئے ایک وقت خاص میں ہم کو بقدر دور زمین کے قطر کی مسافت کے افلاک کے ایک مقام معین سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے بہ نسبت اس قرب کے جو ہمیں چھ مہینے پہلے حاصل تھا لہذا ثوابت کی حیثیت اعتباری پر اس قرب و بعد کا اثر پڑنا چاہئے اور ان کے مناظر میں تغیر واقع ہونا چاہئے یعنی جوں جوں ہم ان کے قریب آتے جائیں وہ جدا جدا نظر آنے چاہئیں اور جوں جوں ہم اس سے دور دور ہوتے جائیں وہ آپس میں ملے ہوئے نظر آنے چاہئیں یا باصطلاح حیثیت ان ستاروں کا سالانہ زاویہ اختلاف منظر ہونا چاہئے۔

کسی ستارہ کا زاویہ اختلاف منظر وہ زاویہ ہے جو ان دو خطوط کے ملنے سے پیدا ہوتا ہے جو اس سے علی الترتیب سورج اور زمین کی طرف کھینچے جائیں۔

جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں زمین سے سورج کا فاصلہ بہت کم خیال کیا جاتا تھا۔ اگر اس وقت یہ معلوم ہوتا جیسا کہ اب معلوم ہے کہ یہ فاصلہ نو کروڑ میل سے بھی زیادہ ہے یعنی دور زمین کا قطر اٹھارہ کروڑ میل سے اوپر ہے۔ تو اعتراض متذکرہ بالا بلاشبہ نہایت قوی سمجھا جاتا۔

اس اعتراض کا جواب ٹانکیو کو یہ دیا گیا کہ چونکہ اجرام سماوی کا زاویہ اختلاف منظر اسی نسبت سے گھٹتا جاتا ہے۔ جس نسبت سے کہ ان کا فاصلہ بڑھتا جاتا ہے لہذا ممکن ہے کہ کوئی ستارہ اس قدر دور دراز فاصلہ پر ہو کہ اس کا زاویہ اختلاف نظر محسوس و معلوم ہی نہ ہو سکے۔ یہ جواب آگے چل کر صحیح ثابت ہوا۔ ثوابت کے زوایائے اختلاف منظر کا معلوم ہونا آلات پیمائش زوایا کی ترقی پر منحصر تھا اور جب اس قسم کے آلات ایجاد ہو گئے تو ان زاویوں کی پیمائش آسان ہو گئی۔

ستارہ الفا قنطورس جو ثوابت میں سب سے زیادہ نزدیک خیال کیا جاتا ہے نصف کرہ جنوبی کا ایک روشن دھرا ستارہ ہے۔ اس کا زاویہ اختلاف منظر جو بقدر ۸۴۲-۳۳ میں دریافت کیا تھا اس سب سے پہلے ہنڈرسن اور مکیر نے بمقام راس امید ۳۳-۸۴۲ میں دریافت کیا تھا اس حساب سے گویا یہ ستارہ ہم سے آفتاب کی بہ نسبت دو لاکھ تیس ہزار گنا زیادہ دور ہے اس کی سطح سے اگر آفتاب کو دیکھا جائے تو خواہ قرص آفتاب دور زمین کے مساوی ہی کیوں نہ ہو یعنی اس کا قطر خواہ اٹھارہ کروڑ میل ہی کیوں نہ ہو پھر بھی وہ محض ایک نقطہ دکھائی دے گا یہ ستارہ اور اس کا ہمزا اپنے مشترک مرکز ثقل کے گرد ایکایسی سال میں گھومتا ہے جس

سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کا متفقہ جرم آفتاب کے جرم سے کم ہے۔

ستارہ ۶۱ گنی کا تعلق ثوابت طبقہ سارس سے ہے۔ یہ ستارہ بھی دھرا ہے۔ اس کا زاویہ اختلاف منظر جوئیل نے ۱۸۳۸ء میں دریافت کیا تھا سہراٹانیہ کے قریب ہے۔ اس حساب سے اس کا فاصلہ سطح زمین سے آفتاب کے فاصلہ کی بہ نسبت پانچ لاکھ حصہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ ستارہ اور اس کا ہمزا اپنے مشترک مرکز ثقل کے گرد پانچ سو بیس سال میں گھومتا ہے۔ ان دونوں کا متفقہ وزن تقریباً وزن آفتاب کے ایک ٹکٹ کے مساوی ہے۔

ستارہ سیرنکس جو اپنی چمک دمک کے لحاظ سے آسمان میں سب ثوابت سے زیادہ نمایاں ہے۔ الفا قنطورس سے بھی چھ حصہ زیادہ دور ہے اس کا قطر غالباً ایک کروڑ بیس لاکھ میل ہے اور جو نور کی شعاعیں اس کے جرم سے نکلتی ہیں وہ تابانی و درخشانی میں سورج کی روشنی سے دو سو حصہ زیادہ ہیں لیکن دور بین میں سے دیکھنے پر بھی اس کا قطر ناپا نہیں جا سکتا بلکہ وہ ایک نہایت چمکتی ہوئی چنگاری کی شکل میں نظر آتا ہے۔

پس ثوابت نہ صرف بلحاظ ظاہری عظمت کے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ باعتبار جماعت اصلی بھی ان میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آلہ اسپیکٹروسکوپ (مقیاس الوان نور منشور) سے معلوم ہوتا ہے ترکیب کیمیادی و طبعی کے لحاظ سے بھی ان میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ آلہ ان تغیرات کے ظاہر کرنے سے جو ثوابت کی شعاع نور کی قابلیت اکسار و انحراف میں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کے دوران عمر کی کیفیت پر بھی روشنی ڈال رہا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قریب ترین ستارہ ہم سے اتنا دور ہے کہ اس کے فاصلہ کی پیمائش کرنا قریباً محال ہے لیکن ہمارے قیاس کی یہ ابھی پہلی منزل ہے۔ کائنات فکلی میں ایسے ثوابت بھی ہیں جن کی روشنی کی شعاعوں کو ہماری زمین تک پہنچنے میں ہزاروں بلکہ شاید لکھوں سال کی مدت صرف ہوئی ہے۔ جب خود ہمارے ہی نظام شمسی کی حدود ہماری بڑی سے بڑی دور بین کی رسائی سے باہر ہیں تو ان نظامات کا تو ذکر ہی کیا جو ان حدود سے پرے واقع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں خاک کے ذروں کی طرح فضا کے میدان نامتناہی میں پھیلی ہوئی ہیں۔

کیا یہ عظیم الشان اجرام جن میں سے ہزاروں لاکھوں کا فاصلہ ہم سے اس قدر دور ہے کہ مجرد نگاہ دور بین کی مدد کے بغیر ان کو دیکھ تک نہیں سکتی اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ہم ان کی روشنی سے مستفید ہوں؟ اور جیسا کہ ہمارے پیشوایان دین ارشاد فرماتے ہیں

کیا ان روشن و تابناک کواکب کی تخلیق کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ انسان کو روشنی پہنچائیں؟ کیا ان کے جرم کی عظمت اور جسامت کی پسائی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس طرح ان میں سے ہر ایک قوت کا مرکز ہے اسی طرح اس کی حرکت کا بھی مرکز ہونا چاہئے؟ یہ الفاظ دیگر کیا ان کا وجود اس امر پر دال نہیں ہے کہ وہ شمس ہیں جن میں سے ہر ایک جداگانہ نظام عالم کا مبداء نکوین^۱ ہے؟

ابھی ان واقعات کا علم بہت ہی ناقص تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس علم کا وجود سرا پرہ تخیل سے باہر نہ نکلا تھا کہ اٹلی کے ایک باشندے گارڈیو بروٹو نامی نے جو کوپرنیکس کی وفات کے سات سال بعد پیدا ہوا ایک کتاب کائنات اور دنیاؤں کے عظیم النہایت ہونے پر لکھی چند کتابیں اور بھی اس کی تصنیف سے ہیں۔ مثلاً ”ایوننگ کاغور سیشن آن ایٹم وڈنڈے“ (اسماء اربعہ الرماؤ) جس میں نظام کوپرنیکس کی حمایت کی گئی تھی اور ”دی ون سول کا ز آف تھنکر“ (وحدت علت اعلیٰ) ان تصانیف پر ایک اور رسالہ کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے جو اس نے علی سبیل التمثیل لکھا اور ۱۵۸۳ء میں شائع کیا۔ اس رسالہ کا نام ”دی اسپین آف دی ٹرنٹ بیسٹ“ (فتح مند وحشی کا اخراج) تھا۔ اس کے علاوہ ہیئت دانوں کی آئندہ نسلوں کے لئے اس نے ایک جدید ستارے کے متعلق اپنے مشاہدات فلکی کو سپرد قلم کیا۔ یہ ستارہ ۱۵۷۲ء میں دفعہ ”برج فوات الکرسی میں نمودار ہوا اور اس کی تابانی و درخشانی روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ باقی تمام کواکب اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ یہ ستارہ روز روشن میں بھی صاف نظر آتا تھا۔ ۱۱ نومبر کو اس کی چمک زہرہ کے منتہائے درخشندگی کے برابر ہو گئی۔ مارچ ۱۵۷۳ء میں اس کا شمار ثوابت طبقہ اولین میں ہونے لگا۔ چند مہینے تک اس نے مختلف رنگ بدلے اور مارچ ۱۵۷۳ء میں غائب ہو گیا۔

کپلر کے زمانہ (۱۶۰۳ء) میں جو ستارہ دفعہ برج ثعبان میں نمودار ہوا تھا ابتداً ”زہرہ سے بھی زیادہ درخشاں تھا۔ اس نے ایک سال سے زیادہ عمر پائی اور پھر ارغوانی زرد سرخ مختلف رنگ بدلتا ہوا فنا ہو گیا۔

ابتداً ”برونو کا یہ قصد تھا کہ اپنی زندگی کلیسا کی خدمت گزاری کے لئے وقف کر دے چنانچہ ڈامینیک فرقہ کے راہبوں میں وہ داخل بھی ہو گیا تھا لیکن مسئلہ عشاءِ ربانی اور مسئلہ جبل بلاؤس یعنی امکان استقرار عمل بحالت دو شیزگی پر غور کرنے سے اس کا یہ ایمان مبدل بہ شکوک ہو گیا۔ چونکہ اس نے اپنے خیالات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی لہذا اسے بہت جلد پیشوایان دین کا مورد عتاب ہونا پڑا اور ان کے بچہ مخوبت سے بچنے کے

لئے اول سوئٹزرلینڈ پھر فرانس پھر انگلستان پھر جرمنی میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن ”اکونزیشن“ کے خونخوار تازی کتے جن کی قوت شامہ بلا کی تھی برابر اس کے پیچھے لگے رہے۔ اور آخر جب وہ اٹلی واپس آیا تو اس کا کھوج لگا کر رہے۔ وینس میں وہ گرفتار کیا گیا اور پیاپی کے جیل خانہ میں چھ سال تک اس سختی سے قید رکھا گیا کہ نہ اسے لکھنے کے لئے قلم دوات کاغذ دیا جاتا تھا نہ پڑھنے کے لئے کوئی کتاب دی جاتی تھی اور نہ اس کے کسی دوست کو اجازت تھی کہ اس قید تنہائی میں آکر گھڑی دو گھڑی کے لئے اس سے ملے اور اس کا غم غلط کرے۔

برونو نے زمانہ قیام انگلستان میں لحد و عوالم پر لکچر دئے تھے اور اپنی سب سے زیادہ مشہور کتابیں بزبان اطالوی تصنیف کی تھیں۔ پادری یہ دیکھ دیکھ کر اور بھی کھیانے ہوتے تھے کہ وہ جہاں جاتا تھا ان کی ریاکاری اور بدباطنی کی پردہ دری کرتا تھا اور علے روس الاشادیہ کتا پھرتا تھا کہ اہل مذہب کے تشکک پر مابہت اور منافقت کا طبع چڑھا ہوا ہے ان کے ظاہر اور باطن میں بعد المشرقین ہے اور ان کے عقائد زور و التباس اور نفاق دریا کی اس متزلزل بنا پر قائم ہیں جسے اخلاق حسہ یا ایمان بالنبی چھو کر بھی نہیں گیا ہے۔

”اسماء اربعاء الراو“ میں اس نے اس بات پر زور دیا تھا کہ تنزیل کا مقصد سائنس کی تعلیم ہرگز نہیں ہے بلکہ اس سے محض اخلاق کی ہدایت مقصود ہے۔ اناجیل مقدسہ ہیئت یا طبعیات کے مسائل کے متعلق ذریعہ استناد نہیں ہو سکتیں۔ خصوصاً ان کی یہ تعلیم تو بالکل ہی غلط اور ناقابل قبول ہے کہ زمین ایک سطح مستوی ہے جو ستونوں پر قائم ہے اور آسمان ایک قبہ جامہ ہے جو فردوس کا صحن ہے۔ برونو کتا ہے کہ ان پادروں کا تاویلات کو پس پشت ڈال کر ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ کائنات غیر محدود لامتناہی ہے جو منیر و غیر شفاف دنیاؤں سے معمور ہے اور ان دنیاؤں میں سے اکثر آباد ہیں۔ ان مسائل پر غور کرتے کرتے وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ابن رشد کے خیالات حقیقت سے دور نہیں ہیں۔ ضرور ہے کہ ایک ایسی عقل کل موجود ہو جس نے اس تمام کائنات میں جان ڈال رکھی ہے۔ اور جس کا یہ عالم ظاہری محض ایک رشتہ یا منظر ہے۔ اس عقل کی قوت اس کائنات ظاہری کی ٹکون و قیام کا باعث ہے اور اگر یہ قوت ہٹ جائے تو تمام چیزیں معدوم ہو جائیں۔ اسی حاضر و ناظر اور ساری دوائر عقل کل کا نام خدا ہے جو تمام چیزوں میں خواہ وہ زندہ نظر نہ بھی آئی ہوں موجود ہے اور ہر شے میں ترکیب پذیر ہونے اور زندگی قبول کرنے کی صلاحیت ہر وقت پائی جاتی ہے۔ پس خدا تمام موجودات کی علت واحد اور اس کا مدار حلیہ ہے۔

اس لحاظ سے فلاسفہ میں برونو کا درجہ ابن رشد اور اسپائینوزا کے بین بین ہے اسپائینوزا کا یہ مذہب تھا کہ خدا اور کائنات ایک ہی وجود کے دو مختلف نام ہیں۔ ہر واقعہ قدرت کے ایک غیر تغیر پذیر قانون کے اقتضا سے مجبوراً پیش آتا ہے اور خدا بظن کائنات موجود فی الاصل غیر متغیر اور غیر ممکن الاندفاع توانائی کے اقتضا سے لازمی حرکات یا افعال کا ایک سلسلہ پیدا کرنے میں ہر وقت مصروف ہے۔

پیشوایان مذہب کے مطالبہ پر برونو وینس سے روما کو منتقل کیا گیا اور اس الزام کی پاداش میں کہ وہ طہری نہیں بلکہ راس الملاحظہ ہے ”انکوینیشن“ کے مجس میں قید کیا گیا۔ سب سے بڑا الزام اس پر یہ تھا کہ وہ تعداد عوالم جیسے ناپاک مسئلہ کا قائل ہے جو کتب مقدسہ کے سیاق اور آیات الہامی خصوصاً ”ان آیات سے تناقض کلی رکھتا ہے جنہیں انسان کی سبیل نجات سے تعلق ہے۔ دو سال تک قید کائن کے بعد وہ حاضر عدالت کیا گیا اور حکام عدالت نے اس پر فرد قرار داد جرم لگا کر اسے مسیحی برادری سے خارج کر دیا اور جب مقدس عدالت کے اس حکم کی تعمیل سے اس نے ازراہ عنایت شرافت نفس انکار کیا کہ اپنے گناہ سے توبہ کرے تو کار فرمایان قضا و قدر یعنی حکام ”انکوینیشن“ نے اس سفارش کے ساتھ اسے دیوبی حکام کے سپرد کر دیا کہ ”اسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے“ عدالت ”انکوینیشن“ کے اس خوفناک فقرہ کا مطلب ایسے موقعوں پر یہ ہوا کرتا تھا کہ مجرم کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چونکہ برونو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے دشمن اگرچہ اس کے جسم کو فنا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے خیالات کی اشاعت کو نہیں روک سکتے۔ لہذا اس نے اپنے ججوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہارے اس فیصلہ کو سن کر میرے لب پر اس خوف کا عشرِ عمیر بھی طاری نہیں ہوا جو خود تمہارے دل میں اس کے صادر کرتے وقت پیدا ہوا ہو گا۔ اس فیصلہ کی تعمیل ۲۱ فروری ۱۶۰۰ء کو ہوئی اور برونو زندہ جلا دیا گیا۔

ان بے شمار شدا کے مصائب و نواب کی یاد ہمارے دلوں میں رحم و ہمدردی پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتی جنہیں محض اپنے مذہبی عقائد کی وجہ سے فریق مخالف کے تعصب کے ہاتھوں آگ میں جلنا پڑا ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کو آخری وقت میں جب کہ اس کی روح بھد درد و کرب جسم سے علیحدہ ہو رہی تھی ایک بہت بڑی زبردست طاقت کا سہارا تھا۔ ان کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ اس دنیا میں گو ان کی زندگی مصیبت سے کئی اور عقبی کی دہلیز پر قدم رکھتے وقت بھی انہیں گرفتار عذاب الیم ہونا پڑا لیکن دوسری دنیا میں

منہجے ہی ان کا رنج مبدل بہ راحت ہو جائے گا اور ان کی تکالیف لذت ہائے جاودانی سے تبدیل ہو جائیں گی۔ موت کی بھیانک اور اندھیری وادی میں سے گزرتے وقت شہید کو کم از کم یہ اطمینان قلب تو میسر ہوتا ہو گا کہ ایک رحیم و شفیق نظروں سے پوشیدہ ہستی اس کی رہنمائی کر اسے ابدی زندگی کی روشنی اور پر فضا منزل میں صحیح و سلامت لے جائے گی۔ لیکن برونو اس سارے سے بھی محروم تھا۔ وہ فلسفیانہ عقائد جن کی خاطر اس نے اپنی جان دی اس کے لئے کسی طرح موجب تسکین و تسفی نہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے ضرور تھا کہ مرتے دم تک اس کو اپنی قوت بازو ہی پر بھروسہ ہو اور وہ کسی کی تائید سے سروکار نہ رکھے۔ کیا اس بے یار و مددگار شخص کی استقامت عزم کو دیکھ کر جو تنہا ایک تاریک مکان میں اپنے خوزیر اور بے درد جوں کے سامنے محض اس اصول کی تائید کے لئے بے دھڑک کھڑا ہوا ہے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے۔ ہمارا جی بے اختیار اس کی تعریف کرنے کو نہیں چاہتا! اس ڈراؤنے کمرے میں نہ کوئی الزام لگانے والا موجود ہے نہ گواہ حاضر ہے نہ وکیل نظر آتا ہے۔ بلکہ محکمہ مقدس کے صرف کارندے ہیں جو سیاہ لباس پہنے دبے پاؤں موت کے سایہ کی طرح نقل و حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نیچے کے زمین دوز حجروں میں کھجور رکھا ہوا ہے اور مجرموں کو انواع و اقسام کے عذاب دینے کے شیطانی آلات اور ان آلات کے سفاک استعمال کرنے والے پاس ہی موجود ہیں۔ ملزم سے صرف اس قدر کہا جاتا ہے کہ اس کی نسبت لہذا نہ عقائد رکھنے کا قوی شبہ ہے۔ پس کیا وہ اس بات تیار ہے کہ اپنے قصور کا اعتراف اور اپنے گناہوں سے توبہ کرے لیکن جن عقائد کو وہ صحیح سمجھتا ہے ان سے وہ نہ ابا کر سکتا ہے اور نہ کرتا ہے بلکہ پہلے کی طرح اپنے ایذا دہندوں سے کہتا ہے کہ دل میں تم بھی انہیں باتوں کے قائل ہو جن کو صحیح سمجھنے کی پاداش میں اس وقت تم مجھے سزا دے رہے ہو۔ ایک تو تصویر کا یہ رخ ہے جس میں شرافت نفس۔ ہمت مردانہ۔ استقامت۔ غیر متزلزل اور اعتصام بالحق کے خط و خال صاف صاف نظر آ رہے ہیں۔ تصویر کا اگر دوسرا رخ دیکھنا منظور ہو تو تاریخ عالم کی پندرہ صدی پہلے کا ایک ورق الٹو۔ سردار کاہن کیا فس کے مکان کا ایک کمرہ ہے انگلیشی میں آگ دھک رہی ہے۔ مرغ صبح ازلان دے رہا ہے۔ اور خداوند خدا حسرت بھری نگاہوں سے پلیٹ کر پطرس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ (لوقا باب بست دوم آیت ۶) خدا کی شان ہے کہ کلیسا کو برونو کے ساتھ اس طرح کے سلوک کرنے کا حق جس کی بدولت حاصل ہوا وہ خود پطرس کی ذات ہو!!

لیکن شاید وہ دن قریب آ رہا ہے جب کہ آئندہ سلیس پادریوں کے اس گناہ عظیم کا

کفارہ ادا کریں گی اور ہرونو کا مجسمہ کلیسائے سینٹ پیٹر واقع روما میں نصب ہو کر بے نقاب کیا جائے گا۔

لہ جہاز کے اگلے حصہ میں ایک مرتفع مقام کا نام جہاں سے نافذا کو حد نظر تک سب کچھ دکھائی دے سکتا ہے۔ مترجم

۲۔ بحرالقیانوس شمال میں پرنگال سے کوئی آٹھ سو میل جنوب مغرب واقع ہے۔ اس مجمع الجزائر میں کل نو جزیرے ہیں۔ مجموعی رقبہ ایک ہزار میل اور آبادی کوئی تین لاکھ نفوس ہو گی۔ دارالحکومت کا نام انکارا ہے جو جزیرہ ٹریرا میں واقع ہے۔ ان جزائر میں بہت سے آتش فشان پہاڑ ہیں جن کی وجہ سے آئے دن اطراف جان و مال ہوتا رہتا ہے۔ آب و ہوا نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے چنانچہ جو لوگ امراض صدر میں مبتلا ہوتے ہیں وہ بغرض تبدیل آب و ہوا و تکمیل صحت یہیں جاتے ہیں۔ انگور، نارنگیاں اور نیبو میوؤں میں اور گیہوں اور کی اناج میں یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ اہل کارہج کو ان جزائر کا علم ہو چکا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں سے کارہج کے سکے برآمد ہوئے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس مسلمان جہازرانوں کے یہاں آنے کی بھی بکثرت شہادت بہم پہنچ

سکتی ہے۔ مترجم

۳۔ فرانسیسی اندازہ یہ تھا کہ ایک قطر قلب سے خط استوا تک کے درمیانی فاصلہ کا ایک لاکھواں حصہ ہو۔ یہ اندازہ تو عند اللہ قتی غیر صحیح ثابت ہوا لیکن پھر بھی دوسرے اندازوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہونے کے باعث عام طور سے فاصلہ کا یہی پیمانہ علمی مقاصد کے لئے استعمال ہونے لگا ایک قطر ۳۹۶۳۷۰۷۷ انچ کے مساوی ہے۔ مترجم

۴۔ اٹلی کا ایک مشہور ہیئت دان جسے لوئی چارلیم شاہ فرانس نے رصد گاہ پیرس کا مہتمم مقرر کیا تھا۔ مترجم

۵۔ تازہ ترین اکتشافات نے اس اندازہ میں کسی قدر ترمیم کی ہے اور اس وقت کہ ۱۹۰۹ء ہے مہندسین عالم کے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے کہ سورج کا فاصلہ زمین سے نو کروڑ انیس لاکھ میل ہے۔ مترجم

۶۔ دور بین میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ثوابت مضاعف ہیں۔ اس کی توجیہ اول اول اس طرح کی گئی تھی کہ ممکن ہے کہ وہ ثوابت تقریباً اسی خط مستقیم پر واقع ہوں جس پر زمین واقع ہے اور اس لئے بظاہر دہرے نظر آتے ہوں مگر مسلسل ارتصالات سے یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ یہ دہرے ثوابت آپس میں اسی طرح مربوط و منوط ہوتے ہیں جس طرح ارض و قمر اور ایک کوکب دوسرے کوکب کے گرد جو اس کا ہم زاوہ ہے ایک وقت معینہ میں گھومتا ہے۔

مترجم

کچھ اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان شمس بازنہ کا فاصلہ زمین سے کس قدر ہو گا۔ مترجم

۱۔ علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب ”الکلام“ میں ایک مقام پر یورپ کے تمدن کے سمات اصول پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ انسان کی تمام ترقیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ وہ اعلیٰ ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان اس سے متبع اٹھائے۔ یہ لکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے قرآن مجید نے اس اصول کی تعلیم کی اور ان آیات کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش فرماتے ہیں۔

(۱) لقد خلقنا الانسان في احسن تقويم۔

(۲) وسخر لكم ما في السموت وما في الارض جميعا۔

ہمیں ڈر ہے کہ ڈرپہر اور اس کے ہم خیال مولانا کے اس دعوے کو بلا ترمیم تسلیم کرنے میں متامل ہوں گے۔

کائنات سے اگر مولانا کی مراد کہ ارض سے ہے تو یقیناً ”انسان اس خیال میں حق بجانب ہے کہ اعلیٰ ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان اس سے متبع اٹھائے۔“

لیکن اگر کائنات کے مفہوم میں ان کروڑوں روشن و تابناک دنیاؤں کو بھی داخل کرتے ہیں جن کے وجود پر جناب باری کی عظمت و حکمت بے پایاں گواہ ہے اور جن کا ثبوت انسان باوجود اپنی بے بضاعتی کے دینے پر قادر ہو گیا ہے تو ڈرپہر کے اس سوال کا معقول جواب شاید پیش نہ کیا جاسکے گا کہ کیا ان دنیاؤں کا جو ہم سے اس قدر فاصلہ پر ہیں کہ مجرد نگاہ بلامدد دور بین انہیں دیکھ نہ سکتے ہیں سکتی بجز اس کے اور کوئی فشا نہیں کہ ہم ان سے متبع اٹھائیں اور ان کے نور سے مستیز ہوں؟

قرآن مجید میں جو صرف کہ ارض کے باشندوں کی اخلاقی رہبری کے لئے نازل کیا گیا ہے اور جس کا روئے سخن صرف ان عقل و فہم ہستیوں کی طرف ہے جو نظام شمسی کے اس تیرے رکن پر آباد ہیں یہ دعویٰ کیس نہیں کیا گیا کہ کائنات فلکی کا فشا بجز انسان کو فائدہ پہنچانے کے اور کچھ نہیں ثوابت و سیار کی تخلیق سے اور جو مقاصد جناب باری کے پیش نظر ہوں گے وہ تو بجز اس کے اور کون جان سکتا ہے لیکن اگر ان میں سے بعض کا ذیلی و ضمنی مقصد یہ بھی ہو کہ کہ ارض کے مکین ان کے نور سے مستیز ہوں تو اس سے دوسرے مقاصد کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی لئے اس عام فہم پیرایہ میں جو جناب باری انسان کے دل میں اس جذبہ احسان مندی و شکرگزاری کے برانگیختہ کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے جو عبد کو معبود کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہے اس نے کیس تو یہ کہا ہے کہ چاند سورج اور ستارے ہمیں روشنی دیتے ہیں کیس یہ کہا ہے کہ خدا نے

کائنات سلوی کو تمہارا تابع کر دیا ہے۔ لیکن ان الفاظ کی حکمت آفرین جامعیت پھر بھی اس قابل اعتراض دعوے کی گرد سے اپنے دامن کو کمال وقیعہ رسی کی راہ سے بچا گئی ہے کہ کائنات فلکی کا فضا بجز انسان کے افادہ کے اور کچھ نہیں۔ وسخر لکم مائی السموات سے یہی مراد نہیں ہے کہ وہ تمام اجرام روشن و تاریک جو فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بلحاظ سودمندی انسان کے تابع کر دئے گئے ہیں بلکہ ان الفاظ کا صریح مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو وہ عقل و وقیعہ سنخ عطا فرمائی ہے جس کی بدولت اسے اس کائنات کے پوشیدہ اسرار معلوم ہو گئے جہاں وہ جسم کے ساتھ نہ پہنچ سکتا تھا۔ تغیر جسمانی ہی نہیں بلکہ عقلی و ذہنی بھی ہوتی ہے اور یہی اس کا درجہ کمال ہے۔ کیا دور بین کے ذریعہ سے الفاظ طورس کا اکتشاف کچھ کم تغیر آسمان ہے جو ہم کو یہ دعویٰ کرنے کی ضرورت ہو کہ یہ شمس بازغہ جس کی روشنی ہماری مجرد نگاہ کو بمشکل نظر آتی ہے اس غرض سے ہمارا تابع کیا گیا ہے کہ ہم کو روشنی پہنچائے۔ فاعتبروا یا اعلیٰ الابصار۔ مترجم

اے اگر ہم کو یقین ہو کہ وہ خدا کی ہستی کا منکر تھا تو ہم ہرگز اس کے معترف نہیں ہو سکتے۔ انسان ضعیف البیان کا جس کی حقیقت اس عالم لامتناہی کی بے پایانی میں ایک جزو لا تجزئ سے زیادہ نہیں ہے عقل غیر محدود پر جس کے کرشمے ہر وقت اس کی نظر کے سامنے ہیں بھروسہ نہ کر کے اپنی عقل محدود پر تکیہ کئے رکھنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ باغی اور سرکش ہے اور بغاوت اور سرکشی سے کسی کو بھی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ لیکن برونو جیسا کہ خود مصنف کو اعتراف ہے دہریہ نہ تھا۔ وہ خدا کی ہستی کا قائل تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خدا کو بشکل اقانیم میں نہ مانتا ہو لیکن وہ اس کا قائل تھا کہ ایک ایسی عقل کل ضرور موجود ہے جس نے اس تمام کائنات میں جان و مال رکھی ہے اور جس کا یہ عالم ظاہری محض ایک رشتہ یا منظر ہے وہ اسی عقل کو تمام موجودات کی علت واحد تو مانتا تھا۔ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو وہ خدا کا منکر نہیں سمجھا سکتا اور اس لئے ہمیں من قل لا الہ الا اللہ فدخل الجنہ اس کی نجات میں شک نہیں۔ مترجم

نہ یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواری پطرس نے جو مسیحی دنیا میں سینٹ پیٹر کے لقب سے مقرب ہے کمال کورنٹی ویزدان ناشای کی راہ سے اپنے آقا سے اعراض کیا تھا۔ پطرس کو آپ کی وفاداری کا بڑا دعویٰ تھا اور جب آپ نے ایک دفعہ اس سے کہا کہ تو میرا منکر ہو گا اور اس پر اپنی خیر خواہی جتانی چاہی تو آپ نے کہا کہ ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ تین دفعہ چنانچہ یہ قول سچ ہو کر رہا۔ جب حضرت مسیحؑ یہودیوں کے معاندانہ اغوا سے رومی عدالت کے سامنے لائے گئے اور پطرس سے جو بطور گواہ حاضر تھا دریافت کیا گیا کہ تو اس شخص کو جانتا ہے تو ان حضرت نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا۔ تعجب ہے کہ باوجود اس کے نصرانیت میں پطرس کا اتنا بڑا مرتبہ کیوں ہے۔ مترجم

ساتواں باب

نزاع دربارہ عمر زمین

بائبل کی رو سے زمین کی عمر صرف چھ ہزار سال ہونا اور اس کا ایک ہفتہ کی مدت میں بتایا جاتا۔ پادریوں کے علم الاربع کا انبیاء سلف کی عمروں پر مبنی ہونا۔ بائبل کے مختلف نسخوں میں مختلف تخمینوں کی وجہ سے تناقض۔

قصہ طوفان نوح روئے زمین کا ازسرنو آباد ہونا۔ مینارہ بابل۔ اختلاف السنہ۔ انسان کی قدیمی زبان۔

کیسینی کا یہ اکتشاف کہ سیارہ مشتری سطح الارضین ہے۔ نیوٹن کا یہ اکتشاف کہ کرہ ارض سطح الارضین ہے۔ اس اکتشاف سے اس نتیجہ کا استخراج کہ زمین نے حرکات کے سانچے میں ڈھل کر موجود شکل اختیار کی ہے۔ اجار آبی کی طبقات الارضی تحقیقات سے اس نتیجہ کی تصدیق آثار اجسام ذوی الاعضا سے اس نتیجہ کی مزید توثیق۔ زمین کی عمر کا اندازہ کرنے میں مدت ہائے مدید کے تسلیم کرنے کی ضرورت۔ مسئلہ پیدائش کی جگہ مسئلہ ارتقا لے لیتا ہے۔ اکتشافات دربارہ قدامت انسان۔

کائنات کے پیمانہ زمان و مکان کا غیر محدود ہونا۔ زمین کی عمر کی بحث میں افراط و تفریط سے احتراز۔

کائنات میں جو درجہ کرہ ارض کو حاصل ہے اس کی حقیقت کا اعتراف ایک حلول و طویل کشش کے بغیر نہ ہو سکا۔ کلیسا نے اس کی مخالفت میں ناخنوں تک کا زور لگایا اور اپنے عقائد کے برقرار رکھنے کی کوشش میں لوگوں کو سزائے موت تک دی۔ لیکن اس کی تمام کوششیں راکٹاں گئیں۔ نظام کھوپڑی کی تائید میں ناممکن التردید شادتوں کا انبار لگ گیا۔ آخر کار تمام دنیا نے بالاتفاق اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ آفتاب اس نظام کا جس کو انسان سے تعلق ہے مرکزی جرم ہے اور زمین کا شمار ان سیاروں میں ہے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں اور ان میں بھی زمین سب سے بڑی نہیں ہے۔

چونکہ اس بحث کا سبق کلیسا کو نہ بھولا تھا لہذا جب مسئلہ عمر عالم کی جدید بحث پیش ہوئی تو پادریوں نے اس شدید مخالفت کا اظہار نہ کیا جو پہلی بحث کے وقت ان کی طرف سے ظاہر ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کلیسا کی روایات کے ایوان میں اس نئی بحث نے پھر زلزل ڈال دیا لیکن پیشوایان دین کی رائے میں یہ حملہ سختی میں پہلے حملہ کی بہ نسبت برابرت کم تھا۔ چنانچہ حامیان مذہب اس موقع پر یہ کہتے ہوئے پائے گئے کہ زمین کو اس کے تخت عظمت و جلال سے نیچے اتار دینا تو یہ معنی رکھتا ہے کہ حقائق الہامی کی بنیاد میں سرگ لگا دی جائے البتہ تاریخ نگویں عالم پر بحث کرنے کیا جازت خاص حدود کے اندر دی جاسکتی ہے۔ لیکن اہل مناظران حدود سے بہت جلد تجاوز کر گئے اور اس لئے یہ جدید بحث بھی ویسی خطرناک ہو گئی جیسی پہلی بحث ثابت ہوئی تھی۔

نگویں عالم کے مسئلہ کے متعلق فلاطون نے اپنی کتاب ”ٹائیس“ میں فریق مقابل کو حسب ذیل مشورہ دیا تھا:

”مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اور آپ جو آخر انسان ہیں اس امر کو ذہن نشین رکھیں کہ روایات مذہبی کے احتمالات میں مزید تفحص سے احتراز کرنا ہی اولیٰ ہے۔“

لیکن اس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس مشورہ پر کاربند ہونا ناممکن نہ تھا۔ ہیٹ آگسٹائن کے زمانہ سے سائنس کے ہر مسئلہ کی سند کتب مقدسہ میں ڈھونڈی جانے لگی تھی اور اہل مذہب نے آیات انجیل سے تاریخ اور جغرافیہ کے ایسے ایسے خیالی نکات کا استخراج کیا تھا جنہوں نے حقیقی علم کی چلتی گاڑی میں روٹھے انکائے تھے۔

ہم اس مقام پر پادری صاحبوں کی ان تاریخی و جغرافیائی معلومات کا جن کا دارودار آیات انجیل پر ہے صرف سرسری سا حوالہ دینے پر اکتفا کریں گے۔ ان کی خصوصیات ایسی ہیں جن کے پہچاننے کے لئے زیادہ تفصیل و وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ انجیل میں یہ لکھا ہوا تھا کہ دنیا چھ دن میں بنائی گئی اور ساتویں دین جو یوم السبت ہے خدا نے آرام لیا اور ایک دن خدا کے نزدیک بمنزلہ ایک ہزار سال کے ہے لہذا مقدس مورخوں نے یہ استدلال کیا کہ دنیا کی عمر کل سات ہزار سال کی ہوگی جس میں سے چھ ہزار سال تو مصیبت میں کٹیں گے اور ایک ہزار سال کا زمانہ عیش و راحت اور سکون و اطمینان میں بسر ہوگا۔ عام طور سے یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ حضرت مسیح کی ولادت کے وقت دنیا کی عمر چار ہزار سال تھی لیکن یورپ سنین عالم کے مطالعہ کی طرف سے اس درجہ غافل اور بے پروا تھا کہ ۱۵۸۷ء سے پہلے اسے سن عیسوی کے قائم کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ اس زمانہ میں

روما کے ایک پادری ٹھونہسیس اکیگوس کو یہ فروگزاشت محسوس ہوئی اور اس نے بجائے عام بت پرستانہ سن کے موجودہ عیسوی سن کو رواج دیا۔

قدیم ترین واقعات عالم کے سنن کا اندازہ لگانے میں ان تخمینوں سے کام لیا گیا جو زیادہ تر انبیائے سلف کی عمروں پر مبنی تھے اور اس طور پر اعداد میں جو نواقض پیدا ہوئے ان کی تطبیق میں بے حد دقیقیت پیش آئیں۔ فن انتقاد سے تو اس زمانہ کے اصحاب جس میں سے ہمیں بحث ہے مطلقاً بیگانہ تھے اور اسی لئے حضرت موسیٰ کو ان صحائف کا حامل تسلیم کر لیا گیا جو ان سے منسوب ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت موسیٰ ان صحائف کے مصنف تھے تو اس اجتماع ضدین کی کیا تاویل ہو سکتی ہے کہ وہ ایسے واقعات کے راوی ہیں جن میں سے اکثر ان کی ولادت سے دو ہزار سال قبل پیش آ چکے تھے۔ تورات کا ہر حصہ بادی النظر میں الہامی نہ سمجھا جاسکتا تھا اس لئے کہ اس کو تحریف سے بچانے کی کوئی تدبیر اختیار نہ کی گئی تھی۔ مختلف نسخوں میں جو زمانہ کی دست برد سے بچے بجائے باقی چلے آتے تھے بہت کچھ اختلاف تھا۔ مثلاً "سامری نسخہ میں پیدائش یعنی آفرینش عالم سے طوفان تک کا زمانہ ایک ہزار تین سو سات سال درج تھا عبرانی نسخہ میں یہ مدت ایک ہزار چھ سو چھپن سال تھی۔ حالانکہ نسخہ بعینہ میں یہی مدت دو ہزار دو سو تریسٹھ سال مذکور تھی۔ نسخہ سبعینہ میں پیدائش سے حضرت ابراہیمؑ تک کا زمانہ عبرانی نسخہ کے مقابلہ میں ڈیڑھ ہزار سال زیادہ تھا۔ لیکن اس اندازہ میں ان سب کا اتفاق تھا کہ واقعہ طوفان پیدائش سے تقریباً دو ہزار سال بعد پیش آیا اور اس پر جب اور دو ہزار سال گزر گئے تو حضرت مسیحؑ تولد ہوئے۔ جن لوگوں نے اس مضمون کی اچھی طرح سے چھان بین کی تھی ان کا یہ قول تھا کہ حضرت مسیحؑ کی تاریخ ولادت کے بارے میں ایک سو بتیں مختلف اقوال موجود ہیں اور ایسی حالت میں کتب مقدسہ کے شمار و اعداد پر پورا بھروسہ کرنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ اس لئے کہ مختلف نسخوں کے اختلافات ظاہر کر رہے ہیں کہ خدا نے خود صحیح نسخہ کی حفاظت نہیں کی نہ کوئی ایسا نشان یا علامت موجود ہے جس سے انسان کو معلوم ہو سکے کہ فلاں نسخہ صحیح اور غیر محرف ہے۔ وہ نسخے بھی جنہیں خاص وقت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ایسی ایسی غلطیوں سے بھرے پڑے ہیں جن کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔ مثلاً "نسخہ سبعینہ میں درج ہے کہ یتیموسلا طوفان کے بعد بھی بقید حیات موجود تھا جو ایک مرتب غلطی ہے۔

یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا تھا کہ دنیا کے قبل طوفان میں سال تین سو ساٹھ دن کا

ہوتا تھا اور دائرے کو تین سو ساٹھ درجوں میں تقسیم کرنے کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ لیکن جب طوفان آیا تو آفتاب کی حرکت میں تغیر واقع ہو گیا اور سال کی مدت بقدر پانچ دن اور چھ گھنٹے کے بڑھ گئی۔ بعض پیشوایان دین کی یہ رائے تھی کہ دنیا کا یہ عظیم الشان واقعہ ۱۹۵۶ء آفریقہ عالم میں نومبر کی دوسری تاریخ کو پیش آیا۔ ڈاکٹر وٹسن جن کی وقت نظری اور دقیقہ سنجی کو اس تاریخ میں تھوڑی سی غلطی محسوس ہوئی۔ ازراہ غایت تدقیق و تحکیم فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کی اصلی تاریخ ۲ نومبر نہیں بلکہ ۲۸ نومبر ہے۔ بعض بزرگواروں کا یہ خیال تھا کہ طوفان سے پہلے قوس قزح دیکھنے میں نہیں آئی تھی بلکہ طوفان کے فرو ہونے کے بعد اول اول بطور ایک آسمانی نشان کے ظاہر کی گئی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کشتی نوح سے باہر آنے کے بعد آدمیوں کو گوشت کھانے کی اجازت ملی اور طوفان سے پہلے انسان نباتات خور تھا۔ مظلوم ایسا ہوتا ہے کہ طوفان کی وجہ سے روئے زمین پر کوئی نمایاں جغرافیائی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی ان معلومات کے بحروسے پر جو انہیں قبل طوفان حاصل تھیں زمین کو اپنے تین بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ یعنی یورپ یا فٹ کو دیا۔ ایشیا سام کو اور افریقہ ہام کو۔ چونکہ انہیں امریکا کے وجود کا علم نہ تھا اس لئے اس کے اذسرفو آباد کرنے کی کوئی گنجائش نہ نکالی۔ حضرت نوحؑ کے ان سعادتمند فرزندانوں نے اپنے والد ماجد کے حکم کی تعمیل بسر و چشم کی اور دل میں مطلق یہ ہراس لائے بغیر کہ جن خوفناک ویرانوں میں ہم جا رہے ہیں وہاں ہو کا عالم چھایا ہوا ہے اور طوفان کی وجہ سے جو دلدلیں پیدا ہو گئی ہیں وہ خشک بھی نہیں ہونے پائیں اپنے اپنے منقضہ مقبوضات میں نو آبادیاں قائم کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

ستر سال میں ایشیائی خاندان کے بال بچوں کی تعداد بڑھ کر کئی سو ہو گئی یہ سب کے سب دشت نوردی و باویہ گردی کرتے ہوئے مسوپوٹیمیا میں جا پہنچے تھے۔ جہاں انہوں نے کسی مصلحت سے جس کا علم ہمیں نہیں ہے۔ ایک مینارہ تعمیر کرنا شروع کیا جس کی چوٹی کو وہ آسمان تک پہنچانا چاہتے تھے۔ یو سیٹس رقم طراز ہے کہ اس مینارہ کی تعمیر کا کام چالیس سال تک جاری رہا۔ اس وقت خدا نے دفعتاً ان کی زبانوں میں اختلاف پیدا کر دیا اور وہ مجبوراً مینارے کا کام چھوڑ کر روئے زمین پر منتشر ہو گئے۔ سینٹ امبروز فرماتے ہیں کہ اس اختلاف السنہ کا باعث انسانی طاقت نہ تھی اور آریجی کا قول ہے کہ فرشتے بھی اس اختلاف کی تکمیل نہ کر سکے بلکہ خود خدا نے اس قوم کی زبانوں کو بدل ڈالا۔

اختلاف السنہ کی بنا پر علماء مذہب نے انسان کی ابتدائی زبان کے متعلق عجیب و غریب

قیاس آرائیوں سے کام لیا ہے۔ ایک گروہ ایسے علما کا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ حضرت آدمؑ کی زبان مطلقاً "اسا پر مشتمل تھی اور یہ اسا واحد الجہات تھے۔ جب اسمائے کثیر الجہات کی اشاعت و ترویج ہوئی تو زبان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگواروں نے یہ رائے قائم کرتے وقت ان متعدد مکالمات کو نظر انداز کر دیا جن کا ذکر کتاب پیدائش میں موجود ہے۔ چنانچہ خدا نے حضرت آدمؑ اور سانپ نے حضرت حواؑ سے جو گفتگو کی اس کی روایات و تورات میں تمام و کمال مندرج ہے۔ اس گفتگو میں کلمہ کی سبھی اقسام و اصناف پائی جاتی ہیں۔ بہر حال یہ امر متفق علیہ تھا کہ انسان کی ابتدائی زبان عبرانی تھی اور جن اصول پر پادریوں کے علوم و فنون کا انحصار تھا ان کی رو سے یہی مناسب بھی تھا۔

کیسائے یونان کے پادریوں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ جب اختلاف زبان کی وجہ سے اقوام میں تفرقہ پڑا تو باہل کی آبادی بہتر قوموں میں منقسم ہو گئی اور اس اندازہ سے سینٹ آگسٹائن کو بھی اتفاق ہے۔ لیکن عقل سلیم کو اس تخمینہ کے صحیح تسلیم کرنے میں جن دقتوں کا سامنا تھا وہ اپنا رنگ لائے بغیر نہ رہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر کنفرڈ نے اپنی قابل قدر کتاب میں جو "عالم کی تواریخ پاک و نجس کا مقابلہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے متذکرہ بالا تمام مباحث پر نظر انتقاد ڈالتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ان بہتر اقوام میں سے ہر ایک کی آبادی مرد و عورت بچے سب ملا کر اکیس بائیس نفوس سے زیادہ کسی حالت میں نہ ہو سکتی تھی۔

شعور و عوام کے اس تاریخی تخمینہ میں جو انبیاء اولیائے سلف کی عمروں پر مبنی تھا سب سے زیادہ قابل غور بات ان بزرگوں کی عمروں کی غیر معمولی اور فوق العادت طوالت تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ طوفان نوح سے پہلے مزاج کائنات میں دائمی اعتدال پایا جاتا تھا۔ باغ عالم میں ہر وقت بہار جلوہ گر رہتی تھی اور قدرت کے انقلابات و تغیرات مفقود تھے۔ لیکن طوفان کے بعد یہانہ عمر بقدر نصف کے خالی ہو گیا اور صاحب زور کے زمانہ میں انسان کی عمر کا اوسط اور بھی گھٹ کر ستر سال تک پہنچ گیا جو آج کے دن تک قائم ہے۔ چونکہ طوفان کے وقت زمین کا محور اپنی جگہ سے ٹل گیا لہذا موسموں میں سختی پیدا ہو گئی اور صیف و شتاء ہر شکل کے اشداد کو طوفان کے واقعہ ہاتھ کی ان ہمہ گیر بلاؤں نے اور زیادہ بڑھا دیا جن کی وجہ سے سطح زمین ایک وسیع دلدل بن گئی اور خون میں احراق اور اعصاب میں استرخا پیدا ہو گیا۔

انبیائے سلف اور قبوں اولی کے شیوخ قبائس کے عمروں کی حیرت انگیز طوالت سے جو

مشکلات استقرا کو پیش آتی تھیں ان سے بچنے کے لئے بعض علماء دین نے تاویل کا یہ پہلو اختیار کیا کہ کتب مقدسہ میں جن سنین کا ذکر کیا گیا ہے وہ شمسی سال نہ تھے بلکہ قمری سال تھے اس تاویل نے ان بزرگواروں کی عمر کو اگرچہ آج کل کی مدت حیات کے برابر کر دیا اور ایک مشکل رفع ہو گئی لیکن ایک دوسری بہت بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ پانچ چھ سال ہی کی عمر میں وہ سن بلوغ کو پہنچ کر صاحب اولاد بھی ہو گئے۔

پیشوایان کلیسا نے مقدس سائنس کو جن معارف و حقائق کا منفع قرار دیا ہے ان کا انقطاع ذیل کے سمات السائل کی شکل میں کیا جا سکتا ہے۔

(۱) تاریخ پیدائش یعنی سکونین عالم کو کچھ بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا یعنی ظہور مسیح علیہ السلام سے یہی کوئی چار پانچ ہزار برس پہلے (۲) عالم کو پیدا کرنے میں چھ معمولی دنوں کی ایک مدت صرف ہوئی (۳) طوفان عالم گیر تھا اور جو حیوانات اس کی تباہی سے بچے وہ ایک کشتی کے ذریعہ سے محفوظ رہے (۴) حضرت آدم پیدائش کے وقت اخلاق اور عقل میں کامل تھے لیکن اس پایہ عقل و اخلاق سے انہیں گناہ نے گرا دیا اور ان کی اولاد و افتاد کو ان کی معصیت و ہبوط میں شریک ہونا پڑا۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض مسائل ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو کلیسا کی فہرست عقائد میں شامل ہیں۔ ان میں سے دو مسائل ایسے تھے جن کی حقیقت پر پیشوایان دین عیسوی کو اصرار کئے بغیر مفر نہ تھا۔ اول یہ کہ آفرینش عالم کو کچھ بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ مسیحیت کی بقا کے لئے یہ عقیدہ لازمی تھا اس لئے کہ آفرینش کا زمانہ جس قدر بعید ہو گا اسی قدر خدا کے عدل و انصاف کو ثابت کرنے کے لئے زیادہ قوی دلائل کی ضرورت عائد ہو گی جس نے بنی نوع کے ایک حصہ کثیر کو اس کی قسمت کے حوالہ کر کے نجات کی نعمت صرف انہیں چند نفوس کو بخشی جو ظہور مسیح کے بعد یعنی عالم کے دور آخر میں پیدا ہوئے۔ مسیحیت کا دوسرا رکن اعظم یہ تھا کہ حضرت آدم پیدائش کے وقت انسان کامل تھے۔ یہ عقیدہ مسئلہ ہبوط و مسئلہ نجات کی تاویل کے لئے نہایت ہی ضروری تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ علمائے دین عیسوی ہر اس کوشش کی مخالفت پر مجبور تھے جو اس بات کے ثابت کرنے کے لئے عمل میں لائی جائے کہ زمین کی ابتدا ایک ایسی دور دراز زمانہ میں ہوئی جس کا بعد زبونی کش تعین نہیں ہے اور مسلمانوں کے اس قیاس کو وہ کسی طرح بہ نظر استحسان نہ دیکھ سکتے تھے کہ انسان طبقہ سافل کی اشکال حیوانی کی ترقی یافتہ صورت ہے یعنی قرنماقرن تک بتدریج نشوونما پا کر موجودہ درجہ کو پہنچا ہے۔

عبارت مذکور الصدر جن مملات و لغویات و اضداد سے معمور ہے ان سے اس مقدس سائنس کی حقیقت روز روشن کی طرح آشکار ہے۔ اور عجب نہیں کہ ہمیں بھی وہی رائے ظاہر کرنی پڑے جو پچھارے ڈاکٹر ککفرڈ نے جن کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے اس علم پاک کے نواقض میں شان توافقی و معقولیت پیدا کرنے کی بے سود کوششوں کے بعد مجبوراً "ان الفاظ میں ظاہر کی ہے کلیسا کے پیشوایان قرون اولیٰ کی نسبت ہم سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نیکوکاری میں شک نہیں لیکن ان کی معلومات تجرے سے عاری تھیں۔"

روایات مقدسہ کی رو سے خدا زمین کی ترکیب و تنظیم کی بلاواسطہ علت ہے۔ روایات مذکور کو آفرینش عالم میں علل ثانیہ کی مداخلت سے انکار ہے۔

علم ترکیب کائنات کا زمانہ کیسینی کے اس دور بینی اکتشاف سے شروع ہوتا ہے کہ سیارہ مشتری کہ نہیں ہے بلکہ ایک مطح القطنین جرم بیضوی ہے۔ علم الحركات و الجبل نے ثابت کر دیا کہ اس قسم کی شکل ایک مادہ قابل الجبل کی گردش کا لازمی نتیجہ ہے اور گردش جس قدر زیادہ تیز ہوگی اسی قدر جرم دوار کے قطبین زیادہ مطح ہوں گے بالفاظ دیگر اس کے استوائی حصے باہر کو زیادہ نکلے ہوئے ہوں گے۔

علم الحركات ہی کے اصول کی بنا پر نیوٹن نے حکم لگایا تھا کہ کسی قدر ترمیم کے ساتھ زمین کی بھی اسی طرح کی شکل ہونی چاہئے۔ منطقہ استوائیہ کا اتنا اندلاع یعنی چمک کر باہر کو نکلا ہوا ہونا استقبال اعتدالین کا باعث ہے جس کے دور کی بحیل پچیس ہزار آٹھ سو اڑسٹھ سال میں ہوتی ہے اور اسی اندلاع سے محور زمین کا ہتزاز پیدا ہوتا ہے جسے بریڈلی نے دریافت کیا تھا۔ اس سے پہلے ایک مقام پر ہم لکھ چکے ہیں کہ زمین کا قطر استوائی قطر قطبی سے بقدر چھبیس میل کے زیادہ ہے۔

زمین کی تسطح قطبین سے دو واقعات منکشف ہوتے ہیں اول یہ کہ وہ زمانہ سابق میں جاہل و لین یعنی بصورت خیرہ چلی ہے دوم یہ کہ وہ حرکت کے سانچے میں ڈھلی ہے اور اس لحاظ سے گویا اس کی ترکیب میں کسی علت ثانیہ نے حصہ لیا ہے۔

قوانین حرکات و جیل کا یہ اثر کہ زمین کی ترکیب خارجی و ظاہری ہی میں نمایاں نہیں ہے یعنی اس اثر نے اس کے قطبین کی تسطح اس کی بیضویت اور اس کی حرکت داری ہی میں حصہ نہیں لیا بلکہ اگر ان اجزا کا معائنہ کیا جائے گا جن سے زمین مرکب ہے تو یہی اثر ان میں بھی نظر آئے گا۔

اگر ہم اجار آبی کے طبقہ کو جانچیں تو معلوم ہو گا کہ اس کا دل کئی میل کا ہے لیکن

اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان چٹانوں کے التمام و انطباق کا عمل بہت آہستہ آہستہ ہوا ہے۔ جس مادہ سے یہ چٹانیں مرکب ہیں وہ قرنماقرن پہلے کے اجزائے ارضی کی تحلیل و شعیث سے حاصل ہوا ہے جنہیں نالوں اور ندیوں کے بہاؤ نے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے اذسرنوہ بہ بہ جما دیا۔ اس قسم کا عمل تحلیل و انطباق ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے لیکن تاوقتیکہ مدت ہائے مدید متعینی نہ ہو جائیں کوئی نمایاں اثر اس سے مترتب نہیں ہو سکتا۔ پانی کی روانی کے عمل سے مٹی کے اجزائے تحلیل شدہ کی جو بہ کسی دریا کے دہانہ پر جم جاتی ہے اس کی موٹائی ایک صدی میں چند انچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پس اسی قسم کی جس بہ کی موٹائی کئی ہزار گز ہو اس کے انطباق میں کس قدر زمانہ صرف ہوا ہو گا؟

مصر کے ساحل کی ہیئت ترکیبی کا علم انسان کو دو ہزار سال بلکہ اس سے بھی پہلے سے ہے۔ اس زمانہ میں ان اجزائے ارضی نے جنہیں دریائے نیل کی موجیں اپنے ساتھ بہا لاتی رہی ہیں اس ساحل میں ایک نمایاں اضافہ کر کے بحر روم کو کچھ دور پیچھے ہٹا دیا ہے۔ لیکن مصر کا تمام شمالی حصہ اسی طرح سمندر کو پاٹ پاٹ کر بنا ہے۔ دریائے نیسی کے دہانے کے قریب خلیج کمیکو کا ساحل تین سو سال سے ماہرین فن طبقات الارض کے پیش نظر ہے لیکن اس مدت میں خط ساحل نے کوئی نمایاں پیش قدمی نہیں کی حالانکہ مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا جب کہ اس دریا کا دہانہ سینٹ لائیس کے قریب موجودہ مقام سے سات سو میل کے فاصلہ پر تھا۔ مصر و امریکا ہی پر کچھ موقوف نہیں۔ تمام ممالک میں دریا انچ ۲ انچ خشکی کو تری میں بہائے ہوئے چلے جاتے ہیں اور ان کی آہستگی عمل اور اس عمل کے عظیم الشان آثار سے ہم وثوق کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس عمل تراکم اجراف و انطباق طبقات کے لئے اور مدیدہ و قرون بعیدہ کا اقتضا لازمی ہے۔

یہی نتیجہ ہم کو اس وقت بھی نکالنا پڑتا ہے جب ہم جھیلوں کے پائے جانے پانی کے قطران سے اجزائے کثیر یعنی چونے اور کھاد کے متحجر ہونے۔ بارش کے عمل سے کسماروں کے حل ہو ہو کر بننے۔ سمندروں کی موجوں کے تھپیڑوں سے ساحل کے کٹنے سنگلاخ ٹیکوں کی بنیادوں میں پانی کے سرگ لگانے اور بادوباراں کے اثر سے چٹانوں کے فرسودہ ہونے پر غور کرتے ہیں۔

تراکم اجراف سے اعجاز آبی کے جو پرت تلے اوپر جم گئے ان کے انطباق کی سطح ضرور ہے کہ ابتدا میں تقریباً "افقی السمیت ہو۔ لیکن کثیر التعداد طبقات یا تو کسی ایسے بطش شدید

کی وجہ سے جس کا ظہور باوقات مختلف ہوا اور یا تدریجی حرکت کے باعث زیادہ مختلف المیٰان بناتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ان عظیم الشان اوجہاجات و انحرافات کی اصلی وجہ خواہ کچھ ہی ہو لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ ان طبقات کے ترکیب پذیر ہونے کے لئے اس قدر مدت مدید کا گزرنا لازمی ہے۔ جس کے ادراک سے فہم قاصر ہے۔

ویلز کے ان طبقات ارضی کا محق جن سے پتھر کا کونکہ برآمد ہوتا ہے بتدریج قعر زمین میں غرق ہوتے ہوئے بارہ ہزار فٹ ہو گیا ہے اور نواسکو تیا میں ان طبقات کا دل چودہ ہزار پانچ سو ستر فٹ ہے۔ دھننے کا یہ عمل اس آہستگی اور مواظبت سے ہوا کہ ہر طبقہ کے درخت تلے اوپر جون کے نوں کھڑے ہوئے ہیں اور چار ہزار پانچ سو پندرہ فٹ کی موٹائی میں سترہ طبقے اس قسم کے گنے جاسکتے ہیں۔ درختوں کی عمر کا اندازہ ان کی جسامت سے ہو سکتا ہے چنانچہ بعض کے تنے کا قطر چار فٹ ہے۔ دھنستی ہوئی زمین کے ساتھ ساتھ جب درخت بھی آہستہ آہستہ زمین میں سمٹ گئے تو ان کے گرد وہ پودے اگتے گئے جنہیں اصطلاح فن طبقات الارض میں ”کیلیمائٹ“ (ذنب الفرس) کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ پودے غرق شدہ درختوں کی طرح درجہ بدرجہ ہر طبقہ میں پائے جاتے ہیں۔ سڈنی کے طبقہ زغالی میں انسٹھ دہے ہوئے جنگل تلے اوپر کھڑے ہوئے ہیں۔

بحری کونگوں کی سیڑیوں کو برا عظموں کے اندرونی حصہ کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دیکھ کر علمائے مذہب اپنی تصانیف میں یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ان سیڑیوں سے طوفان نوح کی ہمہ گیری کی حجت قاطع بہم پہنچتی ہے۔ لیکن جب علم طبقات الارض کے مسائل صحت کے ساتھ معلوم ہونے لگے تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ زمین کے خول بیرونی میں وہ طبقات جو آب شیریں کے عمل سے بنے ہیں ان طبقات کے ساتھ جنہیں آب شور نے بنایا ہے علی التوالی و التسلسل کسی کتاب کے اوراق کی طرح ملے ہوئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک ہی طوفان ان مختلف مظاہر کا باعث نہیں ہو سکتا بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی قطعہ زمین اپنی سطح کے تدریجی تغیرات اور اپنے جغرافیائی حوالی کی تبدیلیوں سے کبھی تو بالکل خشک تھا کبھی آب شیریں کے تلے ڈوب گیا اور کبھی آب شور کے نیچے آگیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی روز روشن کی طرح آشکار ہو گئی کہ ان تغیرات و انقلابات کی تکمیل کے لئے ہزاروں لاکھوں سال کی مدت مطلوب ہے۔

قدامت ارض کی اس شہادت پر جو اس کے طبقات کی وسعت۔ عمق اور تنوع سے ماخوذ تھی ان زبردست شہادتوں کا اضافہ ہو گیا جو اس کے آثار و نتیجہ پر مبنی تھیں۔ زمین

کے ہر طبقہ کی عمر جب مستحق ہو گئی تو اس بات کا ثبوت دینا آسان ہو گیا کہ نباتی و حیوانی ہر طرح کے اجسام ذوی الاعضاء نے قدیم ترین اشکال سے لے کر جدید ترین اشکال تک بتدریج ترقی کی ہے اور وہ نباتات و حیوانات جو ہمارے زمانہ میں سطح زمین کی آبادی کا باعث ہیں ان کثیر التعداد اشکال نباتی و حیوانی کا محض ایک جزو حقیر ہیں جو بہ زمانہ سابق عالم ہستی میں آچکی ہیں۔ یعنی اگر ایک نوع اس وقت زندہ ہے تو ہزارہا انواع فنا ہو چکی ہیں۔ اگرچہ طبقات ارض سے متحجرات کے جو آثار برآئ ہوئے ہیں ان میں سے حیوانات کی بعض انواع اپنی خصوصیات مخصوصہ کے لحاظ سے اس درجہ نمایاں ہیں کہ ہماری زبان پر دور حیوانات مفیلہ (بے ریزہ کی ہڈی کے جاندار) دور ہوام الارض (زمین پر ریگننے والے وہ جاندار جو ریزہ کی ہڈی رکھتے ہیں) دور ذرات اثری (دودھ پلانے والے جاندار) کی اصطلاحیں چڑھ گئی ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہر نئی نوع ایک بیک نمودار ہو گئی تھی۔ ہر نوع کا تصور بتدریج دور سابق میں ہوا اور اپنے دور میں جو اس کے نام سے منسوب و مخصوص ہے ستھائے نشوونما پر پہنچ کر وہ بتدریج دور آئندہ میں معدوم ہو گئی۔ فوری پیدائش یعنی کسی شے کا ایک بیک کامل و مکمل صورت میں نمودار ہو جانا خارج از امکان ہے۔ ہر وجود کمال آہستگی سے اپنا چولا بدلتا ہے اور ایک سابقہ شکل سے ترقی کرتا ہوا موجودہ شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کے لئے بھی ایک بہت بڑے طویل و مدید زمانہ کا انقضا لازمی ہے۔ جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے یعنی جس زمانہ سے تاریخ کی روشنی انسان کے تمدن پر پڑی ہے۔ اس قسم کے تبدیلی یا استحالیہ یا نشوونما کی کوئی بین مثال ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی۔ علیٰ ہذا القیاس انقدام نوع کی کوئی تاریخی مثال دیتے ہوئے بھی ہم کچھ بہت زیادہ وثوق ظاہر نہیں کر سکتے لیکن ان قرون و ادوار میں جنہیں حقائق طبقات الارض سے تعلق ہے صدا ہزارہا کون و فساد اور ارتقا و انقدام پیش آچکے ہیں۔

چونکہ انسان کا تجربہ تبدیلیت یا ارتقا کی کسی مثال پر حاوی نہیں ہے لہذا بعض اصحاب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس قسم کا تبدل یا ترقی خارج از امکان ہے۔ اور حیوانات و نباتات کی حتمی نوعیں علیحدہ علیحدہ پیدا کی گئی ہیں۔ لیکن ان اصحاب کو یہ تو سوچنا چاہئے کہ ہر نوع کا ایک نوع سابقہ سے بہ تبدیل و ترمیم اعضا ترقی پا کر درجہ کمال پر فائز ہونا اس کے مقابلہ میں زیادہ قرین دلائل ہے کہ وہ نوع ایک بیک عدم سے وجود میں آ جائے۔ یہ قول بھی کچھ بہت زیادہ وقت نہیں رکھتا کہ کبھی انسان نے کسی نوع کے کسی فرد کو ارتقا کا چولا بدلنے ہوئے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ شاید وہ لوگ جن سے اس ادعا کو

نسبت ہے اس امر کی طرف سے خالی الذہن ہیں کہ آج تک کسی شخص نے اپنی آنکھ سے یہ بھی تو نہیں دیکھا کہ کوئی جسم ذوی الاعضا بغیر کسی مورث کے خود بخود اور یک بیک پیدا ہو گیا ہو۔

آفرینش کے ان افعال سے جو ہستہ صادر ہوں اور جن میں مغائر للقانون ہونے کے علاوہ کوئی ربط نہ پایا جاتا ہو۔ گو قدرت ایزدی ظاہر ہوتی ہو لیکن اجسام ذوی الاعضا کو وہ غیر منقطع سلسلہ جو طبقات قدمہ تختانیہ کے متحجرات سے لے کر طبقات جدیدہ فوقانیہ تک پھیلا ہوا ہے اور جس کا ہر ایک حلقہ ایک حلقہ ماسبق سے مطلق اور ایک حلقہ مابعد کا سہارا ہے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ جاندار ہستیوں کا وجود میں آنا ایک مقررہ ضابطہ کے تابع ہے اور یہ وہ ضابطہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ قانون ہزاروں لاکھوں سال سے اپنا عمل کر رہا ہے۔ لیکن آج تک اس میں کوئی تغیر اور کوئی رکاوٹ نہیں واقع ہوئی۔^۱ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے اس شہادت کے ایک حصہ کی نوعیت معلوم ہو سکتی ہے جس سے مسئلہ عمر زمین پر بحث کرتے وقت ہمیں سابقہ پڑنا ضرور ہے۔ علمائے فن طبقات الارض کی متصل و مسلسل کوششوں نے اس شہادت کا اتنا بڑا انبار جمع کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے کئی ضخیم جلدیں مطلوب ہیں۔ یہ شہادت ان تمام احجار کے اجزائے ترکیبی و ہیئت کذائی کا حاصل ہے جن میں سے بعض تو آبی ہیں یعنی پانی کے عمل سے بنے ہیں۔ بعض آتش ہیں یعنی جوف زمین کے کھولے ہوئے خارج شدہ مادے سے مرکب ہیں اور بعض مستحیلہ ہیں یعنی حرارت اور دباؤ کے متفقہ عمل سے ترکیب پذیر ہوئے ہیں۔ طبقہ احجار آبی کے متعلق یہ تحقیقات کی گئی ہے کہ اس کی موٹائی کس قدر ہے۔ اس کے مختلف پرتوں کا میلان کس سمت میں ہے۔ ہر ایک پرت دوسرے پرت پر بے ڈنگے پن سے کس شکل میں قائم ہے۔ وہ طبقات جو آب شیریں کے عمل سے بنے ہیں ان طبقات کے ساتھ جن میں آب شور کا اثر پایا جاتا ہے کس طرح ملے ہوئے ہیں۔ تفریہ و تحلیل کے بطی اصل اسباب نے مادہ ارضی کے کوہ پیکر انباروں کو کیوں کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے وسیع و عریض جغرافیائی رقبوں کی شکل تبدیل کر دی ہے۔ ہوا عظیموں کی سطوح میں ابھرنے اور دھنسنے کی وجہ سے کس طریقہ پر نشیب و فراز پیدا ہو گیا ہے یعنی ان کے سواحل کیوکر تو سمندر میں غرق ہو گئے ہیں اور یا خشکی میں بہت دور اندر تک چلے گئے ہیں۔ حیوانات و نباتات کے حال سے بھی علم طبقات الارض کی شہادتوں کو بحث ہے یعنی اس مسئلہ پر نظر دیا گیا ہے کہ ہر دور میں کون کون سی حیوانی اور نباتی شکلیں موجود تھیں اور کیوکر نہایت

ترتیب و تسلسل کے ساتھ اجسام ذوی الاعضاء یعنی نباتات و حیوانات کا سلسلہ عالم ابدان کے مبہم و مبہوم نقطہ آغاز سے ہمارے زمانہ تک پہنچا ہے۔ حشیش منجر سے جس کی اصل ہر صورت میں نباتات ذایل ہے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نہ صرف زمین کے کہ ہوا ہی میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں بلکہ موسم میں بھی ہمہ گیر انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ بعض دوسرے واقعات متعلقہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ روئے زمین کی حرارت میں بھی مدو جزر ہوتا رہا ہے۔ یعنی بعض زمانوں میں حرارت کا اوسط بہت بڑھ گیا ہے اور بعض میں قطبین کی برف کے تودے موجودہ براعظموں کے ایک بہت بڑے حصہ پر چھا گئے ہیں۔ چنانچہ ان ادوار کو ازمنہ زممر یہ کہتے ہیں۔

ماہرین فن طبقات الارض کا ایک گروہ جس کی دلائل کا مدار علیہ نہایت زبردست شہادت ہے یہ رائے پیش کرتا ہے کہ کل جرم ارض ابتدا میں ایک جسم گداختہ یا سیال تھا بلکہ شاید فرط حرارت سے بحالت و خان تھا۔ لاکھوں قرون کے گزرنے کے بعد تنجیر کے ذریعہ سے اس کی حرارت کا اشتداد کم ہوتا گیا تا آنکہ اس کے مزاج میں موجود اعتدال پیدا ہوا۔ علم دینت کے مشاہدات خصوصاً "نظام شمسی کے اجرام سیار کے حالات اس تاویل کی تائید و توثیق کرتے ہیں۔ بعض دوسرے واقعات سے بھی اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے مثلاً "اوسط کثافت ارض کی کمی۔ زیادتی عمق قعر زمین کی نسبت سے حرارت کا ازدیاد کھولنے ہوئے مادہ کا آتش فشاں پہاڑوں اور دراڑوں کی راہ سے اخراج۔ اعجاز آتشی و مستحید کا وجود۔ ان طبعی تغیرات کی تکمیل کے لئے جو علل طبقات الارض کی اس جماعت کے پیش نظر ہیں بے انتہا صدیاں مطلوب ہیں۔

لیکن نظام کوپرنیکس کے حقائق کا اعتراف اس ضرورت کا مستلزم ہے کہ زمین کی ابتدا و سرگزشت کے واقعہ پر انفرادی حیثیت سے نظر نہ ڈالی جائے۔ ضرور ہے کہ اس واقعہ پر بحث کرتے وقت اس نظام یا خاندان کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے جس کا کہ زمین ایک رکن ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اپنی بحث کو نظام شمسی تک بھی محدود نہیں کر سکتے۔ اس بحث میں ہمیں ثوابت کی دنیاؤں کو بھی شریک کرنا چاہئے اور چونکہ اس برتر از قیاس فاصلہ کی غرابت سے ہمارا دماغ اب مانوس ہو چکا ہے جو ان ثوابت کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے لہذا ہم ان کی ٹکون کے زمانہ میں بھی بعد کے اس عصر کے اعتراف کے لئے آمادہ ہیں جس کی پیکائش محالات سے ہے۔ کائنات میں ایسے ایسے کواکب بھی موجود ہیں جو ہم سے اس قدر دور ہیں کہ باوجودیکہ روشنی اس تیزی سے حرکت کرتی

ہے پھر بھی ان کی شعاع نور کو ہم تک پہنچنے میں کئی ہزار سال کا زمانہ صرف ہوا ہے جس سے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کو وجود میں آئے ہوئے اگر زیادہ نہیں تو کم از کم کئی ہزار سال کی مدت تو ضرور منقضى ہوئی ہوگی۔

علمائے طبقات الارض جب بالاتفاق تسلیم کر چکے کہ تاریخ تکوین ارض بہت زیادہ توسیع کی محتاج ہے تو یہ کوششیں ہونے لگیں کہ اس تاریخ کو معین کیا جائے۔ ان کوششوں میں سے بعض اصول ثابت پر مبنی تھیں اور بعض اصول طبیعیات پر۔ مثلاً "سب سے آخری دور زمیریہ سے اس وقت تک کی مدت کے دریافت کرنے کی غرض سے جو تخمینہ مرکز مدار ارض و مرکز آفتاب کے درمیانی فاصلہ کی مطومہ تبدیلی کی بنا پر قائم کیا گیا ہے اس کا حاصل دو لاکھ چالیس ہزار سال ہے۔ اگرچہ اس عام اصول کے صحیح ہونے میں شک نہیں کہ ازمہ طبقات الارض کی مدت سمیر الاحصا ہے لیکن اس قسم کے تخمینے ایسے غیر یقینی قیاسات پر مبنی ہیں کہ وہ کسی طرح موثق و معتبر نہیں ٹھہر سکتے۔

تاہم اس مسئلہ کے مالمہ ماعلیہ پر علمی پہلو سے نظر ڈالنے کے بعد اس میں تو مطلق شک نہیں رہتا کہ علمائے مذہب نے صحیفہ موسیٰ سے جن واقعات کا استعما کیا ہے وہ ناقابل تسلیم ہیں۔ اگرچہ اکتشافات جدیدہ و واقعات مستفاد کے ساتھ واقعات الہامی کو تطبیق دینے کی حواضر کوشش کی گئی ہے لیکن وہ لاحاصل ثابت ہوئی ہے۔ تورات کا زمانہ حد سے زیادہ قلیل ہے۔ ترتیب ظہور مخلوقات بالکل خلاف واقعہ ہے اور خدا کی طرف سے جو مداخلت ہوئی ہے اس میں شان انسانی معمول سے زیادہ اپنی جھلک دکھا رہی ہے اور اگرچہ مسائل زیر بحث ان خیالات سے توافق و تطابق رکھتے ہیں جو انسان کے دماغ میں اس وقت پیدا ہوئے تھے جب اس کو اول اول صحیفہ فطرت کی ورق گردانی سے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا شوق پیدا ہوا لیکن ان کو زمین کی پچ میرزی اور کائنات کی عظمت و شان کے موجودہ تصورات سے مطلق ربط نہیں۔

حال کے طبقات الارضی اکتشافات میں سے ایک اکتشاف خصوصیت کے ساتھ ہماری توجہ کا محتاج ہے۔ یعنی ان طبقات میں جن کو اگرچہ طبقات الارضی اعتبار سے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری لیکن تاریخی اعتبار سے ایک عرصہ دراز منقضى ہو چکا ہے۔ انسانی جسم کے ڈھانچہ اور انسانی صنعت کے آثار پائے گئے ہیں۔

انسان کے آثار نتیجہ یعنی اس کے جسم کے ڈھانچہ اور کھردرے یا ترشے ہوئے مجلات پتھر اور ہڈی اور نحاس (کانسی) کے اوزار یورپ میں غاروں سنگریزوں کے تودوں اور حشیش

سنجر کے طبقوں میں پائے گئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اس زمانہ میں وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا اور جنگل کے جانوروں اور پھیلیوں کے شکار سے قوت بری کرتا تھا۔ جو تحقیقات حال میں کی گئی ہے اس سے اس واقعہ کی صریح شہادت بہم پہنچتی ہے کہ انسان دورِ فلک میں بھی موجود تھا اور جنوبی ہاتھی پتلی تھوٹھنی والے گینڈے اور عظیم الجثہ دریائی گھوڑے کا ہم عصر تھا۔ بلکہ شاید دورِ فلک الوسطی کے مشہور داڑھوں میں قہن رکھنے والے فیل نما حیوان ”سلوان“ کا بھی معاصر تھا اور یہ وہ حیوان ہیں جن کی سلیس معدوم ہو چکی ہیں۔

دورِ فلک کے اختتام پر پوجہ ان اسباب کے جو ابھی تک مستحق نہیں ہوئے زمین کے نصف کرہ شمالی کی حرارت میں غیر معمولی کمی واقع ہو گئی۔ یعنی منطقہ حارہ سے وہ منطقہ بارودہ ہو گیا اور تابستان کی جگہ برفستان نے لے لی۔ ایک مدتِ مدت کے بعد حرارت پھر بڑھ گئی اور برف کے وہ پہاڑ جو سطحِ زمین پر دور دور چھا گئے تھے پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد پھر حرارت میں کمی ہو گئی اور تودہ ہائے برف آگے بڑھ آئے۔ لیکن اس مرتبہ انہوں نے زیادہ پیش قدمی نہ کی۔ اب دورِ رابع کا آغاز ہوا اور موسم بتدریج بدلتا ہوا موجودہ حالت پر پہنچ گیا۔ تراکمِ اجزاف کے عمل کو جو پانی کی مدد سے برابر جاری تھا طبقاتِ آبی کے انطباق کے لئے ہزارہا صدیوں کی ضرورت تھی۔ قرونِ رابع کے اوائل میں خرس کنفی۔ اسد کنفی۔ فرس البحر و غیرین۔ کرمدن مشبک المتاخر اور فیل شعرانی (سمتہ) کی سلیس زندہ تھیں۔ ان کو پیکر ہاتھیوں کے کثیر التعداد غول جنگلوں میں آباد تھے اور ان کے پنپنے کے لئے نصف کرہ شمال کا موسم نہایت موزوں تھا۔ رفتہ رفتہ برفانی بارہ سیگوں گھوٹوں بیلوں اور ار نے ہمینوں کی سلیس ترقی کر گئیں اور قدرت کو جس کا دسترخوان پہلے صرف ایک اکیلے فیل شعرانی کے لئے وقف تھا اب اتنے بہت سے مہمانوں کی تواضع کرنی پڑی۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ روز افزوں حرارت کے باعث فیل شعرانی معدوم ہو گیا۔ وسطِ یورپ سے برفانی بارہ بیگا رخت ہو کر اظہارِ شمالی کی طرف جہاں زیادہ سردی تھی چلا گیا۔ اس کا نقل مکان قرونِ رابع کے خاتمہ کی علامت ہے۔

پس روئے زمین پر انسان کے ظاہر ہونے کی تاریخ سے لے کر اب تک بہت سے قرون گزرے ہیں جن کی میعاد ہر یون از قیاس اور برتاز اعصا ہے۔ ان قرونِ متمدنہ میں انقلاباتِ آب و ہوا اور تغیراتِ انواعِ حیوانات ان بطنی الاثر اسباب سے ہوتی ہے جو آج کے دن بھی اپنا عمل برابر کر رہے ہیں۔ شمار و اعداد سے ہم ان مدتِ ہائے دراز و ازمہ

بعیدہ کا اندازہ ہرگز نہیں کر سکتے۔

یہ امر پایہ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ انسان کی ایک نسل جو قوم ہاسک سے مشابہت رکھتی ہے زمانہ حجرہ جدید میں روئے زمین پر آباد تھی۔ اس زمانہ میں جزائر برطانیہ کی سطح اسی طرح زیر انقلاب تھی جس طرح فی زمانہ جزیرہ نمائے اسکندینیو یا تنغیر ہو رہا ہے۔ اسکاٹ لینڈ ابھر رہا تھا اور انگلستان دھنس رہا تھا۔ طبقہ ثانیہ الثالثہ جدید کے زمانہ میں وسط یورپ شکاریوں اور ماہی گیروں کی ایک وحشی نسل سے آباد تھا جو اسکیما نسل سے ملتی جلتی ہے۔

ریت مٹی اور خس و خاشاک کے ان انباروں میں جو اسکاٹ لینڈ کو دور زمیریہ جدید سے ترکہ میں پہنچی ہیں انسان اور ہاتھی کے سحجرات پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں یعنی جب یورپ کا بہت بڑا حصہ برف کے ان تودہ ہائے عظیم سے ڈھک گیا تھا جو قطب شمالی سے کھسکتے ہوئے جنوبی ممالک کی طرف بڑھ آئے تھے اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے اتر کر میدانوں میں چھا گئے تھے۔ حیوانات کی بے شمار انواع برف اور رخ کے اس طوفان میں تباہ ہو گئیں لیکن انسان بچ رہا۔

قدیم وحشیانہ حالت میں جب انسان پھل پھلاری جنگل کی جڑی بوٹیوں اور گھوگھوں پر زندگی بسر کرتا تھا اسے ایک بات ایسی معلوم تھی جس کی وجہ سے کبھی نہ کبھی اس کا متہدن و مذہب ہو جانا لازمی تھا یعنی اسے آگ جلائی آتی تھی۔ سطح زمین کے بالائی پرت کے ان مقامات میں جہاں کھودنے پر حشیش ستجر کا ایدھن لکھتا ہے ابھی تک انسان کے آثار پائے جاتے ہیں اور اس کے اوزاروں سے اس کا تاریخی زمانہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے۔ سطح زمین سے تھوڑی دور پر کانسی کے اس سے کچھ نیچے ہڈی یا سینک کے اس سے بھی نیچے ترشے ہوئے مجلا پتھر کے اور سب سے نیچے کھدوے ان گھڑ پتھر کے اوزار پائے جاتے ہیں۔ جن طبقات میں سے یہ اوزار برآمد ہوئے ہیں ان میں سے بعض کا زمانہ کسی طرح چالیس پچاس ہزار سال سے کم نہیں ہے۔

فرانس اور دوسرے ممالک میں ماہرین فن طبقات الارض نے جن غاروں کا معائنہ کیا ہے ان میں سے ازمہ حجرہ کے اوزار مثلاً "کلباڑیاں۔ چمڑیاں۔ برچھوں اور تیروں کے پھل۔ داتھان اور ہتھوڑے برآمد ہوئے ہیں۔ ان گھڑ پتھر کے زمانے یعنی عہد حجرہ قدیم کا تبدیل ہو کر ترشے ہوئے پتھر کے زمانے یعنی عہد حجرہ جدید میں ضم ہو جانا بہت ہی آہستگی کے ساتھ عمل میں آیا۔ یہ تبدیلی کتے کے پالے جانے کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوئی گویا یہ وہ دور تھا جب انسان نے شکاری زندگی شروع کی یہ دور بھی ہزاروں ہی صدیوں تک رہا۔

نیزوں کے پھلوں سے اس امر کی شہادت بہم پہنچتی ہے کہ انسان نے کہاں ایجاد کر لی تھی اور مدافسانہ طرز ماند و بود سے ترقی کر کے معارضانہ طریقہ زندگی اختیار کر لیا تھا۔ خاردار پیکانوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قوت ایجاد رو بہ ترقی تھی۔ ہڈی اور سیٹنگ کی کھلی پھالیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے جانوروں کے علاوہ انسان چھوٹے جانوروں بلکہ شاید پرندوں کا بھی شکار کرنے لگ گیا تھا۔ ہڈی کی سیٹیوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس کے ساتھ دوسرے شکاری بھی ہوتے تھے یا کم از کم اس کا کتا تو ضرور اس کا رفیق ہوتا تھا۔ سنگ خارا کی راپینوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے لباس کے لئے چمڑے کا استعمال کرنے لگ گیا تھا اور بھدے ٹوچنوں اور سوئیوں سے لباس کی سلائی کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے چھدی ہوئی سیٹیوں سے جو چوڑیوں اور ملاؤں کے لئے کام میں لائی جاتی تھیں۔ آرائش جسمانی کے مذاق کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ آلات رنگ سازی کا وجود تکوین و توہیم بدن پر گواہ ہے اور اعلیٰ مرتبہ کے ظاہر کرنے والے عصا تمدن کی تکوین و تنظیم کی علامات ہیں۔

ان قدیم انسانوں کی صنعت و دستکاری کا پہلا نمونہ ہمارے لئے نہایت ہی دلچسپی کا موجب ہے۔ ہاتھی دانت کے ٹکڑوں اور ہڈی کی تختیوں پر انہوں نے ان جانوروں کی بھدی تصویریں کھینچی ہیں جو ان کے زمانہ میں موجود تھے۔ اسی طرح ان جانوروں کی صورتیں بھی ان کی سنگ تراشی اور کندہ کاری کی ابتدائی کوشش کو ظاہر کرتی ہیں۔ زمانہ قبل تاریخ کی ان تصویروں میں جو بعض صورتوں میں اصلیت سے کچھ بہت زیادہ مغائر نہیں ہیں فیلان شعرانی اور برستانی بارہ سیٹگوں کی لڑائی کا نظارہ دکھایا گیا ہے۔ ایک تصویر میں ایک آدمی مچھلی کا شکار برچھے سے کر رہا ہے۔ ایک اور تصویر میں چند برہمن آدمی دکھائے گئے ہیں جو ہاتھ میں بھالے لئے شکار کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فقط انسان ہی وہ حیوان ہے جو اشکال خارجی کے انتقال کی قابلیت رکھتا ہے اور آگ کا استعمال کر سکتا ہے۔

گھوگھوں کے ٹیلوں میں جو ہڈیوں اور سیٹیوں سے مرکب ہیں اور جن میں سے بعض بہت بڑے بڑے اور ازمہ نحاسیہ سے بھی پہلے کے ہیں اور پتھر کے اوزاروں سے معمور ہیں ہر جگہ آگ کے استعمال کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہ ٹیلے اکثر تو موجودہ سواحل سے ملتی ہیں لیکن بعض صورتوں میں سمندر کے ساحل سے چالیس چالیس پچاس پچاس میل اور خشکی میں ہٹ آئے ہیں۔ ان کے اجزائے ترکیبی اور محل وقوع سے پایا جاتا ہے کہ ان کا زمانہ دودھ پلانے والے معدوم چوپایوں سے بعد لیکن پالتو جانوروں سے پہلے کا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان ٹیلوں میں سے بعض کی عمر کسی طرح ایک لاکھ سال سے کم نہیں

ہے۔

سوفٹولینڈ کے آب دوز اماکن یعنی ان جموںپرلوں میں جو جمیل کے اندر کٹڑی کے موٹے موٹے لٹے گاڑ کر درختوں کی شنیوں کے گھونٹنے سے بنائی جاتی تھیں کچھ اوزار پائے گئے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جموںپرلوں ازمہ حجرہ میں بنی شروع ہوئیں اور ازمہ نحاسہ تک قائم رہیں۔ ازمہ نحاسہ کے جو آثار موجود ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ انسان نے اس دور میں مزارعہ زندگی اختیار کر لی تھی۔

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ علمائے طبقات الارض نے اپنی آسانی کے لئے انسان کے زمانہ ترقی تمدن کو جن ادوار میں تقسیم کر لیا ہے ان کا آغاز و انجام ہستہ ہوا اور بنی نوع انسان کے کل افراد ہر دور کو ایک ساتھ ملے کرتے گئے۔ امریکہ کی خانہ بدوش وحشی اقوام زمانہ حجرہ کی وادی سے اب باہر نکل رہی ہیں۔ بہت سے مقامات میں ابھی تک یہ لوگ ایسے تہیوں سے مسلح نظر آتے ہیں جن کے پھل پتھر کے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ان میں سے بعض نے گورے رنگ کی مہذب اقوام سے لوہے بدوق اور گھوڑے کا استعمال سیکھا۔ غرض جس قدر تحقیقات اب تک ہوئی ہے اس سے یہ بات بلا امکان تردید ثابت ہوتی ہے کہ انسان آج سے کئی لاکھ سال پہلے کہ زمین پر آباد تھا۔ مٹی نہ رہے کہ اس تحقیقات کو کچھ بہت عرصہ نہیں گزرا اور جغرافیائی حدود کے لحاظ سے بھی اس کا دائرہ عمل بہت تنگ ہے۔ ان مقامات میں ابھی تک کوئی انکشاف نہیں کیا گیا جن کی نسبت محل سلیم گواہی دیتی ہے کہ انسان اولین کا مسکن ہمیں ہو گا۔

اس طور پر ہم چھ ہزار سال کی اس مدت سے جو پادریوں کا میل تاریخ ہے قزوں اور بکوں پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ دور زمیریہ جدید یعنی یورپ کی گزشتہ تہذیب کا زمانہ کسی طرح وحشی سال سے کم نہیں ٹھہر سکتا اور انسان کا اس زمانہ سے بھی پہلے دنیا میں موجود ہونا ثابت ہے لیکن ایک فطری عظیم الشان حقیقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے بلکہ ہم کو اس واقعہ کا بھی خواہی غواہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انسان سے بھی پہلے حیوانی زندگی موجود تھی اور ہر جسم ذوی الاعضاء نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ ارتقا پذیر ہوا۔

ایک طرف تو روایت کو اصرار ہے کہ ہمارے جد امجد باغ عدن میں جامہ اکیلیت زیب تن کئے ہوئے فردوس کی لذتوں سے بہرہ اندوز تھے اور دوسری طرف روایت علی روس الاشاد انسان اولین کی بے بسی اور بے کسی اور وحشیانہ حالت کا ثبوت دے رہی ہے۔

بین تفاوت رہ از کجاست تا بجای

روایت کے اس ادعا نے مسئلہ ہیوط آدم کو جو چرکا لگایا ہے اس سے ممکن نہیں کہ وہ جانبر ہو سکے۔

ہم نے اس فصل کے موضوع کو پیرایہ ترتیب تاریخی سے اس لئے عاری کر دیا ہے کہ مسئلہ ماہیت عالم کے متعلق جو کچھ ہمیں کہنا تھا اس کے مابہ و مابلیہ سے ہمیں مختلف مقامات پر بحث نہ کرنی پڑے۔ ورنہ مسئلہ عمر زمین مسئلہ معیار حق و صدق سے مدتوں بعد چھڑا یعنی ”رفارمیشن“ (اصلاح کینس) کے بعد اس مسئلہ پر بحث ہوئی کہ حق کی ماہیت کیا ہے بلکہ ہمیں یوں کہنا چاہئے کہ یہ بحث انیسویں صدی تک چھڑی رہی۔ اس بحث میں فریقین نے غیر معمولی اعتدال سے کام لیا چنانچہ اس پر مناقشہ کے مناظرہ کا لفظ زیادہ موزوں طور پر صادق آتا ہے۔ علم ہیئت کی مخالفت جس معاندانہ و متعاندہ شان کے ساتھ کی گئی تھی علم طبقات الارض کو اس سے سابقہ نہیں پڑا اور اگرچہ علمائے طبقات الارض نے کہ زمین کی بے انتہا قدامت کے تسلیم کئے جانے پر زور دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ جن اعداد کے ذریعہ سے عمر زمین کا اندازہ قائم کیا گیا ہے وہ ناقابل اعتبار ہیں۔ جن ناظرین نے اس فصل کو توجہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے ان اعداد کے عدم تطابق کو نظر انداز نہ کیا ہو گا۔ جن کا حوالہ جابجا دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اعداد متفق و محکم سے عاری ہیں لیکن اس دعوے کی تائید ان سے پھر بھی بخوبی ہوتی ہے کہ زمین نامایت قدیم ہے اور ان کی بنا پر ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عالم کا پیمانہ زمان اس کے پیمانہ مکان کا جواب ہے۔

لہٰذا اس کے مقابلہ میں قرآن مجید کو دیکھو جس کا ایک حرف ایک ایک لفظ ایک ایک سطر کسی تحریف، ترمیم یا تغیر کے بغیر وہی ہے جس کا الفاظ حضور سرور کائناتؐ پر ہوا تھا اور جس کو دست برد روزگار سے بچانے کا وعدہ خداوند جل و علے نے خود ان الفاظ میں کیا ہے۔ ”وَعَلَّامُ الْغُیُوبِ“۔ مترجم

یہ معلومت ظاہر ہے بجز اس کے اور کیا ہو سکتی تھی۔ کہ آئندہ جب طوفان آئے تو کشتی کی ضرورت نہ پڑے بلکہ یہ لوگ بٹارے کی محنت پر جا پہنچ لیں۔ مترجم

تھے ڈاکٹر کنفرس کے اس خیال کو خان بہادر مولانا اکبر حسین صاحب الہ آبادی نے ازراہ ستم عمرانی ذرا زیادہ تعمیم کے ساتھ اس طرح ظاہر کیا ہے

کچھ شک نہیں کہ حضرت داعی ہیں خوب مض
یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہیں

کہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی صنعت و حکمت کا جو ثبوت اس ضابطہ غیر ممکن التعمیر سے ملتا ہے وہ کسی ایسے فعل سے ہرگز نہیں ہم پہنچ سکتا جس میں نکلون آمیز جبروت کی مثال پائی جاتی ہو۔ دنیا کے ترقی یافتہ مسلک یعنی اسلام نے اسی خیال کو بار بار ان الفاظ میں ظاہر کر کے حقیقت قدرت ایزدی کے چہرے پر پردہ اٹھایا ہے۔ لا تبديل لخلق الله۔ لن تجد لسنة الله تبديلا۔ حرم

فہم اسپن کا وہ وسیع علاقہ جو کوستان پر ہنیز کے جنوب و مغرب میں واقع ہے صوبہ ہامک کہلاتا ہے جس کا رقبہ تین ہزار مربع میل اور آبادی پانچ لاکھ ہوگی۔ اس صوبہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں ایک قدیم نسل کے لوگ جو ہامک کے نام سے موسوم ہے آباد ہیں۔ ماہرین علم الاقوام کا خیال ہے کہ اسپن میں قوم کلٹ کے آکر آباد ہونے سے قبل پورے جزیرہ نما میں ایک قوم ہستی تھی جس کا نام آئیری تھا چنانچہ اسپن کو آئیریا اسی لئے کہتے ہیں۔ ہامک انہیں آئیریوں کی نسل سے ہیں۔ اس نسل کا تعلق اقوام کے اس خاندان سے تھا جو آریہ اقوام کے ظہور سے پہلے یورپ میں آباد تھیں۔ ہامک قوم کی زبان جو آریہ زبانوں کے عصر کی آمیزش سے بالکل پاک ہے غالباً نورانی الاصل ہے۔ تمدن جدید کا اثر اس قوم پر کچھ کچھ اب پڑنے لگا ہے۔ ورنہ پچاس سال اوہر تک ان کی زندگی نیم وحشیانہ تھی۔ حرم

لے اسکیماس وحشی نسل کا نام ہے جو شمالی امریکہ کے منطقہ بارڈہ میں گرین لینڈ اور لبرڈار کے ساحلوں اور دوسرے برفستانی علاقوں میں آباد ہے۔ اگرچہ اس ساحلی علاقہ کا طول پانچ ہزار میل سے کم نہ ہو گا۔ لیکن اس کی آبادی اپنی شکل صورت۔ عادات و اطوار۔ رسم و رواج۔ بول چال اور روایات و خیالات کے اعتبار سے آپس میں بہت کچھ مشابہ ہے اور دنیا میں دوسری کوئی قوم نہ ہوگی جس کا خون اس درجہ خالص اور بلا آمیزش ہو اور جس کی قومی خصوصیات میں بیرونی اثرات نے اتنا کم تغیر پیدا کیا ہو۔ یہ لوگ ہزار ہا سال سے ایک ہی طرح رہتے سنتے چلے آئے ہیں۔

ان کی زندگی کا دارومدار دریائی مچھڑوں اور دوسرے دودھ پلانے والے بحری جانوروں اور مچھلیوں پر ہے ان جانوروں کی چربی ان کی عام غذا ہے جس کی وجہ سے وہ سردی کی سختی جھیل سکتے ہیں اور ان کا لباس بھی انہیں جانوروں کے پھڑے کا ہوتا ہے۔ دریائی مچھڑوں اور مچھلیوں اور دوسرے جانوروں کے شکار میں انہیں ایسی مہارت ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لباس اور غذا کے علاوہ اپنی زندگی کی باقی تمام ضرورتوں کو بھی انہیں جانوروں کے ذریعہ سے پورا کرتے ہیں۔ ان کی ہڈیوں سے شکار کے لئے ہتھیار بناتے ہیں۔ ان کی نسوں سے تانے اور ڈوری کا کام لیتے ہیں۔ ان کی بے ہوشی کی برف پر چلنے والی گاڑیاں بھی جن کے آگے کتے جوتے جاتے ہیں۔ ہڈیوں کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ دس دس بارہ بارہ کنہوں کے جرگے ایک جگہ آباد ہوتے ہیں۔ جازوں کے موسم میں جہاں یہ جرگے رہتے ہیں وہی ان کا اصلی گھر ہے۔ کیونکہ گرمی کے موسم میں وہ خانہ بدوش بن جاتے ہیں اور اوہر اوہر پھرتے ہیں۔ اس زمانہ میں علاوہ دریائی مچھڑے مچھلی وغیرہ کے

شکار کے وہ برافانی بارہ سینکے کا بھی شکار کرتے ہیں اور تھوڑی بہت تجارت بھی کرتے ہیں جو تبادلہ اجناس کے اصول پر مبنی ہوتی ہے۔ جاڑے کی آمد آمد کے ساتھ وہ اپنے شقائق کو لوٹ جاتے ہیں۔ اگرچہ گوشت وہ کچا بھی کھاتے ہیں لیکن عام دستور یہ ہے کہ گوشت ایک پتھر کی ہڈیا میں جو ایک چراغ کے اوپر لٹکا دی جاتی ہے اہل لیا جاتا ہے اس چراغ میں تیل دریا کی مچھڑوں اور دیل مچھلیوں کی چربی کا ہوتا ہے اور جی کلئی کی ہوتی ہے۔ گرمی کا موسم وہ عیموں میں بسر کرتے ہیں جو کھالوں کو سی کر تیار کر لئے جاتے ہیں اور جاڑوں میں گھروں کے اندر رہتے ہیں جن کی ساخت حالات مقامی کا پتہ دیتی ہے یعنی یا تو پتھر اور گھاس پھوس کے ہوتے ہیں یا پتھر اور ہڈیوں یا پتھر کر آئی ہوئی لکڑیوں کے یا پتھر کی اینٹوں کے جو تیلے اوپر اس ترکیب سے چن دی جاتی ہیں کہ ایک گنبد نما جھونپڑا بن جاتا ہے۔ اسیکا قوم کا مذہب بت پرستی کی ایک شکل ہے۔ وہ ایک بہت بڑی ہستی عالیہ پر ایمان رکھتے ہیں جس کا نام ان کی زبان میں ٹورنار سک ہے اس کے علاوہ وہ کئی محافظ دیوتوں کے قائل ہیں جن کا نام اسیکائی اصطلاح میں تورنات ہے۔ ان کے اس سلسلہ ارادت میں تیسرا درجہ بعض انسانوں کو حاصل ہے جو اگا کوٹ کھاتے ہیں اور فوق القدرت عقل و قوت سے متصف ہیں ان کا عالم عقوبی پر بھی ایمان ہے یہ عالم ان کے عقیدہ کی رو سے دو طبقوں میں منقسم ہے۔ فوقانی و تحتانی طبقہ فوقانی گنہگار اور بد قسمت روحوں کا ٹھکانا ہے جو ہمیشہ سردی سے ٹھنرتی رہتی ہیں اور جنہیں کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ طبقہ تحتانی کا موسم گرم ہے اور اس میں غذا بافراط میسر آتی ہے۔ یہ طبقہ خوش نصیب روحوں کا مسکن ہے۔ اسیکا متواضع خوش اخلاق ملن سار اور مسمان نواز ہوتے ہیں اور ان کی خاندانی زندگی نہایت اچھی طرح سے بسر ہوتی ہے۔ مساوات جائداد کا اصول عام طور سے ان میں رائج ہے اور ایک جرگہ جو معاش پیدا کرتا ہے ان میں سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ موجودہ تمدن نے ان کے حال پر اتنی حساسیت کی ہے کہ شراب اور دوسرے فواحش کی معافی ان سے نہیں کرائی اور یہی وجہ ہے کہ اب تک یہ قوم بدستور قائم ہے ورنہ امریکہ اور آسٹریلیا کی قدیم نسلوں کی طرح ان کا بھی کبھی کا صفایا ہو گیا ہوتا۔

مترجم

نزاع دربارہ معیار حق

قلمہ قدیمہ کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کے پاس احقاق حق کا کوئی ذریعہ نہیں۔

قدیم مسیحیوں میں عقائد کے اختلافات۔ کلیسائی کونسلیں ان اختلافات کے ختم کرنے کی بے سود کوششیں کرتی ہیں۔ حجت معجزہ و محبت انطاکی ترویج۔

پاپائے روم طریقہ اعتراف سری کو جاری کرتا ہے اور محکمہ احتساب عقائد کو اپنا آلہ اقتدار بناتا ہے اور اختلافات عقائد کے رفع کرنے کے لئے وحشیانہ مظالم پر اتر آتا ہے۔

قیصر جیشین کے مجلہ القوانین کی دریافت اور قانون دینیہ کے نشوونما کا اثر نوعیت و مہیت شہادت پر۔ قانون شہادت میں روایت کی شان نمودار ہونے لگتی ہے۔

”اصلاح کینہ“ کی بدولت ہر انسان کو اپنی عقل اور سمجھ کے لحاظ سے رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ کلیسائے رومن کیتھولک دعویٰ کرتا ہے کہ حق و صدق کا معیار خود کلیسا ہے۔ فہرست کتب محرمہ کے اجراء سے وہ کتابوں کے مطالعہ کی ممانعت کرتا ہے اور حکم انتہائی کی خلاف ورزی کرنے والوں کا قلع و قمع سینٹ برقا لوسیو کے قتل عام کے سے ذرائع سے کرتا ہے۔

پرائسٹ مذہب تورات کو معیار حق تسلیم کرتا ہے۔ تورات کی موثوقیت پر نظر اعتقاد ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محرف ہے۔ سائنس کی رو سے معیار حق انکشافات فطرت ہیں۔ پرائسٹ

کے نزدیک یہ معیار کتب مقدسہ میں موجود ہے اور رومن کیتھولک کی رائے میں پاپائے معصوم اس کا مورد و ضبط ہے۔

ایک موقع پر جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے صفحہ تاریخ پر بھٹ جلی لکھے جانے کا اشتقاق رکھتا ہے روم کے ایک گورنر نے چہاب ہو کر یہ سوال کیا کہ حق کسے کہتے ہیں۔ لیکن اس الوہیت ماب فیض نے جو گورنر کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور جس سے یہ استفسار کیا گیا تھا جواب میں کچھ نہ کہا۔ شاید غموشی ہی اس سوال کا بہترین جواب تھی۔

یہ سوال بارہا پہلے بھی کیا گیا تھا لیکن بے فائدہ اور آج تک اس کا اعادہ نہ کر رہا ہے۔ مگر بے سود۔ کسی شخص سے اس کا شائبہ جواب آج تک بن نہیں پڑا۔

جب افق یونان پر صبح علوم و فنون کی روشنی نمودار ہوئی اور قدیم مذہب کی ظلمت کافور ہونے لگی تو اس ملک کے متقی و پرہیزگار اور فطین و فہیم شخص دماغی یاس کی حالت میں جلا ہو گئے۔ انکسافورٹ فرط حسرت و تاسف سے کہتا ہے ”کوئی چہرہ معلوم نہیں ہو سکتی کسی حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھ سکتا۔ کوئی امر یقینی نہیں ہو سکتا۔ قوائے جہ محدود ہیں قوائے عقیدہ کمزور ہیں۔ حیات مستعار قلیل ہے۔“ زونیز کا دعویٰ ہے کہ ناممکن ہے کہ ہم حق بات کو بھی یقینی تصور کریں۔ پارمینیڈس کا قول ہے کہ انسان کی دماغی ساخت ہی ایسی نہیں ہے کہ وہ حق مطلق کی تحقیق کر سکے۔ اسپٹاکلیز کی رائے ہے کہ ضرور ہے کہ کل فلسفہ اور مذاہب ناقابل اعتبار ہوں اس لئے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی معیار نہیں جس سے ہم ان کو جانچ سکیں۔ دی مقراطیس کا بیان ہے کہ حقائق بھی ہمارے ذہن میں یقین کا اقامہ نہیں کر سکتے۔ انسانی حقیقت کا انتہائی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان علم مطلق سے روشناس ہونے کی قابلیت نہیں رکھتا اور اگر حقیقت اس کی طبیعت میں بھی ہو تاہم اس کو اس کی موثوقیت پر یقین نہیں ہو سکتا۔ فیو ہمیں یہ صلاح دیتا ہے کہ چونکہ ہمارے پاس حق و باطل کا کوئی معیار نہیں ہے اس لئے ہمیں ہر شے کی نسبت اظہار رائے میں تامل کرنا چاہئے۔ اس فیلسوف نے اپنے شاگردوں کو تنہا کی اس حد تک تلقین کی تھی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے بلکہ یہ دعویٰ بھی نہیں کرتے کہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ ایکیدورس نے اپنے شاگردوں کو یہ سبق دیا تھا کہ حق کی تکمیل ہرگز عقل کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی۔ آرسٹیلیس کو معلومات حبیہ و عقیدہ دونوں سے انکار تھا اور اس نے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ اسے کسی شے کا علم نہیں۔ یہاں تک کہ اپنی لاعلمی کا بھی علم نہیں۔ غرض جس عام نتیجہ پر فلسفہ یونان پہنچا تھا وہ یہ تھا چونکہ حواس کی شہادت

نقطہ اتصال نقیضین ہے لہذا ہم حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے اور عقل اس درجہ ناقص ہے کہ ہم کسی فلسفیانہ نتیجہ کی صحت کے ضامن نہیں ہو سکتے۔

قیاس چاہتا ہے کہ ایسے موقع پر ایک ایسا مدلل و مبرہن صحیفہ آسمانی مغناب اللہ انسان پر نازل ہو کہ شک و شبہ کا خاتمہ ہو جائے اور کسی شخص کو اس سے یا رائے اختلاف و مقاومت نہ ہو۔ یونان کے ایک فلسفی نے جس کی مایوسی اپنے مصنفوں کی بہ نسبت ذرا کم تھی ایک دفعہ یہ کہنے کی جرات کی تھی کہ دو مختلف الاشکال مذاہب کا ایک ساتھ موجود ہونا اور ملہم من الہی کا دعویٰ کرنا دونوں کے بطلان پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مادی و مریٰ اشیاء تک کی نسبت انسان ایک رائے بمثل قائم کر سکتا ہے۔ تاویلیکہ وہ ایک ہی پہلو سے ان اشیاء کو نہ دیکھے پھر مابعد الطبیعیات کا ٹھکانا ہی کیا۔ حضرت مسیح کے ظہور سے تین سو سال پہلے اگر فلسفہ اختلاف و ارتباب کی جولان گاہ تھا تو آپ کی وفات کے تین سو سال بعد مذہب بھی اسی شش و پنج میں مبتلا تھا۔ پاپی شیرز کا استغفار ہاری اپنے مشہور و معروف مضمون میں جو اس نے فلہسما کی کونسل کے انعقاد کے وقت لکھا تھا ایک مقام پر کہتا ہے۔

”یہ واقعہ جس قدر افسوسناک ہے اسی قدر خطرناک بھی ہے کہ لوگوں کی جتنی رائیں ہیں اتنے ہی مذاہب ہیں۔ جتنی خواہشیں ہیں اتنے ہی عقائد ہیں اور جس نسبت سے ان میں عیوب پائے جاتے ہیں اسی نسبت سے ان کے اسباب کفر و الحاد کا شمار ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم من مانے عقائد قائم کر لیتے ہیں اور جو جی میں آتا ہے ان کی تاویل کر دیتے ہیں۔ ان دیکھے اور ان بوجھے اسرار و رموز کی تاویل و تفسیر کے لئے ہم آئے دن نئے مذاہب تراشا کرتے ہیں۔ ہم اپنے کئے پر بچھتاتے ہیں۔ بچھتانے والوں کی حمایت کرتے ہیں جن کی حمایت کرتے ہیں انہیں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ دوسروں کے عقائد کا باوجود ان عقائد کے چھوڑ ہونے کے ابطال کرتے ہیں اور اپنے عقائد کو بھی باوجودیکہ دوسرے لوگ ان کے چھوڑ ہیں جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ غرض اسی طرح باہم دست و گربان ہو کر ہم آپس میں ایک دوسرے کی تخریب و تباہی کا باعث ہو رہے ہیں۔

یہ محض لفظ ہی لفظ نہیں ہیں، بلکہ اس خود لامتناہی سے بوئے حقیقت آتی ہے اور وہ اشخاص جو اس زمانہ کی کلیسائی تاریخ سے واقف ہیں۔ اس کا مفہوم پوری طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ جو دھرم اور خیر و برکت کے مسلک ہونے کے لحاظ سے جب مسیحیت کا پہلا جوش فرو ہو گیا تو نزاع و ففاق نے اپنا جھنڈا آگاز کیا۔ قسیمی مورخین کا بیان ہے کہ دوسری صدی

عیسوی کے آغاز کے ساتھ ایمان و عقل مذہب و فلسفہ اتحاد ظننت میں جگ چھڑ گئی۔ ان اختلافات و تنازعات کے اندفاع اور احقاق حق کی غرض سے مجالس مشاورت کا انعقاد ہونے لگا جنہوں نے بالآخر مجالس عمومیہ کی شکل اختیار کر لی۔ ایک عرصہ دراز تک ان مجالس کے اقتدارات مشورہ دہی کی حد سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ لیکن جب چوتھی صدی میں مسیحیت مسند شہنشاہی پر جلوہ افروز ہوئی تو ان مجالس کے احکام کی تعمیل لازمی ہو گئی اور احکام کا نفاذ بزرگ حکومت ہونے لگا۔ اس واقعہ نے کلیسا کی کایا ہی پلٹ دی۔ مجالس عمومیہ یعنی مسیحیت کی پارلیمنٹیں جن میں دنیا بھر کے گرجاؤں کے عہدہ دار بطور ارکان شریک ہوتے تھے شہنشاہ کے حکم سے منعقد ہوتی تھیں۔ وہ اصالتہ برائے نام ان مجالس کی خدمت صدارت انجام دیتا تھا اور امور مابہ النزاع کا تصفیہ کرتا تھا گویا وہ مسیحی دنیا کا پاپا ہوتا تھا۔ شیم مورخ جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے اس زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ تیسری صدیوں میں جاہلوں اور عامیوں کے مامور ہونے کو کوئی چیز مانع نہ آ سکتی تھی۔ وحشی اور بے علم جماعت جو علم و فضل کو عموماً "فلسفہ کو خصوصاً" دشمن زہد و اتقا خیال کرتی تھی بڑھتی جاتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ تا۔ سیا کی کونسل یعنی مجلس عمومی میں جمالت اور بے ربطی خیالات کی جو شان علی الخصوص ان بزرگواروں کی تقریر اور دلائل میں پائی جاتی ہے۔ جنہوں نے اس کونسل کے فیصلہ کو بہ نظر استحسان دیکھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ باوجود اس وسیع اثر کے جو اس کونسل نے مسیحی دنیا پر ڈالا ہے تبصرہ نگاران عمدہ قدیم کو نہ تو اس بارے میں اتفاق ہے کہ اس کونسل کا انعقاد کب اور کس مقام پر ہوا اور نہ یہی ٹھیک معلوم ہے کہ اس کے ارکان کی تعداد کس قدر تھی اور صدر نشین کونسا بطریق تھا اس کے مشہور و معروف فیصلہ جات کو سپرد قلم کرنے کی زحمت تک گوارا نہ کی گئی یا اگر کی بھی گئی ہو تو وہ روئداد بہ ضبط تحریر ہم تک نہیں پہنچی۔ زمانہ حال کے مدیرین کی اصطلاح میں کلیسا نے اس زمانہ میں جس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ "ریاستہائے جمہوری متحدہ" کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کونسل کے فیصلہ کا انحصار کثرت رائے پر ہوتا تھا اور اس کے لئے ہر طرح کی سازشیں اور افترا پردازیاں اور دغا بازیوں عمل میں لائی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ دربار شاہی کی خواتین کے رسوخ بلکہ ارتشا بلکہ دھینگا مشتی تک سے کام لیا جاتا تھا۔ تا۔ سیا کی کونسل کو حیرالتوا میں پڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ان سب لوگوں نے جنہیں کسی کی رو و رعایت مد نظر نہ تھی بالاتفاق یہی رائے قائم کی کہ مذہبی معاملات میں معیار حق و صدق قائم کرنا اس قسم کی مجلسوں کے بس کا روگ نہیں۔ فریق مغلوب کو کوئی حق ایسا حاصل نہ تھا جس کا

فریق غالب کو پاس ہو۔ بہت سے نیک نفس اور راست کردار اشخاص نے جب یہ عذر پیش کیا کہ ایسی کثرت رائے جس میں ان دکلا کی آرا کا عنصر غالب شریک ہو جن کا حق رائے دہنگی مسلم نہ ہو کسی طرح حق مطلق کا ذریعہ تعین نہیں ہو سکتا تو ان کے عذر کو محفوظ نظر انداز کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کونسل پر کونسل منقہ ہونے لگی جن کے متباہن اور متناقض نے مسیحا کو حیران و پریشان کر دیا۔ ایک نقطہ چوتھی صدی میں حیوہ کو سلیس ایریکس کے مخالف پندرہ کو سلیس اس کے موافق اور سترہ کو سلیس ان لوگوں کی تائید میں منقہ ہوئیں جن کے عقائد ایریکس سے ملتے جلتے تھے۔ گویا کل پینتالیس کونسلوں کا انعقاد اس ایک مسئلہ کے تعفیہ کی غرض سے ہوا۔ ان کونسلوں کے اراکین کے طرز عمل پر یہ واقعہ روشنی ڈالتا ہے کہ جس قوت کا فریق غالب نے بجا استعمال کیا تھا اسی سے فریق مطلوب بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا تھا۔

جس سورخ کی بے تعہدانہ تحریر سے ہم نے اوپر استعلا کیا ہے اسی کا یہ بھی بیان ہے کہ چوتھی صدی میں عیسائی دہلا کی سنگین غلطیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اول یہ کہ دھوکا دینا اور جھوٹ بولنا داخل حسانت ہے بشرطیکہ اس سے کلیسا کی اغراض کو کوئی فائدہ پہنچے دوم یہ کہ اگر کافی سرزنش اور زجر و تنبیہ کے بعد بھی کوئی شخص اپنی مذہبی لغزشوں پر اڑا رہے تو وہ مستوجب سزائے قانونی و عقوبت جسمانی ہے۔

جب ہم ان امور پر جنہیں عوام اس زمانہ میں معیار حق سمجھتے تھے نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بے اختیار تعجب ہوتا ہے۔ کسی مسئلہ کی حقیقت کی سب سے بڑی دلیل ان شہدا کی تعداد ہوتی تھی جنہوں نے اسے سچ مانا ہو یا وہ معجزے یا کرامتیں اس کی صحت پر گواہ ہوتی تھیں۔ جو اس کی تائید میں پیش کی جاسکیں یا ارواح خبیثہ یا جانین یا اشخاص آسیب زدہ کا اقبال اس کی سچائی کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سینٹ امبروز کو جب کبھی پیروان ایریکس سے مناظرہ کا اتفاق ہوا تو ان بزرگوار نے جھٹ سے آسیب زدہ اشخاص کو پیش فرما دیا۔ جنہوں نے بعض مسیحا شہدا کے حیرات کی صورت دیکھتے ہی یہ پکارنا شروع کیا کہ نالیسیا کی کونسل کا مسئلہ اقاہیم اللہ برحق ہے۔ لیکن پیروان ایریکس بھی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے۔ انہوں نے سینٹ امبروز پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ان غیبت گواہوں کو بہت بڑی رشوت دے کر جھوٹی شہادت دینے پر آمادہ کیا ہے۔ وہ عدالتیں بھی اس زمانہ میں قائم ہو چلی تھیں جن میں املا کا طریقہ جاری کیا گیا تھا۔ یعنی طرم کے خطاوار یا بے خطا ہونے کا فیصلہ اسے انواع و اقسام کی جسمانی آزمائشوں میں ڈال کر نتیجہ کے لحاظ سے منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا۔

چھ صدی تک یہ عدالتیں طرم کی گمنگاری یا بے گنہائی کا ثبوت آب سرد۔ مبارزت۔ جلتی آگ اور صلیب کے گوناگوں ذرائع تحقیقات سے دیتی رہیں۔

شہادت کی ماہیت اور اس کے قوانین کے متعلق اس جہالت اور لاعلمی کی بھی کوئی حد ہے طرم پانی کے تلاب میں پھینک دیا جاتا ہے اور وہ یا تو ڈوب جاتا ہے یا حیرنے لگتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سرخ جلتی ہوئی لوہے کی ایک سلاخ تھادی جاتی ہے جس سے وہ یا تو جل جاتا ہے یا بچ رہتا ہے۔ جس مبارز کو اس نے اجر سے دے کر اپنی طرف سے لڑنے کے لئے منتخب کیا ہے وہ یا تو مطلوب ہو جاتا ہے یا غالب آتا ہے۔ وہ اپنے بازوؤں کو صلیب کی شکل میں اس شخص کی بہ نسبت جس نے اس پر الزام لگایا ہے کم دیر تک پھیلائے ہوئے رکھ سکتا ہے یا زیادہ دیر تک۔ لیکن انہیں آزمائشوں کے نتائج کے لحاظ سے کسی علت منسوبہ کے متعلق اس کی قصور و ادوی یا بے قصوری مسلم قرار پاتی ہے۔ کیا یہی طریقے معیار حق و راستی ہو سکتے ہیں؟

ایسی حالت میں مقام تعجب نہیں کہ یورپ میں صدہا سال تک جمہوری کراہتوں کا بازار گرم رہا اور یہ وہ کرامات ہیں جو انسان کی عقل و تمیز کے لئے باعث تنگ و عار ہیں۔ لیکن وہ دن جو نہ ٹل سکتا تھا آخر آ پہنچا۔ وہ ادعا اور وہ عقائد جو اس قسم کی نامعقول شہادت پر مبنی تھے اس بے اعتباری کی خاک میں مل گئے جس کا پچھندہ خود یہ شہادت ہو چکی تھی۔ جب حیر ہویں صدی شروع ہوئی تو چاروں طرف شکک اور بد اعتقادی کی ہوا چلنے لگی۔ اول اول اس بد اعتقادی سے پادریوں کا طبقہ متاثر ہوا اور اس کے بعد یہ بہ سرعت تمام عوام الناس میں پھیل گئی۔ پادریوں نے اپنے شکک کی بھڑاس ”انجیل لازوال“ کی سی کتابوں کی تصنیف کر کے نکالی اور عوام الناس ”کیتھرسٹ“ ”ولنسیسڈ“ اور ”پروڈیشن“ کے سے فرقوں میں متفرع ہو گئے۔ ان سب کو اس امر میں اتفاق تھا کہ مذہب مسلمہ و مروجہ اغلاط و ادہام کا ایک مجموعہ بے ربط ہے۔ پاپا نے عیسائیوں پر جو جبری حکومت قائم رکھی تھی وہ ناجائز اور ظالمانہ ہے اور روم کا یہ دعویٰ کہ پاپائے روم دنیا کا احکم الحاکمین ہے اور کسی بادشاہ یا قیس یا دینی و دنیوی حکمران کو کوئی جائز مذہبی یا سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا تو فحشہ وہ پاپائی کا عطا کیا ہوا نہ ہو بالکل بے بنیاد اور حقوق انسان کے لئے بمنزلہ عامیانہ و دستبرد کے ہے۔

یہی ہی کے اس سیلاب کی روک تھام کے لئے پاپائے روم کی حکومت نے دو محکمے قائم کئے۔ (۱) انکوڑیشن ”یعنی محکمہ احتساب عقائد اور (۲) محکمہ اعتراف سری طانی الذکر تفتیش

اور سراغ برآری کا ذریعہ تھا اور اول الذکر سزا دی کا۔

عام الفاظ میں ”اکونزیشن“ کا مقصد یہ تھا کہ تخویف و ترہیب کے ذریعہ سے مذہبی اختلافات کا استیصال کیا جائے اور بدعت و زندقہ کو نہایت خوفناک سزاؤں کے تصور سے وابستہ کر دیا جائے۔ اس کے یہ معنی تھے کہ ارباب ”اکونزیشن“ ہی کو بدعت و زندقہ کی تعریف و تحسین کا اختیار حاصل ہو۔ اس طور پر معیار حق محکمہ ”اکونزیشن“ کے ہاتھ آگیا اور پاپا کی طرف سے یہ محکمہ مجاز کیا گیا کہ ”ان ملاحدہ و زندقہ کی نسبت بعد سراغ برآری تجویز مناسب صادر کرے جو شموں مکاؤں و خانوں جنگلوں غاروں اور کھیتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔“

اغراض مذہبی کے تحفظ کی اس خدمت کی انجام دہی میں اس محکمہ نے ایسی وحشیانہ مستعدی ظاہر کی کہ ۱۳۸۱ھ سے لیکر ۱۸۰۸ء تک اس نے تین لاکھ چالیس ہزار اشخاص کو مختلف سزائیں دیں اور اشخاص سزایاب میں سے تقریباً ”تیس ہزار نفوس زندہ جلا دئے گئے اول اول جب علامہ غلاق کو اس کی وحشیانہ سزاؤں کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کی جرات اور مجال نہ تھی تو بسا اوقات ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ امرا اہل قلم تیس راہب اور ہر طبقہ کے عوام الناس الزام عائد ہوتے ہی بلا اس کے کہ انہیں اپیل کا موقع دیا جائے اسی دن مار ڈالے جاتے تھے ارباب فکر و دانش کی جدہر نظر پڑتی تھی انہیں بھیاک اور ڈراؤنی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کوئی شخص بلا خوف سزایابی آزادانہ رائے کے اظہار پر قادر نہ تھا۔“ ”اکونزیشن“ کا طرز عمل ایسا خوفناک اور مسیب تھا کہ پگیا ریسائی کا یہ فقرہ ہزارہا نفوس کی صدے باز گشت بن گیا تھا۔ ”ممکن نہیں کہ کوئی شخص مسیحی ہو اور اطمینان سے اپنی موت مرے۔“

”اکونزیشن“ نے جنوبی فرانس کے عیسائی فرقوں کا تیرہویں ہی صدی میں خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کی غدارانہ سفاکی نے اٹلی اور اسپین میں پرائسٹ مذہب کو بخ دین سے اکھاڑ پھینکا۔ مذہبی امور کے علاوہ اس نے پولیشل شورش کے فرو کرنے کی خدمت بھی خود ہی انجام دینی شروع کی۔ کولس امیرک جو حکومت ایریگان کا پچاس سال تک صدر منتخب رہا اور جس کا انتقال ۱۳۹۹ء میں ہوا۔ اپنی کتاب ”رویداد محکمہ احتساب عقائد“ میں اس محکمہ کے بیست انگیز اور کپکا دینے والے مظالم کی داستان قلم بند کر گیا ہے۔

یہ محکمہ جو مسیحیت بلکہ بنی نوع انسان کے لئے موجب تنگ و عار ہے۔ مختلف ممالک میں مختلف حیثیتوں سے قائم تھا پاپائے روم نے اس کے جابرانہ اور مطلق العنان اختیارات

قائم رکھ کر بالاخر قدیم قیسی محکمہ جات احتساب کو موقوف کر دیا اور وہ اختیارات جو ہر اسٹن کو بزمانہ سابق اس بارہ میں حاصل تھے چھین کر اپنے اقتدارات میں ضم کر لئے۔ اس طرح محکمہ ”انکوزیشن“ براہ راست پاپا کی ماتحتی میں آگیا اور پاپا ہی کے کارندے اور نمائندے اس کو چلانے لگے۔

چوتھی لیٹرن کونسل ۱۹۱۵ء کے فیصلہ نے ”انکوزیشن“ کے اقتدارات میں ایک خوفناک اضافہ کر دیا یعنی یہ بات ہر شخص کے فرائض میں باضابطہ طور پر داخل کر دی گئی کہ اپنے حلقہ کے پادری کے سامنے اپنے تمام افعال و اعمال کا اعتراف کیا کرے۔ اس کا نام طریقہ اعتراف سری ہے۔ اس طریقہ کی بدولت جس حد تک کہ خاکی زندگی کو تعلق تھا محکمہ ”انکوزیشن“ ہمہ بین و ہمہ دان ہو گیا۔ کوئی شخص اپنے آپ کو مامون و معصوم نہ تصور کر سکتا تھا۔ حلقہ کے پادری کو یہ قدرت حاصل تھی کہ اس کی بی بی یا ملازموں کے خفیہ سے خفیہ اور پوشیدہ سے پوشیدہ دلی راز بہ طریقہ جرح یا برسٹیل جبر دریافت کرے اور اس لحاظ سے بی بی اپنے خاوند اور نوکر اپنے آقا کے گویا جاسوس بنا دئے گئے تھے۔ اس خوفناک عدالت کے سامنے وہ کچڑ بلایا جاتا تھا اور اس سے صرف اسی قدر کہا جاتا تھا کہ کلیسا کو تمہارے عقائد نہایت مشتبہ معلوم ہوتے ہیں۔ کسی الزام لگانے والے کا نام ملزم کو نہیں بتایا جاتا تھا بلکہ یہ کسی انگوٹھے کو پچی کرنے والے بیچ۔ بدن کو تاننے والے رسے۔ پاؤں کی ہڈیوں کو چورا چورا کرنے والے بوٹ۔ انگلیوں کو توڑنے والے فالے اور دوسرے معصومیت آفرین شکنجوں سے بہت جلد پوری کر دی جاتی تھی اور خواہ وہ معصوم ہوتا تھا خواہ خاکی ہر حالت میں اسے جرم کا اعتراف کرتے ہی بنتی تھی۔

لیکن باوجود ان تمام اقتدارات کے ”انکوزیشن“ کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب ملاحظہ و زنادقہ اس کی تاب نہ لا سکتے تھے تو اس سے بچنے کے لئے سو سو طرح کے حیلے نکالتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تشکک اور بد اعتقادی کا تمام یورپ میں چپکے چپکے عمل دخل ہو گیا۔ لوگ ذات باری تعالیٰ۔ بھائے روح انسانی اور اختیار ارادہ بشری کے منکر ہو گئے اور یہ سمجھنے لگے کہ انسان جبر مطلق کی مدافعت نہیں کر سکتا اور ان مقدرات سے جن کا دل ہا دل اس کے چاروں طرف چھایا ہوا ہے کسی طرح گریز نہیں۔ اس قسم کے خیالات خموشی کے ساتھ ان ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے دلوں میں گھر کر گئے جو تیسیت کے مظالم سے تنگ آکر مجبور تھے کہ اس مایوسانہ تخیل کی آڑ میں پناہ لیں۔ ”ولڈ نیر“ فرقہ کے پیرو باوجود ان انواع و اقسام کی سختیوں کے جو ان کی بیخ کنی کے لئے عمل میں لائی گئیں اس خیال کی

اشاعت میں کامیاب ہو کر رہے کہ کلیسائے روم قسطنطین کے عہد کی پاکیزگی اور تقدس سے کوحوں دور جا پڑا ہے۔ انہوں نے تذکرہ غفران کی فروخت کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی اور یہ ظاہر کیا کہ اس ذریعہ مغفرت نے دعا روزہ اور خیرات کا تقریباً خاتمہ کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ مرے ہوؤں کی روحوں کے لئے دعائے مغفرت کرنا ایک فضل عبث ہے اس لئے کہ وہ ہمیشہ و دونخ میں پہلے ہی داخل ہو چکے ہوں گے۔ اگرچہ عام طور سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ فلسفہ یا سائنس مسیحیت یعنی اقلائے خالص کی اغراض کے منافی ہے پھر بھی اسلامی تصانیف جو اس زمانہ میں اندلس میں رائج تھیں ہر طبقہ کے لوگوں کے عقائد پر اپنا زبردست اثر ڈال رہی تھیں۔ یہ اثرات ہم کو ان فرقوں میں صاف صاف نظر آتے ہیں جو اس زمانہ میں قائم ہو چلے تھے چنانچہ فرقہ ”ابن ہنات حریت“ کا یہ عقیدہ تھا کہ ”کائنات کا خروج ذات باری تعالیٰ سے ہوا ہے اور بالآخر اسی ذات میں اس کا انضمام ہو جائے گا۔ نفوس ناطقہ انسانی جناب باری کے اجزا ہیں اور کائنات ہی بحیثیت مجموعی خدا ہے۔ یہ وہ خیالات ہیں جو بجز ترقی یافتہ دماغوں کے اور کہیں نہیں سا سکتے۔ اس فرقہ کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ ان میں سے اکثر خوشی خوشی ”انکوئزیشن“ کی آگ میں جل گئے مگر زبان پر اف اور ماتھے پر بل تک نہ لائے پادریوں نے ازراہ مناد اس فرقہ پر یہ الزام لگا کر اپنا جی ٹھنڈا کر لیا کہ آدمی رات کے وقت اس فرقہ کی عورتیں اور مرد برہنہ ہو کر تاریک کمرؤں میں جاتے ہیں اور وہاں حظ نفسانی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں“ اسی قسم کے الزام جیسا کہ ہمیں اچھی طرح سے معلوم ہے روم کی رنگین مزاج سوسائٹی نے قدیم مسیحیوں پر بھی لگایا تھا۔

ابن رشد کے فلسفہ کا اثر ان فرقوں میں سے اکثر کے عقائد میں صاف نظر آتا تھا۔ مسیحی نقطہ نظر سے اس اسلامی مسلک کا لازمی نتیجہ یہ زندیقانہ عقیدہ تھا کہ ارکان مسیحیت کا حاصل بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ روح انسانی ذات باری تعالیٰ میں واصل ہو جائے۔ خدا اور کائنات کو آپس میں وہی تعلق ہے جو روح کو جسم کے ساتھ ہے۔ صرف ایک عقل واحد و منفرد کا عالم میں وجود ہے اور بنی نوع انسان کی روحانی و عقلی مستعدی کی ذمہ دار ایک ہی روح ہے۔ جب اصلاح کثیرہ کا زمانہ قریب آیا اور ”انکوئزیشن“ کے مصیبتوں نے ابن رشد کے اطالوی پیروؤں کے عقائد کی تفتیش شروع کی تو انہوں نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ فلسفیانہ اور مذہبی حقیقت میں ایک بون بعید ہے۔ ممکن ہے کہ ایک بات ازروئے فلسفہ برحق ہو لیکن ازروئے مذہب باطل ہو۔ یہ وہ تہریری حیلہ تھا جسے ”لیٹرن کونسل“ نے

پاپائے لیودہم کے زمانہ میں ناجائز قرار دیا۔

لیکن باوجود اعتراف سری و احتساب عقائد کے یہ بد حیثانہ رجحان بدستور قائم رہے۔ اس قول کی صداقت میں شک نہیں کہ اصلاح کینہ کے وقت یورپ کے مختلف مقامات میں ایسے بہت سے لوگ چھپے ہوئے تھے جنہیں مسیحیت سے قلبی عداوت تھی۔ ان خانہ براندازان مذہب میں پامپو لیسس کی طرح اکثر تو پیروان ارسطو تھے۔ باڈن و بلیسن اور مانٹین کے مانند بہت سے فلاسفہ اور بذلہ سنج نکتہ دان تھے اور لیودہم بہو اور برونو کے جہل بہت سے آزاد خیال اطالوی تھے۔

کراماتی شہادت گیارہویں اور بارہویں صدی میں پایہ اعتبار سے ساقط ہو چلی۔ اندلس کے مسلمان فلاسفہ کے مطاعن و مضاحک سے متاثر ہو کر بہت سے روشن خیال پادری قائل ہو گئے کہ اس قسم کی شہادت کی حقیقت ایک خیال دھوکے سے زیادہ نہیں۔ ۱۱۰۳ء میں بہ مقام امانی جسٹیشن کے مجلہ القوانين کا مکمل نسخہ برآمد ہوا جس نے لوگوں کے دلوں میں علم اصول قانون روم کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا اور قانونی یا فلسفیانہ شہادت کی نوعیت کے متعلق لوگوں کی معلومات زیادہ وسیع ہو گئیں۔ بیلن نے اس نسخہ کے برآمد ہونے کے مشہور و معروف واقعہ کو کسی قدر شبہ کی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن اس امر کا اس کو بھی اعتراف ہے کہ فلارنس کے کتب خانہ ”لارنشین“ میں جو نسخہ مجلہ القوانين کا موجود ہے صرف ایک ہی ایسا نسخہ ہے جو پوری پچاسوں جلدوں پر منتقن ہے۔ غرض مجلہ القوانين کی دریافت کے بیس سال بعد گریشین نامی ایک راہب نے مختلف پاپاؤں کے فراہم کونسلوں کے فیصلہ جات بزرگان و علمائے کلیسا کے ملفوظات ایک کتاب میں جس کا نام ”ڈیکریٹم“ (فادی) ہے جمع کئے۔ چنانچہ یہ کتاب قانون دھنہ پر سب سے زیادہ قدیم تصنیف ہے۔ اس کے بعد کی صدی میں پاپائے گرگوری نہم نے ”ڈیکریٹل“ (کتاب الادامر) پانچ حصوں میں شائع کی اور بائیس ہشتم نے ان پر ایک حصہ کا اور اضافہ کیا۔ اس کے بعد گرگوری سیزدہم نے ”کلمشائین کانٹیوٹر“ (دساتیر کلینٹ) کتاب الادامر کی ساتویں جلد اور ”اے بک آف انیٹیوٹر“ (کتاب الائن) کو ایک جگہ جمع کر کے کارپس جیورس کیمانیسائی“ (مجموعہ قوانین دھنہ) کے نام سے ۱۵۸۰ء میں شائع کیا۔ قانون شری کو وصیت نامجات ولایت بتائی نکاح اور طلاق پر قابو پانے کی وجہ سے رفتہ رفتہ بہت بڑا اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔

کراماتی شہادت کے انکار اور اس کے بجائے قانونی شہادت کے قیام سے اصلاح کینہ

کی ساعت بہت قریب آگئی۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ کنٹریری کے لاٹ پادری اسلم کا مقرر کیا ہوا یہ قاعدہ مسیحی دنیا میں نافذ تھا کہ ہم کو پہلے بے سوچے سمجھے بے دیکھے بھالے یقین کر لینا چاہئے اس کے بعد ہمیں اختیار ہے کہ اپنے یقین کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس قاعدہ پر اس وقت عمل درآمد ہونا ممکن نہ تھا۔ کچین نے لو تھر سے کہا تھا کہ تجھ کو اس بات پر ایمان لانا چاہئے کہ یسوع مسیح کے خون کا ایک قطرہ کل بنی نوع انسان کے کفارہ ذنوب کے لئے کافی ہے۔ باقی جس قدر خون باغ میں اور صلیب پر گرا وہ پیائے روم کو ترکہ میں ملا تاکہ اس نجات کی روشنائی سے تذکرات انفران لکھے جا سکیں۔ اگر اگلا سا زمانہ ہوتا تو لو تھر کو اس قول کی صداقت کے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہ ہوتا۔ مگر اب آزادی خیال کی ہوا چلنے لگی تھی۔ اور بزم داغ میں شمع دانش جلنے لگی تھی۔ کچین کی ہرزہ سرائی کو اس دلبر جرمن راہب نے استحقاق و اعتراف کی نظر سے دیکھا اور اگر کچین اپنے دعوے کی تائید میں ہزار معجزے اور کرامتیں بھی پیش کرتا تب بھی وہ اس کو تسلیم نہ کرتا۔ معصیت پر خط غصہ کھینچنے کے لئے تذکرۃ انفران کی فروخت کے ٹپاک اور شرمناک طریقہ کی ابتدا ان اساقف نے کی تھی جنہیں اپنی اوباشیوں اور عیاشیوں کے لئے جب اور کسی طریقہ سے روپیہ نہ ملتا تھا تو مسیح کے گلے کی کالی بھڑوں کے ہاتھ پروانہ مغفرت ہی بیچ بیچ کر روپیہ وصول کرتے تھے جن قسیوں اور راہبوں کو اس سودمند تجارت سے ہاتھ رکنے کی ممانعت تھی وہ تہمکات ہی کے جلوس نکال کر اپنی جیبیں بھرتے تھے یعنی جو شخص بنرض حصول ثواب ان تہمکات کو چھوٹا چاہتا تھا اس سے ایک خاص رقم بطور نذرانہ رکھوا لیتے تھے۔ حضرت پاپا کمالی قافیہ بہت تنگ ہوا اور آپ نے دیکھا کہ تذکرات انفران کے بیوپار میں بہت بڑا فائدہ ہے تو آپ نے اساقف کو حق تذکرہ فروشی سے محروم کر کے اس حق کا استعمال اپنی ذات کے لئے مخصوص کر دیا اور اپنے گماشتے اور کارندے تذکرہ فروشی کے لئے جا بجا مقرر کر دیئے۔ اس گماشتگی اور کارندگی کے لئے زیادہ تر گداؤں پیشہ طبقوں کے راہبوں کا انتخاب ہوتا تھا۔ ان طبقوں میں مسابقت اور رقابت کا بازار بہت جلد گرم ہو گیا۔ ہر طبقہ فخریہ اعلان کرتا تھا کہ چونکہ ہمارا اثر آسمانی دربار میں زیادہ ہے اور مقدس مریم عذرا اور دوسرے اولیائے کرام کی جناب میں ہمیں زیادہ تقرب حاصل ہے اس لئے ہمارے تذکرے غفور و غفران کا زیادہ موثر ذریعہ ہیں۔ خود لو تھر پر جس کا تعلق طبقہ آگسٹائن کے راہبوں سے تھا یہ بہتان باندھا گیا کہ جب ۱۵۱۷ء میں پیائے لیوہم اسی ذریعہ سے سینٹ پیٹر کے گرجا کی تعمیر کے لئے روپیہ جمع کر رہا تھا تو بجائے اس کے کہ بخشش کے

پردانوں کی فروخت کا ٹھیکہ لوہڑی کی برادری کو دیا جاتا ڈاٹمنیک فرقہ کے راہبوں کو دے دیا گیا۔ جس کی وجہ سے لوہڑی ناراض ہو کر کلیسا سے قطع تعلق کر لیا۔ ”اصلاح“ کے ابتدائی ایام میں خود لویو بھی اس الزام کو صحیح تصور کرتا تھا۔

اس طور پر واقعہ ”اصلاح“ کی فوری محرک فروخت تذکرات انفران ہوئی لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ سبب اصلی بھی جو اس کھٹکشی کی روح و رواں تھا ظاہر ہو گیا۔ حقیقی بحث جس پر اس تمام جدوجہد کا دارومدار تھا یہ تھی کہ آیا انجیل کی حقیقت کا دارومدار کلیسا پر ہے یا کلیسا کی حقیقت کا دارومدار انجیل پر ہے؟ بالفاظ دیگر معیار حق کا ماخذ ہے تو کونسا ہے؟

واقعہ اصلاح کینہ کی مشہور و معروف جزئیات اور ان خوریز لڑائیوں کی تفصیل جو اس کی وجہ سے یورپ میں مدتوں چھڑی رہیں۔ ہم اس مقام پر سپرد قلم کرنا ضروری نہیں خیال کرتے لوہڑی کا ڈیبرگ کے گرجا کے دروازے پر ۵۵ مسائل نصب کرنا اور اس جرم کی جواب دہی کے لئے روما میں طلب کیا جانا۔ اس کا پایا کو یہ لکھ بھیجنا کہ آپ اس وقت حقیقت حال سے خالی الذہن ہیں جب آپ کو پوری کیفیت معلوم ہوگی تو جو جرم مجھ سے منسوب کیا جاتا ہے وہ جرم نہ رہے گا بلکہ ایک حقیقت نفس الامری سمجھا جائے گا۔ اس پر بدعت اور زندہ کا الزام لگایا جانا اور اس کا ایک عام کونسل میں اپیل دائر کرنا۔ مسائل مطہر۔ عشائے ربانی۔ اعتراف سری و غفران دنوب کی پیچ در پیچ بحثوں میں سے اصلی بحث یعنی ذاتی رائے کے اظہار کے استحقاق کا چھٹ کر نکل آتا۔ ۱۵۲۰ء میں لوہڑی کا مسیحی جماعت سے خارج کیا جانا اور اس کے جواب میں اس کا فرمان اخراج اور نیز مجموعہ خواتین دھنہ کو یہ کہہ کر کہ اس کا مقصد بجز ملکی و دیوانی اقتدارات کے استیصال اور پیائے روما کی شوکت و سطوت کے اعتلا کے اور کچھ نہیں جلا ڈالتا۔ اس دانشمندانہ حیلے سے اس کا جرمی کے متعدد ریسوں کو اپنا ہم خیال بنا لیتا۔ مجلس شاہی میں جو بمقام درس منعقد ہوئی اس کا طلب کیا جانا اور اپنے عقائد سے تائب نہ ہونا۔ ڈیبرگ کے قلعہ میں اس کا کچھ مدت کے لئے روپوش ہونا اور اس عرصہ میں اس کے عقائد کا اطراف و اکناف ملک میں پھیلنا اور سوئٹزرلینڈ میں زوننگلی کی کوششوں سے اصلاح کینہ کی ایک جداگانہ تحریک کا بارور ہونا۔ تحلیل ظل و شعیث نعل کے اس اصول کا جو تحریک اصلاح میں مضر تھا اہل جرمنی و سوئٹزرلینڈ کی باہمی رقابت کا باعث قرار پانا۔ بلکہ سوئٹزرلینڈ میں زوننگلی اور کیلون کی سرکردگی سے دو مخالف گروہ پیدا کر دینا۔ ماربرگ، اسپارس اور آگسبرگ کی مجلسوں کا ان

اختلافات و نزاعات کے منانے کی کوشش میں ناکام رہتا اور مصلحانِ جرمنی کا بمقام اسمال کالڈ سیاسی اتحاد قائم کر کے اصلاح کو سیاسی رنگ میں رنگ دیتا۔ ہیروان لو تھرو و ہیروان کیلون کی باہمی نزاعات سے روما کو اپنے نقصانات کی تلافی کی امید بندھتا۔ یہ تمام واقعات ایسے ہیں جن کی جزئیات کا اعادہ اس مقام پر غیر ضروری ہے۔

لیو کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ لو تھرو کی پیدا کی ہوئی تحریک فروخت تیزکرات انفران کے منافع کی بابت چند شوریدہ سراور دنیاوار پادریوں کا جھگڑا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی بہت بہت زیادہ اندیشہ ناک اور نتیجہ خیز اسباب چھپے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس نے پوری پاپائی قوت کو باغی جماعت کی سرکوبی پر صرف کرنا شروع کیا۔ پاپائے روما کے اس جوڑ توڑ نے وہ خوفناک اور تباہ کن لڑائیاں چھڑوائیں جنہوں نے سالہا سال تک یورپ میں قتل و خونریزی کا ہنگامہ پھا کئے رکھا اور مسیحی اقوام میں ان عداوتوں کا بیج بو دیا جن کو نہ معدنامہ و شنیلیا مناسکا اور نہ ٹرنٹ کی کونسل ہی باوجود اٹھارہ سال کے مسلسل بحث و مباحثہ اور افہام و تفہیم کے فرو کر سکی۔ واقعہ سینٹ برتھالومیو ۱۵۷۲ء نے جس میں فرانسیسی پرائسٹوں کا قتل عام ہوا یورپ بھر کو مبہوت و سراپہ کر دیا اور کیا پرائسٹ کیا رومن کیتھولک سب کے جسم پر رو کھٹے کھڑے ہو گئے۔ غدارانہ بدعہدی اور وحشیانہ خونریزی کے لحاظ سے یہ واقعہ تاریخِ عالم میں اپنی مثال آپ ہے۔

پاپائے روما نے مخالفین کی بیخ کنی کے لئے سبھی طرح کے جتن کئے۔ خانہ جنگیوں کی آگ بھڑکانے کے لئے ہیزم کشی کی۔ قتل عام کرا دئے۔ اہل خلاف کو چن چن کر مروا ڈالا لیکن ان مایوسانہ کوششوں سے کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ ٹرنٹ کی کونسل کی جدوجہد بھی بیکار گئی۔ اس کونسل کے انعقاد کا منشا بظاہر اگرچہ یہ تھا کہ کلیسائے عیسوی کے عقائد کی اصلاح و توضیح و حکیم و تعین کرنے اور احیاءِ تادیب سے پیشوایانِ دین عیسوی کی اخلاقی اور علمی حالت کو سدھارے لیکن ارکان کونسل کے انتخاب میں یہ چالاک کی گئی تھی کہ عنصر غالب اطالوی اور اس لحاظ سے پاپا کے زیر اثر تھا۔ اسی لئے ممکن نہ تھا کہ پرائسٹنٹ فرقہ اس کونسل کے فیصلوں پر کاربند ہو۔

اصلاح کینہہ کالب لباب یہ مسئلہ تھا کہ بائبل ہر مسیحی المذہب شخص کی ہدایت کے لئے کافی و کفایتی ہے اور یہی مسئلہ تمام پرائسٹنٹ کلیساؤں کے مسلمات میں داخل ہو گیا۔ روایت کی بنا منہدم ہو گئی اور یہ امر تسلیم کر لیا گیا کہ ہر شخص کو بذاتِ خود مذہبی معاملات میں رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ غرض یہ خیال عام طور پر پھیل گیا کہ حق و باطل

میں تمیز کرنے کا رستہ آخر انسان کے لئے کھل گیا ہے۔

کتاب مقدسہ سے استہداد و استناد کرنے کا جو اصول اس طور پر قائم کیا گیا اس کا تعلق خالص مذہبی یا اخلاقی معاملات ہی سے نہ تھا بلکہ فلسفیانہ حقائق کا انکشاف اور رموز فطرت کا انکشاف بھی اسی اصول کی حد عمل میں داخل تھا۔ بہت سے لوگ تو اس بارے میں ایڈیفیس کے نقش قدم پر چلے جس نے بزمانہ قدیم یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بائبل میں معدنیات کے بھی تمام اصول و فروع شامل ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اہل اصلاح کسی علم کو رواداری کی نظر سے نہ دیکھ سکتے تھے جو کتاب پیدائش کے ساتھ تطابق کلی نہ رکھتا ہو۔ ان میں سے اکثر بزرگواروں کی یہ رائے تھی کہ اتحاد دینداری علم و حکمت سے جدا ہوئے بغیر کبھی سرسبز نہیں ہو سکتی۔ ٹرٹلین اور سینٹ آگسٹائن کا یہ قدیم ملک اصول موضوعہ کہ بائبل ان تمام معلومات کا مجموعہ اور خلاصہ ہے جو انسان کو حاصل ہو سکتی ہیں یا اسے فائدہ پہنچا سکتی ہیں ابھی تک سختی کے ساتھ قائم تھا۔ لو تھر اور ملکتھان نے جو اصلاح کینہ کے بانی مہانی تھے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ فلسفہ کو کلیسا کی سرحد سے خارج کر دیا جائے۔ لو تھر کا بیان تھا کہ ارسطو کی تصانیف کا مطالعہ بے سود محض ہے۔ ارسطو پر سب و شتم کا اس نے جو جھاڑ باندھا ہے وہ صنعت تہمت کی ایک انوکھی صنف سمجھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس ضمن میں یوں گرافٹائی فرمائی ہے۔ ”اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ طعون ابدی و شقی ازلی یعنی ارسطو بڑا خناس ہے۔ اقترا پردازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ خیشانہ ہرزہ سرائی کے فن کا موجد ہے۔ سرگردہ شیطاٹین ہے۔ فلسفہ کا ایک حرف نہیں جانتا۔ جھوٹا ہے۔ فریبی ہے۔ دغا باز ہے۔ بھٹتا ہے۔ بکرا ہے۔ نفس پرست ہے۔ عیاش ہے۔“ فلاسفہ طریقہ مشائیہ لو تھر کے نزدیک ”مڈیاں ہیں۔ ریگنے والے کیڑے ہیں۔ مینڈک ہیں۔ جو کیں ہیں۔“ ان فلاسفہ کو وہ جس نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا وہ بیان سے باہر ہے۔ اگرچہ کیلوں نے ان خیالات کا بوضاحت اعادہ نہیں کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ بھی اس بارے میں لو تھر ہی کا مصفیہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعہ اصلاح کا سائنس کے سر پر ذرا سا بھی احسان نہیں ہے۔ سائنس کو ابھی ایک بہت کڑی منزل کا سامنا تھا۔ یعنی وہ اپنے پاؤں تو رات کی اس چادر کے مطابق پھیلانے پر ابھی تک مجبور تھا جو طول میں پرو کر شیز کے ضرب المثل والے فولادی پلنگ سے کم نہ تھی نہ۔“

مسیحیت کی تاریخ میں سب سے زیادہ نامبارک وہ دن ہے جب کہ اس نے اپنے آپ کو سائنس سے علیحدہ کر لیا۔ اس نے آریجن کو جو اس زمانہ ۳۳۱ء میں کلیسا کی طرف سے

سائنس کا بہت بڑا وکیل اور سرپرست تھا۔ مجبور کیا کہ اسکندریہ چھوڑ کر قیصریہ چلا جائے۔ اس کے بعد پیشوایان دین عیسوی صدہا سال تک اس کوشش میں مصروف رہے کہ حقیقت اشیا کی تاویل بذریعہ آیات انجیل کریں لیکن اس کوشش میں جو ناکامیاں انہیں نصیب ہوئیں ان کی پرہ درہ تیسری سے لیکر سولہویں صدی تک کی تاریخ عالم کر رہی ہے۔ قرون متوسطہ کی ظلمت کا باعث یہی مملکت طرز عمل تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس تاریکی میں ہمیں کہیں کہیں روشنی کی ایک جھلک سی نظر آ جاتی ہے یعنی فریڈرک ثانی اور الف نوبوہم جیسے مشاہیر کے قابل قدر کارناموں سے ہماری نگاہ دوچار ہوتی ہے جنہوں نے وسیع الحیال و آزادہ روی کے بلند مینارہ پر کھڑے ہو کر ایک نظر میں دیکھ لیا تھا کہ تمدن کو علم و فضل کی کس قدر احتیاج ہے اور جن کو اس وادی لقی وق میں بھی جہاں پادریوں کی تاریک خیالی کے باعث جہالت اور تعصب کا اندھیرا چھایا ہوا تھا اس ضرورت کا احساس ہو گیا تھا کہ سائنس ہی انسان کی معاشرت کی اصلاح کر سکتا ہے لیکن ان چند نفوس کی کوششوں سے کیا ہو سکتا تھا۔ اکیلا سورما چٹا بھاڑ پھوڑنے سے رہا۔

اختلاف رائے ابھی تک ایک ایسا جرم سمجھا جاتا تھا جس کی پاداش میں سزائے موت دی جاتی تھی۔ جب کیلون نے سرویش کو جنا میں زندہ جلوا دیا تو ہر شخص سمجھ گیا کہ جابرانہ ایذا رسانی کے سانپ کا سرا بھی نہیں کھلا گیا۔ سرویش کا جرم صرف اسی قدر تھا کہ اس کے عقائد فلسفیانہ تھے یعنی اس کا خیال یہ تھا کہ مسیحیت کے اصلی عقائد ناسیا کی کونسل کے انعقاد سے پہلے ہی مٹ چکے تھے۔ روح القدس روح عالم کی طرح تمام کائنات میں ساری دوائر ہے اور خاتمہ کائنات پر مسیح کے ساتھ وہ جو ہر ذات باری میں جس سے اس کا صدور ہوا تھا ضم ہو جائے گی۔ اس عقیدے کی پاداش میں سرویش کو وہی آج پر کباب کی طرح بہون ڈالا گیا۔ ایسی حالت میں کون کہہ سکتا ہے کہ پرائمنٹ فتوے اور اس کیتولک فتوے میں کچھ بھی فرق ہے جس کی رو سے دینی کو ۱۷۳۹ء میں حکام محکمہ احتساب عقائد نے بمقام ٹولوز اس علت میں زندہ جلا دیا کہ اس نے کتاب ”ڈایا لاگز کنسرننگ نیچر“ (مکالمات دربارہ حقائق فطرت) تصنیف کی تھی۔

چھاپے کی ایجاد اور کتابوں کی اشاعت سے وہ خطرات پیدا ہو گئے جن کے آگے ”انکوٹریشن“ کے مظالم کی کوئی ہستی نہ تھی۔ ۱۵۵۹ء میں پاپائے پال چہارم نے محکمہ ترتیب فرست کتب محرمہ قائم کیا جس کے حالات ہم ایک مورخ کے الفاظ میں حسب ذیل قلمبند کرتے ہیں؟ ”اس محکمہ کا فرض یہ ہے کہ کتب و مسودات مقصود الاشاعت کی جانچ پڑتال کر

کے یہ فیصلہ کرے کہ آیا عامہ خلائی کو ان کے مطالعہ کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں۔ ان کتابوں میں جن میں بے شمار غلطیاں نہ ہوں بلکہ بعض مفید و نتیجہ خیز حقائق پائے جائیں ایسی اصلاح کرے جس سے وہ عقائد کلیسا کے مطابق ہو جائیں۔ ان کتابوں کو جن کے اصول لحدانہ و زندیقانہ ہوں ممنوع الاشاعت قرار دے اور لحدانہ تصانیف کے مطالعہ کا خاص حق خاص خاص اشخاص کو عطا کرے اس محکمہ کے ارکان مجلس انتظامی کا اجلاس بعض دفعہ بموجب پاپائے اعظم لیکن عموماً "کریٹل کے محل میں بصدارت کریٹل موصوف ہوتا ہے اس کے اختیارات محکمہ احتساب عقائد کے اقتدارات سے بہت زیادہ وسیع ہیں۔ اس لئے کہ اس کو نہ صرف انہیں کتابوں کی اشاعت میں دست اندازی کرنے کا اختیار حاصل ہے جن میں رومن کیتھولک مذہب کے مخالف عقائد مندرج ہوں بلکہ ان تصانیف کی اشاعت بھی اس کے دائرہ اقتدار سے باہر نہیں جن کا موضوع فرائض و وجوب اخلاق۔ انضباط تادیبات کلیسا اور صیانت مقاصد خلق اللہ ہو۔ اس محکمہ کی وجہ تسمیہ لحدانہ تصانیف اور ان کے مصنفین کے اسما کی فہرست ہے جو بہ ترتیب حروف تہجی اس کے حکم سے تیار کی جاتی ہے۔"

فہرست کتب محرمہ میں اول اول ان کتابوں کا نام درج تھا جن کا مطالعہ ناجائز قرار دیا گیا تھا لیکن جب اس سے کام نہ نکلا تو یہ قید لگا دی گئی کہ ہر اس کتاب کا مطالعہ ممنوع ہے جس کے پڑھنے کی صریح اجازت نہ دی گئی ہو۔ اس بے باکانہ و شوش و شمشانہ حکم کا مقصود یہ تھا کہ بجز ان معلومات کے جن کو اغراض کلیسا کے ساتھ تطابق و توافق ہو اور کسی قسم کا علم لوگوں میں پھیلنے نہ پائے۔

اس سے واضح ہو گا کہ کلیسائے مسیحی کی دو حریف جماعتیں یعنی پرائسٹنٹ و کیتھولک باوجود باہمی رقابت کے اس امر میں متفق و متحد تھیں کہ بجز ان علوم کے جو ان کی رائے میں کتب مقدسہ کے نقیض نہ ہوں اور کسی علم کو مسالمت اور رواداری کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔ کیتھولک فریق کی قوت کا چونکہ ایک مرکز موجود تھا اس لئے جہاں اس کی حکومت قائم تھی وہ اپنے فیصلہ کی تعمیل بہ جبر کر سکتا تھا اور فہرست کتب محرمہ کے نفاذ میں حکومت کے زور سے کام لے سکتا تھا لیکن پرائسٹنٹ فریق کا اثر مختلف اقوام میں پھیلا ہوا تھا اور اس کی قوت مختلف مرکز تھی۔ لہذا وہ کوئی ایسی نتیجہ خیز کارروائی نہ کر سکتا تھا۔ اس کا طرز عمل یہ تھا کہ مجرم کو راندہ درگاہ کلیسا قرار دے کر اسے برادری سے خارج کر دیا جائے اور یہ طریقہ شاید دوسرے طریقہ کی بہ نسبت کچھ کم موثر نہ تھا۔

ہم ابواب سابق میں ظاہر کر چکے ہیں کہ مذہب اور سائنس میں اداسل عیسائیت ہی سے مخالف چلا آتا تھا۔ اس مخالف کے کرشمے ہمیں ہر صدی میں نظر آتے ہیں۔ عجائب خانہ اسکندریہ کی بربادی اسی کا نتیجہ تھا۔ اربینا اور وکلف کی فلسفیانہ روشن خیالی میں اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ تیرہویں صدی کے ملاحدہ و زناوہ کا تورات کے بیان پیدائش کو فرط استحقار سے لغو و مہمل قرار دینا اسی کا کام تھا۔ لیکن کہیں کوپر لیکس کپلر اور گلیلو کے زمانہ میں جا کر اس آہنی زنجیر کے حلقوں نے جو سائنس کے پاؤں میں عیسائیت نے ڈال رکھی تھی مشق گنگی شروع کی۔ کلیسا کی سیاسی قوت ہر ملک میں بہت کچھ گھٹ گئی تھی اور سربر آوردگان کلیسا دیکھ رہے تھے کہ وہ ریتی زمین جس پر مسیحیت کے عالیشان محل کی بنیاد قائم تھی اس کے پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے۔ جبروتعدی کے ساتھ مخالفین کی نیکنی کرنے کا طریقہ جو زمانہ سابق میں بہ کچھ کارگر ثابت ہوا تھا اب بیکار و بے اثر تھا۔ اکادکا فلاسفوں کا آگ میں جلا دیا جانا بجائے اس کے کہ اس کی اغراض کے لئے مفید ثابت ہوتا اور الناموجب نقصان ہو رہا تھا۔ ہیئت کے دنگل میں جب مذہب عیسوی خم ٹھوٹک کر اترا تو اس کا مقابل ایک اکیلا گلیلو تھا لیکن اس یکہ و تنہا پهلوان نے اس اڑنے پر لا کر ایسی پٹنی دی کہ اس کا سارا زعم باطل ہو کر خاک میں مل گیا اور جب نیوٹن کی غیرفانی تصنیف شائع ہوئی تو باوجودیکہ لائبنز نے یورپ بھر میں پکار کر کہہ دیا کہ نیوٹن نے خدا سے اس کے بعض بڑے بڑے اوصاف چھین کر طبعی مذہب کی جڑ کو کھلی کر دی ہے لیکن کلیسا ایسی ٹٹی بھولا کہ اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

نیوٹن کے زمانہ سے لے کر آج کے دن تک اس دریا کا پاٹ جو معتقدات کلیسا اور مسلمات سائنس کے درمیان حائل ہے روز بروز زیادہ چوڑا ہوتا چلا آیا ہے۔ کلیسا نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز اور اجرام کائنات میں سب سے بڑا جسم ہے۔ اور آفتاب ماہتاب اور ستارے اس کے تابع ہیں۔ اس کا یہ دعویٰ علم ہیئت نے باطل کر دیا۔ اس نے نہایت وثوق کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ روئے زمین پر ایک عالمگیر طوفان چھا گیا تھا جس کے فرو ہونے پر صرف وہی حیوانات زندہ رہے جو کشتی نوح میں موجود تھے۔ علم طبقات الارض نے اس کے اس دقیانوسی طسم کو بھی توڑ دیا۔ اس نے بڑے شہد سے اس عقیدے کی تلقین کی تھی کہ اول اول صرف ایک انسان موجود تھا جو کوئی سات آٹھ ہزار سال پہلے جسمانی و اخلاقی کمال کی حالت میں پیدا یا گیا مگر اس پایہ تکمیل سے بوجہ اپنے گناہوں کے مر گیا۔ علم الانسان نے اس کے اس ادعا کی بھی قلعی کھول دی اور ثابت

کر دیا کہ انسان لاکھوں سال سے کہ زمین پر آباد ہے اور اس کی ابتدائی حالت وحشیانہ پن میں جنگل کے درندوں سے کچھ ہی بہتر تھی۔ بہت سے بھلے لوگوں نے جن کی نیت کے اچھے ہونے میں شک نہیں کوشش کی ہے کہ کتاب پیدائش کے بیانات کو سائنس کے ماکتشافات سے تطبیق دیں لیکن ان کی کوشش سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مسیحیت اور سائنس کا اختلاف اتنا بڑا کہ اس پر مخالفت کا اطلاق ہونے لگا اب بجز اس کے چارہ نہیں کہ ان حریفوں میں سے ایک کو ہار مانی پڑے۔

جب صورت واقعات یہ ہے تو کیا ہم کو یہ استحقاق حاصل نہیں ہے کہ اس کتاب کو جو دوسری صدی عیسوی سے حقائق ملیہ کے معیار کے طور پر پیش کی جا رہی ہے بہ نظر انتقاد دیکھیں اور اس کے دعوائے ملہم من الہی کو جانچیں جس کتاب کا دعویٰ ایسا بڑا اور درجہ اتنا اونچا ہو اسے اپنی یہ حیثیت برقرار رکھنے کے لئے انسان کے ناقدانہ تبصرہ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

مسیحیت کے ابتدائی دور میں بہت سے سربرآوردہ پیشوایان کلیسا کو تورات کی پہلی پانچ کتابوں کے مصنف کی شخصیت کے متعلق بہت سے شکوک و شبہات دامن گیر تھے۔ قلت منجائش اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس مقام پر ان واقعات و دلائل کو بہ تفصیل درج کریں جو آج تک اس بارے میں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ اس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں اور ایک بہت بڑا ذخیرہ اس کے مالہ و ماعلیہ کے متعلق جمع ہو گیا ہے۔ ناظرین کو اگر اس بحث سے دلچسپی ہو تو وہ تقدس ماب و فضیلت انتساب پادری پریڈو کی کتاب ”دی اولڈ اینڈ نیو ٹیسٹمنٹ کنکٹڈ“ (ربط عہد و عتیق و جدید) ملاحظہ فرمائیں جو اشعار ہویس صدی کی اشاپروازی کی ایک قابل قدر یادگار ہے۔ پادری کولنز نے بھی حال میں اس مضمون پر شرح و وسط سے بحث کی ہے۔ فقرات ذیل سے اس بحث کی موجودہ کیفیت پوری طرح سے واضح ہوگی۔

کہا یہ جاتا ہے عہد عتیق کی پہلی پانچ کتابوں کو حضرت موسیٰ نے خدا کے الہام سے قلمبند کیا۔ پس اس لحاظ سے کہ یہ نسخہ خدا کا تصدیق کیا ہوا اور لکھوایا ہوا ہے ضرور ہے کہ نہ صرف سائنس اسے صحیح و موثق تسلیم کرے بلکہ تمام دنیا اس کی موثوقیت کی معترف ہو۔ لیکن اس موقع پر یہ سوال ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ کون شخص تھا جس نے تورات کی نسبت ایسا بڑا دعویٰ کیا یا وہ کون سی ایسی بات ہے جس کی بنا پر یہ دعویٰ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ خود یہ کتاب تو اس ادعا سے عاری ہے۔ کسی مقام پر

بھی اس میں یہ دعوے نہیں کیا گیا کہ اس کا مصنف ایک شخص واحد ہے اور کہیں بھی یہ کفر آمیز تحدی اس میں موجود نہیں ہے کہ یہ کتاب خدا کا کلام ہے۔

نئی نوع انسان کی سرجی الاعتقادی پر یہ دست تصرف کس دوسری صدی عیسوی میں جا کر دراز کیا گیا۔ اس دعوے کی ابتدا اعلیٰ طبقہ کے مسیحی فلاسفہ سے نہیں ہوئی بلکہ ان جو شیلے پادریوں سے ہوئی جن کی تحریرات ثابت کر رہی ہیں کہ وہ تبحر علمی سے عاری اور فن تنقید سے نا آشنا تھے۔

دوسری صدی سے لے کر آج تک ہر زمانہ میں مسلم اثبوت قابلیت کے مسیحی و یہودی علما ایسے پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے ان دعاوی کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان علما کا فیصلہ خود تورات کی اندرونی شہادت پر مبنی ہے جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف زیادہ نہیں تو دو مصنفین سے تو ضرور منسوب کی جا سکتی ہے اور ان دونوں کا نام الوہیم و یہودا ہے۔ ہینڈل نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہودائی قصہ کی عبارت سے جا بجا اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ کسی اصلی نسخہ کی نقل ہے اور الوہیمی قصہ سے بالکل جدا ہے۔ جن دو ماخذوں سے یہ قصے لئے گئے ہیں وہ کئی ایک اعتبار سے متضاد و متباہن ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عمد عتیق کی پہلی پانچ کتابیں عبرانی نسخوں یا عبرانی بائبل کے مطبوعہ نسخوں میں کہیں بھی حضرت موسیٰ سے منسوب نہیں کی گئیں اور نہ انہیں نسخہ سبعینیہ یا ترجمہ لاطینی ہی میں ”صحف موسیٰ“ کہا گیا ہے بلکہ یہ نام انہیں جدید تراجم ہی میں دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ تورات کے منزل الیہ صرف حضرت موسیٰ ہی نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ کی وفات کا واقعہ بھی اس میں مذکور ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تورات اس واقعہ کے کئی سو سال بعد قلمبند کی گئی اس لئے کہ اس میں ان واقعات کے حوالے موجود ہیں جو یہودیوں میں سلسلہ فرمانروائی کے قیام کے بعد پیش آئے۔

وہ شخص بڑا ہی بے باک ہے جو تورات کو خدا کا الہامی کلام سمجھتا ہے اس لئے کہ اس میں ایسے ایسے اضداد و نواقض اور امور غیر حادی و غیر ممکن بھرے پڑے ہیں جن کا خدائے پاک کے کلام میں پایا جانا ممکن نہیں اور یہ وہ اضداد و نواقض ہیں جن کی حقیقت کا انکشاف جرمنی اور انگلستان کے بہت سے متقی و راسخ الاعتقاد علما کر چکے ہیں۔ ان تنقید نگاروں نے فیصلہ کیا ہے کہ کتاب پیدائش ایک قصہ ہے جس کا ماخذ سنی سنائی فرضی روایات ہیں۔ مصر سے بنی اسرائیل کا خروج تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ تورات کی

پانچوں کتابیں پایہ اعتبار تاریخی سے ساقط اور غیر موسوی الاصل ہیں۔ اس میں ایسے ایسے خلاف قیاس متضاد اور مناقض امور درج ہیں جو کل توراۃ کی تنلیط و مخذیب کے لئے کافی ہیں اور ایسے ایسے عیوب و اسقام پائے جاتے ہیں جو اگر زمانہ حال کی کسی تاریخی تصنیف میں موجود ہوں تو اس کے اعتبار کو فوراً زایل کر دیں۔

ہیکسٹر برگ نے ایک کتاب اس بحث میں لکھی ہے کہ تورات اصلی ہے یا محدث اس میں وہ ایک مقام پر لکھتا ہے۔ ”ہر تاریخی تصنیف جس میں التباس و تدلیس سے کام لیا گیا ہو ضرور ہے کہ کبھی نہ کبھی اجتماع ضدیں کی الجھن میں پڑے اگر تورات اصلی نہیں ہے تو لامحالہ اس کا بھی یہی حشر ہونا چاہئے۔ اگر تورات بتلس اور محرف ہے تو یہ تاریخی واقعات اور قوانین اس میں مذکور ہیں وہ ظاہر ہے کہ مختلف زمانوں میں وضع کئے گئے ہیں اور کئی صدیوں کے دوران میں مختلف اشخاص نے انہیں سپرد قلم کیا ہے۔ جس کتاب کا طرز تصنیف یہ ہو اس کا اضداد و نواقض سے معرا ہونا ممکن نہیں اور کوئی شخص جو بعد میں اسے بہ تصرف شائع کرے خواہ وہ کیسا ہی قابل کیوں نہ ہوں اضداد کے نشانات پوری طرح سے ہرگز نہیں مٹا سکتا۔“

عبارت مندرجہ بالا پر اس قدر اضافہ اور کیا جا سکتا ہے کہ عزرا نے صاف الفاظ میں بیان کیا ہے (ملاحظہ ہو کتاب عزرا بنی باب دوم آیت ۱۳) کہ اس نے پانچ دوسرے اشخاص کے ساتھ مل کر تورات کی پہلی پانچ کتابوں کو چالیس دن کی مدت میں لکھا وہ بیان کرتا ہے کہ جب یہودی بائبل میں قید تھے تو ان کی مقدس کتابیں جلا دی گئی تھیں۔ اس کے بعد انے تورات کے قلمبند کئے جانے کی مفصل کیفیت بیان کی ہے۔ اور ظاہر کیا ہے کہ آفرینش عالم سے لیکر اس وقت تک جتنے واقعات پیش آئے تھے ان سب کو اس نے سپرد قلم کیا۔ شاید اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ کتاب عزرا منجملہ اسفار محرقہ ہے لیکن اس کے جواب میں یہ الزامی استفسار کیا جا سکتا ہے کہ کیا اس دعوے کی موید ایسی براہین و دلائل ہیں جو موجودہ فن تنقید کے حملہ کی تاب لا سکتی ہیں؟ مسیحیت کے ابتدائی دور میں جب کہ قصہ ہیوط آدم مسیحیت کے ارکان میں داخل نہ تھا اور مسئلہ کفارہ تفتق و تحکیم کے اس درجہ کو نہ پہنچا تھا جس پر اسے بالآخر انسلم نے پہنچا دیا پیشوایان کلیسا کو اس امر کا عام طور سے اعتراف تھا کہ بطن غالب عزرا نے تورات کی پہلی پانچ کتابوں کو حسب بیان خود حقیقتاً تصنیف کیا چنانچہ سینٹ جروم کہتا ہے۔ ”تم خواہ یہ دعویٰ کرو کہ تورات کی پہلی پانچ کتابیں موسیٰ نے لکھیں خواہ یہ کہو کہ عزرا نے ان کتابوں کو ازسرنو قلمبند کیا مجھے اس پر کوئی

اعتراض نہیں“ علیٰ ہذا القیاس کلیمس اگر پڑرخس کا قول ہے کہ جب زبخت نصر نے یودیوں کو قید کر رکھا تھا اور تورات کا نسخہ ضائع کر دیا گیا تھا تو عزرا بنی نے الہامی طاقت سے اسے از سر نو قلمبند کیا۔ آریخس کو بھی اس قول کے ساتھ اتفاق ہے۔

کتاب پیدائش کے پہلے دس باب سائنس کے ساتھ تعلق رکھنے کے اعتبار سے تورات کے دوسرے مقامات کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہیں۔ ان ابواب میں جن واقعات کا ذکر ہے وہ مختلف مصنفین کی روایات کے ماتم اجزا سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن تدقیق و تنقید کی نظر سے دیکھا جائے تو ان سب میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب پیدائش صحرائے عرب میں بیٹھ کر نہیں لکھی گئی تھی بلکہ دریائے فرات کے کنارے تصنیف کی گئی تھی۔ اس میں بہت سے کلدانی محاورات اور سریانی مختصات موجود ہیں مثلاً کوئی مصری بحرہ روم کی نسبت یہ نہ لکھے گا کہ یہ سمندر مغرب کی سمت میں واقع ہے لیکن سریانی ضرور لکھے گا اس کے علاوہ اگر کتاب پیدائش کو ایک تھیمپر فرض کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تھیمپر کے پردے اور باقی سب سلمان مصری الاصل نہیں ہے۔ بلکہ سریانی مصنوعات ہے پیدائش کے پہلے دس ابواب میں جو داستان مندرج ہے وہ ان قصوں سے ملتی جلتی ہے جو سریانی سلاطین کی خشتی کتابوں کی شرحی الحظ عبارت میں لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ سریانی آثار قدیمہ کے ماہروں کا بیان ہے کہ ایک روایت جو طوفان سے تعلق رکھتی ہے برآمد ہو بھی چکی ہے۔ اور عجب نہیں کہ باقی روایات بھی اسی طرح آگے چل کر دے دیئے کھنڈروں میں سے نکل آئیں۔

پیدائش زمن و آسمان۔ باغ عدن۔ ماوٹین کے خمیر سے مرد اور مرد کی ایک پہلی سے عورت کی تخلیق۔ سانپ کا اغوا۔ تسمیہ حیوانات۔ ملاکہ۔ شعلہ زن تلوار۔ طوفان اور کشتی۔ آب طوفان کا ہوا کے چلنے سے خشک ہو جانا۔ مینارہ بابل کی تعمیر۔ اختلاف السنہ یہ تمام وہ روایات ہیں جو عزرا کو سریانی کتبوں اور تحریروں سے بہم پہنچی تھیں۔ کتاب پیدائش کے گیارہویں باب میں وہ دفعہ و خستہ یودیوں کی تاریخ کہنی شروع کر دیتا ہے گویا یہاں پہنچ کر اس کی تاریخ عالم ختم ہو جاتی ہے اور وہ صرف ایک خاندان یعنی نسل سام کے حالات کی تفصیل کے لئے اپنے قلم کو وقف کر دیتا ہے۔

ڈیوک آف آرگل نے اپنی کتاب پرائیمرل مین ”انسانی اولین“ میں اس تحدید پر قلم اٹھا کر معانی کے پھول یوں برسائے ہیں۔ ”سام کے خاندان کا شجرہ نسب ہمارے لئے بجز اساطیر کی ایک فرست کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ ایک ایسا شجرہ ہے جس میں سمنہ ان

کروڑوں انسانی خاندانوں کے جو اس وقت روئے زمین پر پہلے سے آباد تھے صرف گنتی کے چند خاندانوں کی سلسلہ بہ سلسلہ نسب شاری کی گئی ہے۔ بجز اس ترتیب لمبی کے اور کچھ نہیں بتایا گیا اور اس ترتیب کا مسلسل و مکمل ہونا بھی یقینی نہیں ہے۔ ہمیں یہ مطلق نہیں بتایا گیا کہ اس سیاہ پردے کے پیچھے کیا ہے جس پر یہ چند نام کسی قالوس خیالی کے نقوش کی طرح گزرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں لیکن باہیں ہمہ یہ پردہ کچھ کچھ دیر کے لئے اٹھ جاتا ہے اور ہمیں ان عظیم الشان واقعات کی شکلیں دکھائی دے جاتی ہیں جن کا عمل مدت مند سے جاری ہے۔ یہ شکلیں بالکل دھندلی اور مدھم ہیں اور ان کی صرف پرچھائیں ہی نظر آتی ہے۔ ان کی حرکت کا رخ بھی ہم کو صاف صاف محسوس نہیں ہوتا۔ البتہ آوازیں سنائی دے رہی ہیں جو کان میں بہت سی امواج آب کے شور کی طرح پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

پہنڈ نے اس بارہ میں حسب ذیل رائے ظاہر کی ہے جس کے ساتھ ہمیں پورا اتفاق ہے۔ ”یہ تحقیقات کہ تورات کی پہلی پانچ کتابیں مختلف تصانیف سے تالیف کی گئی ہیں نہ صرف عمدہ عتیق کے تاریخی مقامات کی تاویل یا مناسب ہو گا اگر یوں کہا جائے کہ کل الہیات و تاریخ کی تاویل کے لئے نہایت ہی ضروری ہے بلکہ فن انتقاد و ادب کی تاریخ میں بھی اس سے زیادہ یقینی اور موثق تحقیقات کا ہونا ممکن نہیں۔ جو فریق کوچہ تنقید سے نابلد ہے وہ خود کسی ہی تاویلات بارہ عذرات رکیکہ کیوں نہ پیش کرے لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ جب تک انتقاد کے اصول قائم ہیں اس وقت تک اس تحقیقات کے مسلمہ اثبات ہونے میں کوئی رخنہ نہیں پڑ سکتا۔ نکتہ آفرینی و دقیقہ سنجی کی جس بلندی پر صدیوں کی تدقیق و تحکیم کے بعد ہم آج پہنچے ہیں اس پر چڑھ کر اگر کوئی غیر متعصب اور حقائق آشنا شخص اس تحقیقات پر نظر ڈالے گا تو ممکن نہیں کہ وہ اس کے نتائج سے متاثر نہ ہو۔“

ایسی حالت میں کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم ان صحافیوں سے ابا کریں؟ کیا اس امر کا اعتراف کہ باغ عدن کے بہو کی داستان ایک فرضی روایت ہے مسیحیت کے سب سے زیادہ مقدس و مستن عقیدے یعنی کفارہ کے مسئلہ کو نیست و نابود نہیں کر دیتا؟

ہمیں چاہئے کہ ٹھنڈے دل سے اس حقیقت پر غور کریں۔ مسیحیت کو قرون اولیٰ میں جبکہ وہ دنیا کو اپنا حلقہ بگوش بنا رہی تھی یا مسخر کر رہی تھی اس عقیدہ کا یا تو مطلق علم نہ تھا یا تھا تو اس قدر تھا کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ٹرٹلین نے اپنے جواب میں جہاں مسیحیت کے اور ارکان گنائے ہیں وہاں مسئلہ کفارہ کا کہیں ذکر نہیں کیا

جس سے صاب پایا جاتا ہے کہ اگر اس کو اس مسئلہ کا علم تھا بھی تو اس کے نزدیک یہ مسیحیت کے اصول میں شمار ہونے کے قابل نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کفارہ کے مسئلہ کو اول اول فرقہ اور یہ کے اہل بدعت نے رواج دیا۔ اسکندریہ کے طبقہ مقابلین کو اس کا اعتراف نہ تھا۔ پیشوایان کلیسا نے کبھی اس پر زور نہ دیا۔ جس پادری نے کفارہ کو اس عقاید بنا دیا وہ انسلم تھا۔ فلو جوڈنئیس لکھتا ہے کہ قصہ ہیوط محض ایک تمثیل ہے۔ آریجن کی رائے میں واقعہ ہیوط ایک رمز مجازی ہے۔ شاید بعض پرائسٹنٹ کلیساؤں پر معقولیت کے ساتھ مبالغہ و مناقضت کا الزام لگایا جاسکتا ہے اس لئے کہ وہ اسے ایک لحاظ سے مجازی اور ایک لحاظ سے حقیقی تصور کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم ان کے ہم آہنگ ہو کر یہ تسلیم کر لیں کہ سانپ سے کنکلتہ شیطان مراد ہے تو کیا کل قصہ ایک استعارہ میں تحلیل نہ ہو جائے گا؟

افسوس ہے کہ کلیسائے عیسوی نے تورات کی حمایت کی بلا کو خود بلا کر اپنے گلے لگا لیا ہے اور اس کی صریحی تضاد و اغلاط کی ذمہ داری برضا و رغبت خود اپنے اوپر عائد کر لی ہے۔ اس کتاب کو برحق ثابت کرنے کی کوشش بصورت امکان یہودیوں کے لئے چھوڑ دی جانی چاہئے تھی کہ انہیں کی یہ کتاب ہے اور انہیں سے عیسائیوں تک پہنچی ہے۔ زیادہ تر افسوس اس بات کا ہے کہ تورات کی پہلی پانچ کتابیں جو اپنے اسقام و نقائص کی وجہ سے زمانہ حال کے انتقادی عملوں کی تاب نہ لا سکتیں۔ سائنس کے حق میں بمنزلہ قول فیصل سمجھی گئیں۔ مخفی نہ رہے کہ ان کتابوں کی قلعی کھولنے والے مخالفین و معاندین نہیں ہیں بلکہ ایسے ایسے صاحب زہد و ورع علمائے مسیحی ہیں جن میں سے بعض کی جلالت قدر مسلم ہے۔

پرائسٹنٹ کلیساؤں نے تو کتب مقدسہ کو معیار حق قرار دیا لیکن کیتھولک فرقہ کے لوگ اس زمانہ میں بھی پیائے روما کے معصوم ہونے کے قائل ہیں شاید یہ کہا جائے گا کہ اس عصمت کا اطلاق صرف اخلاقی یا مذہبی امور پر محدود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دینی اور دنیوی امور کا خط فاصل کس مقام پر کھینچا جائے گا؟ معرفت مطلق یعنی ہمہ دانی کا عصر چند خاص خاص مسائل پر نہیں ہو سکتا ایسی معرفت کی نوعیت ہی کل اشیاء کے حقائق کے ادراک کی متلازم ہے اور اس لحاظ سے عصمت عن الخطا ہمہ دانی کی مترادف ہے۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر اطالوی مسیحیت کے اصولی عقائد کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ پیائے روما کا غلطی ہونا ممکن نہیں۔ ہمارے لئے یہ

ضرور نہیں ہے کہ منطق کی اس شکل کی غیر فلسفیانہ نوعیت پر بیٹھے ہوئے غور کیا کریں۔
پاپائیت کی سیاسی تاریخ اور پاپاؤں کے سوانح عمری کی تنقید اس شکل کو مسخ کئے دیتی ہے۔
تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ غلطیاں اور خطائیں دکھائی دیتی ہیں جن سے
انسان کی سرشت مرکب ہے اور پاپایان روما کی بر کے مطالعہ جب ہم کو اتفاق ہوتا ہے تو
بدکاری اور بے غیرتی کی داستان پڑھنے میں آتی ہے۔

ممکن نہ تھا کہ روشن خیال اور بالغ نظر کیتولک عقیدہ صحت پاپاوی کو بلا چوں و چرا
تسلیم کر لیں۔ جن لوگوں کو اس عقیدے کے تسلیم کرنے میں تامل ہے ان کی ناراضماندی
وسعت و اشتداد کے لحاظ سے رو بہ ترقی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو عقیدہ فطرت انسانی سے
اس درجہ مغایرت رکھے گا اس کا یہی حشر ہو گا۔ بہت سے کیتولک ایسے ہیں جن کا یہ
خیال ہے کہ صحت اگر فی الاصل موجود ہے تو بجز مجالس عمومیہ مسیحیہ کہ اس کا وجود اور
کہیں نہیں۔ لیکن واضح رہے کہ خود ان مجالس کو بھی اتفاق اجماعی کی نعمت ہمیشہ نصیب
نہیں ہوئی۔ یہ واقعہ بہت سے لوگوں کو فراموش نہیں ہوا کہ کولسلوں نے پاپایان روما کو
معزول بھی کیا ہے اور ان کے ہضوات و شطیحات کی نسبت مخالف تجاویز بھی صادر کی ہیں۔
پرائسٹوں کا یہ سوال بے وجہ نہیں ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ کلیسا صحت کی
صفت سے متصف بھی ہے؟ اس امر کی کیا شہادت ہے کہ کلیسا کے اغراض و مقاصد کی
حفاظت کسی کونسل میں مصنفانہ اور واجبی طور پر کی گئی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ احقاق حق قلت
رائے پر منحصر نہ ہو بلکہ کثرت رائے پر مبنی ہو؟ کیا یہ بات اکثر دیکھنے میں نہیں آئی کہ ایک
فرد واحد کی حقیقت شناسی صحیح رائے کے قیام کا باعث ہوتی ہے اور باقی تمام لوگوں نے
اسے جھوٹا سمجھ کر اور اس کو ایذا نہیں پہنچا کر آخر کار مجبوراً اسی کی رائے کو صحیح تسلیم ہے
اور کیا تمام بڑے بڑے اکتشافات کی تاریخ یہی نہیں ہے؟

سائنس کو ان حرفوں میں معالجت کرنے سے کچھ سروکار نہیں۔ اس کا یہ کام نہیں
ہے کہ اس امر کا فیصلہ کرتا پھرے کہ اہل مذہب کو معیار حق بائبل کی آیات میں ڈھونڈنا
چاہئے یا مجالس عمومیہ مسیحیہ کے فیصلہ جات میں پاپائے روما کے فرامین میں وہ صرف اس
حق کا مطالبہ کرتا ہے کہ جس طرح اس نے دوسروں کو اپنا معیار خود قائم کرنے کی اجازت
دے رکھی ہے اسی طرح اسے بھی اپنا خاص معیار قائم کر لینے دیا جائے اگر وہ غیر تاریخی
روایات کو بہ نظر حقارت دیکھتا ہے یا اس ادعا پر کہ کثرت رائے ذریعہ احقاق حق ہے مطلق
اعتنا نہیں کرتا یا انسان کے دعوائے صحت کی تنقید کو واقعات آئینہ کے سپرد کرتا ہے تو

خود اپنے ساتھ بھی اسی سردہری اور غیر جنبہ داری سے پیش آتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ مسئلہ کشش ثقل یا مسئلہ ارتعاش نور واقعات سے توافقی نہیں رکھتا تو وہ بلا تامل ان مسائل سے قطع تعلق کر لے اس کا سرچشمہ الہام کتاب فطرت ہے جس کے اوراق ہر وقت ہر شخص کے مطالعہ کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ یاران نکتہ دان کے لئے اس کی صلاعاں ہے۔ اپنے اصول کی اشاعت کے لئے وہ نہ کسی انجمن کی حمایت کا محتاج ہے نہ کسی جماعت کی قصیدہ خوانی کا رہین منت ہے اس کی وسعت غیر محدود اور اس کا مرور بے پایان ہے اور اسی لئے انسان کا استکبار و تعصب اس کے ساتھ ساز و باز نہیں کر سکا۔ زمین پر ہر شاندار اور خوبصورت چیز میں اس کا جلوہ دکھائی دیتا ہے اور آسمان پر اس کی داستان شمس و بازمہ و نجوم لامعہ کے نورانی حروف میں لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔

۱۸۵۷ء کو لوہرنے اس شہر کے گرجا کے دروازے پر وہ مشہور اشتباہ کیوں سے جڑ دیا جس کے ۹۵ مسائل نے مسیحی دنیا کو رومن کیتھولک اور پرائسٹنٹ دو فرقوں میں تقسیم کرنے کی بنیاد رکھی۔ لوہر اس گرجا میں دفن ہے۔ ۱۸۵۸ء میں گرجا کے دروازے بدل دئے گئے اور کانی کے نئے دروازے لگائے گئے۔ جن میں ۹۵ مسائل کھدے ہوئے ہیں۔ مترجم

ملکہ پاپا کا فریڈرک لوہرنے ونمبرگ میں جس مقام پر تاریخ ۱۰ دسمبر ۱۵۲۰ء جلایا تھا وہاں شاہ بلوط کا ایک سالنوردہ درخت کھڑا ہے جو اس لحاظ سے اصلاح کینہ کی پرانی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ مترجم

۱۵۰۲ء کی شام کو شروع ہوا جو ایک مسیحی بزرگ سینٹ برتھلمیوس کے عرس کی تاریخ ہے اس زمانہ میں چارلس نہم فرانس کا بادشاہ تھا لیکن حکومت کی باگ اصل میں اس کی ماں ملکہ کیترائن ٹیڈی کے ہاتھ میں تھی جو تعصب کی پتلی اور جبر و بے عنوانی کی زندہ تصویر تھی۔ کیتھولک فریق نے کیترائن کی شہ پاکر یہ منصوبہ کانٹھا کہ پرائسٹنٹوں کے سرداروں کو جمع کر کے قتل عام کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کے ساتھیوں کا قلع و قمع کیا جائے۔ اس منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لئے طرح طرح کے جوڑ توڑ کئے گئے۔ کیترائن اپنی بیٹی کی شادی نیویر کے فرمانروا شاہ ہنری سے جو پرائسٹنٹ تھا کرنے پر رضامند ہو گئی اور شادی کی تقریب پر تمام بڑے بڑے پرائسٹنٹ امرا و اعیان کو دعوت دی گئی۔ جب یہ سب پیرس میں جمع ہو گئے تو آدھی رات کے وقت شاہی محل سے سمندر بھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قتل عام شروع ہو۔ چنانچہ کیتھولک کواہر میں لے کر اٹھے اور جس پرائسٹنٹ کو جہاں پایا ذبح کر ڈالا۔ کشت و خون کا یہ ہنگامہ پیرس تک ہی محدود نہ تھا بلکہ مملکت فرانس میں جہاں جہاں پرائسٹنٹ موجود تھے کٹڑی کی طرح کاٹ ڈالے گئے۔

پلائے گریگوری یزیدیم اس وقت جلوہ افروز سند قدس و عصمت تھے۔ اس قتل عام کی خبر جب آپ کو پہنچی تو آپ نے سجدہ شکر ادا کیا اور گرجا میں جا کر شکرانہ کی نماز پڑھی اور اس مبارک واقعہ کی یادگار میں ایک تمغہ تیار کرایا جو مومنین پاک یعنی پرائسٹوں کے قاتلوں کو عطا فرمایا گیا۔

مترجم

تھم پروکرشیز ایک یونانی ڈاکو ڈمسٹیز نامی کا عرف تھا ”پروکردو“ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی کھنچاؤ یا تانڈ کے ہیں۔ پروکرشیز اسی سے مشتق ہے یہ نام اس ڈاکو کو اس لئے دیا گیا تھا کہ جو مسافر اس کے ہتھے چڑھ جاتا تھا اسے ایک فولادی پلنگ پر لٹا دیتا تھا اور بد نصیب مسافر کا قد اگر پلنگ سے چھوٹا ہوتا تھا تو اس کے جسم کو ٹکڑے میں یہاں تک کھینچتا تھا کہ وہ پلنگ کے برابر ہو جاتا تھا اور اگر بڑا ہوتا تھا تو اس پھارے کی ٹانگیں اسی نسبت سے کاٹ ڈالا کرتا تھا۔ اسی لئے ”پروکرشیز کے پلنگ“ سے استعاراً ”ناجائز زیادتی یا کمی مراد لی جانے لگی۔ مترجم

شہ ایک جرمن عالم جو ۱۸۲۴ء میں یونیورسٹی برلن میں اہیات کا پروفیسر تھا۔ مترجم
۱۷۷۰ء ساتویں صدی قبل مسیح میں آسور بنی پال اسیریا کا ایک بادشاہ تھا۔ اس کا پایہ تخت شہر نینوا تھا جس کے کھنڈر مشرقین یورپ کی انتھک کاوشوں کو ایک قدیم تمدن کی عبرت ناک داستان بنا رہے ہیں۔ آسور بنی پال کے محل میں ایک عظیم الشان خشتی کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانہ کے جو اجزاء برآمد ہوئے ہیں ان میں چند اینٹوں پر کسی قدیم سالی زبان میں ایک روایت مندرج ہے جس کے واقعات طوفان نوح سے ملتے جلتے ہیں۔ سریانی آثار کے ماہروں نے بالاتفاق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جو روایت ان اینٹوں پر لکھی ہوئی ہے وہ کسی قدیم تر تصنیف کی نقل ہے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح سے دو ہزار سال قبل یہ روایت اسیریا میں زبان زد خاص و عام تھی اس روایت کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

”کئی ہزار سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ مسوپوٹیمیا میں ایک شہر آباد تھا جس کا نام سرپک تھا۔ اس سر میں مسی سدرا نامی ایک شخص رہتا تھا ایک رات اس شخص نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ عالم خواب میں اسے معلوم ہوا کہ عنقریب ایک بڑا طوفان آیا چاہتا ہے اور اسے اشارہ یہ ہوا کہ فوراً ایک جہاز بنانا شروع کرے جس میں طوفان کے نمودار ہونے کی خبر پاتے ہی وہ اپنے خاندان اور احباب و اقارب سمیت کچھ پالتو اور کچھ جنگلی جانور اور کچھ نباتات کے بیج لے کر سوار ہو جائے اور تباہی سے بچ جائے۔ اسی سورا نے جاتے ہی اس اشارہ غیبی کے مطابق عمل کرنا شروع کیا۔ اس نے ایک مضبوط عرشہ کا جہاز تیار کیا جس کو اندر اور باہر قیر سے لیس دیا گیا۔ اس کے بعد اس جہاز کو پانی میں چلا کر دیکھ لیا گیا کہ دریا کی موجوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں اور جب اطمینان ہو چکا تو ضروری سامان معاش جہاز پر بار کر دیا گیا اور ایک ہوشیار و معتبر ناخدا مقرر کیا گیا۔

”آخر طوفان کی آمد آمد کی موعودہ خبر ہی سدرا کو دی گئی اور وہ اپنے ہل بچوں اور اعزاء و

اقربا سمیت کشتی میں سوار ہو گیا۔ اس نے احتیاط کی راہ سے کشتی کا درپچہ بند کر لیا اور نس بیا کو جو ناخدا تھا عرشہ پر چھوڑ دیا کہ جس طرح بن پڑے طوفان کا مقابلہ کرے۔ اس کے بعد باد و باراں کا طوفان شروع ہوا۔ مینہ موسلا دہار برسنے لگا۔ زمین کے چٹھے پھٹ پڑے ملک پانی میں غرق ہو گیا۔ ہوا کے تھپیڑوں سے موجیں بلند ہو کر آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ زمین آسمان و ہندکار بادل ہے ایک ہو گئے۔ چھ دن اور سات رات تک جھکڑ چلا رہا اور مینہ برستا رہا۔ لیکن کشتی سلامت رہی۔ آخر ساتویں دن طوفان تھما اور ہی سدا عرشہ پر گیا۔ دیکھا تو چاروں طرف پانی ہی پانی تھا اور انسانوں اور جانوروں کی لاشیں موجوں پر تیرتی پھرتی تھیں۔ اپنی قوم اور ملک کی یہ تباہی دیکھ کر ہی سدا بہت رویا۔ بہت دور زیر کے پہاڑ نظر آئے کشتی ان کی طرف چلائی گئی اور اس کا پیندا اونچی زمین پر جا کر ٹک گیا۔ جب اور سات دن گزر گئے تو ہی سدا نے ایک فاختہ چھوڑی جو کوئی اڈا نہ پا کر لوٹ آئی۔ اس کے بعد ابابیل اڑائی گئی وہ بھی خشکی کے موجود نہ ہونے سے واپس آگئی۔ سب سے آخر میں ایک کوا چھوڑا گیا۔ اس سیانے پرندے نے یہ معلوم کر لیا کہ طوفان ختم گیا ہے اور پانی پایاب ہو گیا ہے اس لئے وہ کشتی کے قریب تو آیا مگر اندر نہ داخل ہوا۔ یہ دیکھ کر ہی سدا نے باقی کے جنگلی جانوروں کو چھوڑ دیا جو چاروں طرف منتشر ہو گئے اور خود اپنے کنبہ اور دوستوں سمیت ایک پہاڑ کی چوٹی پر جو پاس ہی تھا چڑھ گیا جہاں اس نے اپنی سلامتی کے شکرانہ میں دیوتاؤں کو قربانی دی۔“ (ہی سدا کی داستان از پروفیسر کسلے مندرجہ رسالہ نائنٹیسمہ پتھری پابت ماہ جون ۱۸۹۹ء)

ہی سدا کا یہ قصہ طوفان نوح کی روایت ہے اس قدر مشابہ ہے کہ قیاس یہی چاہتا ہے کہ دونوں قصے ایک ہوں اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ طوفان وادی فرات میں واقع ہوا اور حضرت نوح بھی اسی سرزمین میں مبعوث ہوئے تھے تو اس قیاس کو مزید تقویت ہوتی ہے کہ نوح اور ہی سدا ایک ہی شخص کے دو مختلف نام ہیں یا ممکن ہے کہ تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہو اور ہی سدا کی سرگزشت نوح کو پیش آئی ہو۔ پروفیسر کسلے نے اس مضمون میں جس کا ہم نے حوالہ دیا ہے بدلائل قاطع ثابت کر دیا ہے کہ ہی سدا والا طوفان مقامی تھا عالمگیر نہ تھا۔ جن حضرات کو ان دلائل سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہو وہ مضمون متذکرہ کا مطالعہ فرمائیں۔ پس اگر ہی سدا اور نوح ایک نہ ہوں تو طوفان نوح بھی جو ہی سدا کے طوفان سے بعد میں آیا ہو گا ضرور ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے صرف مقامی ہو۔

ان خلاف عقل قیاسات کی ذمہ دار تورات ہے کہ طوفان عالمگیر تھا جس نے روئے زمین کے حیوانات و نباتات کو تباہ کر دیا اور حضرت نوح کے تین بیٹوں نے زمین کو ازسرنو آباد کیا۔ اصل قصہ کی حقیقت جو عزرائیلی کو غالباً کسی سریانی ماخذ سے ملا ہے صرف اسی قدر ہے کہ حضرت نوحؑ یا جو کچھ بھی ان کا دوسرا نام ہو اس مصیبت سے پیش از پیش آگاہ ہو گئے جو ان کی قوم میں بھل طوفان آنے والی تھی اور ایک کشتی تیار کر کے مع اپنے قبائل و رفقا کے اس میں سوار ہو گئے اور

اس طور پر تباہی سے بچ گئے۔ جب تورات میں تحریف شروع ہوئی تو اس قصہ پر محرقین کی سربلج الاعتقادی اور ادہام پرستی نے بہت کچھ لاطائل و لایعنی اضافے کر دیئے۔

قرآن مجید میں بھی قصص و حکایات موجود ہیں لیکن باوجودیکہ ان کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ ان قصوں کے پڑھنے والے ان سے محض ایک اخلاقی سبق بہ پیرایہ تمثیل حاصل کریں پھر بھی اس دور از کار اور پادور ہوا مبالغہ کے عنصر کو ان سے نہایت احتیاط کے ساتھ خارج کر دیا ہے جو آج کل یورپ کے طعن و تضحیک کا آماجگاہ بنا ہوا ہے اور جس کی وجہ سے تورات اہل سائنس کی نظروں میں لغویات و مزخرفات کے ایک مجموعہ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی۔

واقعہ طوفان نوح کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید تورات کی تصدیق کرتا ہے لیکن صرف اس حد تک جس حد تک کہ حقیقت نفس الامری کو تعلق ہے۔ وہ اس کے تحریفی مقامات کا مصدق بن کر جائز نکتہ چینی کا نشانہ نہیں بنا۔ اس نے یہ کہہ کر کہ ”لقد ارسلنا نوحا“ اسی قومہ فقل یا قوم اعبدا اللہ ملککم من الہ غیرہ“ صاف بتا دیا ہے کہ حضرت نوحؑ صرف اپنی قوم یا امت کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے کل دنیا کی رہبری کے لئے مامور نہ ہوئے تھے اور اس لئے طوفان کا عذاب ان کے جھٹلانے کی پاداش میں عالمگیر نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی توضیح ایک دوسرے مقام پر اس طرح کی گئی ہے۔ فکنبوا فاجنبوا والذین معہ فی الفلک وافرقتنا الذین کنبوا بالیبتنا انہم کافوا قوما“ عمین جس سے ثابت ہے کہ صرف وہی لوگ تباہ ہوئے جنہوں نے آیات ربانی کو جو بوساطت نوح علیہ السلام نازل کی گئی تھیں جھٹلایا۔ کشتی کے بنائے جانے حضرت نوح اور ان کے اہل ایمان پیرؤں کے اس پر سوال ہونے اور طوفان کے فرو ہونے پر کشتی کے ایک اونچے مقام پر جا ٹھہرنے اور ان سب لوگوں کے بچ جانے کا واقعہ قرآن میں بہ تفصیل درج ہے لیکن یہ تفصیل ایسی نہیں ہے جو تورات کی تفصیل کی طرح خندہ و آفرین ہو۔ مترجم

نزاع دربارہ انتظام عالم

انتظام عالم کے تصور کی دو حیثیتیں ہیں۔ اول بذریعہ توفیق ربانی دوم بذریعہ قانون شق اول کا تعلق پیشوایاں مذہب سے۔ شق ثانی کی ترویج کا مختصر بیان۔

کچلر وہ قوانین دریافت کرتا ہے جو نظام مسمیٰ پر مکتوی ہیں۔ پاپائے روم اس کی تصانیف کی تکفیر کرتا ہے۔ ڈاؤنسی فلسفہ حرکات و جیل کی بنا ڈالتا ہے۔

کلیلو علم تحریک الاجرام کے اصولی قوانین دریافت کرتا ہے۔ نیوٹن اجسام ساوی کی حرکات کو ان قوانین کے غیر اطلاق میں لا کر ثابت کرتا ہے کہ نظام مسمیٰ کی عتقان نظم و نسق مندرسانہ جبر کے ہاتھ میں ہے۔ ہرشل ثابت کرتا ہے کہ کل کائنات اسی قانون کی تابع فرمان ہے۔ مسئلہ منبابتہ النجوم النجوم اس پر ستالین کے اعتراضات۔

اس امر کا ثبوت کہ ترکیب ارضی و نشوونما سے سلسلہ نباتی و حیوانی تابع قانون ہے۔ نباتات و حیوانات کا ظہور بذریعہ پیدائش نہیں ہوا بلکہ بذریعہ ارتقا۔

حکومت قانون کا ثبوت انسانی جماعتوں کے تاریخی حالات اور نیز افراد انسانی سے ہم پختہ ہے۔

اصلاح یافتہ کلیساؤں میں سے بعض اس خیال کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ تسلیم کر لیتی ہیں۔

طریقہ نظم و نسق عالم کی دو تاویلیں کی جاسکتی ہیں یا تو ہر واقعہ خدا کی دست اندازی و

مداخلت سے پیش آتا ہے اور یا غیر متبدل و غیر متغیر قانون کا عمل انتظام دنیا کا ذمہ دار ہے۔

قیسوں کاہنوں اور مذہب کے پیشواؤں کا رجحان ہمیشہ پہلی تاویل کی طرف ہو گا اس لئے کہ ان کی دلی تمنا یہی ہے کہ عبادت گزار کی دعا اور لطیفہ غیبی کے درمیان ان کی حیثیت حاجب یا شفیع کی سمجھی جائے۔ اس تاویل کی اہمیت کو لطیفہ غیبی کی نوعیت کے تعین کا دعوے اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ مسیحیت سے پہلے رومائے بت پرستوں کے مذہب میں کاہنوں کا فرض یہ ہوتا تھا کہ غیب دانی یا ٹھگون شناسی کے ذریعہ سے یا جانوروں کے رودوں کو دیکھ کر یا دیوتاؤں کی استسما و رضا جوئی کے لئے جینٹ چڑھا کر واقعات آئندہ کی نسبت حکم لگائیں۔ جب مسیحیت کا دور آیا تو رازداران شرمیت کا پایہ قدرت اس سے بھی اونچا ہو گیا یعنی پادریوں نے یہ دعویٰ پیش کر دیا کہ ہم اپنی سفارش یا شفاعت کے زور سے معاملات عالم کے انضباط و انقیاد میں حصہ لے سکتے ہیں۔ آفات و بلیات کو ٹال سکتے ہیں۔ تمنغات و دعویٰ کا انعام دلوا سکتے ہیں۔ معجزے اور کرامتیں دکھا سکتے ہیں بلکہ قانون قدرت تک کو بدل سکتے ہیں۔

پس کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس مسئلہ کو کہ کائنات کا انتظام غیر متغیر قانون کے تابع ہے بہ نظر استحسان دیکھیں۔ اس مسئلہ سے ان کی شان میں ہتھ لگتا تھا۔ ان کی وقت میں فرق آیا جاتا تھا۔ ایسا خدا ان کے نزدیک نہایت ہی مہیب و مکروہ تھا جس پر انسان کی التجاؤں اور منتوں کا مطلق اثر نہ ہو سکے۔ جس کی سردہری و بے اعتنائی اسے بندہ کے خضوع و خشوع پر ملقت نہ ہونے دے اور جو جبر و تقدیر کی خوفناک پیڑیوں میں جکڑا ہوا ہو۔

لیکن اجرام سلوی کی باقاعدہ حرکات ہر زمانہ میں ارباب بصیرت کے دل پر ایک گہرا اثر ڈالے بغیر نہ رہیں۔ آفتاب کا طلوع و غروب دن کی روشنی کا بڑھنا اور گھٹنا۔ قمر کا کمال و زوال۔ موسموں کا اوقات مقررہ پر نمودار ہونا۔ سیاروں کی جچی نہی حرکت۔ یہ اور اسی قسم کے ہزارہا نشانات اگر قدرت کے باقاعدہ و غیر متغیر عمل کے کرشمے نہیں تو کیا ہیں۔ جو لوگ ابتداً اس نتیجہ پر پہنچے ان کے دل میں شاید کسوف و خسوف کے مشاہدہ سے یہ سوچ کر خدشہ پیدا ہوا ہو کہ قدرت کی روش مستمر میں یہ ناگہانی اور نامعلوم تفرقہ کیسا لیکن کسوف و خسوف کے تکرار اور اس تحقیقات نے کہ ان کے اوقات ظہور کی نسبت حکم مطلق لگایا جا سکتا ہے۔ یہ خدشہ مطلقاً مٹا دیا ہو گا۔

فلکیات کی نسبت ہر قسم کی پیشین گوئیوں کا انحصار اس واقعہ کے اعتراف پر ہے کہ

قوانین قدرت کے عمل میں آج تک نہ کوئی مداخلت یا تبدیلی ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ سائنس دان فلسفی کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی جو حالت کسی ساعت معینہ میں پائی جائے گی وہ حالت ساعت ماضی کا بلاواسطہ نتیجہ اور حالت ساعت مابعد کی بلاواسطہ علت ہوگی۔ قانون اور بخت جبر اضطراری کے محض دو مختلف نام ہیں۔

کوپرنیکس کی وفات کے کوئی پچاس سال بعد جان کپلر ساکن ورنبرگ نے سیاروں کے ابعاد و اوقات اور سرعت رفتار و اشکال ادوار کی تحقیقات شروع کی۔ کپلر اس مسئلہ کا قائل تھا کہ آفتاب مرکز عالم ہے اور اس کو یقین واثق تھا کہ آفتاب کے گرد جو سیارے گھومتے ہیں ان کی گردش کو آپس میں ربط و تعلق ہے اور اگر ان گردشوں کی صحت کے ساتھ جانچ کی جائے تو جن قوانین کی یہ حرکات تابع ہیں وہ معلوم ہو سکتے ہیں۔ کپلر نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ٹاکوبری اور دوسرے ہیئت دانوں کے جو جو ارتعادات و مشاہدات فلكی اس کے ہاتھ آئے انہیں ان اندازوں کے ذریعہ سے جانچا جو مختلف قیاسات پر مبنی تھے اور اگر کوئی قیاسی اندازہ مشاہدات کے مطابق نہ ثابت ہوا تو اسے خارج کر دیا۔ کپلر کو جو محنت اس کام میں اٹھانی پڑی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے چنانچہ وہ خود کہتا ہے کہ سوچتے سوچتے اور حساب لگاتے لگاتے میری یہ حالت ہو گئی کہ قریب تھا کہ میں دیوانہ ہو جاؤں۔ آخر اس محنت کا اسے ثمرہ ملا اور ۱۶۰۹ء میں اس نے اپنی کتاب حرکات سیارہ مرغ۔“ شائع کی۔ اس کتاب میں حرکات مرغ کو اس نے اس قیاس کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی تھی کہ سیارے آفتاب کے گرد اس وضع میں گردش کرتے ہیں کہ ان کی حرکت سے ایک کامل دائرہ بن جاتا ہے جس کا مرکز آفتاب ہوتا ہے اور سیارہ دوار اس دائرہ کے محیط پر اپنے مرکز کو رکھ کر اپنے محور پر گھومتا ہوا آفتاب کے گرد دورہ کرتا ہے۔ لیکن بعد میں کپلر کو معلوم ہوا کہ (۱) سیاروں کا مدار مستد پر نہیں ہے بلکہ اہلیجی اصل ہے جس کا ایک مرکز آفتاب ہوتا ہے اور (۲) سیارہ سے بجانب آفتاب جو خط متحرک کھینچا جائے اس کی جھپیٹ میں فضا کا جو منقطع آتا ہے اسے سیارہ کی زانہ گردش سے برابر کی نسبت ہوتی ہے۔ یہ دونوں اصول اب کپلر کے پہلے اور دوسرے قانون کے نام سے موسوم ہیں۔ آٹھ سال بعد کپلر نے تیسرا قانون دریافت کیا جس نے آفتاب اور سیاروں کے اوسط درمیانی فاصلہ اور ان کے زانہ گردش کے باہمی تعلقات کی تمحیص کر دی۔ اس قانون کے الفاظ یہ ہیں۔ ”گردش کے زمانے کا مربع اوسط فاصلہ کے مکعب سے برابر کی نسبت رکھتا ہے۔“ اس قانون کا اعلان کپلر نے اپنی کتاب ”خلاصہ نظام کوپرنیکس“ میں جو ۱۶۸۶ء میں شائع ہوئی کیا تھا

اور یہ بات ثابت کی تھی کہ اقدار مشتری اسی قانون کے تابع ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ جو قوانین نظام شمسی کے اعضاءِ رئیسہ کی حرکات کبیرہ پر حاوی ہیں انہیں کا اطلاق اس کے حواشی کی حرکات صغیرہ پر بھی ہوتا ہے۔

کپلر کے اکتشافات سے قانون غیر متغیر کا جو لازمی تصور پیدا ہوتا ہے اور نظریہ ارضی مرکز کے مقابلہ میں نظریہ شمسی مرکز کا جو ثبوت ان سے بہم پہنچتا ہے وہ پیشوایانِ کلیسا کو برا فروختہ کئے بغیر نہ رہ سکا چنانچہ محکمہ ترتیبِ فرست کتبِ محرمہ نے جب نظام کوپرنیکس کی کسمیر ان الفاظ میں کی کہ اس کی تعلیم کتابِ مقدس کے خوا کی نقیض ہے تو کپلر کے ”خلاصہ“ کو بھی ممنوع الاشاعت قرار دیا۔ اسی موقع پر کپلر نے وہ عذر پیش کیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس متاقرانہ احتذار کے الفاظ یہ ہیں: ”حرکت ارض و استقرار شمس کے متعلق کوپرنیکس کے مسائل اسی سال سے کسی قسم کی مخالفت یا مزاحمت کے بغیر زیر اشاعت ہیں۔ اس لئے کہ مسائلِ طبیعیہ پر بحث کرنا اور خدا کی صنعت و حکمت کے چرے سے پردہ اٹھانا جائز قرار دیا گیا تھا۔ لیکن آج جب کہ ان مسائل کی حقیقت کی تائید میں وہ شہادت بہم پہنچی ہے جو کلیسا کے اربابِ حل و عقد کو معلوم نہ تھی تو کائنات کے نظامِ ترکیبی کی صحیح ماہیت کی اشاعت کی ممانعت کی جاتی ہے!!“

کپلر کے معاصرین میں سے کسی کو بھی اس کے دوسرے قانون کی صحت کا یقین نہ تھا اور نیوٹن کی کتاب ”پرنسپا“ کے شائع ہونے سے پہلے کسی نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانین کپلر کا فلسفیانہ مفہوم اس زمانہ میں کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ خود ان نتائج سے بے خبر تھا جو آگے چل کر لامحالہ ان سے نکلنے والے تھے۔ اس کی غلطیاں بتا رہی ہیں کہ یہ نتائج اس کے ذہن سے کوسوں دور تھے۔ مثلاً ”اس کا خیال یہ تھا کہ سیارہ ایک نفسِ باہقہ کا جو مدرک کلیات و جزئیات ہے مظهر و مبطل ہے۔ اور پانچوں بڑے سیاروں کے ادوار کی متاثرِ علم ہندسہ کے مجسماتِ فہم کے ساتھ نسبت رکھتی ہیں۔ ابتداء وہ یہ سمجھتا تھا کہ سیارہ مرغ کا دور بیضوی شکل ہے لیکن کہیں مدوں کی دماغ سوزی کے بعد جا کر اسے اس عظیم الشان حقیقت کا علم ہوا کہ یہ شکل اہلجی ہے۔ اس خیال کی بنا پر کہ اجرامِ ستاری فساد و زوال سے منور ہیں ارسطو کا یہ عقیدہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ان کی حرکاتِ کامل الاستدار ہیں اور بجز حرکاتِ متدیر کے اجرامِ ستاری میں اور کسی قسم کی حرکت نہیں پائی جاتی۔ کپلر نئی کے ساتھ شکایت کرتا ہے کہ یہ عقیدہ ”اس زمانہ کا چور ہے“۔ اس کی فلسفیانہ جہالت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس عقیدہ کو جسے لوگ صدیوں سے بلاچوں و چرا

تسلیم کرتے چلے آئے تھے اس نے یک بیک پس پشت ڈال دیا۔

بعض اہم مسائل میں کپلر کی رائے نیوٹن پر سبقت لے گئی ہے اور کپلر الفضل للمقدم کا مصداق قرار پاتا ہے۔ مثلاً "اصول کشش ثقل کے مطلق صحیح صحیح خیالات اول اسی نے ظاہر کئے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ مادہ کا ہر ذرہ اس وقت تک حالت سکون میں رہتا ہے جب تک کوئی دوسرا ذرہ اس سکون میں خلل انداز نہ ہو۔ پھر کی ایک سل اگر زمین کو اپنی طرف کھینچتی ہے تو زمین اس سل کو اور بھی زیادہ قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اجسام ایک دوسرے کی طرف اپنے اپنے ثقل کی مناسبت سے حرکت کرتے ہیں۔ زمین میں اور چاند میں جو فاصلہ ہے وہ چون برابر حصوں میں تقسیم کیا جائے تو زمین چاند کی طرف اگر اس میں سے بقدر ایک حصہ کے بڑھے گی تو چاند باقی تہین حصے طے کرے گا۔ کپلر یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ سمندر میں موجز کشش قمر کی وجہ سے واقع ہوتا ہے اور سیاروں کی وجہ سے ضرور ہے کہ حرکات قمر کے تناسب میں خلل پیدا ہو۔

ثبت کی ترقی کے تین دور قرار دئے جاسکتے ہیں۔ دور اول اجرام سماوی کی اعتباری یعنی ظاہری حرکات کے مشاہدات و ارتصادات سے تعلق رکھتا ہے۔ دور ثانی میں ان کی حقیقی حرکات خصوصاً "سیاروں کی گردش کے قوانین کی تکشف ہوتی ہے اس دور کو کھونیکس اور کپلر کے کارناموں نے نمایاں کر دیا۔ دور ثالث ان قوانین کے اسباب کی تحقیق کا زمانہ ہے۔ یہ زمانہ نیوٹن نے پایا۔

دور ثانی کا ترقی کر کے دور ثالث ہو جانا علم تحریک اجسام کے ارتقا پر مبنی ہے جو عہد ارشمیدس یعنی مدرسہ اسکندریہ کی مستعدی کے زمانہ سے جلد و ساکن تھا۔

مسیحی یورپ میں لیونارڈو ڈاونسی سے پہلے جو ۱۴۵۲ء میں پیدا ہوا فلسفہ حرکات و جیل کی طرف کسی نے توجہ نہ کی تھی۔ سائنس کے احیا کا سرا لارڈ بیکن کے سر نہیں ہے بلکہ ڈاونسی کے سر ہے۔ بیکن نہ صرف ریاضیات سے بے بہرہ تھا بلکہ مسائل طبیعیہ کی تحقیقات میں ہندسہ و ریاضی کے استعمال کو غیر مفید خیال کرتا تھا۔ اس نے نظام کھونیکس کے تسلیم کرنے سے ازراہ استحقار انکار کیا ہے اور اس پر لغو و مہمل اعتراضات کئے ہیں۔ ادھر تو کلیلو اپنے متم باطن دور بینی اکثریات کی سرحد پر پہنچا ہوا تھا۔ ادھر بیکن یہ شکوک ظاہر کر رہا تھا کہ علمی تحقیقات میں آلات سے کام لینا سودمند نہیں ہو سکتا۔ طریقہ استقرائیہ یعنی جزئیات سے کلیات کے استدلال کا طریقہ اس سے منسوب کرنا تاریخ کے سبق کو بھلا دیتا ہے۔ اس کا فلسفہ علمی اعتبار سے ذرا بھی مفید ثابت نہیں ہوا اور کسی شخص کے دل

میں ان تجلیات سے استفادہ کرنے کا خیال تک نہیں پیدا ہوا۔ بجز انگریزی ناظرین کے یکن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

ڈاؤنسی کے حالات سے ہم آگے چل کر زیادہ مفصل بحث کریں گے۔ اس مقام پر ہم صرف اس قدر لکھنا کافی خیال کرتے ہیں کہ اس کی جو تصانیف مسودہ کی شکل میں ابھی تک موجود ہیں ان میں سے دو تو میلان کے کتب خانہ میں موجود ہیں اور ایک پیرس میں ہے۔ پیرس والا نسخہ پھولین اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ ڈاؤنسی کے ستر سالہ بعد ولندیز مندرس اسٹیونینس پیدا ہوا جس کی کتاب اصول توازن و اعتدال پر ۱۵۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے چھ سال بعد گلیلیو کا رسالہ علم الحركات شائع ہوا۔

اٹلی کے اس نامور شخص کی بدولت علم الحركات کے دو تین اصولی قوانین دریافت ہوئے جو قوانین حرکت کے نام سے موسوم ہیں۔ ان قوانین کی دریافت سے جو نتائج مرتب ہوئے وہ نہایت ہی اہم ہیں۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ حرکات مسلسل مثلاً "حرکات اجرام سماوی قوت کے دواپی استعمال و اطلاق ہی سے قائم رہ سکتی ہیں۔ لیکن گلیلیو کے قانون اول نے ظاہر کر دیا کہ ہر جسم حالت سکون یا حالت حرکت میں غیر منحرف پر قائم رہتا ہے تاوقتیکہ کوئی خلل انداز قوت اسے اس حالت کے بدلنے پر مجبور نہ کرے۔ اس ابتدائی اصول کا صحیح طور سے سمجھ لینا طبعی ہیئت کے اصولی واقعات کے افہام کے لئے لازمی ہے۔ چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سطح زمین پر تمام حرکات جلد ختم ہو جاتی ہیں لہذا ہم یہ بادی النظری نتیجہ نکالتے ہیں کہ سکون اجسام کی فطری و جبلی حالت ہے۔ پس اگر ہم کو اطمینان ہو جائے کہ ہر جسم سکون و حرکت دونوں میں سے کسی کے ساتھ مبالغت نہیں رکھتا بلکہ ہر حالت پر برابر قائم رہتا ہے تاوقتیکہ کوئی مخالف قوت مغل نہ ہو تو اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم نے اپنی معلومات میں کس قدر ترقی کی ہے۔ اس قسم کی خلل انداز قوتیں جن سے عام حرکات پر اثر پڑتا ہے رگڑ اور اندفاع ہوا ہیں۔ جب یہ قوتیں موجود نہ ہوں گی تو حرکت استمراری ہوگی۔ چنانچہ اجرام سماوی جو فضائے بسیط میں حرکت کر رہے ہیں ایک حال پر مستداما "متحرک ہیں۔

قوتوں کی مقدار میں خواہ کیسا ہی اختلاف کیوں نہ ہو ان کا عمل بالاشتراك و بالاتفاق اس طور پر ہو گا کہ گویا ایک ہی قوت اپنا اثر دکھا رہی ہے دوسری غیر موجود ہے۔ مثلاً "جب کسی توپ کے منہ سے گولا زمین پر گرا دیا جاتا ہے تو وہ بوجہ کشش ثقل کے اثر کے سطح زمین تک ایک خاص وقت میں پہنچتا ہے لیکن اگر اسی گولے کو توپ میں بارود بھر کر

چھوڑا جائے تو اگرچہ اب یہ ایک ٹائمہ میں کئی ہزار فٹ کا فاصلہ طے کر جائے گا لیکن کشش ثقل کا اثر اس پر اب بھی بیحد ہی ہو گا جو پہلے تھا۔ قوتوں کی آمیزش سے کوئی انحطاط یا کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ ہر طاقت نے اپنا اثر مخصوص دکھا دیا ہے۔

سترہویں صدی کے نصف آخر میں یورپلی۔ ہوک اور ہائینس کی تصانیف نے اس بات کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا کہ حرکات مستدیر کی توجہ کلیلو کے قوانین کی بنا پر کی جا سکتی ہے۔ یورپلی نے اقدار مشتری کی حرکات پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایک مرکزی قوت کے عمل سے کیوں کر حرکت مستدیر پیدا ہو سکتی ہے۔ ہوک نے ظاہر کیا ہے کہ ایک خارجی مرکزی کشش حرکت مستقیم کو امالہ دے کر حرکت مستدیر بنا سکتی ہے۔

۱۶۸۷ء وہ تاریخ ہے جو نہ صرف یورپین سائنس بلکہ انسان کی دماغی ترقی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ یعنی اس سال نیوٹن کی بے مثل اور زندہ جاوید کتاب ”پرنسپا“ شائع ہوئی۔

اس اصول کی بنا پر کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی مقدار کی نسبت مستقیم اور اپنے فاصلہ کے مربع کی نسبت معکوس سے کھینچتے ہیں۔ نیوٹن نے ثابت کر دیا کہ اجرام سماوی کی تمام حرکات کی معقول اور شانی وجہ بیان کی جا سکتی ہے اور کپل کے قوانین یعنی حرکات اہلیلی فضاے طے نمود اور نسبت وقت و مسافت کے مطلق اسی اصول کو مد نظر رکھ کر پیش از پیش حکم لگایا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ نیوٹن کے معاصرین کو حرکات مستدیر کی وجہ معلوم ہو چکی تھی۔ یہ تو ایک صورت خاص تھی یعنی اس کا تعلق مشتری کے تابع کی حرکات سے تھا لیکن نیوٹن کی عقل دقیقہ سنج نے اشکال حرکت کے عام مسئلہ کو حل کر دیا۔ جس میں حرکات مستدیر و اہلیلی و قریب البیضوی و بعید البیضوی گویا مخروطات کی کل حرکات کی خاص خاص صورتیں شامل تھیں۔

تندریہ لے مندسوں نے بیان کیا تھا کہ گرتے ہوئے اجسام کا رخ زمین کے مرکز کی طرف ہوتا ہے۔ نیوٹن نے ثابت کر دیا کہ ایسا ہونا لازمی ہے اس لئے کہ کسی کہ کے کل اجزائے ترکیبی کی کشش کا عام اثر ایسا ہی ہے کہ گویا ان سب کا نقطہ اتصال اس کا مرکز ہے۔

اس مرکزی قوت کو جو اجسام کے ہیٹھ کی محسوس کرتی ہے کشش ثقل کا نام دیا گیا۔ اس وقت تک بجز کھلر کے اور کسی کو یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ اس قوت کی حد اثر کہاں تک ہے۔ نیوٹن نے سوچا کہ ممکن ہے کہ اس قوت کا عمل چاند پر بھی ہوتا ہو اور یہی وہ قوت ہو جو چاند کو خط مستقیم سے منحرف ہو کر زمین کے گرد گردش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

قانون مربع معکوس کی بنا پر یہ اندازہ لگانا آسان تھا کہ آیا کشش زمین گردش قمر کے بدیہی نتیجہ کی علت کافی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جسامت زمین کی پیمائش کو جو نتائج اس وقت بہم پہنچ سکتے تھے ان کے ذریعہ سے نیوٹن کو یہ معلوم ہوا کہ انحراف جرم قمر صرف تیرہ منٹ فی دقیقہ ہے حالانکہ اگر مسئلہ کشش ثقل صحیح ہو تو یہ انحراف پندرہ فٹ ہونا چاہئے۔ لیکن جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے۔ پکارڈ نے ۱۷۶۹ء میں ایک درجہ ارضی کی پیمائش زیادہ صحت اور تدقیق کے ساتھ کی جس نے جسامت زمین اور اس لحاظ سے فاصلہ قمر کا اندازہ بدل دیا۔ ۱۷۷۹ء میں جب بعض مسائل متعلق پر ”رائل سوسائٹی“ میں مباحثہ ہو رہا تھا تو نیوٹن کی توجہ اس اندازہ کی طرف متعطف ہوئی۔ چنانچہ وہ پکارڈ کے عمل کی نقل لے کر گھر آیا اور اپنے پرانے کاغذات نکال کر ازسرنو حساب لگانے میں مشغول ہوا۔ جب وہ نتیجہ کے قریب پہنچا تو اسے ایسی گھبراہٹ ہوئی کہ نتیجہ کے استخراج کے لئے اسے مجبوراً اپنے ایک دوست کی مدد لینے پڑی۔ یہ نتیجہ حسب امید برآمد ہوا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ چاند کا اپنے مدار پر قائم رہنا اور زمین کے گرد گھومنا کشش ثقل ارضی کی قوت کا نتیجہ ہے۔ غرض کہلر کے اس خیال کی جگہ کہ اجرام سماوی عقول عالیہ کے مرکز ہیں ڈیکارٹ کے اس خیال نے لے لی کہ فضا میں اشیاء یعنی جو ہر لطیف کی لہریں اٹھ رہی ہیں جن کے زور سے اجرام سماوی حرکت کرتے ہیں اور ڈیکارٹ کے خیال کے بجائے نیوٹن کا اصول قوت مرکزی قائم ہو گیا۔

اسی قوت کشش ثقل کی وجہ سے زمین اور باقی تمام سیارے آفتاب کے گرد شکل الہلیجی بناتے ہوئے گردش کرتے ہیں اور ان میں جو اختلاف واقع ہوتا ہے اس کا باعث وہ عمل ہے جو ایک سیارہ کے جرم کا ثقل دوسرے سیارہ پر کرتا ہے۔ اگر ثقل اجرام کی مقدار اور ان کا فاصلہ معلوم ہو تو اختلاف کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ زمانہ مابعد کے مندسوں نے اس کی شکل معکوس بھی دریافت کر لی۔ یعنی اگر کیفیت اختلاف معلوم ہو تو جرم ذوالاختلال کا وضع اور ثقل معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سیارہ یورینس کا اپنے قیاسی موقع سے منحرف ہونا سیارہ نیپچون کے انکشاف کا باعث ہوا۔

نیوٹن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قوانین تحریک اجسام کو اجرام سماوی کی حرکات سے تطبیق دی اور اس بات پر زور دیا کہ سائنس کے قیاسات کی تصدیق و توثیق مشاہدہ و محاسبہ کی موافقت کے ذریعہ سے کرنی چاہئے۔

جب کہلر نے اپنے تین قوانین کا اعلان کیا تو پیشوایان کلیسا نے انہیں مذموم و ناروا

قرار دیا۔ نہ اس لئے کہ وہ غلط تھے بلکہ کچھ تو اس لئے کہ ان سے نظام کو ہونے کی تائید ہوتی تھی اور کچھ اس لئے کہ کسی غیر متغیر قانون کی حیثیت ایزدی و توفیق ربانی کا مزاج سمجھنا خلاف مصلحت ہے۔ دنیا ایک تماشا گاہ سمجھ لی گئی تھی جس میں خدا کی مرضی ہر روز اپنے کرشمے دکھائی رہتی تھی اور یہ امر جناب باری کی جلالت و جبروت کے متانی سمجھا گیا تھا کہ اس کی حیثیت کسی قاعدے یا قانون کی پابند ہو۔ پادریوں کی طاقت کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ یہی دعویٰ تھا کہ وہ اپنے رسوخ و اثر سے خدا کے عزائم علی الاطلاق کو نسخ کر سکتے ہیں۔ یعنی مدار ستاروں کی نحوست کا اثر کم کر سکتے ہیں۔ دھوپ ٹھکوا سکتے ہیں۔ مینہ برسوا سکتے ہیں۔ کوف و خوف کو رکوا سکتے ہیں۔ سیل قدرت کے ہماؤ کا رخ بدل سکتے ہیں اور ہر طرح کے معجزے اور کرامتیں دکھا سکتے ہیں۔ اسی طریقہ سے گھڑی کی سوئی نے رجعت قمری کر کے پیچھے کی طرح چلنا شروع کر دیا تھا اور آفتاب و ماہتاب چلتے چلتے آسمانوں کے وسط میں رک گئے تھے۔

نیوٹن کے زمانہ سے ایک سو سال پہلے ایک بہت بڑا مذہبی و سیاسی انقلاب ہوا تھا جو اصلاح کینسہ کے نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ اس انقلاب کی بدولت خیال انسانی کو کامل آزادی تو میسر نہیں ہوئی تھی لیکن فہمیت کے قدم پرزے بہت کچھ ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اصلاح یافتہ ممالک میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نیوٹن کی تصانیف کا مذہبی پہلو سے تنقید کرے اور پادری بھی نہ چاہتے تھے کہ اس معاملہ میں خواجوا دخل دیں۔ اول اول پرائیمنٹ فرقہ کی توجہ اپنے بہت بڑے دشمن یعنی کیتھولک فرقہ کی سازشوں کا توڑ کرنے میں تھی اور جب اس طرف سے اطمینان ہوا اور اصلاح کے وہ شاخسانے جن کا پھوٹنا لازمی تھا نکلنے شروع ہوئے تو پرائیمنٹوں کی توجہ حریف و رقیب کلیساؤں پر مبذول ہو گئی۔ ”لوٹھرن“ ”کیلون“ ”ایسکویٹن“ اور ”ہیڈیٹھون“ فرقوں کو اپنے مذہبی جمعیوں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ نیوٹن کے مندرجہ اکتشافات پر اپنا وقت ضائع کرتے۔

غرض ان فرقوں کے باہمی فسادات نیوٹن کے متمم بالشان نظریہ کے لئے ذریعہ قوت بن گئے۔ تکفیر و تخلیق تو کجا کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور یہ نظریہ چپکے چپکے پوری قوت پکڑ گیا۔ اس کا فلسفیانہ مفہوم ان عقائد کے مقابلہ میں جو ان فرقوں کا ماہ النزاع تھے بدرجہا زیادہ نتیجہ خیز تھا۔ اس نے نہ صرف آفتاب کو اپنے نظام کا مرکز تسلیم کر کے کپلر کے قوانین کی صحت کا اعتراف کیا بلکہ ثابت کر دکھایا کہ پادریوں کی مخالفانہ دلائل خواہ کیسی ہی قوی کیوں نہ ہوں لیکن آفتاب ضرور ہے کہ ہمارے نظام کا مرکز ہو اور کپلر

کے قوانین مندرسانہ لزوم یا جبر کا نتیجہ ہیں۔ ناممکن ہے کہ یہ قوانین وہ نہ ہوں جو ہیں۔ اس کل بحث سے بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ نظام شمسی کی حرکات میں ربانی مداخلت خلل انداز نہیں ہوتی بلکہ اس کے نظم و نسق کی عین اس غیر متبدل و غیر متغیر قانون کے ہاتھ میں ہے جو بجائے خود مندرسانہ جبر کا نتیجہ ہے۔

ہرشل اول^۱ نے دوربین سے جو مشاہدات کئے ان کی بنا پر اسے یقین ہو گیا کہ فضائے فلکی میں بہت سے دہرے ستارے بھی موجود ہیں۔ دہرے سے مراد یہی نہیں کہ وہ اتفاقیہ طور پر ایک ہی خط نگاہ پر واقع ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بعا^۲ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط و منوط ہیں اور ایک ستارہ دوسرے ستارے کے گرد گھومتا ہے۔ ہرشل ثانی نے ان مشاہدات کو جاری رکھا اور بہت کچھ وسعت دی۔ برج نبات^۳ انتعاش کبریٰ کے دہرے ستارے کے اہلیجی مدار کی ماہیت سیوری نے دریافت کی تھی اور یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اس کے کمال دور کی مدت سوا اٹھاون سال ہے۔ ایک اور دہرے ستارے کے حالات ہڈ نے دریافت کئے تھے۔ اس کا نام کارونا (اکلیل النور) ہے اور اس کے دور کا زمانہ سات سو چھتیس سال ہے۔ ان شمس جوزائی کی حرکات دواری کا اہلیجی شکل ہونا صاف بتا رہا ہے کہ قانون کشش ثقل نظام شمسی کی حدود سے بھی بہت پرے نافذ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جہاں تک دوربین پہنچتی ہے قانون کی عملداری نظر آتی ہے۔ ڈلبرٹ نے ”انسائیکلو پیڈیا“ (دائرة المعارف) کے دریاچے میں لکھا ہے اور جے لکھا ہے کہ کائنات محض ایک واقعہ واحد یا الفاظ دیگر ایک حقیقت عظمیٰ ہے۔

پس ان تمام واقعات سے کیا ہم کو یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہئے کہ شمس و کواکب کو خدا نے پیدا کیا اور اپنی مشیت علی الاطلاق سے ان کو ایسے قوانین کے تابع کر دیا جن کے تحت میں اس مشیت کا اقتضا تھا کہ یہ اجرام حرکت کریں؟

یا اس امر کے باور کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود ہے کہ شمس بازو کے یہ نظام کسی حکم غیر وجہ کی بنا پر معرض وجود میں نہیں آئے بلکہ قانون کا عمل ان کے وجود میں آنے کا باعث ہوا ہے؟

سپیس کی تحقیقات کے بموجب نظام شمسی میں حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ تمام سیارے اور ان کے اقمار جن اشکال اہلیجی میں حرکت کرتے ہیں ان کی اہلیجیت اس قدر کم ہے کہ ان پر تقریباً دائرہ کی تعریف صادق آتی ہے۔ تمام سیارے ایک ہی سمت میں اور تقریباً ایک ہی سطح پر گردش کرتے ہیں۔ اقمار اور سیاروں کی گردش کا رخ ایک ہی

ہے۔ آفتاب سیاروں اور ان کے اقمار کی گردش محوری و گردش دوری کا رخ ایک ہی ہے اور اس گردش کی سطح میں بہت کم تفاوت ہے۔

ممکن نہیں کہ موافقت و مطابقت کی اتنی بہت سی صورتیں محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہوں۔ کیا یہ امروز روشن کی طرح آشکارا نہیں ہے کہ ان تمام اجسام کی شیرازہ بند ایک قوت ہے اور ایک رشتہ بطور قدر مشترک ان سب کو ربط دینے والا موجود ہے اور یہ ایک ایسے جرم عظیم الشان کے اجزاء ہیں جو تشرد و تحلیل سے پہلے واحد و منفرد تھا؟

لیکن اگر ہم تسلیم کر لیں کہ جس مادہ سے نظام شمسی مرکب ہے وہ ایک دفعہ بطل نباتہ النجوم یعنی بصورت غبار کوکی موجود تھا اور اپنے محور کے گرد گھومتا تھا تو تمام وہ خصوصیات جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ازروئے اصول حرکات الاجسام لازمی نتائج کے طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ سیارگان و اقمار و نجم کے ترکیب پذیر ہونے کی معقول توجیہ ہمارے ہاتھ آ جاتی ہے۔ ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ بیرونی سیارے اور اقمار اندرونی سیاروں اور اقمار سے کیوں بڑے ہیں۔ ہم بتا سکتے ہیں کہ بڑے سیارے کس لئے زیادہ تیزی سے گھومتے ہیں اور چھوٹے سیاروں کی حرکت میں آہستگی پائی جاتی ہے اور بیرونی سیاروں کے اقمار اندرونی سیاروں کے اقمار کے مقابلہ میں کیوں زیادہ ہیں۔ ہم حکم لگا سکتے ہیں کہ سیارے اور اقمار اپنے اپنے دور کس قدر زمانہ میں طے کرتے ہیں۔ ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ زحل کے حلقے کس طور پر ہیں۔ ہم سمجھ جاتے ہیں کہ آفتاب کی موجودہ طبعی حالت کی کیا وجہ ہے اور ارض و قمر جن کی طبقات الارضی سرگزشت سے ہم واقف ہیں کیوں کر مختلف مدارج تغیر طے کرتے ہوئے موجود حالت کو پہنچے۔

لیکن خصوصیات مذکورہ بالا میں دو مستثنیات بھی پائی گئی ہیں جو یورینس اور نیپچون سے متعلق ہیں۔

اگر اس قسم کے نباتہ النجوم کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو باقی تمام نتائج خود بخود نکلنے چلے آتے ہیں۔ البتہ ایک بہت بڑی مشکل سبک راہ ہوتی ہے۔ یعنی جن دنیاؤں کو خدا نے بنایا ہے ان سے خدائے قدیر خارج ہوا جاتا ہے۔

اول ہم کو یہ اطمینان کر لینا چاہئے کہ آیا ایسے نباتہ النجوم کے وجود کا اعتراف کرنے کے لئے کوئی قوی شہادت بھی بہم پہنچ سکتی ہے یا نہیں۔

مسئلہ نباتہ النجوم کا اصولی حضر ہر شل اول کے اس دور بنی اکتشاف پر ہے کہ افلاک میں جابجا نور کے زرد درخشاں بقیے پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے بعض اس قدر بڑے ہیں کہ

مردانہ کو بھی محسوس ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے اکثر بقال پر جب زبردست دوریوں کے ذریعہ سے نظر ڈالی گئی تو معلوم ہوا کہ کواکب کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا ہے لیکن ایک آدھ جھ نور مثلاً ”برج جوزا کا منبہ اکبر ایسا بھی ہے جسے زبردست سے زبردست دور نہیں بھی کواکب میں تحلیل نہیں کر سکیں۔

جو لوگ مسئلہ منبہ النجوم کی حقیقت کا اعتراف نہ کرنا چاہتے تھے انہوں نے یہ اعتراض پیش کیا کہ عدم تحلیل کی وجہ دوریوں کا نقص ہے۔ ان آلات مشاہدہ میں دو جداگانہ قوتیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ان کی قوت اقتباس ان کے ”لنز“ (زجاجہ) کے دور پر اور قوت ایضاح صورت ان کی سطوح نظریہ کی غایت لطافت و زکات پر منحصر ہوتی ہے۔ بڑی دوریوں میں وصف اول الذکر تو بوجہ اپنی جسامت کے بدرجہ تام موجود ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسری صفت شان و ثناء ہی بکمال الوجہ پائی جاتی ہے جس کا باعث یہ ہے کہ یا تو ان کی اصولی ترکیب ہی ناقص ہوتی ہے اور یا وزن کے باعث خمیدگی پیدا ہو جانے سے سطح نظریہ بگڑ جاتی ہے۔ لیکن تاوقتیکہ کسی دورین میں یہ دونوں صفتیں پوری طرح سے موجود نہ ہوں، اس سے غبار انجم کا انفکاک بصورت نقاط منفصل نہیں ہو سکتا۔

حسن اتفاق سے اس عقدے کے حل کرنے کا دوسرا سامان بھی موجود ہے۔ ۱۸۳۶ء میں مصنف کتاب ہڈانے اس حقیقت کا اکتشاف کیا کہ اجسام مستوقد یعنی جلتے ہوئے اجسام کے الوان منشور کا انعکاس مسلسل ہوتا ہے یعنی اس میں نہ سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں نہ روشن دھاریاں۔ اس سے پہلے فرانوفر نے یہ تکشیف کی تھی کہ غاز (گاس) مستوقد کے الوان منشور کا انعکاس غیر مسلسل ہوتا ہے۔ پس ان دونوں اکتشافات کو پیش نظر رکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کسی منبہ النجوم سے جو روشنی خارج ہو رہی ہے اس کا ماخذ غاز مستوقد ہے یا اجرام و ثوابت و شمس مستوقد ہیں۔ اگر اس کے الوان منشور کا انعکاس غیر مسلسل ہو تو سمجھنا چاہئے کہ یہ منبہ حقیقی یا غاز مستوقد ہے اور اگر مسلسل ہو تو مجموعہ انجم سمجھنا چاہئے۔

۱۸۳۳ء میں مسٹر کہنس نے ایک منبہ کو جو برج ڈریکو میں واقع ہے اسی معیار میں جانچا تو معلوم ہوا کہ یہ منبہ حالت غازیہ میں ہے۔ اس کے بعد متعدد مشاہدات ہوئے اور ساتھ منبہ النجوم کا امتحان کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے انیس کے الوان منشور کا انعکاس غیر مسلسل ہے اور باقی کا مسلسل۔

ایسی حالت میں ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آخر کار طبعی و عملی ثبوت اس امر کا ہم

پہنچ گیا ہے کہ مادہ کے عظیم الشان انبار غازیہ حالت میں موجود ہیں اور ان کے التہاب کے اشتداد کی یہ کیفیت ہے کہ ان کی روشنی کا رنگ بالکل سفید ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ لیپلس کا قیاس حجت موجب و شہادت ناطق پر مبنی ہے۔ اس قسم کے کوکبی تودہ مستوقد کی ترمیم تبخیر کے ذریعہ سے لازمی ہے اور انجماد و گردش اس کے نتائج ناگزیر ہیں۔ ضرور ہے کہ اس تودہ میں سے جدا جدا حلقے نکل آئیں جن کی سطح ایک ہی ہو اور سیارے اور اقمار پیدا ہوں جو ایک ہی طرح گردش کرتے ہوں اور وسط میں ایک آفتاب رہ جائے جس کے گرد یہ سیارے گھومتے ہوں۔ غرض ایک ہیولانی مادہ سے قوانین قدرت کے عمل کے باعث ایک مدون و مرتب نظام پیدا ہو جاتا ہے اور حرارت کے بتدریج کم ہونے سے مادہ دنیاؤں کی شکل قبول کر لیتا ہے۔

اگر نظام شمسی اور ثوابت و سیار کی دنیاؤں کی آفرینش کی حقیقت یہی ہو تو ہمیں قانون کی عملداری کے متعلق اپنے دائرہ خیال کو مجبورا وسیع کر کے اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کائنات میں جو بے شمار اجرام پھیلے ہوئے ہیں نہ صرف ان کی تکوین بلکہ ان کی سیانت میں بھی قانون ہی کو دخل ہے۔

لیکن اس مقام پر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعہ کا اعتراف انتہائے بد عقیدگی پر دلالت نہیں کرتا؟ کیا ہم قادر مطلق خدا کو اس دنیا سے جسے اس نے پیدا کیا ہے بے دخل نہیں کر رہے ہیں؟

ہم نے صاف مطلع پر ابر گھرتے ہوئے اکثر دیکھا ہے۔ سیاہی کا ایک دھندلا سا نقطہ غبار کا ایک ننھا سا مرغولہ اول اول نمودار ہوتا ہے اور بتدریج بڑھتے بڑھتے سیاہ و غلیظ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ آسمان کے ایک بہت بڑے حصہ پر کالی گھٹا چھا جاتی ہے۔ یہ گھٹا الوکھی اور نرالی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ آفتاب کا نور جب اس میں سے چھٹتا ہے تو ایک عجب و دلفریب سماں نظر آنے لگتا ہے۔ لکھ ہائے ابر و دوش ہوا پر سوار ہو کر بڑے چلے جاتے ہیں۔ گھٹا چھٹنے لگتی ہے اور جس طرح بتدریج نمودار ہوئی تھی اسی طرح شاید آہستہ آہستہ کم ہوتی ہوئی ہوا میں غائب ہو جاتی ہے اور مطلع پھر صاف ہو جاتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے اجزائے منفوط جن سے یہ گھٹا مرکب تھی حرارت میں تخفیف ہو جانے کے باعث ان آبی نچروں کے انجماد سے پیدا ہوئے جو پہلے سے کہ ہوا میں موجود تھے اور نمجد ہو کر انہوں نے سحابی شکل اختیار کر لی۔ بادل کی تباہی یا ظلمت کی توجیہ ہم علم مناظرہ و مرایا کے اصول پر کرتے ہیں۔ ہوا کے زور سے اس کی نقل و حرکت کا

سبب بیان کرتے ہوئے ہم علم تحریک اجسام کے اصول پیش کرتے ہیں۔ اس کے نمودار ہو کر غائب ہو جانے کی وجہ ہمارے نزدیک علم کیمیا کے اصول میں پائی جاتی ہے۔ یہ ہمیں کبھی خیال نہیں آتا کہ اس شکل گرینپا کی ٹکونین و ترکیب کو خدا کی بلا واسطہ مداخلت سے منسوب کریں۔ اس کے کل واقعات مخلقہ کی توجیہ ہم طبعی قوانین کی بنا پر کرتے ہیں اور شاید ادب و احرام مانع آئے کہ ہم بادل کی تخلیق کے لئے جناب باری کے قدرت کو بروئے کار آنے کی زحمت دیں۔

لیکن اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے تو کائنات کی حقیقت بھی اس بادل سے زیادہ نہیں۔ اس کے اجزا بخارات آبی تھے۔ اس کے اجزا شمس و عوالم ہیں۔ ہماری نظروں میں گو اس کی عظمت و حکمت کی کوئی انتہا نہ ہو لیکن عقل غیر محدود و لازوال کے نزدیک اس کی ہستی ایک رمتی بدلی ہے۔ جس طرح آسمان پر ایک بادل آتا ہے ایک جاتا ہے اسی طرح یہ نظام ثابت (یعنی کائنات) بے شمار دوسری دنیاؤں کا قائم مقام ہے جو اس سے پہلے گزر چکی ہیں اور ان گنت ان دنیاؤں کا پیشرو ہے جو وجود میں آنے والی ہیں۔ غرض انقلاب و تبدل علت و معلول اور سبب و مسبب کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔

اگر طبیعیات کے اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم کمرے اور بادل کے اسباب پر غور کر سکتے ہیں حالانکہ اس قسم کے مسائل علم حوادث الجو کے مضامین داخل ہیں تو کیا اسی اصول کی بنا پر دنیاؤں اور کائناتوں کی ابتدا و آفرینش کے مسائل پر غور کرنے کی ہم کو اجازت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ آخر یہ دنیاؤں بھی بادل ہی ہیں اگرچہ ان کی وسعت مکان کا پیمانہ کسی قدر زیادہ ہے اور ان کی حقیقت کمرے سے زیادہ نہیں اگرچہ اس کی وسعت زمان کا معیار کسی قدر کم ٹاپائدار ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک ایسی حد فاصل قائم کر سکے جس کے ایک طرف طبیعیات کا عمل ہو اور دوسری طرف مابعد الطبیعیات کا؟ کیا اشیاء کی مقدار اور مدت بقا کے متعلق ہمارے قیاسات محض اعتباری نہیں ہوتے؟ برج جوزا میں جو نسبتاً النجوم نظر آتا ہے اگر ہم اس میں موجود ہوں تو کیا شاندار نظارہ ہمیں دکھائی دے۔ اس کے متمم بالشان انقلابات کا ظہور میں آتا۔ اس کے آتشیں غبار کا منجمد ہو کر دنیاؤں کی شکل اختیار کرنا ہمیں اس قابل معلوم ہو کہ خدا بذات خود موجود ہو کر ان کی مگرانی کرے۔ اس مقام بعید سے جہاں کروٹوں میل کی ہماری نگاہوں کے سامنے کوئی ہستی نہیں اور شمس بازمہ فضائے فلکی میں ہمیں چمکتے ہوئے ندوں

کے برابر نظر آتے ہیں۔ برج جوزا کا یہ نہایتہ النجوم دھندلی سے دھندلی بدلی سے بھی زیادہ مہووم معلوم ہوتا ہے۔ گلیلیو نے برج جوزا کا ذکر کرتے وقت اسے اس درجہ حقیر و بچ میرز سمجھا ہے کہ اس کا حوالہ تک نہیں دیا اور اگر کوئی شخص اس کی تکوین و تخلیق کو کسی علت ثانیہ سے منسوب کرتا اور جو انقلابات اس میں ہو رہے ہیں ان کے لئے خدا کی مطلق العنان دست اندازی کو ضروری نہ سمجھتا تو اس زمانہ کے کٹر سے کٹر پادری بھی اسے قابل الزام نہ خیال کرتے۔ پس جب اس نہایتہ النجوم کے متعلق ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں تو وہ نفس ناقلہ جو وہاں کی کسی دنیا میں موجود ہو گا ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرے گا؟ اس نہایتہ النجوم کی وسعت ہمارے نظام شمسی سے کروڑوں گنی زیادہ ہے۔ ہم وہاں سے مطلق نظر نہیں آتے اور اس لئے وہاں کی عقل کے لئے ہمارا عدم وجود برابر ہے۔ کیا وہ عقل ہماری آفرینش اور بقا کے لئے خدا کی فوری و بلا واسطہ مداخلت کو ضروری و لازمی تصور کریں گی؟

نظام شمسی سے قطع نظر کر کے اب ہم اس کے ایک جزو حقیر یعنی اپنے کہ زمین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ہے اس میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ کیا یہ تبدیلیاں ربانی مداخلت کا نتیجہ ہیں یا غیر متغیر قانون کے مسلسل اور نہ ٹٹنے والے عمل کا؟ قدرت کی شکل ہماری آنکھوں کے سامنے ہر لمحہ متغیر ہوتی رہتی ہے اور طبقات الارضی زمانوں میں یہ تغیر نہایت وسیع اور خیرت انگیز پیمانہ پر ہوا ہے۔ لیکن ان قوانین میں جو ان تغیرات پر حاوی ہیں خفیف سی تبدیلی بھی نہیں ہوتی۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے لیکن وہ نہیں بدلتے۔ موجودہ نظام کون و فساد اس عظیم الشان زنجیر کا محض ایک حلقہ ہے جس کا ایک سرا ماضی کی غیر معین و برتر از اعصاب سرحد کی طرف چلا گیا ہے اور دوسرا سرا مستقبل کی غیر محدود و خارج از قیاس نہائی کی جانب پھیلا ہوا ہے۔

اس امر کی طبقات الارضی اور بیستی شہادت موجود ہے کہ قرون ماضیہ میں زمین اور چاند کی حرارت بمقابلہ زمانہ موجودہ بہت زیادہ تھی۔ یہ حرارت بتدریج کم ہوتی گئی لیکن کمی کا عمل اس قدر بلی الاثر تھا کہ کسی مختصر مدت میں اس کا محسوس ہونا ممکن نہ تھا۔ البتہ طویل زمانوں کے انقضا کے بعد یہ کمی نمایاں ہوتی گئی۔ جو حرارت بذریعہ تبخیر زمین سے خارج ہوئی ہے وہ فضا میں چلی گئی ہے۔

مادہ کے کسی تودہ کی حمید خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا غیر مسلسل نہیں ہوتی یعنی اس کا عمل رک رک اور تھم تھم کر نہیں ہوتا۔ بلکہ ریاضی کے ایک مقررہ قانون کے تابع ہوتی ہے

اگرچہ ان تغیرات عظیمہ کے لئے جن سے ہمیں یہاں بحث ہے نہ تو نیوٹن کا کلیہ کام دیتا ہے نہ ڈیولانگ کا اور نہ ہیٹ کا۔ اس واقعہ سے ہمارے دعوے میں کوئی فرق نہیں آسکتا کہ ایک زمانہ میں حرارت زمین کی رفتار زوال معمول سے کسی قدر کم ہو گئی۔ ایک زمانہ میں یہاں تک کم ہوئی کہ دور زمہر سگریہ نمودار ہو گیا۔ پھر ایک زمانہ میں کچھ عرصہ کے لئے معمول سے زیادہ ہو گئی۔ نہ یہ بحث ہی ہمارے دعوے پر کوئی اثر ڈال سکتی ہے کہ آیا یہ اختلافات سطح زمین کے بلند و پست ہونے کے باعث پیدا ہوئے یا حرارت آفتاب کے موقت الاشداد ہونے کی وجہ سے حرارت آفتاب کا موقت الاشداد ہونا حرارت کی تدریجی کمی میں محض بمنزلہ ایک اختلال کے ہے۔ سیاروں کی حرکات کے اختلالات سے اصول کشش ثقل کی تائید و توثیق ہوتی ہے نہ کہ تردید و تنقیط۔

حرارت کا یہ زوال ظاہر ہے کہ ہمارے کرہ کی طبعی نوعیت میں بے شمار تبدیلیوں کا باعث ہوا ہو گا۔ سکڑنے کی وجہ سے اس کا حجم بہت کچھ کم ہو گیا ہو گا۔ اس کے دن کا طول گھٹ گیا ہو گا۔ اس کی سطح شکستہ ہو گئی ہو گی اور جن جن طبقات کی قوت اندفاع سب سے زیادہ کم ہو گی وہاں بڑے بڑے دراڑ اور غار پڑ گئے ہوں گے۔ سمندر کی کثافت بڑھ گئی ہو گی۔ اس کے پانی کی مقدار گھٹ گئی ہو گی۔ کرہ ہوا کے اجزائے ترکیبی خصوصاً "انہرات آبی اور "کاربانک ا۔س۔" (حوتہ الصخیم) کی مقدار میں تغیر واقع ہو گیا ہو گا۔ ہوا کا دباؤ کم ہو گیا ہو گا۔

یہ انقلابات اور بہت سے دوسرے تغیرات جو ان کے ساتھ لازم ملزوم ہیں۔ غیر مسلسل طور پر نہیں بلکہ نہایت ترتیب و باقاعدگی سے واقع ہوئے ہوں گے اس لئے کہ وہ علت کبرے یعنی زوال حرارت جو ان تغیرات کے ظہور کا باعث تھی خود ایک ہندی قانون کے تابع تھی۔

لیکن ان اٹل تبدیلیوں کا اثر کائنات غیر ذی حیات ہی پر نہیں پڑا۔ کائنات ذی حیات بھی ساتھ ساتھ برابر متاثر ہوتی گئی۔

ہر شکل ذوی الاعضا خواہ وہ از قسم نباتات ہو یا از قسم حیوانات اس وقت تک تبدیلی قبول نہیں کرتی جب تک کہ اس کے حوالی میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر حوالی بدل جائیں تو وہ شکل یا تو متغیر ہو جائے گی اور یا بالکل معدوم ہو جائے گی۔

اگر تغیر حوالی فوری و ناگہانی ہو تو انعدام زیادہ قرین قیاس ہے لیکن اگر تغیر علی التدریج ہو تو تبدیل یا تحلیب کا امکان زیادہ ہو گا۔

چونکہ اس واقعہ کے یقینی ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قدرت کے مظاہر غیر ذی روح میں قرناقرن کے مرور سے وسیع و عظیم تغیرات واقع ہوئے ہیں۔ چونکہ کہ زمین کا بیرونی خول اور سمندر اور کہ ہوا وہ نہیں ہیں جو کسی زمانہ میں تھے۔ چونکہ خشکی اور تری کی تقسیم اور دوسری طبیعی حالتیں بدل گئی ہیں۔ چونکہ مخلوقات ذی حیات کے حوالی میں اس قدر عظیم الشان تغیرات ہوئے ہیں لہذا صاف ظاہر ہے کہ ان مخلوقات کو بھی اسی طرح کے مدارج فناء و استحالہ طے کرنے پڑے ہوں گے۔

اس قسم کے فناء و استحالہ کے وقوع میں آنے کی باطل اور قطعی شہادت اس کثرت سے موجود ہے کہ یقین کو مجبوراً اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

اس موقع پر ہم مکرر اس امر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ چونکہ وہ قوت جو ان تغیرات کا باعث تھی خود ایک ہندی قانون کی پابندی کر رہی تھی لہذا اس کے یہ نتائج بھی اسی قانون کے تابع تصور ہونے چاہئیں۔

ان تمام مباحث سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ مخلوقات ذوی الاعضا کی ترقی قانون غیر ممکن التغیر کے عمل کی تابع ہے۔ خدا کی غیر مسلسل غیر مربوط اور مست ممکن مداخلت کا ماحصل نہیں ہے۔ ان مباحث سے ہمارے اس خیال کو بھی تقویت ہوتی ہے کہ بجائے تخلیق کے اس فصل کے جو ہفتہ صادر ہوا ہو ایک جسم ذوی الاعضا کی شکل کا مستیل ہو کر دوسری شکل اختیار کر لیتا بہت زیادہ قرن عقل ہے۔ تخلیق یا پیدائش کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شے دفعتاً خود بخود نمودار ہو جائے اور استحالہ سے مراد یہ ہے کہ ایک شکل جو پہلے سے موجود ہے بتدریج تغیر ہوتی ہوئی دوسری صورت اختیار کر لے۔

اس طور پر ہمارا ادراک مسئلہ ارتقا کی حقیقت عظیمہ سے دوچار ہوتا ہے۔ ہر وجود ذوی الاعضا حوادث کے سلسلہ سے مربوط و منوط ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس وجود کو دوسرے مظاہر آفرینش سے کوئی لگاؤ نہیں اور یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے سلسلہ علت و معلول سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اسے واجب الوجود تصور کرنا چاہئے۔ اس کا تعلق اس برتر از اعضا سلسلہ حوادث سے ہے جو زمانہ ماضی میں علی سبیل تدریج پیدا ہو کر زمانہ موجود تک پہنچا ہے اور سلسلہ مقدرات آئندہ کی تیاری کا سامان کر رہا ہے۔ اس وسیع زنجیر کے حلقوں کا انقباض کچھ کچھ وقفہ پر مبدل بحالت وسط ہو جاتا ہے۔ یعنی ارتقا کا اثر نمودار ہوتا ہے۔ لیکن ان تغیرات کے دوران میں وہ قوانین جن کی حدودی اس زنجیر کی تیاری کی ذمہ دار ہے مطلق نہیں بدلتے۔

اگر ہم حیوانات کی کسی جنس کے ظہور پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اس کا وجود تغیر و استحالہ کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ تخلیق کے ذریعہ سے مجدداً "نمودار نہیں ہوا۔ اس کی ابتدا بہ شکل ناقص ان دوسری اشکال کے درمیان ہوتی ہے جن کا دور حیات قریب الاختتام ہے اور جو معدوم ہونے کے قریب ہیں۔ اس کی متعدد نوعیں یکے بعد دیگرے بتدریج نمودار ہوتی ہیں اور ہر نوع پہلی نوع سے زیادہ کامل و مکمل ہوتی ہے یہاں تک کہ کئی قرون کے بعد وہ انتہائی اعلیٰ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہاں سے اسی تدریج اور آہستگی کے ساتھ زوال شروع ہوتا ہے تا آنکہ اپنی زندگی کی مدت ختم کر کے وہ بھی اپنے اسلاف کی طرح سراپردہ عدم میں چلی جاتی ہے۔

مثلاً "اگرچہ حیوانات ذات اللہ دور ٹاڈ دور ٹالٹہ الاخری سے مخصوص ہیں لیکن یہ جنس اپنی آمد آمد کا اعلان کئے بغیر اسی دور میں دفعتاً و خستہ ظاہر نہیں ہوتی۔ دور ثانیہ کے قرون بیدہ میں ہم اسے بشکل ناقص اس طور پر پاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ بالآخر یہ ترقی کرتے کرتے کامل شکل و تناسب الاخصا ہو گئی ہے۔

اسی طرح جنس ہوام الارض قرون ثانیہ کی حیاتی خصوصیات میں سے ہے۔ جس طرح ہم کسی بدلتے ہوئے طلسمی پردہ تصویر میں ایک منظر کی صورتوں کو دھندلا اور مدہم ہوتا ہوا اور ان دھندلی صورتوں میں سے ایک نئی صورت کو نمودار ہوتا ہوا دیکھتے ہیں بتدریج واضح و نمایاں ہو کر نہایت صاف نظر آنے لگتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ تحلیل ہو کر دوسرے مرقع کے لئے جگہ خالی کر دیتی ہے اسی طرح زمین پر رہنے والے حشرات الارض بشکل ناقص و موہوم نمودار ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ انتہائی شباب کو پہنچ کر انحطاط کے رستہ پر پڑ پڑتے ہیں۔ ان تغیرات میں ایک بھی ایسا نہیں جو فوری و ناگہانی ہو بلکہ یہ درجہ بدرجہ ایک دوسرے میں غیر محسوس طور پر ضم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

یہ نتائج وہ ہیں جو کسی طرح ٹل نہ سکتے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ گرم خون والے حیوان قرون اولیٰ کی اس ہوا میں زندگی بسر کر سکیں جس میں حموضہ القلم کا عنصر اس درجہ غالب تھا۔ لیکن درختوں کے پھول نے سورج کی شعاعوں کے ساتھ مل کر کیمیادی طریقہ پر اس زہریلے عنصر کو ہوا سے خارج کر دیا۔ حموضی جو ہر کوئلہ کی شکل میں زیر زمین دفن ہو گیا۔ آکسیجن کا عنصر اس سے علیحدہ ہو گیا اور اس طور پر حیوانات زندہ رہنے کے قابل ہو گئے۔ کہ ہوا میں جب یہ تبدیلی ہوئی تو سمندر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ حموضہ القلم کا

جو جزو اعظم اس میں ملا ہوا تھا وہ اس سے جدا ہو گیا اور چوڑے کا پتھر جو اب تک پانی میں غلول تھا رسوب بن کر ٹھوس ہو گیا۔ جس قدر کوئلہ طبقات زمین میں پیوند ہوا۔ اسی قدر کلس منعم غیر مقرر شکل حالت میں نہیں بلکہ اشکال ذوی الاعضا بن کر علیحدہ ہو گیا۔ آفتاب کی شعاعیں روز بروز اپنا عمل کرتی رہیں لیکن اس کام کے ختم ہونے کے لئے بے انتہا دنوں کی ضرورت تھی۔ کہ ہوا کا زہریلے اجزا کی آمیزش سے پاک و صاف ہونا قرنہا قرن کے مورد کا محتاج تھا۔ علیٰ ہذا القیاس سرد خون والے حیوانات کے دور کا گرم خون والے حیوانات کے دور میں فہم ہونا مدت ہائے دراز کے امتداد کا مستقنی تھا۔ لیکن یہ طبعی تغیرات ہپا بندی قانون عمل میں آتے رہے اور اجسام ذوی الاعضا کی تبدیل شکل ناگہانی یا خدا کے کسی بے ضابطہ فعل کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ ان تغیرات طبعی کا لازمی و لابد نتیجہ ہونے کے لحاظ سے ان کی طرح قانون کا حاصل تھی۔

اگر اس مضمون پر تفصیل سے نظر ڈالنی مقصود ہو تو ناظرین میری کتاب ”ٹریٹیز آن ہیومن فزیالوجی“ (علم حیات انسانی) کی دوسری جلد کے پہلے دوسرے اور ساتویں ابواب ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

غالباً اس سوال کا جواب اب آسانی سے دیا جاسکے گا کہ آیا انتظام عالم پایندہ و قانون ہے یا مداخلت ربانی کا تابع ہے جو سلسلہ علت و معلول کے سلسلہ کو توڑتی رہتی ہے۔ اس سوال کے ہر پہلو پر نظر غائر ڈالنے کے لئے ہم ایک ایسے نکتہ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو اگرچہ ایک لحاظ سے تو بے حقیقت محض ہے لیکن ایک اعتبار سے نہایت اہم اور معنی خیز بھی ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ آیا انسانی جماعتوں کی تاریخی زندگی قضا و قدر کی نہ ٹلنے والی منزل میں ارتقاء سابق التحین کی علامات ظاہر کر رہی ہے۔ آیا کوئی شہادت اس واقعہ کی موجود ہے کہ اقوام کی زندگی قانون غیر متغیر کی تابع ہے اور آیا یہ خیال صحیح ہے کہ جماعت انسانی میں افراد انسانی کی طرح اجزا عدم میں سے دفعت پیدا نہیں ہو جاتے بلکہ ان اجزا کے تدریجی ارتقاء سے پیدا ہوتے ہیں جو پہلے سے بیکل ناقص موجود تھے؟

مسئلہ ارتقاء کا مفہوم جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ کہ زمین پر زندگی کے نمودار ہونے کے وقت سے لے کر اس وقت تک اشکال ذوی الاعضا کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے۔ جس کے اجزا نے مدارج نشوونما منزل بمنزل طے کئے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس مسئلہ کو قابل اعتراض یا قابل تحقیر خیال کرے تو اسے غور کرنا چاہئے کہ جن تبدیلیوں میں اسے کلام ہے ان کی مرحلہ پیمائی وہ خود کر چکا ہے۔ نو مہینے تک جب کہ وہ ماں کے

پیٹ میں تھا اس کی زندگی کی نوعیت آبی تھی اور اس زمانہ میں اس نے درجہ بدرجہ بہت سی متمایز مگر مناسب شکلیں بدلیں۔ جب وہ پیدا ہوا تو اس کی زندگی آبی سے ہوئی ہو گئی وہ ہوا میں سانس لینے لگا۔ نئی قسم کی غذا اسے دی جانے لگی۔ اس کی پرورش کا طریقہ بدل گیا لیکن ابھی نہ وہ کچھ دیکھ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا نہ پہچان سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے ہوش و حواس کی نعمت عطا ہوئی۔ اسے معلوم ہونے لگا کہ ایک بیرونی و خارجی دنیا بھی موجود ہے۔ وقت مقرر پر اس کے اعضا تبدیل غذا کے خوگر ہو چلے۔ دانت نکل آئے اور خوراک بدل گئی۔ شیرخوارگی کے زمانہ کے بعد طفولیت کا دور آیا اور عمدہ طفولیت تبدیل بہ عالم شباب ہو گیا۔ اس کا جسم نشوونما پاتا گیا اور ہاتھ ساتھ ساتھ قوائے عقلی بھی ترقی کرتے گئے۔ جب اس کی عمر ۱۵ سال کے قریب پہنچی تو بوجہ اس ترقی کے جو اس کے جسم کے خاص خاص اعضا نے کی تھی اس کی اخلاقی سیرت میں تغیر پیدا ہو گیا۔ نئے جذبے نئے خیالات اور نئی انگلیں اس پر اپنا اثر ڈالنے لگیں۔ اس بات کا ثبوت کہ ان اعضا کا ارتقا ان جذبات کے ظہور کا باعث تھا فن تشریح ابدان کی موشگافیوں سے بہم پہنچتا ہے اور یہ ترقی یا تبدیلی ہمیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جسم کو مستحاضے بلوغ اور دماغ کو مستحاضے کمال پر پہنچنے کے لئے کئی سال کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخر کار ریعان بلوغ کی حد آ پہنچتی ہے اور اس کے بعد انحطاط کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہمیں اس دور کے خست ناک نگارے یعنی قوائے جسمانی و ذہنی کے ضعف کی تصویر کھینچنے کی ضرورت نہیں۔ شاید یہ قہل مہانے کی آمیزش سے پاک ہے کہ ہر انسان جو روئے زمین پر موجود ہے ایک صدی سے بھی کم مدت میں ان تمام منازل کو طے کر لیتا ہے بشرطیکہ اس کا خاتمہ قبل از وقت نہ ہو چکا ہو۔

کیا زندگی کی ان تمام منازل کے طے کرنے میں ہر شخص کو قدم قدم پر مداخلت ربانی کا سارا ڈھونڈنا پڑتا ہے یا بجائے اس کے یہ عقیدہ زیادہ تر قرین عقل ہو گا کہ وہ بے شمار نفوس انسانی جو روئے زمین پر آباد رہ چکے ہیں ایک غیر حفر و ہمہ گیر قانون کے تابع رہے ہیں۔

لیکن افراد اقوام کے اجزائے عنصری ہیں ان کا تعلق اقوام سے وہی ہے جو اجزائے جسمانی کو جسم کے ساتھ ہے۔ جسم کے اجزائے ترکیبی نظام جسمانی میں داخل ہو کر اپنا کار منوفہ انجام دیتے ہیں اور جب یہ کام ختم ہو چکتا ہے تو وہ فنا ہو جاتے ہیں اور جسم سے خارج کر دیے جاتے ہیں۔

فرد کی طرح قوم بھی میراچے علم کے وجود میں آتی ہے اور اس کی موت میں بھی

اس کی مرضی یا خواہش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قوی و انفرادی زندگی میں بجز اس کے اور کوئی فرق نہیں ہے کہ قوم کی عمر بمقابلہ فرد کی عمر کے ذرا زیادہ ہوتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم اپنی ساعت موقت سے ایک لمحہ بھی زیادہ زندہ رہے۔ ہر قوم کی زندگی پر اگر نظر غائر ڈالی جائے گی تو معلوم ہو گا کہ اگر اس کو زندگی کے کل مدارج طے کرنے کا موقع ملا ہے تو بچپن۔ جوانی۔ بڑھاپے جیسی منزلوں میں سے گزرنا پڑا ہے۔

افراد و اقوام دونوں کی زندگی میں بشرطیکہ زندگی کی مختلف منازل طے کی گئی ہوں۔ خاص خاص خصوصیات بطور قدر مشترک پائی جاتی ہیں اور چونکہ افراد کی حالت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی زندگی حکومت قانون کی تابع ہے لہذا یہ استدلال غیر حق بجانب نہیں ہے کہ اقوام کی رفتار ترقی جگہ کل بنی نوع انسان کا ارتقا بخت و اتفاق سے متاثر نہیں ہوتا اور فوق العادت دست اندازیاں تاریخی واقعات کے شیرازہ کو پرانہ نہیں کرتیں بلکہ ہر تاریخی واقعہ کسی واقعہ ماضی کا معلول ہے اور ان واقعات کے لئے جو ظہور میں آنے والے ہیں بمنزلہ علت ہے۔

لیکن یہ نتیجہ مذہب جبریت یعنی اس یونانی فلسفہ کا اصل اصول ہے جس کی نسبت ہم ایک مقام پر بیان کر آئے ہیں کہ مصیبت کے وقت جب انسان کا بجز بیکسی کے اور کوئی یا رو مددگار نہیں ہوتا یہ فلسفہ اس کے لئے سرمایہ تسلی و تسکین ثابت ہوا اور نہ صرف مشاہیر یونان بلکہ رومنہ الکبریٰ کے جلیل القدر مدبروں پہ سالاروں اور فرماں رواؤں کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتا رہا۔ اس فلسفہ نے بخت و اتفاق کے عنصر کو ہر شے سے خارج کر دیا تھا اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ تمام واقعات کو جو جبر و قدر کے لزوم لایہ کے تابع ہیں خیر کامل کی تکمیل کا ذریعہ قرار دینا چاہئے اس لحاظ سے یہ فلسفہ گویا صدق و غلو صحت مناحت و متعسف، نیکی و پاک بازی کی تعلیم دیتا تھا اور بنی نوع انسان کو یہ سکھاتا تھا کہ عقل و تدبیر سے کام لیں۔ ایشیکو کے اس قول سے شاید ہمیں بارائے اختلاف نہ ہو گا کہ جبریتیں یعنی پروان حکیم ربو کی تیاری نسل انسانی کے حق میں ایک بہت بڑی آفت تھی اس لئے کہ یہی وہ لوگ تھے جن میں سے اکابر و مشاہیر پیدا ہوئے۔

لاٹینی مصیبت اپنے پاپائے شکل میں اس اصول کی قطعی مخالف ہے کہ انتظام عالم بذریعہ قانون چل رہا ہے۔ کلیسائے عیسوی کی اس شاخ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معجزوں اور فوق القدرت تصرفات کا ایک اچھا خاصہ روزنامہ پیش نظر ہو جائے گا۔ اس روزنامہ کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ مقدس بزرگوں کی التجاؤں نے بے اوقات نظام قدرت کو

(بشرطیکہ ایسا کوئی نظام حقیقت میں موجود ہو بھی) درہم و برہم کر دیا ہے۔ مورتوں اور تصویروں نے عجیب و غریب کوشے دکھائے ہیں اور ہڈیاں بال اور دوسرے حرکات کرامتوں کے ظہور میں آنے کا باعث ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر اشیا کی حقیقت و صداقت کا معیار ان کی غیر ممکن التزید تاریخی اصلیت نہیں ہے بلکہ ان کی معجزہ نمائی اور کرامت آفرینی ہے۔ ایسی منطق کے نرالے ہونے میں کے کلام ہو سکتا ہے جو ایک ادعا کا ثبوت کسی دوسرے واقعہ غیر متعلق کی ناقابل فہم شہادت سے دے؟

دور جاہلیت کے تاریک ترین زمانہ میں بھی حقیقت شناس اور معقولیت پسند مسیحیوں کو ان ربانی تصرفات اور کراماتی دست اندازیوں کے صحیح ہونے میں ضرور شبہ ہوا ہو گا۔ یہ نظام قدرت کے باقاعدہ ارتقا میں عظمت و جبروت کی ایک ایسی شان نظر آتی ہے کہ ہم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ہماری انفرادی زندگی کے واقعات میں اس بلا کا تسلسل پایا جاتا ہے کہ ہم کو دوسروں کی زندگی میں خوارق عادات یعنی اس تسلسل کے انقطاع کا عمل میں آنا بے باور نہیں آتا۔ ہر سمجھدار آدمی اچھی طرح جانتا ہے کہ قدرت نے اس کی ذات کے لئے اپنی روش کبھی نہیں بدلی۔ اس کے لئے کبھی کوئی معجزہ ظہور میں نہیں آیا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر واقعہ کو کسی واقعہ ماضی سے منوط و مربوط پاتا ہے اور اس کو علت اور اسے معلول قرار دیتا ہے۔ جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کے فلاں ہم جنس کی خاطر سنت اللہ تبدیل ہو گئی قانون قدرت بدل گیا اور فلاں فوق القدرت واقعہ معجزے کے طور پر ظاہر ہوا تو لامحالہ اسے یہی سمجھنا پڑتا ہے کہ وہ ہمجنس یا تو خود فریب حوزہ ہے یا دوسروں کو فریب دے رہا ہے۔

غرض جب اصلاح کثیر کا زمانہ آیا تو نشانات آسمانی کے بارے میں رومن کیتھولک عیسائیوں کے عقیدے کو سخت صدمہ پہنچا۔ بعض بڑے بڑے متاہلین اور نیز پرائسٹٹ کلیسا مسئلہ جبر و قدر کے قائل ہو گئے۔ کیلون زینو کا ہمنفر ہو کر کہتا ہے کہ ہم ازل کے روز سے جب کہ ابھی عالم کا نام و نشان بھی نہ تھا پابند تضاد و قدر کئے گئے ہیں۔ اس پابندی میں ہماری رضامندی کو کوئی دخل نہیں بلکہ کارفرمائے قدر نے اپنے مقاصد کی تکمیل کو پیش نظر رکھ کر ہمیں جیسا چاہا بنا دیا۔ کیلون کا یہ دعویٰ اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ جو واقعات گزرتے ہیں وہ ازل سے مقدر ہو چکے ہیں۔ اس طور پر کئی صدیوں کے گزرنے کے بعد دوسری صدی کے مسیحی فرقوں یعنی فرقہ مسیحیون و ویسٹمنسٹن کے خیالات پھر نمایاں ہونے لگے اور یہ وہی فرقے تھے جن کے اوریت آئیز عقائد نے مسیحیت کی شاخ میں مسئلہ تثلیث کا

پیوند لگا دیا تھا۔ ان فرقوں کا یہ دعویٰ تھا کہ انسان سے تمام افعال بر سبیل اضطراب سرزد ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایمان بھی ایک وہی نعمت ہے جس سے انسان کو مجبوراً "مستفیض ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے انسان کی زندگی کا اخلاقی پہلو گو کیسا ہی قلیل اعتراض کیوں نہ ہو لیکن اس کی نجات کے لئے لازمی ہے کہ ایمان میں خلل نہ آنے پائے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ خدائے بزرگ و برتری تمام اشیا کا مصدر و محرز ہے۔ اس طرح وہ خیالات رواج پا گئے جن کو سینٹ آگسٹائن نے اپنی تصانیف میں بوضاحت درج کیا ہے۔ یعنی خدا نے اپنی فوق القانون مشیت سے بعض اشخاص کی قسمت میں بلا لحاظ ان کے ایمان یا اعمال صالح کے راحت ابدی لکھ دی ہے۔ اور اسی طرح بعض دوسرے اشخاص کو جتلائے عذاب مغلہ کر دیا ہے۔ پیروان مسئلہ تاخر تقدیر ہیوط کا یہ عقیدہ تھا کہ ہیوط آدم مشیت ایزدی کے اقتضا کے تابع تھی۔ یعنی حضرت آدم خدا کی اجازت سے جتلائے معصیت ہوتے اور پیروان مسئلہ تقدیم تقدیر ہیوط یہ مانتے تھے کہ ہیوط اپنے ملک نتائج سمیت ازل سے مقدر ہو چکا تھا اور ہمارے آبائے اولین شروع ہی سے کوئی اختیار نہ رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے اس جماعت کا عقیدہ سینٹ آگسٹائن کے اس قول کے خلاف تھا کہ :

”یہ کتنا گناہ ہے کہ بجز حسنت کے خدا کسی اور امر کو بھی مقدمات میں داخل کرتا ہے۔“

پس کیا یہ خیال صحیح ہے کہ نجات ابدی خدا کے ان مقدرات میں سے ہے جن کے ذریعہ سے قبل ازانکہ بنیاد عالم رکھی گئی اس نے اپنی پوشیدہ مصلحت کو اس غرض کی تکمیل کے لئے وقف کر دیا کہ بنی نوع انسان کے ایک منتخب اور برگزیدہ طبقہ کو لعنت و عذاب مخلد سے نجات دلائی جائے؟ کیا یہ سچ ہے کہ جماعت انسانی میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہیں قادر مطلق نے بلاوجہ بے تصور غیر منتہی مصیبت اور غیر مختتم عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟

۱۵۹۵ء میں عقائد عیسوی کی توضیح کے لئے جو تحریر بمقام لمبتہ (واقع انگلستان) قلمبند کی گئی اس میں یہ فقرہ درج ہے کہ ”خدا نے بعض انسانوں کو ازل ہی سے سعید بنایا ہے اور بعض کو شقی قرار دیا ہے۔“ ۱۶۱۸ء میں اس مسیحی کونسل نے جو بمقام ڈارٹ منعقد ہوئی تھی اس عقیدے کی تائید کرتے ہوئے اس کے مخالفین کو طعون قرار دیا اور ان کے ساتھ ایسی سختی کا برتاؤ کیا کہ بہت سے لوگوں کو ممالک غیر میں جا کر پناہ لینی پڑی۔ کلیسائے انگلستان نے بھی جیسا کہ اس کے دستور العمل عقائد کے سرہوین فقرہ سے پایا جاتا ہے اس عقیدہ کی حمایت کی۔

رومن کیتھولک عیسائیوں نے پرائسٹوں پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا ہے کہ انہوں نے انتظام عالم میں قانون کی مداخلت کو ایک حد تک تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن ان جملے پھپھولوں کے پھوڑنے سے کیا نتیجہ نکل سکتا تھا۔ یورپ میں جہاں جہاں پرائسٹ مذہب نے رواج پایا مجبورے اور کراہتیں صادر ہوئی یک قلم موقوف ہو گئیں۔ اس موقوفی سے اس بہت بڑے مالی منافع کا بھی خاتمہ ہو گیا جو کلیسا کو خاندانوں اور تہذیب کی مسیحائی سے حاصل ہوا کرتا تھا۔ تذکرات انفران جو اصلاح کینہ کے محرک تھے بکتے بند ہو گئے اور ان پروانوں کی تجارت جس کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ پادریوں کی خدمت میں ایک رقم مقررہ کے پیش کرنے پر خدا کی طرف سے کیلے بندوں گناہ کرنے کی اجازت مل جائے ماند پڑ گئی۔

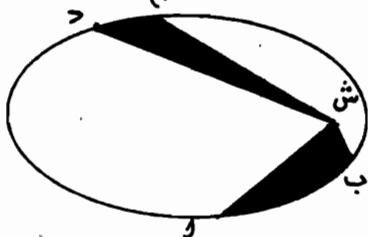
اصلاح کینہ کا فلسفیانہ مفہوم اس رومن کیتھولک عقیدے کے ابطال پر متعین تھا کہ خدا قیسی شفاعت کی تحریک پر معاملات انسانی میں مسلسل دست اندازی کرتا رہتا ہے لیکن اس ابطال میں سب کے سب اصلاح یافتہ کلیساؤں نے خاطر خواہ حصہ نہیں لیا۔ سائنس نے گزشتہ چند سال سے شہادت کا جو انبار اس مسئلہ کے متعلق جمع کرنا شروع کیا ہے کہ انتظام کائنات تابع قانون ہے۔ اسے ان میں سے اکثر کلیساؤں نے ایشناہ بلکہ عدم استحسان کی نظر سے دیکھا ہے لیکن شہادت کا وزن روز بروز بڑھتا چلا جاتا رہا ہے اور اس لئے ضرور ہے کہ اس ٹھنک و ناپسندیدگی کا ایک نہ ایک دن خاتمہ ہو جائے۔

جب حالت یہ ہے تو بجز اس کے چارہ نہیں کہ کشیش کے ہمسفر ہو کر سیرو کے اس قول کو اپنا اصول موضوعہ قرار دیں کہ ایک ابدی و غیر متغیر قانون تمام اشیاء اور تمام زاتوں پر حاوی ہے۔

لے اگر دو سوئوں کو ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ پر ایک دھن میں گاڑ کر ان میں تارے کا ایک گرہ زدہ حلقہ ڈالا جائے اور پنل کی نوک سے تارے کو تان کر تارے کے ساتھ ساتھ نوک کو حرکت دی جائے تو جو بیضہ نما شکل پیدا ہو گی وہ شکل اہلیلی کلائے گی۔ دونوں سوئیاں اس شکل کے دو مرکز ہوں گے۔ سوئوں میں جس قدر زیادہ فاصلہ ہو گا اسی قدر اس شکل کی اہلیلیت زیادہ ہو گی اور جس قدر کم فاصلہ ہو گا اسی قدر یہ شکل دائرہ کے قریب ہو گی تا آنکہ اگر دونوں سوئوں کو ملا دیا جائے اور پھر ڈوری تان کر پنل کی نوک سے حلقہ کھینچا جائے تو بجائے شکل اہلیلی کے کمال دائرہ پیدا ہو جائے گا۔ مترجم

لے سر رابرٹ بال نے اپنی کتب ”دی اسٹوری آف دی ہیونس“ (داستان اٹلاک) میں اس

قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ”ہر سیارہ آفتاب کے گرد ہر نقطہ پر جس رفتار کے ساتھ گھومتا ہے اس کی سرعت اس قدر ہوتی ہے کہ اگر اس نقطہ سے بجانب آفتاب ایک خط کھینچا جائے تو وہ خط مساوی رقبوں کو مساوی زمانوں میں طے کرے گا۔“



مثلاً اگر شکل ذیل میں اب ش اور ج و ش کا رقبہ مساوی ہو تو جو سیارہ یہ شکل اپنی بنانا ہوا آفتاب کے گرد گھومے گا وہ اب کو بلوغت تک اس کا فاصلہ ج د سے زیادہ ہے ایک ہی وقت میں طے کرے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ اب کا موقع ج د کے مقابلہ میں ش یعنی شمس سے زیادہ قریب ہے اور از روئے اصول حرکت سیارہ اس منطقہ میں پہنچنے ہی بوجہ قرب آفتاب زیادہ سریع السیر ہو جاتا ہے لیکن منطقہ ج د چونکہ آفتاب سے نسبت زیادہ دور ہے لہذا یہاں سیارہ کی رفتار اسی نسبت سے سست پڑ جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقت مرور مساوی ہو جاتا ہے۔ حیرت منگنے والے چوں کہ سیاروں کی حرکت کامل الاستدوار نہیں ہے بلکہ اپنی شکل ہے لہذا گردش کی حالت میں ہر سیارہ کا فاصلہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے لیکن بلوغت اس تبدیلی کے ہم اس فاصلہ کا تعین اس کا اوسط نکل کر کر سکتے ہیں جس کی سب سے زیادہ آسان شکل یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ فاصلہ کو کم سے کم فاصلہ کے ساتھ جمع کر کے اس کا نصف لے لیا جائے۔ یہ نصف مقدار اوسط فاصلہ کہلائے گی۔ کپلر اچھی طرح جانتا تھا کہ مختلف سیاروں کا زمانہ گردش مختلف ہوتا ہے اور اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اوسط فاصلہ جس قدر زیادہ ہو گا اسی قدر زمانہ گردش بڑھا ہوا ہو گا۔ اس علم کی بنا پر اس نے دونوں کی باہمی نسبت دریافت کرنی چاہی۔ حساب لگانے سے اسے معلوم ہوا کہ زمانہ گردش اوسط فاصلہ سے برابر کی نسبت نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے کہ اگر یہ نسبت صحیح سمجھی جائے تو جس سیارہ کا اوسط فاصلہ دوسرے سیارہ کے اوسط فاصلہ سے دگنا ہو گا اس کا زمانہ گردش بھی دوسرے سیارہ کے زمانہ گردش سے دگنا ماننا چاہئے۔ حالانکہ مشاہدہ اس کی نفی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ بعد سیاروں کا زمانہ قریب سیاروں کے زمانہ کے مقابلہ میں دگنے سے زیادہ اور بچنے کے قریب ہے۔ کپلر نے اپنی فوق العادت ہندسہ سائنہ قابلیت سے اس محنت کے بعد جو کسی معمولی دماغ کے انسان کو دیوانہ بنا دیتی آخر میں صحیح نسبت دریافت کر لی جو اس کے تیسرے قانون میں مضمر ہے۔

سر رابرٹ ہل اس قانون کی شرح اس طرح کرتے ہیں: ”مثلاً کے طور پر ہم کہ زمین اور سیارہ زہرہ کا مقابلہ کریں گے۔ اگر آفتاب سے زمین کا اوسط فاصلہ اکائی فرض کیا جائے تو سیارہ

زہرہ کا اوسط فاصلہ ۶۷۳۳ ہو گا۔ اگر کسور اعشاریہ کو پہلی کسر کے بعد حذف کر دیا جائے تو زمین کا زمانہ گردش ۳۶۵ دن اور زہرہ کا ۲۲۴ دن قرار پاتا ہے۔ کپل کا قانون کہتا ہے کہ ۳۶۵ دن کا مربع ۲۲۴ دن کے مربع سے وہی نسبت رکھتا ہے جو ایک کو ۶۷۳۳ کے کعب سے ہے۔ اس نسبت کی تصدیق ضرب کے عمل کے ذریعہ سے ہسانی کی جاسکتی ہے۔” مترجم

لکھ سح زمین پر جو اجسام اوپر سے نیچے کی طرف گرتے ہیں ان کی سرعت رفتار سولہ فٹ فی ثانیہ ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر مرکز زمین سے چار ہزار میل کے فاصلہ پر ایک جسم سولہ فٹ فی ثانیہ کی سرعت رفتار سے اس کی طرف کھینچتا ہے۔ سح زمین سے اگر یہ جسم چار ہزار میل یعنی مرکز زمین سے آٹھ ہزار میل کے فاصلہ پر ہو تو چونکہ مرکز زمین سے اس کا فاصلہ بمقابلہ سح زمین دگنا ہے لہذا از روئے قانون کشش ثقل قوت کشش ثقل فاصلہ کی نسبت معکوس سے گھٹ جائے گی یعنی ایک چوتھائی رہ جائے گی۔ بالفاظ دیگر ایک ثانیہ میں وہ جسم صرف ہندو چار فٹ کے گرے گا۔ مترجم

لہ سرویم ہرشل سے مراد وہ شخص ہے جو ایک مشہور و معروف ہیئت دان تھا اور ۱۷۳۸ء میں بمقام ہینور پیدا ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں ہرشل انگلستان گیا اور وہیں بودباش اختیار کر لی۔ مروجہ دور میں چونکہ بہت چھوٹی تھیں جن سے اس کا شوق رصد بینی پورا نہ ہوتا تھا لہذا اس نے خود ایک بہت بڑی دوربین بنائی شروع کی جس میں اسے کامیابی ہوئی اور اس کی مدد سے اس نے نظام شمسی کا وہ سیارہ دریافت کیا جو یورینس کے نام سے مشہور ہے۔ شاہ جارج ثالث نے اس کی نمایاں علمی خدمات کے صلہ میں اس کا وظیفہ مقرر کیا اور خطاب سے بھی سرفراز کیا اس کا انتقال ۱۸۲۲ء میں ہوا۔ مترجم

لہ سرویم کا بیٹا سر جان فریڈرک ولیم ہرشل ایک نامور باپ کا نامور بیٹا ہے۔ ۱۷۹۳ء میں پیدا ہوا۔ فن ہیئت میں اس کی دقت نظر اور مسلسل اور ان تھک محنت نے بہت کچھ معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ باپ بیٹے ہر اشلہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ہرشل ثانی کا انتقال ۱۸۷۱ء میں ہوا۔ مترجم

کے خدائے قدیر تو شاید خارج ہو جائے مگر اس کا بنایا ہوا ضابطہ یعنی وہ قانون جس کا مفہوم لن نجد لسنہ اللہ تبدیلا میں مضمر ہے خارج نہیں ہو سکتا۔ لیکن بات ایک ہی ہے۔ ہم مقنن کے قائل ہیں۔ آپ قانون کے ہم ذات کا اعتراف کرتے ہیں آپ صفات کا۔ ہم خدا کو مانتے ہیں۔ آپ مہرہ اور حرکت کو۔

چلو بس ہو چکا جھگڑا نہ تم خالی نہ ہم خالی

مترجم

۱۰۰ انہی خیالات کو ہم نے نظم کا لباس پہنایا ہے۔ یہ نظم جس کا انداز بیان فلسفیانہ تخیل کے نقل کی ایک مد تک طائی کرتا ہے۔ حضرات ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے جو خشک فلسفہ پڑھتے

پڑھتے اکتا گئے ہوں گے یہاں درج کی جاتی ہے۔

اول اول جب نہ تھا کچھ بھی بجز ذات خدا
ماوے کے منفصل اجزا تھے مانند غبار
سرکھت جاتا ہے وادی قدم میں جب کہ وہم
اس جگہ اس مسئلہ پر ہم نہیں کرتے ہیں بحث
ہم فقط اتنا کہیں گے قرن گزرے بے شمار
پہلے جو کچھ منفصل تھا ہو گیا اب متصل
کھا کے ذروں نے تصاد مہائے عظیم سے رگڑ
کچھ تو سیارے بنے اور کچھ ثابت بن گئے
اس طرح بچھ نظام شمس قائم ہو گئے
اپنے محور پر ہوئے سرگرم گردش آفتاب
جس مکاں کے ہم کہیں ہیں یہ بھی اک سیارہ ہے
کھن قدرت کا اک چھوٹا سا آتش پارہ ہے

معروض ہستی میں جب آیا ہمارا آفتاب
حرقتِ تنویر کا گویا کدوؤں میل میں
جرم تھا اب کی طرح اس کا سرپا آشین
گرد و پیش اس کے نہ تھی آراستہ انجم کی بزم
یکہ و تما وہ رانیض تھا خلا کے صحن میں
مدتیں اس نے گزاریں عالم تجرید میں
جس طرح ہوتا ہے کوہ آتش افشان مشتعل
پہلجری کے منہ سے جیسے نور کے جھرتے ہیں
پھول

نور تھا اس کی روا اس کی قبا تھا اشلاب
روئے دریائے فضا پر تھرتا تھا اکہ حباب
کود کی بھی تھی وہی اس کی جو ہے اس کا شاب
تھی عید اس کی ظاہر تھا بے انتہا و بے حجاب
ایک بھی کوکب نہ تھا اس وقت اس کا مرکب
اپنی تھلی پہ صدیوں اس نے کھلیا بیج و تاب
جوش میں رہ رہ کے آیا آخر اک دن آفتاب
کچھ ستارے ٹوٹ کر اس سے گرے شل شباب
ان میں اور اس میں ہوا قائم تجلوب کا حباب
کر لئے پیدا انہوں نے اپنے اپنے ماہتاب

آٹھ سیارے یہی ہیں جو توابع اس کے ہیں
دیکھ کر اپنی ولادت کے طریقے کو یونہی

کہتے ہیں جس کو نظام شمس انور ہے یہی

وہم جس کا محل میں لاتا ہے چکر ہے یہی

جب زمین آ کر ہوئی صحنِ خلا میں جلوہ گر
خل بھی کدوی تھی اس کی اپنے مصدر کی طرح
متصل تنخیر سے لیکن بہ امضائے زمان
رفتہ رفتہ ہو چلا زائل حرارت کا اثر
خاصیت خورشید کی اس میں عیاں تھی سربر
جرم بھی تھا خل خورشید اس کا موجِ شر
رفتہ رفتہ ہو چلا زائل حرارت کا اثر

آتشیں حالت مبدل ہو گئی سیال سے
پھر بتدریج انحداد اپنا عمل کرنے لگا
سنگ خارا کی زمین نے ایک چادر اوڑھ لی
جانبجا لیکن بلندی اور پستی چھا گئی
تھیں یہ ٹاہواریاں اس سطح ٹھیں پر جہاں
بن گئے کسار اور میدان بلندی تھے جہاں
اک گھٹا ٹوپ انجروں کا چھا رہا تھا ہر طرف
اتحاد مود ابو و
موج آب شور لپی

ہو چکا جس وقت کال یہ موادا وطن
وقت آ پہنچا کہ ہو سرسبز باغ روزگار
خامہ ابداع مناع ازل ظاہر کرے
رہ گیا باقی تھا پڑنا سب فقط اک جان کا
زندگی اک راز ہے اور راز داراک راز خود
ہیں مظاہر جس کے بیش کے لئے عین القیاس
اس چھپی قوت سے ظاہر الہ دنیا کو کیا
مردم و مای و مورد سبزہ و آب و حجر

چلین

اپنی حکمت سے بنائے بے حساب اس نے جہاں
اپنی قدرت کے دکھائے لاجواب اس نے نشان
مترجم

۱۰ اسی خیال کو شاعر نے کس خوبصورت سے ادا کیا ہے

ہنگامہ گرم ہستی ٹاپا نادر کا
چشمک ہے برق کی کہ جسم شرار کا
مترجم

۱۱ "مٹنے" جب خاک میں بیٹے کو آئے سوپ کر

کھڑے کھڑے تھا کلیجہ پارہ پارہ تھا جگر

کتنی تھی شان رسالت ہے یہ وقت مبروشکر
تھے صحابہ بھی شریک اس غم میں پیغمبر کے ساتھ
اتفاقاً "آفتاب اس دن گمن میں آ گیا
گرچہ تھا دل کا تقاضا روئے جی کھول کر
سب کے دل اس صدمہ جانکاہ سے تھے پراثر
نظمستان بن گیا جس سے مدینہ سرسبز

370

اک صحابی نے کہا فرط عقیدت سے کہ آج سوگوار اس غم میں سے سورج بھی یا خیر ابتر
جو جواب اس بات کا اس کو پیہر نے دیا اب نہ سے مستعش ہے صفحہ تاریخ پر
کیا تعلق آدمی کے غم سے سورج کو بھلا اک نشان قدرت حق ہے کسوف اے بے خبر
مترجم

دسواں باب

لاٹینی مسیحیت اور تمدن جدید کا تعلق

ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ تک لاٹینی مسیحیت نے یورپ کے عقل و ادراک پر قبضہ کئے رکھا جس کے نتائج کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔

ان نتائج نے جو شکل اختیار کی وہ اصلاح کینسہ کے وقت شہر روما کی حالت اور خانگی و عمرانی زندگی میں یورپ کی حالت سے ظاہر ہوتی ہے۔ اقوام یورپ کے کندھوں پر دہری حکومت کا جوا رکھا ہوا تھا یعنی ایک طرف انہیں حکام دنیوی کی متابعت کرنی پڑتی تھی دوسری طرف حکام دینی کی۔ اہل یورپ جمالت ادہام پرستی اور تکالیف مدنیہ میں مبتلا تھے۔ رومن کیتھولک مذہب کی ناکامیابی کی وجہ۔ پاپائیت کی سیاسی تاریخ۔ دینی و روحانی حکومت سے ترقی کر کے یہ مطلق العنان مخصی حکومت کی شکل میں بدل گئی۔ کرویٹالوں کی انجمن اور کیوریا کی کارروائی۔ پاپائے خزانہ کے لئے بیش قرار محاصل کی ضرورت بد اخلاقی کی محرک ہوتی ہے۔

جو فائدے یورپ کو کیتھولک عہد حکومت میں پہنچے ان میں حکومت کے فشا کو کچھ دخل نہ تھا بلکہ وہ محض اتفاقی یا ضمنی تھے۔ عام نتیجہ یہ ہے کہ پاپائیت کا سیاسی اثر موجودہ زمانہ کے تمدن کے حق میں مضر تھا۔

لاٹینی مسیحیت جو تھی سے لے کر سولہویں صدی تک یورپ کی مادی اخلاقی اور عقلی حالت کی ذمہ دار ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس فرض سے یہ کس طرح عہدہ برآ ہوئی۔

موجودہ بحث کی اغراض کے لحاظ سے ہم جو کچھ لکھیں گے صرف یورپ ہی کے متعلق لکھیں گے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پاپائیت کا یہ دعویٰ کہ اسے الوہیت کے ساتھ ایک نسبت قریبہ ہے اور ساری دنیا کو اس کی اطاعت کرنی چاہئے اسے کل بنی نوع انسان کی حالت کا

جواب وہ ٹھہراتا ہے۔ جنوبی و مشرقی ایشیا کے عظیم الشان اور قدیم مذاہب کے مقابلہ میں اس کے اثر کا فقدان ایک اہم اور نکتہ خیز بحث پیدا کرتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اس کا اثر وہیں تک پہنچا جہاں رومہ الکبریٰ کا شمنشاہانہ اقتدار نافذ تھا لیکن اس سیاسی نتیجہ کو وہ ازراہ غایت استحقار رد کر دیتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاح کینہ کے آغاز پر بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس وقت کی تہنی حالت کو زمانہ قدیم کی حالت سے مقابلہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ نہ تو یورپ کے اخلاق میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ نہ لحاظ عقل و ادراک اس نے کوئی ترقی کی ہے اور نہ لوگوں کی حالت میں کوئی اصلاح ہوئی ہے۔ خود رومہ الکبریٰ کی عظمت و شوکت صفحہ تمدن سے محو ہو گئی تھی۔ سنگ مرمر کی وہ سڑکیں جن پر قیصر آگسٹس کو ایک زمانہ میں ناز تھا نابود ہو چکی تھیں۔ اجڑے ہوئے ہیکل۔ ٹوٹے ہوئے مینار کھنڈروں سے پٹے ہوئے کینیا کی عظیم الشان انہوں کی طویل مسافت محرابیں۔ حسرت ناک ویرانی کا مرقع نگاہ کے سامنے پیش کرتی تھیں۔ کپہیل کا برج مشید جس پہاڑی پر واقع تھا اس کا نام اب کوہ گوسفند ہو گیا تھا اس لئے کہ یہاں بکریوں کے گلے رکھے جاتے تھے۔ جس مقام پر فورم کی وہ عالیشان عمارت قائم تھی جہاں روما کے آئین و قوانین وضع ہو کر دنیا میں نافذ ہوئے تھے اسے اب احاطہ گاؤں کہتے تھے اس لئے کہ یہاں گاؤں بندھتی تھیں۔ قیصر کا پر کلف محل مٹی کے ڈھیروں میں چھپ گیا تھا جن پر جھاڑ جھکار اگ آئے تھے۔ کراکلا کے حمام اپنے جلوخانوں جتنوں اور حوضوں سمیت خزانہ آب کے برباد ہو جانے کے باعث جس سے انہیں پانی پہنچا کرتا تھا مدت کے ویران ہو چکے تھے۔ اس عظیم الشان عمارت کے کھنڈروں میں بلند محرابوں اور وسیع چوتروں پر پھولدار بیلین اور خوشبودار جھاڑیاں ہر طرف اگی ہوئی تھیں۔ رومہ الکبریٰ کی ویران عمارتوں میں سب سے زیادہ عظیم الشان عمارت یعنی کاٹیرنم کا صرف ایک تہائی حصہ باقی رہ گیا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ اس میں نوے ہزار تماشاہوں کی نشست کی گنجائش تھی لیکن انقلاب روزگار نے ازمند و سطلی میں اسے قلعہ بنا دیا اور اس کے بعد روما کے ناخلف و نالائق فرمانرواؤں نے اس کی دیواریں توڑ توڑ کر اپنے محلوں کے لئے پتھر کی سلوں کا ذخیرہ فراہم کیا۔ پاپایان روما میں سے بعض نے اس میں پشینہ بانی اور شورہ سازی کے کارخانے قائم کئے اور بعض نے یہ تجویز کی کہ اس کے عالیشان چھتوں اور کمانچوں میں بیوپاروں کی دکانیں لگائی جائیں۔ وہ لوہے کے قبضے جن سے اس کے پتھر جڑے ہوئے تھے چوری جا چکے تھے۔ دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور سلسلہ شکست و ریخت

جاری تھا۔ خود رو نباتات کی جو مختلف قسمیں اس عظیم الشان کھنڈر میں پیدا ہو گئی تھیں ان کی ماہیت پر متعدد کتابیں زمانہ حال میں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ ”دی فلورا آف دی کالیشیریم“ (نباتات کالیشیریم) میں چار سو بیس انواع کا حال موجود ہے۔ پرانی پرانی وسیع و د کشتا عمارتوں کے کھنڈروں میں ٹوٹے ہوئے ستون۔ صنوبر اور عرعر اور بوسیدہ دستکاری کے ابھریں نقش دیواروں سے جدا ہو ہو کر گرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ عالم نباتات بھی اس حسرت اندوز تعمیر میں شریک تھا۔ ریحان جو ایک زمانہ میں ایونٹائن کے کنارے بہ کثرت پھولتا تھا تقریباً معدوم ہو گیا تھا۔ لادل (شجرۃ الغار) کی جگہ جس کے پتے کبھی تاجداروں کی پیشانی کو زینت بناتے تھے۔ عشق بچان کی بیل آگ آئی تھی جو موت کی علامت ہے۔

لیکن شاید اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اس تمام ویرانی و بربادی کے ذمہ دار پاپایان روا نہیں قرار دئے جاسکتے اور اس ادعا کی تائید میں بیان کیا جائے کہ ایک سو چالیس برس سے کم کے عرصہ میں روما کو الیرک۔ جنسرک۔ اریسر۔ و۔ ٹیجر اور ٹائیٹا نے یکے بعد دیگرے مسخر کیا اس کی بہت سی بڑی بڑی عمارتیں قلعوں اور برجوں کی شکل میں بدل دی گئیں۔ و۔ ٹیجر نے کینیا کو برباد کر کے سنوں کو ضائع کر دیا۔ ٹائیٹا نے قیصر کے محلوں کو تاخت و تاراج کیا۔ پھر قوم لامبرڈ نے اس کے محاصرہ پر محاصرے کئے۔ اس کے بعد رابرٹ سکارد اور اس کی نارمن فوج نے شہر کو انٹوائن مینار سے لے کر فلیمش دروازہ تک اور لیٹرن سے لے کر کیپٹل تک جلا دیا۔ بعد ازاں کانسٹیبل بوریون نے اسے لوٹا اور اجاڑا۔ کئی دفعہ دریائے ٹائیبر کی طغیانی نے اسے غرقاب کیا اور بارہا اس کو زلزلہ کے صدمے سے پہنچے۔ یہ سب سچ ہے لیکن ہم کیا وہی کے الزام کو بھی نہیں فراموش کر سکتے جو اپنی تاریخ غلامی میں لکھتا ہے کہ اٹلی پر شمال کی وحشی اقوام نے جس قدر حملے کئے سب پاپایان روما کی تحریک سے کئے۔ اس لئے کہ انہیں نے ان وحشیوں کو اٹلی پر چڑھائی کرنے کی دعوت دی تھی۔ روما کی تباہی و بربادی کا باعث گاتھ یا وینڈل یا مارمن یا عرب قوم کی حملہ آوری نہیں ہے۔ بلکہ خود پاپاؤں اور ان کے بہتیسوں نے اس خوبصورت شہر کو غارت کیا اپنی چوڑے کی بھٹیوں کے لئے انہوں نے اس کے کھنڈروں سے مصالحہ بہیم پہنچایا۔ اپنے محلوں کی تعمیر کے لئے انہوں نے قدیم عالی شان عمارات کے پتھر اکھڑوا اکھڑوا کر منگوائے۔ پرانے مندروں اور عیالوں کی غارت گری سے گرجاؤں کی آرائش کا سامان لیا۔

اس وحشیانہ پن کا بھی کوئی ٹھکانا ہے کہ مندر توڑ توڑ کر گر جائے جائیں!! اس الزام اور اسی طرح کے دوسرے الزامات کا وجہ پاپایان روما کے دامن سے نہیں جھوٹ سکتا۔

عالمی شان کا رستہ وضع کے ستونوں کو خیر اور چڑھا کر ان بزرگواروں نے مسیحی اولیا کی مورتیں بنوا ڈالیں۔ شاندار مصری چوکوئے میناروں کی پاپائی کتبوں کے انتقال سے بے حرمتی کی گئی۔ قیصر سیویس کے عہد کی بے نظیر عمارت پیٹینونیم کو اس غرض سے منہدم کیا گیا کہ اس کے المہ سے سینٹ پیٹر کا گرجا تعمیر کیا جائے۔ پتھین کی کالسی کی چھت گلا کر وہ ستون ڈھالے گئے جن سے سینٹ پیٹر کے روضہ کو آراستہ کیا گیا۔

کیمپل کے برج میں دثرو کا گھنٹہ اپنی ماتی گونج سے بہت سے پاپاؤں کی موت کا اعلان کر چکا تھا اور عمارت کی بے حرمتی اور لوگوں کی فاسد الاخلاقی کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ غرض پاپائی روما کو قدیم روما کا کچھ پاس نہ تھا بلکہ اور اس سے الٹی نفرت تھی جس کا وہ رہ کا اظہار ہوا۔ پاپایان روما اول اول فرمان روایاں قسطنطین کے ماتحت تھے۔ پھر تاجدارن فرانس کے مددگار ہو گئے اور اس کے بعد یورپ کی عتقان فرمان فرمائی ان کے ہاتھ میں آگئی۔ گویا ان کی حکومت نے بھی ہمسایہ اقوام کی حکومت کی طرح تفسیر و انقلاب کے مختلف مدارج طے کئے اور ان کے اغراض و مقاصد اور مطالبات و دعاوی یک قلم بدل گئے۔ پاپائیت کو تعمیر نہیں ہوا تو صرف ایک بات میں نہیں ہوا یعنی اس کا تعصب بدستور قائم رہا۔ چونکہ اسے یورپ کی مذہبی زندگی کے مرکز ہونے کا دعویٰ تھا لہذا اس نے پاپائیت سے خارج ہر مذہبی وجود کے تسلیم کرنے سے اصرار کے ساتھ انکار کیا حالانکہ اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ سیاسی اور دینی ہر ایک اعتبار سے وہ ازسرتپا بوسیدہ اور متعفن ہو رہی تھی۔ ارکس اور لوٹھرنے جب روما کی بے دینی اور دہریت پر نظر ڈالی تو ان کے اندام اقتدار اداوت پر لرزہ طاری ہو گیا۔

ان واقعات میں سے اکثر کی تفصیل کے لئے ہم رینگی کی وقایع نویسی کے رہیں منت ہیں جس نے اپنی تاریخ میں روما کے اخلاقی مفاسد و فزایم کی تصویر کھینچ دی ہے۔ انتخاب کے وقت پاپایاں روما عموماً "عمر رسیدہ سالخورہ ہوتے تھے۔ اس لئے عتقان اقتدار ہمیشہ نئے ہاتھوں میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ ہر انتخاب امیدوں اور تمنائوں کا انقلاب ہوتا تھا۔ جس جماعت کے تمام افراد کو بام ترقی پر پہنچنے کا موقع حاصل ہو اور ہر شخص کو اپنے دامن میں دولت اور طاقت کے سنج شاگن کا سیٹھا ممکن نظر آئے اس کا ہر فرد بھلا کیوں نہ دوسروں کے حقوق کی پامالی کی دھن میں لگا ہوا ہو۔ اگرچہ واقعہ اصلاح کینہ کے وقت روما کی آبادی گھٹنے گھٹنے اسی ہزار رہ گئی تھی پھر بھی عمدہ داروں کی تعداد بہت بڑی تھی اور ان عمدوں کے امیدواروں کی تعداد اور بھی زیادہ تھی۔ کامیاب پاپا ہزاروں خدمتیں عطا کر سکتا تھا اور

یہ وہ خدمتیں ہوتی تھیں جن سے بہت سے بے قصور ملازم نہایت بے دردی سے برطرف کر دئے جاتے تھے اور بہت سی جدید خدمتیں اس غرض سے قائم کی جاتی تھیں کہ امیدواران ملازمت کے ہاتھ فروخت کی جائیں۔ کسی امیدوار کی دیانت یا قابلیت کو ہرگز پیش نظر نہ رکھا جاتا تھا بلکہ صرف ان امور پر لحاظ ہوتا تھا کہ وہ فریق مقتدر کی کیا خدمت کر چکا ہے یا کر سکتا ہے اور ماموری کے معاوضہ میں کسی قدر نذرانہ پیش کرنے کی استطاعت رکھتا ہے ہمارے امریکن ناظرین ان حالات کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ امریکہ کے پریزیڈنٹ کے انتخاب کے موقعہ پر بھی اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ مجلس انتخاب پاپائے روم۔ جماعت نامزدگی پریزیڈنٹ ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے چنداں مغایر نہیں ہے۔ قرعہ انتخاب جس کے نام پر پڑتا ہے اسے دونوں صورتوں میں بہت سے عہدوں کے عطیہ کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

ولیم ساکن ماسبری کا بیان ہے کہ اس کے زمانہ میں اہل روم نے صداقت اور تقدس کا اچھا خاصا بیوپار قائم کر رکھا تھا۔ کوئی پاک یا مقدس شے ایسی نہ تھی جس کا بھاؤ سونے چاندی میں مقرر نہ ہو۔ اس کے زمانہ کے بعد بھی کوئی اصلاح نہ ہوئی بلکہ کلیسا کی حالت اور بدتر ہو گئی اور کلیسا آلہ جلب منفعت بن گیا۔ اٹلی میں اس طور پر بیش قرار رقیس جمع کی گئیں اور ممالک ملحقہ سے ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف یہ لطائف الجھل بڑی بڑی رقیس وصول کی گئیں۔ روپیہ جمع کرنے کا سب سے زیادہ ناپاکن حیلہ فروخت تذکرات الغفران تھا جنہیں خرید کر مشتری من مانے گناہ کر سکتا تھا۔ غرض اطالوی مذہب لوگوں کو لوٹنے کا فن بن گیا تھا۔

ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک روم پاپاؤں کے زیر نگین رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس عرصہ میں اس پر بہت سی جاہلیاں ایسی آئیں جن کے وہ جواب دہ نہیں ٹھہر سکتے لیکن یہ ذمہ داری یقیناً ان پر عائد ہوتی ہے کہ ان کی طرف سے کبھی کوئی پرزور یا مستقل کوشش اس شہر کی مادی و اخلاقی اصلاح کے لئے عمل میں نہیں آئی۔ بجائے اس کے اس بارے میں روم کوئی ایسی نظیر قائم کرتا جو دنیا کے لئے واجب التقلید ہو اس نے ایک ایسی حالت کی مثال پیش کی جو ہر طرح سے قابل نفرت ہے۔ القصد روم کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جب واقعہ اصلاح ظہور پذیر ہوا تو نویت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کوئی صاحب اتقا اجنبی یہاں آکر کارہ اور متفر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

پاپایان روم نے سائنس سے تو اس بنا پر قطع تعلق کر لیا تھا کہ یہ ان کے دعاوی سے

بالکل مغایر ہے۔ البتہ اخیر اخیر میں فنون لطیفہ کی سرپرستی شروع کی تھی۔ لیکن موسیقی و نقاشی گو بجائے خود سرمایہ لذت و آرائش حیات ہوں پھر بھی ان میں کوئی ایسی زندہ طاقت موجود نہیں ہے جو ایک کمزور قوم کو شنور بنا دے یا جماعت انسانی کی مادی راحت و آسائش میں بالاستقلال اضافہ کر سکے۔ اسی لئے اصلاح کے وقت اس شخص کی نظروں میں جو روما کی حالت پر نظر غائر ڈال چکا تھا اس شر کی تمام زندہ توانائی سلب ہو چکی تھی۔ وہ اس قابل نہ رہا تھا کہ دنیا کی دنیوی یا دینی ترقی میں حصہ لے سکے۔ نظام جمہوری و شہنشاہی کے ترقی پذیر قواعد کے بجائے اس نے پاپائیت کے جامد و غیر متحرک اصول قائم کر لئے تھے۔ اس کی دینی حالت تو یہ تھی کہ اس پر زہد و اتقا کا ایک غیر حقیقی ملمع چڑھا ہوا تھا اور دنیوی ترقیات کی قسم سے اس کے قبضہ میں فنون لطیفہ تھے۔ اس لحاظ سے گویا وہ کسی راہب کی اس لاش کے مشابہ تھا جو ہمیں ابھی تک کپوشنی طبقہ کے راہبوں کے مدفن میں بحورے رنگ کی کفنئی اوڑھے اور ہاتھ میں دعاؤں کی کتاب یا کچھ مرحمائے ہوئے پھول لئے نظر آتی ہے۔

”ملفنتہ البقا“ (روما) کی تصویر کا یہ رخ دکھانے کے بعد اور لاطینی مسیحیت نے اس کے ساتھ جو جو سلوک کئے ان پر نظر ڈالنے کے بعد اب ہم کل براعظم یورپ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مذہب جو جماعت انسانی کے پیشوا اور رہنما ہونے کا مدعی تھا اپنے نتائج کے لحاظ سے کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔

اقوام کی حالت باعتبار ان کے سود و بہبود کے نہایت صحیح طور پر ان کی آبادی کی کمی و بیشی سے ظاہر ہوتی ہے۔ آبادی پر طرز حکومت (یعنی اس کی جمہوریت یا شخصیت) کا اثر بہت کم پڑتا ہے۔ البتہ تمدن مملکت و طریقہ نظم و نسق کا اثر اس کے شمار و اعداد پر چھا جاتا ہے۔

جن مصنفین نے اس مضمون پر غور کیا ہے انہوں نے قابل اطمینان طور پر ثابت کر دیا ہے کہ آبادی کا گھٹنا بڑھنا جماعت انسان کی قوت تولید اور قوت مدافعت حیات کے باہمی توازن پر منحصر ہے۔

قوت تولید سے مراد وہ مقننات فطرت ہیں جو توفیر نسل انسانی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں ایک حد تک اس قوت کا دار و مدار آب و ہوا پر ہے لیکن چونکہ یورپ کی آب و ہوا میں چوتھی اور سولہویں صدیوں کے درمیان کوئی محسوس تغیر نہیں ہوا لہذا ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ براعظم یورپ میں یہ قوت زمانہ زیر بحث میں بحالت اصلی قائم رہی۔

قوت مدافعت حیات سے مراد وہ تمام اسباب ہیں جن سے بجائے افراد انسانی مشکل ہو

جائے۔ اس جسم کے اسباب میں غذا کا ناکافی ہونا لباس کا غیر کفایتی ہونا اور مسکن کا ناقص ہونا شامل ہیں۔

ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر قوت مدافعت گھٹ کر غیر محسوس ہو جائے تو قوت تولید آبادی کو ۲۵ سال میں دگنا کر سکتی ہے۔

قوت مدافعت کے عمل میں آنے کے دو طریقے ہیں۔ جسمانی و دماغی۔ مدافعت کی جسمانی قوت اولاد کی تعداد کو کم کر دیتی ہے اور زندگی کا اوسط گھٹا دیتی ہے۔ مدافعت کی دماغی قوت ان لوگوں کو جن پر اخلاق اور خصوصاً ”مذہب کا گہرا اثر ہو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ تاوقتیکہ ان میں بیوی بچوں کی خبرگیری و پرورش کی ذمہ داری سے عمدہ برآ ہونے کی قابلیت نہ پیدا ہو جائے شادی نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مدت معینہ میں جس قدر شادیاں ہوتی ہیں ان کی تعداد کو خوراک کی قیمت کی شرح کے ساتھ ایک خاص نسبت ہوتی ہے۔

خوراک میں جس نسبت سے اضافہ ہوتا ہے اسی نسبت سے آبادی بھی بڑھ جاتی ہے اور قوت تولید اس درجہ طاقتور ہے کہ وہ ذرائع معاش سے تجاوز کر جاتی ہے اور ان پر مسلسل دباؤ ڈالے رکھتی ہے۔ ایسی حالت میں ضرور ہے کہ افلاس کی ایک خاص مقدار دنیا میں موجود ہو۔ یعنی جماعت انسانی کے ایک طبقہ کے لئے فاقہ کشی کرنا ضروریات سے ہے۔

مختلف ممالک کی آبادی میں جو تغیرات واقع ہوئے ہیں ان کا ثبوت مفصل ذیل مثالوں سے مل سکتا ہے۔ جیٹینین کی فوج کشی نے اٹلی کی آبادی کو بے حد گھٹا دیا۔ شمالی افریقہ مذہبی جھگڑوں کی وجہ سے قریب قریب ویران ہو گیا۔ لیکن جب یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو آبادی پھر ترقی کر گئی۔ طریقہ جاگیرداری کے رواج سے تمام یورپ کی آبادی بڑھ گئی۔ اس لئے کہ جاگیریں بمقابلہ ان متوسلین کی تعداد کے جن کی قوت بستی کا وہ ذریعہ تھیں زیادہ وقتی ہو گئیں۔ حروب ملیہ نے آبادی کو بہت کچھ گھٹا دیا اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ لڑائیوں میں بہت سے آدمی مارے گئے اور کچھ یہ کہ بہت سے تندرست اور صحیح البدن لوگوں کو مہلکانہ زندگی سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اسی طرح کے انقلابات براعظم امریکہ میں بھی ہوئے ہیں۔ میکسیکو کی آبادی ہسپانویوں کی اس وحشیانہ سفاکی اور ظالمانہ دست برد کی وجہ سے جس نے یہاں کے تہذیب یافتہ باشندوں کی عافیت نگ کر دی اور انہیں زندگی کی طرف سے ناامید کر دیا۔ بقدر بیس لاکھ کے گھٹ گئی۔ یہی حال بیرو کا بھی ہوا۔

انگلستان کی آبادی نارمن فتوحات کے وقت تقریباً "میں لاکھ تھی۔ پانچ سو سال میں یہ بمشکل دگنی ہو سکی۔ اس جمود کی ذمہ دار ایک حد تک غالباً "وہ پاپائی مصلحت تھی جس نے پادریوں کو تجرد کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس مصلحت نے قانونی قوت تولید پر تو ضرور اثر ڈالا لیکن حقیقی قوت تولید پر اس سے خاک اثر نہ پڑا اس مسئلہ پر جن لوگوں نے نظر غائر ڈالی ہے وہ مدت کے مطمئن ہو چکے ہیں کہ علانیہ تجرد خفیہ عیاشی کا مترادف ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام انگلستان چیخ اٹھا کہ ملک میں ایک لاکھ عورتیں ایسی موجود ہیں جنہیں پادری کر چکے ہیں اور اسی بنا پر عامہ خلافت اور نیز حکومت انگلستان نے ان خاتماہوں کو جو رہبانیت کا مرکز تھیں بند کر دینے کا قصد کر لیا۔

ہم نے اپنی کتاب "تاریخ خانہ جنگی امریکہ" میں اسی مسئلہ پر بعض خیالات ظاہر کئے ہیں جن کا اقتباس اس مقام پر خالی از لطف نہ ہو گا۔ "آبادی کی اس جلد اور استقراری حالت کا مفسوم یہ ہے کہ لوگوں کو خوراک بھد وقت و زحمت حاصل ہو۔ تن ڈھکنے کو کافی کپڑا میسر نہ آئے۔ جسم غلاظتوں سے آغشته ہو۔ رہنے کے لئے جھوپڑیاں ایسی بنائی جائیں کہ موسم کی سختی سے بچاؤ نہ ہو سکے۔ سردی گرمی کے تباہ کن اثر کے سدباب کی کوئی صورت نہ ہو۔ غلیظ اور دہائی اُبھرے پھیلے ہوئے ہوں۔ حفظان صحت کی تدابیر مفقود ہوں۔ اطباء و معالج نام کو دکھائی نہ دیں۔ گندے تعویذ ٹونے ٹوکے کی چارہ گرمی بے سود ثابت ہو۔ معجزوں اور کرامتوں کی اونچی دکان کا پکوان پیکا اور سینا نکلے۔ غرض مصیبتوں تکلیفوں اور حاجتوں کی اس طویل فہرست کا اگر خلاصہ کیا جائے تو آبادی کے جلد و غیر محرک ہونے کا مفسوم یہ ہو گا کہ شرح اموات کا اوسط غیر معمولی طور پر بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ مفسوم ابھی مزید تفصیل کی گنجائش رکھتا ہے۔ یعنی اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ شرح پیدائش کا اوسط معمول سے گھٹا ہو یا بالفاظ دیگر مناکحت کا دروازہ بند ہو گیا۔ عیاشی کی گرم بازاری ہو۔ درپردہ فسق و فجور ہوتا ہے۔ اخلاق کا قوام بگڑ گیا ہو۔

"باشندگان امریکہ کے لئے جو ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں کل تک ایک وسیع اور ناقابل نفوذ جنگل چھایا ہوا تھا مگر جہاں آج اس آبادی کا ہجوم ہے جو ہر پچیس سال کے بعد مقررہ رفتار کے مطابق دگنی ہو رہی ہے حقیقی و اضافی زندگی کی یہ خوفناک تضییع ایک نہایت ہی حیرت انگیز واقعہ ہے وہ بہ تقاضائے تھیر دریافت کریں گے کہ آخر وہ کس قسم کا طرز نظم و نسق تھا جس کا دعویٰ تو یہ تھا کہ انسان کے معاش و معاہد کی اصلاح و ترقی اس کا نصب العین ہے لیکن جب نتیجہ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو خوفناک تباہی

اور مصیبت انسان پر نازل ہوئی وہ ہمہ گیری میں جنگ و با اور قحط کی سہ گانہ بلاؤں کے متفقہ اثر سے کیسے بدی ہوئی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ لوگوں کو گمان تھا کہ اس طرز حکومت میں ان کی دنیوی بھلائی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اس زمانہ کی حالت اور آج کل کی حالت کا اگر مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ انگلستان کی اسی جغرافیائی سطح پر آج دس حصہ زیادہ لوگ آباد ہیں اور آبادی کے روز افزوں اضافہ کی یہ حالت ہے کہ ہجرت کرنے والوں کے انبوه کثیر دنیا کے مختلف حصوں میں جا جا کر آباد ہو رہے ہیں۔ جو شخص ہمد گزشتہ کو ادب و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اسے خود قیاس کر لیتا چاہئے کہ اس قسم کے طرز نظم و نسق و تدبیر مملکت کی کیا قدر و منزلت ہو سکتی ہے۔“

یورپ کی آبادی کے ان تغیرات کے ساتھ ساتھ آبادی کی تقسیم بھی متغیر ہوئی رہی ہے۔ سلطنت روم میں مسیحیت کے شائع ہونے کے بعد سے آبادی کا مرکز شمال کی طرف منتقل ہو گیا اور وہاں سے صنعت و حرفت کی ترقی کے باعث مغرب کی طرف چلا گیا۔

اب کسی قدر زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ ان مدافعانہ قوتوں کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں جنہوں نے یورپ کی آبادی کو ایک ہزار سال تک حالت جمود و سکون میں رکھا۔ براعظم یورپ کی سطح کا بہت بڑا حصہ لق و وق اور بے راہ جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ کیسے راہوں کی خانقاہیں اور بستیاں آباد تھیں۔ نشیبی مقامات اور دریاؤں کے دونوں جانب سینکڑوں میل لمبی دلدلیں پھیلی ہوئی تھیں جن میں سے غنوت انگیز بخارات نکل نکل کر دور دور تک دبا پھیلاتے تھے۔ پیرس اور لندن میں مکانات لکڑی کے تھے جن کی درزوں پر گارا لسا ہوا تھا اور چتھیں پرال یا سرکنڈوں کی تھیں۔ ان مکانوں میں روشن دان اور کھڑکیاں نہ ہوتی تھیں اور آہ کی کل کے زمانہ ایجاد تک بہت کم مکان ایسے تھے جن کا فرش چوبی ہو۔ دری یا قالین ایک ایسا سامان آرائش تھا جسے کوئی جانتا تک نہ تھا۔ اس کا قائم مقام پرال تھا جس کی کچھ مقدار فرش پر بچھا دی جاتی تھی۔ گھروں میں دوردش بھی نہ ہوتے تھے۔ اس چولے کا دھواں جو کافی اندھن کے میسر نہ آنے سے بے رونق نظر آتا تھا چھت کے ایک سوراخ میں سے باہر نکل جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے جمونیزے موسم کی سختی کو کسی طرح روک سکتے تھے۔ بدر روئیں بالکل موجود نہ تھیں اور صفائی کا مطلق انتظام نہ تھا۔ سڑے ہوئے فضلہ اور کوڑے کرکٹ کا دروازہ پر ڈھیر لگا رہتا تھا۔ مرد عورت اور بچے ایک ہی کوٹھری میں سوتے تھے اور اکثر گھر کے جانور بھی اسی حجرے میں ٹھونس دئے جاتے تھے۔ اس طوفان بدتمیزی میں ممکن نہ تھا کہ حیا اور اخلاق قائم رہ سکے۔ بستر بالعموم پرال کا ایک

تھیلا ہوتا تھا اور لکڑی کا ایک گول کنڈا بکیہ کا کام دیتا تھا۔ جسمانی صفائی سے لوگ مطلق نا آشنا تھے بڑے بڑے ارکان دولت یہاں تک کہ کنٹریری کے لاٹ پادری کے سے جلیل القدر حکام اس درجہ گندے ہوتے تھے کہ ان کے کپڑوں میں جو کس بجیہ کے ٹانگوں سے سوا تھیں

چنانچہ انگلستان کے ایک تاجدار کے حریف ٹاس بیٹک کی یہی حالت بیان کی گئی ہے۔ جسمانی صفوت کے چھپانے کے لئے عطریات کا بکھرت استعمال کیا جاتا تھا۔ عوام الناس کا لباس چرمی ہوتا تھا جو سالہا سال تک کام دیتا تھا اور جس میں جسم کا میل برابر جمع ہوتا رہتا تھا۔ ہفتہ میں جس شخص کو کھانے کے لئے ایک دفعہ گوشت مل جاتا تھا وہ فارغ البال اور آسودہ حال مقصود ہوتا تھا۔ گلیوں میں کوئی بد رو نہ ہوتی تھی۔ سڑکیں نہ تو کٹی ہوئی ہوتی تھیں نہ ان پر روشنی کا انتظام ہوتا تھا۔ رات کے وقت کوٹھریوں کے دروازے کھول دئے جاتے تھے اور کوڑا کچرا دھوؤں بلا تکلف باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ جو بچارہ شامت کا مارا رہ گزر تک و تازگی میں سے ہاتھ میں مدہم ٹٹھاتی ہوئی لائین لئے گزر رہا ہوتا تھا وہ اس آلائش کے سیلاب سے لت پت اور شور پور ہو جاتا تھا۔

۱۔ شس سلوٹیس نے جو آگے چل کر پاپس ٹائی کے نام سے مسند پاپائی پر متمکن ہوا اور جس کی تحریر اس لحاظ سے نہایت قابلانہ و غیر متعصبانہ سمجھی جائے گی۔ اپنی سیاحت جزائر برطانیہ کے مشرق حالات قلمبند کئے ہیں۔ یہ سفر اس نے ۱۸۳۰ء کے قریب اختیار کیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ کسانوں کے مکانات خشک چٹائی کے پتھروں کے تھے جن میں چونا نہیں لگایا گیا تھا۔ چھتیں گھانس پھونس کی تھیں اور تیل کی ایک ایتھی ہوئی کھال دروازے کا کام دیتی تھی۔ خوراک کی قسم سے وہ ساگ پات موٹھ مڑیہاں تک کہ درختوں کی چھال تک کا استعمال کرتے تھے۔ بعض مقامات کے باشندے روٹی کے نام تک سے ناواقف تھے۔ گارے سے لے ہوئے سرکنڈوں کو ٹھریاں۔ بھدے اور بے ڈھنگے ٹھروں کے گھر۔ بے درد کش کے بے رونق دھواں دہار ایتھیاں۔ جوؤں کھٹلوں اور پھوؤں سے بھرے ہوئے جسمانی اور اخلاقی غلاظتوں کے بھٹ۔ سردی سے بچنے کے لئے اعضا کے گرد پراں کے لپٹے ہوئے مٹھے۔ بخار سے سسکتے ہوئے کسان کے لئے عالموں اور سیانوں کی چارہ گری کے سوا اور کسی تدبیر کا نہ ہونا!! ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے کیونکر ممکن تھا کہ آبادی میں ترقی ہو سکے؟

جب حالت یہ ہو رہی ہو تو کون سی تعجب کی ہے کہ ۱۸۳۰ء کے قحط میں انسان کا

گوشت پکایا اور بچا گیا اور ۳۵۸ء کے قحط میں لندن کے ۱۵ ہزار باشندے بمحوں مر گئے یا وبا کے بعض حملوں میں لوگ اتنے مرے کہ لاشوں کی تجیز و تحفین کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ ۳۳۸ء کی وبا میں جو مشرق سے اٹھی اور تجارتی رستہ سے ہوتی ہوئی یورپ پر چھا مئی فرانس کی ایک ٹکٹ آبادی ضائع ہو گئی۔

دہمات اور شہروں کے عوام الناس کی تو یہ حالت تھی ہی لیکن امراء کی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی۔ انگلو سکس قوم کی بد اطواریوں کا ذکر کرتے ہوئے ولیم ساکن ماس بری کہتا ہے کہ ”اس قوم کے امرا پیڑ اور عیاش تھے اور کبھی گرے نہیں جاتے تھے۔ نماز فجر اور نماز قد آس کے ادا کرنے کا انہوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ انکا پادری جس کو ان کی کاسہ لیسے ان کی نظروں سے گرا رکھا تھا ان کی خوابگاہ میں جا کر بیدار ہونے سے قبل جلد جلد نماز کے الفاظ دہرا جاتا تھا اور ان کے کان میں ایک لفظ بھی نہ پڑتا تھا۔ عام لوگ طاقتور امرا کے بچہ ظلم میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان کی جائیدادیں چھین لی جاتی تھیں وہ دور و دراز ممالک میں جبراً بھیج دئے جاتے تھے۔ ان کی لڑکیوں کو یا تو دارالقمانہ میں بٹھا دیا جاتا تھا اور یا وہ لوطیاں بن کر بیچ ڈالی جاتی تھیں۔ دن رات شراب کے دور پیانے چلتے رہتے تھے اور جو برائیاں بد مستی کی رفتی ہیں وہ ظاہر ہو کر مردوں کو نامرد بناتی جاتی تھیں۔“ جاکیرداروں کے قلعے گویا ڈاکوؤں کے گھر ہو رہے تھے۔ چنانچہ یہی موصوفہ جس کی تحریر سے ہم نے اوپر اقتباس کیا ہے بیان کرتا ہے کہ مرد اور عورتیں ان قلعوں میں پکڑ بلائی جاتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کے انگوٹھوں یا پاؤں میں رسی باندھ کر انہیں لٹکا دیا جاتا تھا۔ ان کے اعضا آگ سے جھلے جاتے تھے۔ گرہ دار رسیوں کو ان کے سر کے گرد لپیٹ کر مروڑا جاتا تھا۔ غرض زر ندیہ وصول کرنے کے لئے طرح طرح کے عذاب انہیں پہنچائے جاتے تھے۔

یورپ بھر میں بیش قرار مشاہرہ اور ذمہ داری کی بڑی بڑی سیاسی خدمتوں پر پادری مامور تھے۔ ہر ملک میں دہری حکومت تھی۔ ایک تو مقامی یعنی دیہی حکومت اور دوسری غیر ملکی حکومت جس کے اقتدارات کا مصدر و مرکز پاپائے روما تھا۔ روما کے اثر کا مقامی اثر پر غالب ہونا ایک لازمی امر تھا۔ اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے ایک شخص واحد کا شہنشاہانہ ارادہ یورپ کی تمام اقوام کے متحدہ و منقطع ارادہ کے مقابلہ میں کامیابی کے ساتھ ظاہر ہوتا تھا اور بوجہ اپنی وحدت و اکتاز کے بے انتہا طاقتوں کا جامع تھا۔ علی ہذا القیاس مقامی اثر کا ضعیف ہونا بھی لازمی تھا۔ کیونکہ اول تو خود ہمسایہ سلطنتوں کی باہمی رقابتیں اسے کمزور کر دیتی تھیں اور دوسری سہی طاقت کے سلب کرنے کے لئے رومانی رقیب کی جلا فرین تفرقہ

پردازیاں کافی تھیں۔ ایک بھی ایسا موقع پیش نہیں آیا کہ مختلف دول یورپ نے اپنے مشترک حریف کو زک دینے کے لئے آپس میں اتحاد قائم کیا ہو۔ جب کبھی کسی بحث کے چمڑنے سے اتحاد کا خدشہ پیدا ہوتا تھا تو نہایت چالاک سے یہ جھگڑا علیحدہ علیحدہ چکا دیا جاتا تھا اور ہر حکومت کو بالعموم پیپائے روم کے سامنے گردن جھکانے ہی بنتی تھی۔ پیپائی مداخلت کا ظاہری و بادی النظری مقصد تو مختلف اقوام کے اخلاقی و روحانی حقوق کی نگہداشت ہوتا تھا لیکن اصلی و حقیقی غایت یہ ہوتی تھی کہ ذرائع آمدنی میں توفیر کا پہلو نکالا جائے اور پادریوں کے جم غفیر کی شکم پروری کی سبیل پیدا کی جائے۔ جو محاصل اس طور پر پیپائی خزانہ میں داخل ہوتے تھے وہ بسا اوقات مقامی حکومت کے مداخل سے ہمارج بڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً جب انوسنٹ رابع نے یہ مطالعہ کیا کہ کلیسائے انگلستان تین سو مزید اطالوی پادریوں کا مستغفل ہوا اور لیکن کے گرجا میں اس کا ایک بستیجا جو سن بلوغ کو بھی نہ پہنچا تھا ایک بڑی خدمت پر نامور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ جو رقم پہلے ہی سے ہر سال غیر ملکی پادریوں پر صرف ہوتی تھی وہ اس رقم کے مقابلہ میں شامی خزانہ میں داخل ہوتی تھی کتنی تھی۔

اعلیٰ طبقہ کے پادریوں نے تو ہر ملکی خدمت پر جو کچھ بھی باعث منفعت تھی قبضہ کر ہی رکھا تھا اور ہر دیر کا صدر راہب کثیر التعداد غلاموں کے مالک ہونے کے لحاظ سے بڑے بڑے امیروں اور جاگیرداروں کا مقابلہ کرتا تھا چنانچہ بعض صدر راہبوں کے پاس بیس بیس ہزار غلام موجود تھے لیکن گدائی پیش راہبوں کے لئے بھی معاش کے وسیع ذرائع موجود تھے۔ ملک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں یہ نظر نہ آتے ہوں اور غریا کے قوت لایموت میں اپنا حصہ نہ بنا لیتے ہوں۔ کتھے اور کتھو پادریوں کا ایک انبوہ کثیر جس کے ارادت میں ممالک غیر مسلک تھے ایسا تھا جس کی زندگی کالی اور بے کاری میں کتنی تھی اور جو اپنا پیٹ محنت مزدوری کرنے والوں کے پسینے سے پاتا تھا۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن تھا کہ چھوٹے چھوٹے کھیت بڑی بڑی جاگیروں میں ضم نہ ہوتے چلے جائیں۔ غریا کا الاس روز بروز نہ بڑھتا جائے اور جماعت انسانی کی حالت روبہ اصلاح ہونے کے بجائے پایہ اخلاق سے ساقط نہ ہوتی چلی جائے۔ دیروں صومعون اور خافتاہوں سے باہر تحصیل علم کی کوئی کوشش نہ کی جاتی تھی اور کیوں کر کی جاتی؟ کلیسا کی مصلحت اسی میں تھی کہ لوگ جاہل رہیں۔ چنانچہ یہ اصول عام طور سے تسلیم کر لیا گیا تھا کہ جمالت زہد و اتقا کی ماں ہے۔

رومانے جمہوریت اور شہنشاہیت کے زمانہ میں ہمیشہ اس اصول پر عمل کیا تھا کہ منظم

پلوں اور پختہ سڑکوں کے ذریعہ سے اپنے دور دست صوبوں کے ساتھ سرچ السیر تعلقات قائم رکھے جائیں۔ پلوں اور سڑکوں کی تعمیر اور مرمت افواج رومہ الکبریٰ کے اہم فرائض میں داخل تھی۔ اس اصول پر کاربند ہونے سے اس کا فوجی تفوق برقرار رہا۔ لیکن پایائیت کے زمانہ میں چونکہ روما کی حکومت ایک بالکل جداگانہ اصول پر مبنی تھی اور اس کو اگلی سی ضرورتیں درپیش نہ تھیں لہذا اس فرض کی بجا آوری کو اس نے دول مقامی کی بے اعتنائی کے لئے چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ بحر میں کوئی سڑک ایسی نہ تھی جو سال کا اکثر حصہ بند نہ رہتی ہو۔ حمل و نقل کے عام ذرائع بیلوں کے بے ڈھنگے پھڑکے ہوتے تھے جو گھنٹہ میں تین چار میل سے زیادہ نہ جاسکتے تھے۔ جہاں کشتیاں بہم نہ پہنچ سکتی تھیں مال تجارت کہ وہ بھی کیف و کم کے اعتبار سے چنداں قابل لحاظ نہ ہوتا تھا گھوڑوں اور نچروں پر لاد کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچایا جاتا تھا۔ جب فوج کے بڑے بڑے دستوں کو نقل و حرکت کی ضرورت پیش آتی تھی تو مشکلات اس قدر بڑھ جاتی تھے کہ ان پر غالب آنا دشوار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حروب ملیہ کے مجاہدین ادنیٰ کے کوچ کی کمائی ان مشکلات کا مرقع ہے۔ نقل و حرکت بین الممالک کی یہ دقتیں اور زحمتیں اس تاریکی اور جہالت کی ایک بڑی حد تک ذمہ دار تھیں جو عام طور سے پھیلی ہوئی تھی۔ اکیلا اکیلا مسافر جان جوکوں میں ڈالے بغیر سفر نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ کوئی دلدل یا جنگل ایسا نہ تھا جہاں ڈاکو اور لٹیرے موجود نہ ہوں۔

جہالت اور لاعلمی ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے لوگ ادھام پرستی میں مبتلا تھے۔ یورپ میں شرمناک کراحتوں اور معجزوں کی بھرمار تھی۔ کوئی سڑک ایسی نہ تھی جس پر زائروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اولیا کی ان خانقاہوں کی طرف ارادت کی باگیں اٹھائے نہ جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہوں جو اپنی سیمائی اور شفا بخشی کی وجہ سے شہرہ آفاق تھیں۔ کلیسا نے ہمیشہ اسی مصلحت کو پیش نظر رکھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو طیب یا اس کے پیشہ سے مانوس نہ ہونے دیا جائے۔ اس لئے کہ وہ خانقاہوں کو آلہ جلب منفعت بننے سے بہت کچھ روکتا ہے۔ زمانہ اس منفعت رساں زور و تلیس کی آخر قلعی کھول کر رہا۔ یورپ میں آج کتنی خانقاہیں ہیں جن کی دکانداری کا سلسلہ بدستور قائم ہے؟

جو مریض اس قدر ناتواں ہوتے تھے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ پہنچائے جاسکتے تھے ان کا اللہ ہی حافظ تھے۔ بجز روحانی علاج یعنی ان لاطینی دعاؤں کے جو اس پر دم کر دی جاتی تھیں اس کے لئے اور کوئی شکل مداوا نہ تھی۔ امراض کے روکنے کے لئے گر جاؤں

میں دعائیں لٹکا دی جاتی تھیں۔ لیکن حفظِ صحت کی کوئی تدبیر عمل میں نہ لائی جاتی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ شہرِ فرطِ غصوت سے سڑا اس بنا ہوا ہے اور دبا چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے لیکن پادری صاحبِ انسداد دبا کا سامان دعا سے کر رہے ہیں۔ سینہ کی جھڑی تھمنے میں نہیں آتی یا اساک باران کی وجہ سے سقامت ہنگام کا اندیشہ ہے لیکن یہ بزرگوار اپنے چند دعائیہ جملوں کے زور سے سینہ کو رکوا یا برسوا دینے کے مدعی ہیں۔ سورج یا چاند کو گھن لگ گیا ہے یا کوئی مدار ستارہ نمودار ہوا ہے لیکن یہ عقل کے پتلے ان قدرت کے کرشموں کو بلائے آسمانی سمجھ کر ادعیہ ماثرہ سے ان کی نحوست ٹالنے کی فکر میں ہیں۔ جب ۱۸۵۶ء میں وہ مدار ستارہ جو بلی کے نام سے موسوم ہے نمودار ہوا تو اس کی شکل ایسی خوفناک اور اس کا منظر ایسا مسیب تھا کہ خود تقدس ماب الوہیت انتساب جناب کیلکٹس خاص پیپائے روم کو اپنی روح القدس قوت سے اس کی مدافعت پر ہونا پڑا۔ چنانچہ آپ نے ایک ایسا زبردست عمل پڑھا اور اتنی لعنتیں بھیجیں کہ مارے ڈر کے یہ خبیث ستارہ دم دبا کر ہانپتا کانپتا جوف فضا میں غائب ہو گیا اور کہیں پچھتر سال کے بعد اس کے ہوش و حواس اس حد تک بجا ہوئے کہ اس نے دوبارہ نمودار ہونے کی جرات کی۔

اولیا کے تصرفات روحانی اور دعاؤں کے ذریعہ سے مریضوں کو جو شفا ہوتی تھی اس کا طبعی اندازہ اگر لگانا مقصود ہو تو اس زمانہ کی اور آج کل کی شرح اموات کا مقابلہ کر لینا کافی ہو گا۔ ان دنوں تیس میں ایک آدی مرتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں جب کہ روحانیت کے بجائے چاروں طرف مادیت کا عمل ہے بحساب اوسط چالیس میں ایک آدی مرتا ہے۔ یورپ کی اخلاقی حالت روز روشن کی طرح وقت آشکارا ہو گئی جب کولبس کے ساتھی جزائرِ غربِ الہند سے مرضِ باورنگ اپنے ساتھ لگاتے لائے۔ یہ بیماری حیرت انگیز سرعت کے ساتھ یورپ بھر میں پھیل گئی۔ ادنیٰ و اعلیٰ غریب و امیر سب کے سب اس شرمناک مرض میں مبتلا ہو گئے اور تو اور پیپائے مقدس حضرت لیودہم بھی تو تپال بیٹھے اور نیم کی شنی ہلاتے ہوئے پائے گئے۔ اکثر لوگ جو شامت اعمال سے یہ دکھ بھر رہے تھے یہ عذر پیش کرتے تھے کہ یہ ایک دہائی مادہ ہے۔ جو سمیت اجزائے ہوا کی وجہ سے پھیل گیا ہے۔ لیکن اگر سچ پوچھا جائے تو اس مادہ کی اشاعت کا باعث ہواست نہ تھی بلکہ فطرتِ انسانی کی ایک خاص کمزوری تھی جسے وہ روحانیت بھی زائل نہ کر سکتی تھی جو انسان کے صدہا سال سے بنزلہ چراغِ ہدایت تھی۔

خاتماہوں کے طبی کرشموں پر خاص خاص تہذکات کی معجزنا شفا گستری مستزاد تھی۔ ان

میں سے بعض تبرکات ایسے تھے جن کی نوعیت عقل کو محو حیرت کر دیتی تھی۔ متعدد دیر اور خانقاہیں ایسی تھیں جن میں جناب مسیحؑ کا کانٹوں کا تاج موجود تھا۔ گیارہ دیروں میں وہ برچھا رکھا ہوا تھا۔ جس سے آپ کا پہلو چھیدا گیا تھا۔ اگر کوئی شخص ازراہ جسارت یہ سوال کر بیٹھا کہ ان سب کا اصلی ہونا کیوں کر ممکن ہے تو وہ دہریہ اور مرتد قرار دیا جاتا۔ حروب صلیبیہ کے دوران میں طبقہ بیکلینٹھ کے سوراؤں نے یورشلیم سے مقدس دوشیزہ کے دودھ کی بوتلیں لالاکر صلیبی افواج کے سپاہیوں کے ہاتھ من مانے اور منہ مانگے داموں بیچیں اور خوب ہی نفع کمایا۔ یہ بوتلیں ازراہ غایت ادارت و عقیدت بعض بڑے بڑے مذہبی اماکن میں مدتوں نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھی ہیں۔ لیکن دیدہ دلیری اور ڈھٹائی میں بیت المقدس کی اس خانقاہ کا درجہ شاید سب سے بڑھا ہوا تھا جس کے تبرکات میں روح القدس کی ایک انگلی بھی داخل تھی۔ اس شرم ناک بطلان پرستی کو زمانہ موجودہ نے حقارت آمیز فحوشی کے ساتھ رد کر دیا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ یہی تبرکات ہزارہا خوش عقیدہ لوگوں کی کشت ارادت کو اپنے روحانی چھینٹوں سے سیراب کرتے تھے لیکن آج وہ اس درجہ ٹپاک اور ذلیل خیال کئے جاتے ہیں کہ کسی عجائب خانہ میں بھی انہیں جگہ نہیں ملتی۔

آخر اس حمان کیا وجہ ہے جو یورپ کی امانت سے عمدہ برآ نہ ہونے کی شکل میں کلیسا کو نصیب ہوا؟ اگر روم نے یورپ کی روحانی و مادی ترقی کو حقیقت میں اپنا نصب العین قرار دیا ہوتا۔ اگر جانشین پطرس یعنی ساری دنیا کے گڈریے نے صدق دل سے واحد الغرض ہو کر اپنے گلہ کی بھینٹوں کی رکھوالی کی ہوتی اور ان کی دنیاوی آسائش اور دینی نجات کو اپنی غایت الغایات سمجھا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ کلیسا کو اس ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔

یہ وجہ بڑی آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے اور اگر اسے قلمبند کیا جائے گا تو حیا سوز معصیت کا ایک طومار تیار ہو جائے گا۔ فقرات ذیل میں ہم توجہاً جو واقعات سپرد قلم کرتے ہیں وہ کیتھولک مصنفین کی تحریرات سے ماخوذ ہیں اور ہم کوشش کریں گے کہ جہاں تک ممکن ہو ان واقعات کا اعادہ مصنفین مذکور بنی کے الفاظ میں کیا جائے۔

جو داستان ہم اب بیان کرتے ہیں اس سے معلوم ہو گا کہ کیونکر ایک جماعت متحدہ نے ترقی کرتے کرتے مطلق العنان حکومت شخصی کی شکل اختیار کر لی۔

قدیم الایام میں ہر گرجا اس توافق کی نفی کئے بغیر جو جملہ اصولی امور میں اسے کلیسائے عمومی کے ساتھ ہونا تھا اپنا انتظام کامل آزادی کے ساتھ جداگانہ طور پر خود کرتا تھا اور اپنی روایات و تادیبات کو انفرادی حیثیت سے برقرار رکھ کر ان تمام مسائل کو جنہیں کلیسائے

عمومی کے اغراض سے تعلق نہ ہوتا تھا۔ یا جن میں کوئی اصولی بحث مضر نہ ہوتی تھی خود مقامی طور پر فیصل کر دیتا تھا۔

نویں صدی کے آغاز تک یہی حالت قائم رہی اور کلیسائے روما کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہونے پائی۔ لیکن ۸۴۵ء کے قریب سینٹ اسی ڈور (ساکن ایشیلہ) کے مرتب کئے ہوئے فتاویٰ بہت کچھ تصرف و تدریس کے بعد فرانس کے مغربی علاقہ میں شائع کئے گئے۔ جن میں پاپایان زمانہ سابق کے تقریباً "ایک سو و سنی فرمان اور دوسرے حکام کلیسا کی بناوٹی تحریرات اور مسیحی کوللوں کے فیصلہ جات شامل تھے۔ ان جعلی فتاویٰ کی اشاعت نے پاپائیت کے اقتدار کو بہت کچھ وسیع کر دیا۔ کلیسائی حکومت کے پرانے طریقہ کو بدل دیا اور اسے جمہوریت کے پیرایہ سے عاری کر کے مطلق العنان حکومت کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ سب کے سب اساقف روما کے حلقہ مجوش ہو گئے اور اسقف اعظم یعنی پاپائے روما کل مسیحی دنیا کے پادریوں کا حاکم اعلیٰ بن گیا۔ ہنڈ میرٹھ (پاپائے گرگوری صالح) نے بعد میں اسی بنا پر یہ متم بالشان کوشش کی کہ دول یورپ کو ایک ربانی الاصل قیسی حکومت کی صورت میں بدل دیا جائے جس کا شہنشاہ پاپائے روما ہو۔

گرگوری صالح جو اس متم بالشان منصوبہ کا بانی تھا جانتا تھا کہ اس کی تجویز کے کامیاب ہونے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ قیسی مجالس کے ذریعہ سے کام نکالا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک فرمان اس مضمون کا جاری کیا کہ قیسی مجالس کے انعقاد کا حق پاپاؤں اور ان کے نائبوں کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ مزید تقویت کی غرض سے انسلم ساکن لکانے کچھ تو قدیم ایسڈوری منسوبات اور کچھ نوزائیدہ فتاویٰ کی بنا پر قانون کلیسا کا ایک نیا مجموعہ کیا۔ روما کی فوقیت اور برتری کے برقرار رکھنے کی غرض سے نہ صرف ایک جدید ضابطہ دیوانی و دینی کی تیاری ضروریات سے تھی۔ بلکہ ایک نئی تاریخ کا کمرڈ لیا جانا بھی لازمی تھا۔ اس تاریخ میں بادشاہوں کے تخت حکومت سے اتارے اور مسیحی برادری سے خارج کئے جانے کے فرضی واقعات اس غرض سے درج کر دئے گئے کہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ ہمیشہ سے پاپایان روما کے مطیع و منقاد تھے۔ پاپاؤں کے فرامین واجب العمل ہونے کے لحاظ سے کتب مقدسہ کی آیات کے ہر درجہ قرار دئے گئے۔ ان کوششوں کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ارض مغرب میں یہ عقیدہ عام طور سے پھیل گیا کہ مسیحیت کی ابتدا ہی سے پاپایان روما کلیسائے عمومی کے واضعان قوانین رہے ہیں۔ چونکہ مطلق العنان روا مجالس شوریہ کے روادار نہیں ہو سکتے لہذا پاپائیت نے بھی جب مطلق العنان ہونا چاہا تو قصد کر لیا

کہ بعض قومی کلیساؤں کی مجالس جو زیادہ آزاد ہو اور سرچڑھی ہیں توڑ دی جائیں اور صرف انہیں مجالس کو قائم رہنے دیا جائے جو پاپائے اعظم کی بلاواسطہ نگرانی میں ہیں۔ یہ بجائے خود ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔

آٹھویں صدی میں ایک اور روایت روما میں تراشی گئی جو بہت سے اہم نتائج کی ذمہ دار ہے۔ وہ روایت یہ تھی کہ چونکہ پاپائے سلولسٹر نے قیصر قسطنطین کو مرض جذام سے اچھا کر دیا تھا اور اصطبلخ بھی دیا تھا لہذا قیصر نے اس کے شکراء میں اٹلی اور مغربی صوبے نذرانہ کے طور پر پاپائے مقدس کی خدمت میں پیش کئے تھے اور نیز بطور اظہار اطاعت حضرت پاپا کی سائبیسی کی خدمت انجام دی تھی اور حضرت اقدس کی گھوڑے کی باگ تھام کر کچھ دور چلا تھا۔ اس تذویر کا مقصد یہ تھا کہ تاجداران فرانس اپنی اصلی قدر پہچان جائیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ جو علاقے وہ کلیسا کو دے رہے ہیں اس میں ان کا کچھ احسان نہیں ہے بلکہ محض حق کو حقدار تک پہنچا رہے ہیں۔

حکومت پاپائی کے جدید نظام کا سب سے زیادہ زبردست حربہ ”فتاوائے گریشین“ تھا۔ یہ کتاب جو بارہویں صدی کے وسط میں شائع ہوئی افترا و تذویر کا ایک بہت بڑا مجموعہ تھی۔ اس کی رو سے کل مسیحی دنیا بوساطت پاپائے روما اطالوی پادریوں کی ملکیت ہو گئی۔ اس نے یہ اصول قائم کر دیا کہ انسان کو اعمال حسہ پر غور کرنا اور ملاحظہ و مذاقہ کو عذاب دینا قتل کرنا اور ان کی جائداد قرق کر لینا جائز و مستحسن ہے۔ جو شخص مسیحی برادری سے خارج کیا جا چکا ہو اسے مار ڈالنا قتل انسان متلزم سزا نہیں ہے اور پاپائے مقدس بلحاظ اس غیر محدود برتری کے جو اسے قانون پر حاصل ہے ابن اللہ کا مہیا ہے۔

اجتماع قوت کی یہ نئی تحریک جوں جوں ترقی پذیر ہوتی گئی ان اصول کا جو زمانہ قدیم میں مثانی مسیحیت سمجھے جاتے بے محابا اعلان ہوتا گیا۔ مثلاً ”کمال بے باکی اور جسارت سے یہ دعوے کیا جانے لگا کہ کل کلیسا پاپائے مقدس کی جائداد ہے اور وہ اس سے جو کام چاہے لے سکتا ہے۔ سیمونیت دوسروں کے حق میں گناہ ہے لیکن اس کے حق میں گناہ نہیں ہے۔ وہ قانون سے بالا اور برتر از احتساب ہے۔ جو شخص اس کی نافرمانی کرے وہ گردن زدنی ہے۔ ہر اصطبلخ یافتہ شخص اس کی رعیت ہے اور خواہ وہ شخص چاہے یا نہ چاہے عمر بھر تک اس کی رعیت رہے گا۔ بارہویں صدی کے ختم تک پاپایان روما پطرس کے نائب تھے انوسٹ ثالث کے زمانہ کے بعد وہ نائب مسیح ہو گئے۔

لیکن ہر مطلق العنان فرمان روا کو خزانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس کلیہ سے

پاپایان روما مستثنیٰ نہ تھے۔ نابان پاپا کا عمدہ ہلدیر عہد کے زمانہ ہی میں قائم ہو چکا تھا۔ ان کا فرض بعض دفعہ تو یہ ہوتا تھا کہ کلیساؤں کا معائنہ و تفتیح کریں اور بعض دفعہ کسی خاص خدمت پر مامور کئے جاتے تھے لیکن ہر صورت میں انہیں ممالک آن روے کوہ الپس سے روپیوں اور اشرافیوں کی پوٹلیاں باندھ کر لانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ چونکہ پاپائے مقدس قوانین وضع کرنے کے علاوہ ان کے منسوخ و معطل کرنے پر بھی مقتدر تھا لہذا ایک قانون اس مضمون کا نافذ کیا گیا کہ جو شخص چاہے نذرانہ ادا پروانہ نقض قانون حاصل کر سکتا ہے۔ جو دیور روما کو خراج ادا کرتے تھے ان کے اختیارات میں پاپا کی طرف سے دست اندازی نہ ہوتی تھی۔ غرض پاپائے روما اسقف عالم ہو گیا۔ ہرا برشید (اسقف کا حلقہ اختیار) پاپائی حدود ارضی میں داخل تھا اور پاپا بوجہ متصادف الاختیار ہونے کے ہر مقدمہ کی مثل اپنی عدالت میں طلب کر سکتا تھا۔ اسقف کے ساتھ اس کے تعلقات وہی تھے جو ایک مطلق العنان بادشاہ کے اپنے ارکان سلطنت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ کسی اسقف کو اجازت نہ تھی کہ بغیر اس کی اجازت کے مستفی ہو اور جو ابرشیہ استعفیٰ کی وجہ سے خالی ہوتا تھا اس پر جدید اسقف کے تقرر کا اختیار بجز اس کے اور کسی کو حاصل نہ ہوتا تھا۔ اس غرض سے کہ اسے پروانہ نقض قانون کے اختیار اجرا کے استعمال کا موقع ملے عدالت ہائے ماتحت کے فیصلوں کی ناراضی سے عدالت العالیہ پاپائیہ میں اپیل دائر کرنے کی بات بات پر فریق متعلقہ کو ترغیب دی جاتی تھی۔ ہزاروں ڈگریاں بغرض قبیل جاری ہوتی تھیں۔ جن کی بدولت روما میں ڈھیروں روپیہ کھنچا ہوا چلا آتا تھا۔ جب کسی ابرشیہ کے لئے بہت سے امیدوار ہوتے تھے تو پاپا اکثر ان سب کو نکا سا جواب دے کر کسی اپنے پنچو کو اس عمدہ پر مقرر کر دیتا تھا۔ پادریوں کو بسا اوقات روما میں سالہا سال تک ملازمت کے لئے امیدواری کرنی پڑتی تھی اور وہ یا تو امیدواری کرتے کرتے دوسری دنیا کو سدھار جاتے تھے۔ اور یا یورپا بدھنا باندھ کر پاپائیت کی خباست و ارتشا کا داغ سینے پر لئے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔ جرمنی کو اس بارے میں بمقابلہ تمام دوسرے ممالک کے زیادہ رنج ناکامی برداشت کرنا پڑا اور یہی وجہ تھی کہ ختم اصلاح کی روئیدگی کے لئے یہاں کی زمین میں سب سے زیادہ قابلیت پیدا ہو گئی۔ تیرہویں اور چودھویں صدی میں پاپاؤں نے اپنے اقتدارات کو غیر معمولی طور پر بڑھا لیا۔ بجائے اس کے کہ پہلے کی طرح وہ کسی کالی شدہ ابرشیہ پر اپنے کسی منظور نظر کے مقرر کئے جانے کی سفارش کرتے اب وہ ایسے تقررات کے متعلق قطعی احکام جاری کرنے لگے۔ چونکہ ان کے اطالوی طرفداروں کی دہان دوزی

ضرور تھی لہذا بجز اس کے اور کوئی علاج نہ تھا کہ ممالک غیر میں ان کے لئے عمدے تجویز کئے جائیں۔ ایک ایک خدمت کے لئے روما میں سینکڑوں پادری امیدواری کرتے کرتے مرتے جاتے تھے۔ اور جب حضرت عزرائیل کی توجہ سے اس طور پر جگہ خالی ہوتی تھی تو پاپا اس جگہ کا انتظام استحقاقاً خود کرتا تھا۔ اول اول یہ استحقاق روما تک محدود رہا۔ بالآخر یہ دعویٰ پیش کیا گیا کہ پاپائے مقدس کو بلا تفریق و امتیاز کل کلیسائی خدمتوں کے انتظام کا حق حاصل ہے اور بیوقت تقرر اسقف کا یہ حلف اٹھانا کہ وہ پاپا کی اطاعت اور فرمانبرداری کرے گا نفسی اور سیاسی دونوں مفہوم رکھتا ہے۔ جو ممالک مثنوی الحکومت تھے ان میں اس طور پر روحانی عنصر کی طاقت بدرجہ غایت بڑھ گئی۔

پاپائی قوت کے اس اکتناز و اجتماع کے لئے ہر قسم کے حقوق نہایت بیدردی سے پامال کئے گئے۔ گدائی پیشہ راہبوں کے طبقتوں سے پاپائیت کو اس مقصد کی تکمیل میں بہت بڑی مدد ملی۔ گویا پاپا اور یہ طبقے ایک طرف تھے اور اساقف اور ان کے ماتحت پادری دوسری طرف۔ پاپائے روما کے دربار نے تمام وہ حقوق غصب کر لئے جو مجالس عامہ۔ مجالس مطرانہ (کونسل متعلق بہ دارالسلطنت)۔ اساقف اور قومی کلیساؤں کو حاصل تھے۔ چونکہ پاپا کے نائب بات بات پر دست اندازی کرتے تھے لہذا اساقف نے اپنے ماتحتین کو ان کی بے عنوان ہونے پر روک ٹوک کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اور چونکہ گدائی پیشہ راہبوں کی مداخلت حد سے بڑھ گئی تھی اس لئے دہائی پادریوں کے اختیار بالکل سلب ہو گئے اور جو رہا سہا اثر تھا اسے ان راہبوں نے پاپائی تذکرات انحراف اور پروانجات نقض قانون بیچ کر زائل کر دیا۔ ان حرام کو حلال اور ناجائز کو جائز کر دینے والی سندوں کی فروخت سے جو روپیہ وصول ہوتا تھا وہ سیدھا روما پہنچ جاتا تھا۔

مالی ضرورتوں سے مجبور ہو کر بہت سے پاپا اس ذلیل حیلہ جوئی پر اتر آئے کہ جب کسی فرمانروایا اسقف یا رئیس بیکلین کا مقدمہ پاپائی عدالت میں پیش ہوتا تھا تو اس سے کہا جاتا تھا کہ ایک جام طلائی جس میں دوکات بھرے ہوئے ہوں بطور نذرانہ پیش کرے۔ اسی قسم کی ضرورتیں۔ جشن جوئی کے انعقاد کی مجھک ہوئیں۔ پاپائے سکس رابع نے بہت سے جدید عمدے قائم کئے اور ہر عمدہ بحوض تین یا چار سو دوکات کے فروخت کر ڈالا۔ پاپائے انوسنٹ ثامن نے اکلیل پاپائی رہن رکھا۔ پاپائے لیوہم کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین پاپاؤں کی آمدنی اڑا ڈالی یعنی جو رقم اس کا پیٹرو خزائنہ میں چھوڑا تھا اول تو اس پر ہاتھ صاف کیا اس کے بعد اپنی دولت پر دست تہذیر دراز کیا اور جب یہ بھی کافی نہ ہوئی

تو اپنے جانشین کے حرقہ مداخل کو پہلے سے وصول کر کے لیکھا چوکھا برابر کر دیا۔ اس نے دو ہزار ایک سو پچاس جدید خدمتیں قائم کر کے فروخت کیں۔ مشتبہوں کے لئے روپیہ لگانے کی اس سے بہتر ترکیب نہ تھی۔ اس لئے کہ اصل سرمایہ پر بارہ فیصدی سود کہیں گیا ہی نہ تھا۔ اس سود کے استحصال کے لئے وہ ممالک موجود تھے جہاں کیتھولک مذاہب رائج تھا یورپ بھر میں کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں سرمایہ اس قدر با منفعت طور پر لگایا جاسکتا ہو جیسے روما میں۔ اخلاق الزہن کے ذریعہ سے اور نیز عہدوں کو نہ صرف ایک دفعہ بلکہ مکرر فروخت کر کے بڑی بڑی رقیں وصول کر لی جاتی تھیں۔ عہدہ داروں کا اضافہ اس غرض سے کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے عہدہ کو دوبارہ بیچ ڈالیں۔

اگرچہ سود خواری پاپائی اجتہاد کی رو سے ممنوع تھی لیکن پھر بھی پاپائی عدالت العالیہ کے متعلق ایک بہت بڑا جک قائم ہو گیا تھا جو پادریوں ملازمت کے امیدواروں اور اہل مقدمہ کو نہایت سخت شرح سود پر روپیہ قرض دیتا تھا۔ پاپائی مہاجنوں کے لئے تو گویا سود لینا مباح تھا اور باقی سود خوار مطرود و درمرد تھے۔ پاپائی عدالت العالیہ کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ بھر کے پادری اگر اس کے مقروض ہوں گے تو پاپائیت کی اغراض کو بہت کچھ نفع ہو گا اس لئے کہ عدالت ان پر من مانا دباؤ ڈال سکے گی اور اگر وہ دباؤ نہ مانیں گے تو عدم ادائے سود کی علت میں انہیں کلیسا کے حلقہ سے خارج کر سکے گی۔ ۱۳۳۷ء میں جب حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ نصف مسیحی دنیا حلقہ کلیسا سے خارج ہو چکی ہے۔ اساتف کا اخراج اس لئے عمل میں آیا کہ وہ پاپا کے تابوں کے مطالبات سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تھے اور عام اشخاص اس لئے خارج کئے گئے کہ وہ مجبور ہو کر تذکرات لغفران یا اجاز نامجات نقض قانون خریدیں اور پاپائی کارندوں کو ان کی منہ مانگی قیمت ادا کریں۔ تمام یورپ کے قسبی مداخل روما کی طرف کھنچے ہوئے چلے جاتے تھے جو ارتشا۔ سیمونیت۔ سود خواری۔ بددیانتی اور استحصال بالجبر کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ۱۶۶۶ء سے جو تحریک اجتماع و اکتاز قوت کی تاریخ آغاز ہے۔ پاپاؤں نے اپنے خاص گلے کی بھیڑوں کی دیکھ بھال بالکل چھوڑ دی تھی یعنی روما کی آبادی کی روحانی عورت پرداخت اور کلیسائے روما کے اندرونی انتظامات کی طرف توجہ کرنے کی انہیں مطلق فرصت نہ تھی۔ ممالک غیر کے ہزاروں معاملات جن میں سے ہر ایک بجائے خود بہت بڑا ذریعہ آمدنی تھا انہیں ہر وقت مصروف رکھتے تھے۔ اسقف الیورڈیلاو کا بیان ہے کہ ”میں جب کبھی ایوان عدالت العالیہ پاپائیہ میں داخل ہوتا تھا تو ارکان عدالت یعنی پاپا کے گماشتوں کو اشرفیاں گنتے ہوئے پاتا تھا جن کے ڈھیر کے ڈھیر ہر طرف لگے رہتے

تھے۔ ”پیائی عدالت کی حدودارضی کی توسیع کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا تھا۔ قانون سے مستثنیٰ کرنے کا ڈھنگ ایسا ڈالا گیا تھا کہ جو شخص مستثنیٰ ہوتا تھا اسے ہر وقت ایک نیا استثنا حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اساقف کو مجمع الاکلیروس کے مقابلہ میں خاص خاص رعایتیں حاصل تھیں۔ تو مجمع الاکلیروس بھی بمقابلہ اساقف خاص رعایات سے مستفیض تھا۔ علیٰ ہذا القیاس اساقف خانقاہیں عام اشخاص نابینا پیایا کے استحصال سے مستثنیٰ تھے۔ غرض استثنا کا یہ سلسلہ پیائے مقدس کی خواہش جلب منفعت کی طرح کیس ختم ہوتا ہی نہ تھا۔

پیائیت کا مدار اب جن دو طاقتوں پر تھا ان میں سے ایک نوکریٹالون کی مجلس تھی اور ایک ”کیوربا“ یعنی عدالت العالیہ پیائیہ۔ ۱۰۵۹ء میں پیایا کا انتخاب کردیٹالون کی کثرت رائے سے ہونے لگا۔ اس سے پہلے یہ انتخاب کل رومن کیتھولک پادریوں کی طرف سے عمل میں آتا تھا اور روما کے مجسٹریٹوں اور سرر آوردہ باشندوں کا استصواب بھی لازمی ہوتا تھا۔ لیکن پیائے کولس مانی نے حق انتخاب کو مجلس کردیٹالان کی آرا کے دو ٹکٹ پر محدود کر کے توثیق انتخاب کا حق شہاہ جرمنی کو عطا کر دیا۔ تقریباً دو سو سال تک کردیٹالون کی حکومت مختصہ و مجتمہ اور پیایا کی حکومت مطلقہ و منفردہ میں ایک دوسرے پر غالب آنے کے لئے کشمکش ہوتی رہی اور آپس میں خوب خوب داؤن بیچ ہوئے۔ کردیٹال اس بات پر تو راضی تھے کہ پیایا کی حکومت خارجہ مطلق العنان ہو اور اس کے اقتدارات کے اس شعبہ میں مطلق دست اندازی نہ کی جائے۔ لیکن بوقت انتخاب اس کے موافق رائے دینے سے پہلے وہ اس سے یہ اقرار لے لیتے تھے کہ حکومت میں ان کو بھی ایک خاص حصہ دیا جائے گا۔ انتخاب کے بعد اور رسم تطہیر کے ادا ہونے سے پہلے وہ خاص خاص مراعات پر کاربند ہونے کی قسم کھاتا تھا مثلاً ”یہ کہ مداخل میں کردیٹالون کو بھی شریک کرے گا ان کو برطرف نہ کرے گا اور سال میں دو مرتبہ اس بحث کے لئے ان کی مجلس کے منعقد ہونے کی اجازت دے گا کہ آیا وہ اپنے عہد و بیان پر قائم رہا ہے یا نہیں۔ لیکن پیایا اپنے عہد پر کبھی قائم نہ رہے اور متواتر بیان کھنی کے مرتکب ہوئے۔ کردیٹال چاہتے تھے کہ کلیسائی حکومت اور آمدنی میں انہیں زیادہ حصہ ملے لیکن پیایا قوت اور دولت کی اس علیحدگی کے کسی طرح روادار نہ تھے۔ کردیٹالون کی آرزو تھی کہ محکومہ و طمطراق اور اسراف و تہذیر میں سرر آوردہ نظر آئیں اور اس کے لئے ظاہر ہے کہ رقم خیرہ درکار تھی۔ ان میں سے ایک کے اختیار میں ایک دفعہ پانچ سو عہدے تھے۔ ان کے اعزاء و اقربا اور ملازمین و متوسلین کا

کفل بھی لازمی تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مملکت فرانس کی پوری آمدنی بھی ان کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہوتی تھی۔ بعض دفعہ ان کی رقاہتوں کی وجہ سے سالہا سال تک کسی پاپا کا انتخاب نہ ہوتا تھا۔ گویا اپنے اس طرز عمل سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ نائب مسیح کے بغیر بھی کلیسا کا کام باسانی چل سکتا ہے۔

گیارہویں صدی کے خاتمہ پر کلیسائے روم دربار روم ہو گیا۔ بجائے اس کے کہ مسیحی بھڑیس میاہی ہوئی اپنے گڈریے کے پیچھے پیچھے روم کے مقدس باڑے میں بھرتی ہوئی نظر آئیں۔ محروم کارندوں مصلوں اور نوشتہ جات داد و سند کی تصدیق کرنے والے عمدہ داروں کا ایک محکمہ قائم ہو گیا۔ جس میں مراعات ناموں تذکرات انفران اور استناؤں کا لین دین ہوتا تھا اور اہل مقدمہ ہاتھوں میں عرنیاں لئے میٹھہ بیٹھہ بھرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ روم ہر قوم و ملک کے امیدواران ملازمت کا نقطہ اجتماع بن گیا تھا۔ دینی ڈگریوں پاپائی نوازش ناموں عفو و غفران کے تذکروں ارتکاب گناہ کے اجازت ناموں، فرمانوں اور فیصلوں کے طومار نے جو یورپ اور ایشیا کے ہر حصہ کے لوگوں کے نام شب و روز جاری رہتا تھا کلیسائے مقامی کے فرائض اور ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال دیا سینکڑوں ایسے اشخاص اس خدمت کی بجا آوری پر مامور تھے جو سکونت ہی ”کیوریا“ میں رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ پاپائی خزانہ کی آمدنی کی توفیر سے مستحق ترقی قرار پائیں۔ تمام مسیحی دنیا ”کیوریا“ کی باج گزار ہو رہی تھی۔ مذہب کا یہاں نام و نشان تک باقی نہ تھا۔ ”کیوریا“ کے عمدہ داروں کو سیاسی مباحث، فصل حضرات اجرا و قیل ڈگریات دینی سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ روحانی امور میں اپنا وقت ضائع کریں، ہر کشش قلم کی ایک خاص قیمت مقرر تھی۔ تذکرات انفران اجازت نامجات نقص قانون۔ سندات نجات۔ پروانہ جات حلت محرمات و ممنوعات کی خرید و فروخت، مال تجارت کی طرح ہوتی تھی۔ اہل مقدمات کو چہرہ اسی سے لے کر پاپا تک سب کی مٹھی گرم کرنی پڑتی تھی۔ ورنہ مقدمہ جیتنا محال تھا۔ غیر مستطیع لوگوں کو نہ ترقی مل سکتی تھی اور نہ ملنے کی امید تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر پادری یہ سمجھنے لگا کہ اسے روم کی مثال کی تقلید کا حق حاصل ہے اور اپنے مقتدیوں کی روحانی تواضع اور عشائے ربانی کے ذریعہ سے جائز و ناجائز طور پر جس قدر روپیہ بھی وصول ہو سکتا ہے وصول کرنا چاہئے۔ جلب منفعت کا یہ استحقاق اس نے روم میں وہ رقم ادا کر کے خریدا تھا جو مہاجن سے قرض لی گئی تھی۔ اگر اس طور پر روپیہ نہ وصول کیا جاتا تو یہ قرض کیونکر ادا ہوتا۔ جب ”کیوریا“ کا مستقر روم سے ایونٹائن میں منتقل ہوا اور اطالویوں کی طاقت فرانسیسیوں کے پاس چلی گئی۔ تو پھر بھی قدیم حالت بدستور قائم رہی۔ فرق صرف اتنا ہوا

کہ اطالیوں کو بھد حسرت معلوم ہوا کہ سونے کی چڑیا ان کے ہاتھ سے اڑ کر فرانسیسی اڈے پر جا بیٹھی ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات ساگنی تھی کہ پاپائیت ان کا موروثی حق ہے اور جس طرح شریعت موسویؑ کے دور میں یہودی خدا کے خاص بندے تھے اسی طرح شریعت عیسویؑ کی رو سے خدا کا فیضان خاص انہیں پر نازل ہوا ہے۔

تیرہویں صدی کے خاتمہ پر ایک جدید مملکت دریافت ہوئی جس میں بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہونے کی قابلیت موجود تھی اس مملکت کا نام مطبر تھا۔ محل کے اندھوں اور گانٹھ کے پوروں کو یہ یقین دلا دیا گیا کہ حضرت پاپا اس سرزمین کی گناہگار آبادی کو تذکرات انحراف کے اجرا سے خالی فرما سکتے ہیں۔ اس کے لئے کسی دام تذویر کا بچھایا جانا ضروری نہ تھا۔ دن دہائے لوگوں کی چشم اعتقاد میں خاک جمو کی جاتی تھی۔ غرض اسٹی طاقت کے ابتدائی جراثیم نے نشوونما پا کر رفتہ رفتہ ایک بہت بڑی زبردست محضی سلطنت کی شکل پکڑ لی۔

حکمران اصحاب عقائد نے پاپائی قوت کو ایسا زبردست بنا دیا کہ اس کی مزاحمت و مداخلت محال ہو گئی۔ جو شخص مخالفت کرتا تھا آگ میں زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ کسی شخص کے دل میں مخالفانہ خیال کا ناشی ہونا عام اس سے کہ اس خیال کا اظہار کسی خارجی علامت سے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو جرم سمجھا جاتا تھا۔ جون جون زمانہ گزرتا گیا حکمران اصحاب عقائد کا طرز عمل زیادہ وحشیانہ ہوتا گیا۔ محض شبہ کی بنا پر ملزم کو کھجھ کی سزا دی جاتی تھی۔ ملزم کو الزام لگانے والے کا نام تک نہ بتایا جاتا تھا۔ اسے کسی قانون دان شخص سے مشورہ لینے کی اجازت تک نہ دی جاتی تھی۔ اس حکمران کے فیصلے کی نہ داد تھی نہ فریاد۔ افسران حکمران یعنی ارکان اصحاب کو حکم تھا کہ رحم و انیت کو دل میں مطلق نہ آنے دیں۔ ملزم کا عقائد منسوب سے توبہ کرنا بھی بے سود لا حاصل تھا۔ ملزم کے ناکرہ گناہ خاندان کا مال و اسباب ضبط کر لیا جاتا تھا۔ جس میں سے آدھا پاپا کے خزانہ میں چلا جاتا تھا اور آدھے سے ارکان اصحاب اپنے دوزخ کی تواضع کرتے تھے۔ پاپائے انوسٹ ثالث کا قول تھا کہ ملاحدہ کی اولاد کی صرف جان بخشی کرنی چاہئے اور وہ بھی محض بہ تقاضائے رحم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کولس ثالث کے سے ڈاکو پاپاؤں نے اس مقدس عدالت کی لوٹ کے مال سے اپنے خاندانوں کو نہال اور مالالال کر دیا اور ارکان اصحاب کو تو ہر روز اس کی بدولت ترلھے ملتے رہتے تھے۔ پاپائیت کے قبضہ کے لئے فرانسیسیوں اور اطالیوں میں جو جدوجہد ہوئی وہ چودھویں صدی کے مشہور مذہبی تفرقہ کی ذمہ دار ہے۔ چالیس سال تک دو رقیب پاپا ایک دوسرے پر سب و شتم کرتے رہے اور وہ رقیب پاپائی عدالتیں بہ تقاضائے جلب منفعت اقوام یورپ کو

جو تک بن کر چھٹی رہیں۔ بالاخر پاپاؤں کی تعداد دو سے بڑھ کر تین ہو گئی اور استعمال امرو اوائے خراج ربانی کے لئے تین جداگانہ مرکز قائم ہو گئے۔ لوگوں کی ارادت و عقیدت صنفطہ میں پڑ گئی۔ وہ حیران تھے کہ کس پاپا کو اصلی اور سچا نائب جناب مسیح کا تصور کریں اور عشائے ربانی و سرائقندوس جیسی پاک مذہبی رسوں کی تطہیر کے متعلق کس سے اور کیوں کر استناد کریں۔ مسیحی انجمن میں جائز مجتہدانہ قیاس کی کرسی صدارت خالی تھی۔ ہر شخص مجبور تھا کہ اپنا مجتہد خود بنے۔ لوگوں کو معلوم ہونے لگا کہ کلیسا کے پاؤں میں عدالت العالیہ پاپائیہ کی جو زنجیر پڑی ہوئی ہے اس کا ٹوٹنا اور ایک مجلس عمومی کا قائم ہونا کلیسا کی سلامتی کے لئے ضروریات سے ہے چنانچہ مجلس عمومی کے قیام کی کوشش بار بار کی گئی۔ اس کوشش کی غایت یہ تھی کہ اس مجلس کو مسیحی دنیا کی پارلیمنٹ بنا دیا جائے جس کا اعلیٰ عہدہ دار انتظامی پاپا ہو۔ لیکن وہ ذاتی اغراض اور نفسانیتیں جو مدت ہائے مدید کے فائیم و مفاسد کا نتیجہ تھیں کیوں کر یک بیک علاج پذیر ہو سکتیں۔ عدالت العالیہ پاپائیہ کا بازار پھر گرم ہو گیا اور پادریوں کا وہی اگلا سا تجارتی لین دین پھر شروع ہو گیا۔ اہل جرمنی نے جنہیں عدالت العالیہ پاپائیہ کے اقتدارات میں کبھی حصہ نہ ملا تھا اصلاح کی ان کوششوں میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن جب حالت بد سے بدتر ہوتی چلی تو ان کو بھی ماننا ہی پڑا کہ مجالس عمومی کے ذریعہ سے اصلاح کینہ کی توقع رکھنا لاجا حاصل ہے۔ چنانچہ ارسس کی زبان سے بے اختیار یہ کلمات نکلے کہ ”اگر مسیح اپنے بندوں کو اپنی گوناگوں نفیس مظالم سے نجات نہ دلائیں گے۔ تو ترکوں کے ظلم کی سختی کم ہو جائے گی۔“ غرض کلیسا کی حالت اس درجہ ابتر ہو گئی تھی کہ کرویٹلون کا منصب علانیہ فروخت ہونے لگا تھا اور پاپائے اگرہم کے عہد میں تو ہر نفیس و مذہبی خدمت نیلام ہوتی تھی۔ زندگی کا اصول موضوعہ یہ ہو گیا تھا کہ اول دولت بعدہ عزت۔ عہدہ داروں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو آنکھ سے اوجھل ایماندار ہو یا گواہ لائے بغیر پاکبازی کا ادا کر سکے۔ کرویٹلون کے ارغوانی رنگ کی عملی عباہیں اور سفید سنجاب کے طبلستان دھوکے کی ٹٹی ہو رہے تھے جن کی آڑ میں کوئی خباثت نہ تھی جس کا یہ بزرگوار ارتکاب نہ کرتے ہوں اور کوئی گناہ نہ تھا جو ان حضرات سے صادر نہ ہوتا ہو۔

کلیسا کی وحدت (اور اس لحاظ سے اس کی طاقت) اس امر کی متقاضی تھی کہ لاطینی کا استعمال بطور زبان مقدس عام طوع سے ہو۔ لاطینی ہی کے استعمال کے بدولت روم یورپ کا جزو لاینفک بنا رہا اور تعلقات بین الاقوام کے قائم رکھنے میں کامیاب ہوا۔ لاطینی زبان کے بین الاقوامی استعمال نے روم کو جو قوت بخشی اس کے مقابلہ میں ان اقتدارت کے اثر کی

کوئی ہستی نہیں۔ جن کے سادہ الاصل ہونے کا پاپائیت کو ادعا تھا اور اگرچہ اس کو اپنے کارناموں پر بہت بڑا ناز ہے لیکن وہ اس الزام سے کسی طرح بچ نہیں سکتی کہ باوجود اتنی بڑی طاقت کے جو آئندہ اس کے کسی جانشین کو حاصل نہ ہو سکے گی اس نے کچھ اس سے بھی زیادہ کیوں نہیں کر دکھایا۔ اگر پاپایان روم اپنی ہوس رانیوں اور دنیا پرستیوں میں جھلا نہ ہوتے تو وہ اس بات پر قادر تھے کہ ان کے ایک اشارہ پر تمام براعظم بالاشفاق ایسی ترقی کرتا کہ دنیا دنگ رہ جاتی۔ ان کے نائب بے روک ٹوک ہر ملک میں جاسکتے تھے اور آئرلینڈ سے لے کر بوہیمیا اور اٹلی سے چل کر اسکاٹ لینڈ تک بلا تکلف آپس میں بات چیت کر سکتے تھے۔ ایک زبان ہونے کی وجہ سے وہ بین الاقوامی امور کے نظم و نسق میں دخل ہو گئے تھے اور ہر ملک میں انہیں ایسے ہوشیار اور معاملہ فہم حلیف ہاتھ آ گئے تھے جو ایک ہی زبان بولتے تھے اور مہمات الامور میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار تھے۔

ایسی حالت میں یونانی زبان کے احیا اور عبرانی زبان کی ترویج پر روم نے جس نفرت و عداوت کا اظہار کیا وہ کچھ بے وجہ نہ تھا اور جو تشویش اسے یہ دیکھ کر دامنگیر ہوئی کہ السنہ جدیدہ کی دیوار گنوار بولیوں کی بنیاد پر چنی جا رہی ہے وہ بیجا نہ تھی۔ پیرس کے مدرسہ الہیات کے اس تردد آمیز استفسار کو کہ اگر یونانی و عبرانی کے پڑھنے کی اجازت دی جائے گی تو مذہب کا کیا حشر ہو گا۔ اگرچہ کورنٹال زمیز کے عہد کے خیالات کی گونج سے تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن اس کی تہ میں ایک حقیقی خدشہ بھی مضمر تھا۔ لاطینی کے رواج عام پر روم کی طاقت کا انحصار تھا۔ اس کے انحطاط کے ساتھ اس کا زوال وابستہ تھا۔ اس کے عدم استعمال کے یہ معنی تھے کہ روم کی حد اثر اٹلی کے ایک چھوٹے سے صوبہ تک محدود ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپین زبانوں کی ترقی روم کی بربادی کا باعث ہوئی ہے۔ یہ زبانیں گردائی پیشہ راہیوں اور ان پڑھ عوام الناس کے درمیان تبادلہ خیالات کا موثر ذریعہ بن گئیں اور ان میں سے ایک زبان بھی ایسی نہ تھی جس نے اپنی اولین تصانیف میں روم کو نشانہ حقارت و آجگاہ ملامت نہ بنایا ہو۔

غرض یورپ کے مختلف الاسنہ لڑیچ کی ترقی پاپائی مسیحیت کے زوال کی ہمعصر ہے۔ پاپائی عہد حکومت میں ناممکن تھا کہ یورپ کا لڑیچ وجود میں آسکے اس لئے کہ مذہبی وحدت علی وحدت کی متقاضی تھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ صرف ایک ہی علی زبان ہر جگہ رائج ہو۔

اگرچہ ایک زبان واحد کے مالک ہونے کی وجہ سے کلیسا کی قوت میں ایسا حیرت انگیز اضافہ ہو گیا لیکن اس کی طاقت کا اصلی راز اس دسترس میں پوشیدہ تھا جو اس نے نہایت

چالاکی سے لوگوں کی خانگی زندگی پر حاصل کر لی تھی۔ اس کے فہدان کے ساتھ اس کا اثر بھی گھٹ گیا اور ساتھ ہی بین الاقوامی امور میں اس کی سیاسی مداخلت بھی برائے نام رہ گئی۔

مسیحیت سے پہلے جب تاجداران روما کا نیر اقبال نصف النہار پر تھا تو سلطنت کے صوبوں میں جہاں رومی افواج کی چھاؤنیاں قائم ہوتی تھیں وہ سب مقامات تہذیب و شائستگی کے مرکز بن جاتے تھے۔ صنعت و حرفت اور امن و امان کی جو حالت ان مقامات میں پائی جاتی تھی اس کی مثال گردولواح کی وحشی اقوام پر جو برطانیہ فرانس اور جرمنی میں آباد تھیں اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہی اور اگرچہ حکام روما کا یہ فرض نہیں تھا کہ اقوام مفتوحہ کی فلاح و بہبود میں نمایاں دلچسپی ظاہر کریں بلکہ ان کا قائدہ اسی میں تھا کہ ان اقوام کی حالت ذلیل رہے۔ کیونکہ ہستی حالت حلقہ گبوشی و اطاعت کیشی کی مدد و معاون ہوتی ہے لیکن پھر بھی رعایا کی تمدنی و معاشرتی حالت میں منفرا و "بجتمعا" برابر اصلاح ہوتی گئی۔

جب روما میں پادریوں کا دور دورہ ہوا تو اسی قسم کے نتائج خود بخود ظہور میں آنے شروع ہوئے۔ ہیر و نجات میں فوجی چھاؤنیوں کی جگہ دیر قائم ہو گئے۔ گاؤں یا شہر میں گرجا روشنی اور تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اول الذکر کے سامان عیش و عشرت اور ثانی الذکر کے مواعظ و نصائح نے لوگوں پر ایک زبردست اثر ڈالا۔

خاندانوں کے نظام معاشرت کی تنظیم۔ حکومت ملکی کے ضابطہ کی تعمین اور دول یورپ کی ترکیب میں پاپائیت کے طرز عمل نے جو حصہ لیا اس کے محاسن پر نظر ڈالتے وقت ہم اس امر کو فراموش نہیں کر سکتے کہ ایسی حکمت عملی کا خاص مقصد اصلاح تمدن نہ تھا بلکہ اعلائے کلیسا تھا۔ پس دنیا دار لوگوں کو جو فوائد پہنچ گئے وہ مقصود بالذات و معبود بالہامیت نہ تھے بلکہ ذیلی و اتفاقی تھے۔

اقوام کی مادی حالت کی اصلاح و ترقی کے لئے کوئی نتیجہ خیز و مستقل بالذات تدبیر پاپاؤں کی طرف سے اختیار نہیں کی گئی۔ ان کے نشوونمائے عقلی کے لئے کوئی طریقہ عمل میں نہیں لایا گیا اور انہیں پڑھ بلکہ جاہل مطلق رکھنے کی کوشش کی گئی۔ صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی گئیں لیکن کسانوں کی حالت کھیت کے چپایوں سے بہتر نہ ہونے پائی۔ وسائل نقل و حرکت اور ذرائع رسل و رسائل کو جو توسیع خیالات کے مدد و معین ہوا کرتے ہیں جامد و غیر متحرک رہنے دیا گیا۔ آبادی کا اکثر حصہ ایسا تھا جسے ساری عمر اپنے گھر سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق نہ ہوا۔ اس بد نصیب طبقہ کو نہ اصلاح حالت کی امید تھی نہ کسی ترقی

کی توقع۔ افلاس کے سدباب اور قحط کے اندفاع کے لئے بڑے پیمانہ پر کوئی تجویز نہ سوچی گئی۔ دبا کو اجازت تھی کہ کھلے بندوں جہاں چاہے پھرے اور جس شہر پر چاہے چھاپے مارے۔ بہت ہی روک ٹوک ہوئی تو کسی پادری نے دو چار لاطینی دعائیں بڑھا دیں۔ بری خوراک ناقص لباس اور ناکافی مکان برابر اپنا اثر کئے چلے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہزار سال کے بعد یورپ کی آبادی دگنی بھی نہ ہونے پائی۔

اگر کسی حکومت کا فن تدبیر مملکت پیدائش کو روکنے اور اموات کا باعث ہونے کے اعتبار سے قابل مواخذہ ٹھہر سکتا ہے تو پاپائیت پر کتنا بڑا مواخذہ عائد ہوتا ہے۔

کیتھولک مذہب کے اس عام اثر کی تنقید کرتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے اپنے آپ کو تو خیر جو کچھ نفع پہنچایا وہ ظاہر ہے لیکن اس کے مقابلہ میں دوسروں کے ساتھ کیا بھلائی کی ہے۔ راہب کی خانقاہ کی شاندار تصویر پردہ تصویر پر کھینچی۔ اس میں عیش و عشرت اور راحت و آسائش کا ہر ایک سامان ہمیں نظر آئے گا۔ ترشی ہوئی گھاس کے زمردیں تختے پھولوں کے چمن۔ میوہ دار درختوں کے حدیقے اچھلتے ہوئے فوارے۔ ترنم آفرین نہیں بھی کچھ پاؤ گے۔ لیکن ان نعمتوں کا تعلق پچارے و بازوہ کسان سے نہ ہو گا جو کسی دلدل کے کنارے ایک ٹوٹے چمچر کے نیچے بے یار و مددگار سسکیاں بھرتا ہوا دم توڑ رہا ہو گا بلکہ ان کا تعلق خانقاہ کے سجادہ صاحب سے ہو گا جن کے ٹانگن کی بھلبھل جن کی ترمیمتوں۔ شکروں اور تازی کتوں کی صید اگنی جن کے نعمتخانہ اور نغمانہ کے اطعمہ لذیذہ و اشربہ نفیسہ کی حکایت سے تاریخ کے ورق بھرے پڑے ہیں۔ یہ عیش پرست راہب اسی مذہبی نظام کا ایک جزو لاینک ہے۔ جس کا مرکز اٹلی ہے۔ وہ روما کا با بکزار اور مطبخ و منقاد ہے اور اس کا کوئی فصل ایسا نہیں ہوتا جس سے روما کے فوائد کا کوئی پہلو نہ لکھا ہو۔ جب ہم اس زمانہ کے عالیشان گرجاؤں اور کیساؤں پر نظر دوڑاتے ہیں جن کا شمار فن تعمیر کی معجز نمائی کے کرشموں میں ہے اور جنہیں دیکھ دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ پاپائیت کے حقیقی معجزات یہی عمارتیں ہیں اور جب ہم ان مہتمم بالشان اور دل پر رعب طاری کرنے والے مذہبی مراسم کو جو ان گرجاؤں میں ادا کئے جاتے تھے۔ اس دھندلے نور کو جو رنگ رنگ آئینوں والے دریچوں میں سے چھٹتا تھا۔ ان سریلی آوازوں کو جن کے الاپ کی سامعہ فریبی ملائک کے نفوس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ان پادریوں کو جو اپنے مقدس نعت ہائے فاخرہ زیب تن کئے ہوئے تھے اور سب سے زیادہ ان سرسبز عبادت گزاروں کو جو ایک اجنبی اور نامعلوم زبان میں دعائیں اور نمازیں سن رہے ہوتے تھے۔ غرض جب ہم

اس تمام عالیشان مذہبی نظام کو اپنے تصور میں لاتے ہیں تو بے اختیار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ عبادت گزاروں کی روحانی فلاح کی خاطر تھا یا روم کی زبردست اور ہمہ گیر طاقت کا پایہ جلال و عظمت اور بھی اونچا کرنے کی غرض سے؟

لیکن شاید کوئی شخص اس کے جواب میں یہ کہے کہ انسانی مساعی محدود ہیں۔ بعض امور ایسے ہیں جنہیں کوئی سیاسی نظام اور کوئی انسانی طاقت خواہ اس کا ارادہ کیسا ہی ٹیک کیوں نہ ہو انجام نہیں دے سکتی۔ انسان وحشیانہ حالت سے ترقی کر کے دفعتاً شائستہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ایک وسیع براعظم ایک ہی دن میں مذہب نہیں ہو سکتا۔

یہ سب سچ ہے مگر پاپائیت کے جانچنے کے لئے اس قسم کا معیار پہلے ہی مقرر نہیں کیا گیا۔ کیتھولک طاقت کی نسبت جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ وہ ازراہ غایت استحقار انسانی الاصل ہونے سے منکر ہوئی بلکہ اس وقت تک منکر ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کا ماخذ ربانی ہے اور اس کو الوہیت کے ساتھ بلا واسطہ نسبت ہے۔ پاپائے اعظم غلیتہ اللہ فی الارض ہے۔ اس کا اجتہاد خطا سے پاک ہے۔ اس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ اگر ضرورت آ پڑے تو معجزے کے ذریعے سے ان ہونی بات کو ہونی کر دکھائے۔ ایک ہزار سال تک اس نے یورپ کے عقل و ادراک پر جابرانہ اور قاہرانہ حکومت قائم رکھی اور اگرچہ بعض تاجداروں نے سرکشی کی راہ سے کبھی کبھی اس کی مخالفت کی۔ لیکن مجموعی حیثیت سے یہ مخالفت ایسی بے حقیقت تھی کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یورپ کے حل و عقد و بست و کشاد کا مدار علیہ پاپائے روم ہی تھا۔

جو واقعات اس فصل میں بیان کئے گئے ہیں ان پر بلاشبہ سولہویں صدی کے پرائسٹس علم برداران اصلاح کی نظر غائر پڑ چکی تھی اور وہ یہ نتیجہ نکال چکے تھے کہ رومن کیتھولک مذہب اپنے فرائض مذہبی کی انجام دہی سے بالکل عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ بلکہ ضلالت افزا اور ریاکاری کا مجموعہ بن گیا ہے۔ پس یحییٰ مسیحیت کے احیاء کی صرف یہی شکل ہے کہ قرون اولیٰ کے عقائد و مراسم کو ازسرنو تازہ کیا جائے۔ اس فیصلے پر حامیان اصلاح خلعت و ہفتہ نہیں پہنچے تھے۔ ایک مدت ممتد سے بہت سے پیشوایان مذہب اور روشن خیال علماء فضلا کی یہی رائے تھی۔ چنانچہ ازمنہ و سہلی میں فرانسسکن طبقہ کے متقی اور پرہیزگار راہب اس خیال کو صاف طور سے ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکے کہ روم کے ایک قیصر کی لن ترانیوں نے سچے مذہب کا خاتمہ کر دیا۔ غرض اصلاح کے لئے مواد ایک عرصہ سے تیار ہو رہا تھا۔ سرنگ بچائی جا چکی تھی۔ صرف حق دکھانے کی دیر تھی۔ لوتھر کی آواز کا بلند ہونا تھا کہ تمام

شمالی یورپ نے فیصلہ کر لیا کہ مریم عذرا کی پرستش۔ اولیا سے مراد طلبی۔ معجزہ نمائی۔ مریضوں کا کراماتی علاج۔ ارکتاب گناہ کے لئے تذکرۃ الغفران کی خرید اور پاپا پرستوں کی مٹی گرم کرنے والے باقی کے تمام ان اعمال سیہ کا جو عیسائیت سے منسوب کر دئے گئے تھے۔ لیکن اس سے حقیقت میں تعلق نہ رکھتے تھے یک قلم خاتمہ کر دیا جائے۔ کیتھولک مذہب کو ایک ایسی طاقت ہونے کی حیثیت سے جس کی عامت فلاح و ترقی انسان تھی اپنے اس دعوے میں کہ اس کا طرز عمل مطل بہ تائید آسمانی ہے صاف ناکامی ہوئی۔ اس کے کارناموں اور اس کے ادعاؤں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک ہزار سال تک اسے انسان کی اصلاح حالت کا موقع دیا گیا۔ لیکن جب اس کی کارگزاری کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ بنی نوع انسان کی جس جماعت کثیر کو اس کے حوالہ کیا گیا تھا اس کی حالت جسمانی و عقلی ترقی کے اعتبار سے اس حالت کے مقابلہ میں بہت ہی پست تھی جس میں یہ جماعت پائی جانی چاہئے تھی۔

لے پروفیسر اڈورڈ ٹیلر فیو آف دی رائل سوسائٹی اپنی کتاب ”اتھنولوجی“ (علم الانسان) کے صفحہ ۲۳۳ پر ترقی فن تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج کل پتھر کی عمارت کے طریقہ تعمیر کے متعلق ہمارا عام خیال یہی ہے کہ پتھر کی سلوں کو جوڑنے کے لئے ان کے درمیان چوڑے یا گچ کی ایک تہ بچا دی جائے لیکن مصر اور یونان قدیم کی خوبصورت شاندار عمارتوں کو جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں خشک چٹائی کا رواج تھا۔ سلیں تلے اوپر چن دی جاتی تھیں اور ان کی پیوٹگی کے لئے چوڑے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ ہاں جب پتھروں کو خاص طور سے جوڑنا منظور ہوتا تھا تو دہات کے قبضے استعمال کئے جاتے تھے۔ مترجم

تہ نکولو کیاولی پاپائے لیوڈیم کا معاصر اور پندرہویں صدی کے مشاہیر اہل تدبر سے ہے۔ لیکن اگرچہ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا فلسفی اور سب سے بڑا تدبر سمجھا گیا ہے پھر بھی اس کی شہرت قاتل رشک نہیں خیال کی جاتی۔ اس لئے کہ اس نے فن تدبیر مملکت اور حکمت عملی کی بنیاد بے ایمانی۔ چالاک۔ بدعہدی اور بے اصولی پر رکھی ہے۔ اسی لئے اس کا نام غدارانہ چال بازی کا مترادف ہو گیا ہے۔ لارڈ میکالے کیاولی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لوگ اس کے اصل نام سے بد معاش اور اس کے مسیح نام سے شیطان مراد لینے لگے۔ مترجم

تہ لیوپولڈوان اینکی زانہ حال کا ایک بہت بڑا جرمن مورخ۔ ۱۷۹۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۶ء میں وفات پائی۔ اس کی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ واقعات کو بے رو و رعایت بلا کم و کاست درج کرتا ہے اور ذاتی رائے یا رجحان کو وقائع نگاری میں مطلق دخل نہیں دیتا۔ اگر

دوسرے یورپین مورخین بھی اسی اصول پر چلتے تو تاریخ تدلیس و تصرف کے ان عیوب سے پاک ہوتی جو یورپ کے عارض تہذیب پر بمنزلہ ایک بدنامہ کے ہیں۔

تاریخ بیلان روما کی نسبت جس کا ڈیجر نے متن میں حوالہ دیا ہے لارڈ میکالے لکھتے ہیں کہ پروفیسر اینسکی کی تصنیف ان حلقوں میں جہاں جرمن لٹریچر کا رواج ہے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور یہ ایک ایسے محض کی مشق قلم کا نتیجہ ہے جو نکتہ ری و دقیقہ سخی اور وسیع انٹھری کے اعتبار سے افران و امثال میں سرر آوردہ ہے۔ کتاب کا طرز تحریر نہایت دلپسندیدہ دل نشین ہے۔ متانت و رزانت اس کے حرف حرف سے مترشح ہے۔ تعصب اور چمچوراپن اس میں نام کو نہیں پایا جاتا اور ابتدا سے لے کر انتہا تک رواداری کے ساتھ بلاورعایت لکھی گئی ہے۔ اس تاریخ کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے اور اس کے انگریزی ترجمہ ہی کی تنقید کرتے ہوئے جولیڈی سارا آسٹن کا کیا ہوا ہے لارڈ میکالے نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ مترجم

کچھ قرون متوسط کے بیسیائیوں کی اس گندگی اور گھٹاؤ نے پن کی اگر تحلیل کی جائے تو اس عنصر غالب وہ مجنونانہ تعصب ثابت ہو گا جو پادریوں کو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ چونکہ جسمانی طہارت مسلمانوں کا مذہبی فریضہ تھی لہذا ضرور تھا کہ پادری شست و شو سے قابلتہ اہا کریں اور اپنے جلوں کو بھی بھی پٹی پڑھائیں چونکہ مسلمان صاف ستھرے رہتے تھے اس لئے لازم تھا کہ پادری گندے رہیں۔ غرض من تشبہ بقول فہومہم کے اصول پر انہوں نے اس حد تک عمل کیا تھا کہ مسلمان اگر دن کو دن کہتے تو پادری کہتے تھے کہ نہیں رات ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کئی صدیوں تک مسیحی دنیا غلامت اور نجات میں لتھڑی رہی۔ مترجم

۱۱۰ جب بیت المقدس اور کل ارض مقدس کو مسلمانوں کے قبضہ میں دیکھ کر مسیحی دنیا کی غیرت یعنی تعصب کا دریا جوش میں آیا اور حروب ملیہ کا خوریز سلسلہ شروع ہوا تو چند مسیحی برادریاں اس غرض سے قائم ہو گئیں کہ جو مسیحی زائر ارض مقدس کا سفر اختیار کریں ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے یہ جماعتیں طبقہ تکلیکین کے نام سے موسوم ہیں۔ بعد میں اس طبقہ کا مقصد دین مسیحی کی حمایت اور مسلمانوں کا استعمال ہو گیا۔ اس طبقہ کے جانباز اراکین اگرچہ رہبانیت اور زہد و اتقا کا دم بھرتے تھے لیکن ان سے بسا اوقات ایسی ایسی حرکتیں سرزد ہوتی تھیں جو بڑے سے بڑے فاسق و فاجر کو بھی عرق انفعال میں ڈبو دینے کے لئے کافی ہوتیں۔ مترجم

۱۱۱ کلیسا کے عہدوں کی خرید و فروخت۔ مترجم

۱۱۲ ڈھائی روپے کا ایک سکہ جو ویش میں چلتا تھا۔ مترجم

۱۱۳ جب اقبال بنی اسرائیل کے ساتھ تھا اور حکومت ان کے ہاتھ میں تھی تو ان کے سلاطین کا یہ دستور تھا کہ ہر پچاسویں سال ایک بہت بڑا تہوار مناتے تھے اور اس موقع پر رعایا کے ساتھ طرح طرح کے سلوک اور احسان کرتے تھے۔ تمام غلام آزاد کر دئے جاتے تھے۔ تمام قیدیوں کو رہائی دے دی جاتی تھی۔ تمام قرض معاف کر دئے جاتے تھے۔ تمام جائیدادیں حواصل مالکوں کے

ہاتھ سے گزشتہ نصف صدی میں نکل چلی تھیں۔ انہیں واپس دے دی جاتی تھیں۔ اسی تیوہار کا نام جولائی ہے جس کے عام معنی خوشی کے ہیں۔ لفظ جولائی ایک عبرانی لفظ یوئل سے مشتق ہے جس کے معنی نفیری کے ہیں۔ چونکہ جشن جولائی کا اعلان نفیری یا ترکی کی صدا سے کیا جاتا تھا اس لئے اس کا نام یوئل یا جولائی پڑ گیا۔

یودیوں کی دیکھا دیکھی کلیسائے رومن کیتھولک نے بھی جشن جولائی منانا شروع کیا چنانچہ پہلے جشن کے انعقاد کا اعلان پاپائے بانی فیس ٹامس نے ۱۳۹۹ء میں کیا۔ یہ جشن اول پنجاہ سالہ قرار پائے پھر حضرت مسیح کی عمر کے اعداد کی مناسبت سے سی و سہ سالہ ہو گئے اور بست و بیج سالہ قرار دئے گئے۔ اصلی غایت اس جشن کے انعقاد کی جیسا کہ مصنف نے بیان کیا ہے یہ تھی کہ اس موقع پر عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے عیسائیوں سے پاپاؤں کو نذرانہ وصول کرنے کا حیلہ ہاتھ آجائے۔ چنانچہ ان موقعوں پر پاپائی خزانہ میں کروڑوں ہی روپیہ داخل ہو جاتا تھا۔ جشن جولائی کلیسا کی خوشی میں پاپا کی طرف سے ہر اس شخص کو جو اعتراف سری کے بعد عشائے ربانی کی صحبت میں شریک ہوتا تھا خاص خاص گرجاؤں میں داخل ہونے کی شرط کے ساتھ پروا نہ مغفرت عطا کیا جاتا تھا۔

مترجم

۸۹ قرائن کے جنوبی و مشرقی حصہ میں دریائے رائن کے بائیں کنارے پر واقع ہے اور اس ریلوے کا اسٹیشن ہے جو لائن سے مارسل کو جاتی ہے۔ مسکی معابد مقابر اور اماکن یہاں کثرت سے موجود ہیں اور ان کی شاندار عمارتیں قیسیٹ کے اس مرکز کی خصوصیات سے ہیں۔ چنانچہ پاپائے جان بست و دہم کا مقبرہ سولہویں صدی کے فن تعمیر کی بہترین یادگار ہے۔ ۱۳۰۵ء سے ۱۳۱۷ء تک اونیان پاپائیت کا صدر مقام رہا۔ ۱۸۷۲ء میں یہاں کی آبادی ۲۷۳۰۹ تھی ۱۹۰۱ء میں ۳۶۳۰۹ ہو گئی۔ آج یہ شہر اپنی تجارت خصوصاً "ریٹھی کپڑوں کے کارخانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ مترجم

۹۰ ارمس کا یہ فقرہ تعصب نفرت اور عناد کے ان سہ گانہ جذبات کا نچوڑ ہے جن کا خون پادریوں کی آنکھوں میں مسلمانوں اور خصوصاً ترکوں کو دیکھ کر رہ رہ کر اترتا چلا آیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ قسطنطنیہ کے تخت پر سلطان سلیمان قانونی جیسا عادل و بیدار مغز فرماں روا محکم تھا جسے یورپ بھی عالیشان کا لقب دئے بغیر نہ رہ سکا اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ سلطان سلیمان کا چل و شل سالہ عہد حکومت اس حسن سلوک و مراعات کے لحاظ سے جو عیسائی رعایا کے ساتھ کی گئی ترکی کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے تو ارمس کی حق ناشناسی پر ہمیں ضرب اللیل والی اس آنکھ کی پھٹی سوجھتی ہے جس کی شان میں "عیب نماید ہنرش در نظر" کہا گیا ہے۔ سرائیڈورڈ کرسی اپنی تاریخ ترکی میں لکھتے ہیں کہ "سلیمان نے اپنے ہر ویرائے کے نام فرمان جاری کیا کہ قیام امن و امن کی فوری تدابیر اختیار کی جائیں۔ امیر و غریب مسلم و ذمی سب کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جائے اور عدل و انصاف سے سرمو تجاوز نہ کیا جائے۔ اس کے اس فرمان کو ساری دنیا نے سراہا

اور اس کی عام طور سے قہیل کی گئی۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ان پر ایک زبردست اور ساتھ ساتھ ہی مہربان حکومت کا سایہ ہے۔" یہ تو یورپ کا خیال ہو اور ارس صاحب ترکوں کو ظالم اور جابر قرار دیں۔ پھر یہ ان کا پادریانہ تعصب نہیں تو کیا ہے!!

کیم مئی ۱۵۰۲ء وہ تاریخ ہے جس کا واقعہ کسی طرح واقعہ کرپلا سے کم نہیں اس لئے کہ اس دن مسلمانوں کو اندلس سے جہاں انہوں نے آٹھ سو سال تک بڑے کروفر اور آن بان کے ساتھ سلطنت کی تھی طرح طرح کے عذاب کے ساتھ نہایت غدارانہ و سفاکانہ طور پر دیس نکالا دیا گیا۔ سلطان سلیمان صاحبقران کا زمانہ حکومت ۱۵۳۰ء سے لے کر ۱۵۶۶ء تک ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جس میں ترک آج کل کی طرح دول یورپ کے چوگان کی گیند بنے ہوئے تھے بلکہ خود ان سے ہر نصرانی حکومت کی کور دیتی تھی۔ اسپین کے مسیحی طرز عمل کو پیش نظر رکھ کر اگر سلیمان جس کی شمشیر آبدار ہنگری کے جگر میں پیر چکی تھی اپنی سلطنت سے عیسائیوں کو اسی طرح نکال دیتا یا زبردستی مسلمان بنا لیتا جس طرح اس کے معاصرین فریڈنڈ اسایلا نے کیا تھا تو وہ ہر طرح سے حق بجانب ہوتا مگر ارس کی خاطر ہم اسے کچھ دیر کے لئے "ظالم" کہہ لیتے لیکن اس کی انسانیت اور شرافت نفس اس سے ظاہر ہے کہ جب اس نے جزیرہ روڈس کو طبقہ سینٹ جان کے ٹیکسٹن سے فتح کیا جنہوں نے اس کا مقابلہ مدت تک جم کر نہایت بے جگری سے کیا تھا تو بجائے اس کے کہ وہ اسکندر کی طرح غیظ و غضب میں آکر ان کا مقابلہ مدت تک جم کر نہایت بے جگری سے کیا تھا تو بجائے اس کے کہ وہ اسکندر کی طرح غیظ و غضب میں آکر ان کو نیست و نابود کر دیتا یا فرڈی نندا اسایلا کی طرح ان کے آثار اور یادگاروں کو مٹا دیتا اس نے روڈس کے صبح باشندوں کو پوری مذہبی آزادی عطا کی اور حکم دیا کہ ان کے گرجاؤں کی بے حرمتی نہ کی جائے بچے اسکے والدین سے نہ چھینے جائیں اور ان کے تمام مذہبی اماکن اور قومی علامات کو برقرار رہنے دیا جائے۔ چنانچہ مارشل مارمانٹ جس نے ۱۸۳۷ء میں روڈس کا سفر کیا۔ لکھتا ہے کہ "تین سو پندرہ سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ طبقہ سینٹ جان کے جلیل القدر ٹیکسٹن کو دو سو بارہ سال تک اس جزیرہ پر قابض رہ کر آخر اپنی پر ڈالنی پڑی۔ ترکوں نے اپنے بہادر حریفوں کا یہاں تک ادب کیا ہے کہ ٹیکسٹن کا محلہ ابھی تک قائم ہے اور ہر گھر کے دروازے پر ابھی تک اپنے سابق کیمین کا طفرے اور معرکہ ابھی تک ثبت ہے۔ ٹیکسٹن کی بنائی ہوئی عمارات بھی بدستور موجود ہیں اگرچہ ان میں آج کل کوئی رہتا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بہادروں کی روحیں یہاں مقیم ہیں۔" مترجم

سائنس کا تعلق تمدنِ جدیدہ کے ساتھ

سائنس کے عام اثرات کی مثال تاریخِ امریکہ سے۔
سائنس کا یورپ میں داخل ہونا۔ اسلامی اسپین سے چل کر
سائنس کا گزر شمالی اٹلی میں ہوا۔ جہاں بوجہ اس کے کہ پاپائیت کا
مستقر ایویٹان میں منتقل ہو گیا تھا اس نے خاطر خواہ نشوونما پائی۔
چھاپہ، بحری اسفاد اور اصلاحِ کتبہ کا اثر۔ اطالوی مجالسِ علمی کا
قیام۔

سائنس کا عقلی اثر اس نے یورپ میں ادراک کی طرز و روش
بدل ڈالی۔ لندن کی رائل سوسائٹی اور دوسری علمی مجلسوں کے
کارناموں سے اس کی تصدیق و توضیح۔

سائنس کا اقتصادی اثر ان بیشارِ ایجادات متعلقہ فنِ جرئیل و
فنِ طبیعیات سے ظاہر ہوتا ہے جو چودھویں صدی کے آغاز سے کی
گئی ہیں۔ ان ایجادات کا اثر صحتِ بدلی۔ اور خانگی زندگی اور نیز
فنونِ رزم و بزم پر۔

اس سوال کا جواب کہ سائنس نے بنی نوعِ انسان کو کیا نفع

پہنچایا ہے۔

یورپ کی تاریخِ برزبانہ اصلاحِ کتبہ ان اثرات کے نتائج پر روشنی ڈالتی ہے جو رومانی
مسیحیت نے اصلاحِ تمدن پر ڈالی۔ اگر ہم امریکہ کی تاریخِ زمانہ حال پر اسی طرح کی نظرِ اشتاد
ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ سائنس کے اثرات سے کیا کیا نتائج مترتب ہوئے ہیں۔

سترہویں صدی میں ایل یورپ کی ایک مختصر سی جماعت بحرا و قیانوس کے مغربی ساحل
پر آباد ہو گئی تھی۔ جزیرہ نیو فاؤنڈ لینڈ (ارضِ جدید) میں چونکہ کاڈ مچھلی کا بامنفعت شکار بہ

کثرت تھا۔ لہذا فرانسیسیوں نے ایک چھوٹی سے نو آبادی سینٹ لارنس کے شمال میں قائم کر لی تھی۔ قوم انگریزی قوم ڈچ اور قوم سویڈ کے لوگ نیو انگلینڈ (انگلستان جدید) کے سواحل اور ”نٹل اسٹیر“ (ریاستہائے متوسط) میں آباد تھے اور فرانسیسی پرائسٹوں کی کچھ جماعت کیرولائنا میں رہتی تھی۔ یہ افواہ کہ فلاریڈا میں آب ہکا کا ایک چشمہ ہے جس کا پانی پی کر انسان ہمیشہ جوان رہتا ہے چند ہسپانویوں کو یہاں لے آئی تھی۔ ان من چلے سیاحوں نے جو گاؤں قائم کر لئے تھے ان کے پرلی طرف ایک وسیع و غیر معلوم سرزمین پھیلی ہوئی تھی جس میں خانہ بدوش و وحشیوں کے گروہ پھرتے تھے۔ ان وحشیوں کی تعداد خلیج میکسیکو سے لے کر سینٹ لارنس تک ایک لاکھ اسی ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ ان کی زبانی یورپین نوآوروں کو معلوم ہوا کہ اندرون ملک میں آب شیریں کے وسیع سمندر موجود ہیں اور ایک بہت بڑا دریا ہے جس کا نام مسی پی ہے اس دریا کے بارہ میں ان کے اقوال مختلف تھے۔ بعض کا یہ قول تھا کہ یہ دریا ورجینا میں سے ہوتا ہوا بحراوقیانوس میں جا گرتا ہے۔ بعض کہتے تھے کہ ورجینا میں نہیں بلکہ فلاریڈا میں سے گزرتا ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ دریا بحرالکمال میں جاملتا ہے اور بعض کا قیاس یہ تھا کہ اس کا دہانہ خلیج میکسیکو ہے۔ بحراوقیانوس کی طوفان خیز موجیں جن کو عبور کرنے کے معنی یہ تھے کہ کئی مہینے کا سفر اختیار کیا جائے ان یورپین پردیسیوں کو ان کے وطن سے جدا کرتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ ایک ایسے کونے میں پڑے ہوئے ہیں جہاں کسی کو ان کی خبر نہیں ہو سکتی۔ لیکن انیسویں صدی ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ان بے سرو سامان اور بے یارومدگار آوارگان دشت غربت کی اولاد دنیا کی ایک زبردست اور طاقتور قوم بن گئی۔ اس قوم نے ایک ایسی جمہوری سلطنت قائم کر لی جس کا علم بحراوقیانوس سے لے کر تباہ ساحل بحرالکمال لہراتا تھا۔ دس لاکھ سپاہیوں کے ایک لشکر جرار کی مدد سے جس کا شمار صفی قرطاس ہی کی زینت نہ تھا بلکہ جو میدان جنگ میں موجود تھا اس قوم نے ایک خانگی حریف کا تختہ سطوت و اقتدار الٹ ڈالا۔ اس کے جنگی بیڑے میں سات سو جہاز شامل تھے جن پر پانچ ہزار توپیں چڑھی ہوئی تھیں اور ان میں سے بعض توپیں ایسی بھاری تھیں کہ دنیا میں اس لحاظ سے ان کا جواب نہ تھا۔ ان جہازوں کے سامان محمولہ کا مجموعی وزن پانچ لاکھ ٹن تھا۔ اپنے قومی حقوق کی حفاظت میں اس قوم نے پانچ سال سے کم کی مدت میں چار سو کروڑ ڈالر خرچ کئے تھے۔ اس کی مردم شماری سے جس کا انتظام وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا معلوم ہوا کہ اس کی آبادی ہر پچیسویں سال دگنی ہو رہی ہے جس سے یہ امید قائم کرنی بجا نہیں کہ انیسویں

صدی کے خاتمہ پر اس قوم کی آبادی تقریباً "دس کروڑ ہو جائے گی۔

ایک ویران براعظم جو سنسان اور سونا پڑا ہوا تھا صنعت و حرفت کا اکھاڑا بن گیا جس میں کلوں کے چلنے کے شور اور آدمیوں کی تمچیں حرکت نے ایک نئی روح پھونک دی۔ جہاں پہلے ایک گھٹا بے راہ جنگل چھایا ہوا تھا وہاں صدہا شہر اور قصبے آباد ہو گئے۔ روٹی تمباکو اور اناج جیسی بیش قیمت پیداوار کے کثیر المقدار انباروں نے تجارت کی رونق بڑھا دی۔ کانوں سے سونا۔ لوہا اور کوئلہ اس مقدار میں نکلنے لگا کہ عقل کو باور نہیں آتا تھا۔ تعداد کلیساؤں دارالعلوم اور مدرسوں نے ثابت کر دیا کہ اس مادی ترقی کے دوش بدوش عقلی و روحانی ارتقا کا عمل بھی جاری ہے۔ ذرائع نقل و حرکت کا انتظام بھی خاطر خواہ کر دیا گیا۔ ریل کی سڑکیں طول میں یورپ کی آہنی سڑکوں کے مجموعی طول سے بڑھ گئیں۔ ۱۸۷۳ء میں یورپین سلسلہ ریل کا مجموعی طول ۳۳۳۶۰ میل تھا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں امریکہ کا سلسلہ ۷۰۶۵۰ میل لمبا تھا۔ اس سلسلہ کی ایک شاخ براعظم کے عرض میں پھیلی ہوئی تھی اور بحراوقیانوس کو بحر الکمال سے ملائی تھی۔

لیکن امریکہ کی ترقی میں یہ مادی نتائج ہی قابل لحاظ نہیں ہیں۔ اخلاقی اور تمدنی نتائج بھی ہماری توجہ کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتے ہیں مثلاً چالیس لاکھ حبشی غلام یک قلم آزاد کر دئے گئے۔ قانون میں اگر رعایت کا میلان پایا گیا تو جہتی غریب پایا گیا۔ واضعان قانون کا مقصد یہ تھا کہ افلاس کا انداد کیا جائے اور غیر مستطیع طبقہ کے لوگوں کی حالت درست کی جائے۔ قابلیت کے لئے ترقی کی راہ کھول دی گئی اور سب رکاوٹیں دور کر دی گئیں۔ ترقی کا کوئی ایسا درجہ نہ تھا جس پر ذہین اور مخفی شخص فائز نہ ہو سکے۔ بعض بڑی بڑی سرکاری خدمتوں پر ایسے شخص مامور تھے جو ابتداً نہایت غریب اور کمپرسی کی حالت میں تھے لیکن بڑے بڑے ان جلیل القدر مدارج پر پہنچ گئے۔ میل جول کی مساوات تو لوگوں میں خیر نہ پائی جاتی تھی اور دولت مند اور آسودہ حال جماعتوں میں اس کا پایا جانہ ممکن بھی نہیں لیکن مدنیت کے حقوق سے ادنیٰ و اعلیٰ یکساں بہرہ اندوز تھے اور یہ مساوات نہایت تشدد کے ساتھ قائم رکھی گئی۔

شاید یہ کہا جائے کہ اس غیر معمولی ترقی کا باعث وہ مختص القام و مختص الیثیت حالتیں تھیں جو کسی قوم کو اس سے پہلے پیش نہ آئی تھیں۔ ترقی کا ایک وسیع میدان کھلا پڑا تھا اور ایک پورا براعظم ہر اس قوم کو جو اس کے ساحلوں تک آنے کی زحمت گوارا کرتی حق مقاومت و ملکیت عطا کرنے کے لئے تیار تھا۔ قدرت کے مسخر کرنے اور اس کے خرمن

فیضان سے خوش چین ہونے کے لئے بجز محنت اور جرات کے اور کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔

لیکن ہم تو یہی سمجھیں گے کہ ان مسافروں کے لئے جنہوں نے نئی دنیا کی عظیم الشان نو آبادی قائم کی ترقی کی راہ پر ایک بہت بڑے اصول نے میل و فرسنگ کا کام دیا۔ اسی اصول کی رہنمائی سے انہوں نے ان خاموش مقامات کو جہاں ابدالاباد سے سناٹا چھایا ہوا تھا تہذیب و شائستگی کا مرکز بنا دیا۔ جنگلوں دریاؤں پہاڑوں اور بیابانوں سے ہراساں ہوئے بغیر ویرانی کو آبادی سے مہل کر دیا اور ایک صدی کے اندر اندر ایک پورے براعظم کو مسخر کر لیا۔ اس کے مقابلہ میں میکسیکو اور پیرو پر اہل اسپین کی اس فوج کشی کے نتائج پر نظر ڈالنا خالی از انتہاء نہ ہو گا جس نے ان ممالک کے حیرت انگیز تمدن کو نیست و نابود کر دیا یہ تمدن ہسپانوی تمدن پر کئی ایک اعتبار سے فوقیت رکھتا تھا۔ اس تمدن نے فولاد اور بارود کی مدد کے بغیر عروج حاصل کیا تھا۔ اس تمدن کا انحصار فلاحات کے ان کارناموں پر تھا جو نہ گھوڑوں کے محتاج تھے نہ بیلوں کے اور جن کو نہ ہل کی ضرورت تھی نہ جوئے کی۔ اہل اسپین کے لئے ترقی کی راہ صاف کھلی تھی۔ ان کے رستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ لیکن انہوں نے کیا تو یہ کیا کہ امریکہ کے اصلی باشندوں کی کی کرائی محنت کو غارت کر دیا۔ ان میں سے لاکھوں بد نصیب قبی القلب حملہ آوروں کی وحشیانہ خونخواری کا شکار ہوئے۔ وہ قومیں جو صد ہا سال سے فارغ البال اور اسودہ حالی کی زندگی بسر کرتی چلی آتی تھیں اور ان رسموں اور رواجوں کی پابند تھیں جنہیں تاریخ نے ان کے لئے موزوں ثابت کیا تھا ایک بیک غدر و بد امنی کی بلا میں گرفتار ہو گئیں۔ ادہام پرستی کا مرض چاروں طرف پھیل گیا اور لوگوں کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ کا بہت بڑا حصہ کلیسائے روما کے قبضہ میں چلا گیا۔

ہم نے تذکرہ بالا مثال کو جس کا انتخاب تاریخ امریکہ سے کیا گیا ہے دوسری مثالوں پر جو تاریخ یورپ سے اخذ کی جاسکتی تھیں اس لئے ترجیح دی ہے کہ اس سے اس واقعہ کی شہادت بہم پہنچتی ہے کہ عمل ارتقا میں خارجی اثرات کا تعارف بہت ہی کم ہوا۔ یورپ کی سیاسی ترقی امریکہ کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کے طرز عمل اور نتائج پر غور کرنے سے پہلے ہم مختصراً بیان کریں گے کہ سائنس نے یورپ میں کس طرح رواج پایا۔

یورپ میں سائنس کی ترویج

حروب ملیہ نہ صرف سالہا سال سے روما کے کلیسائی خزانہ کو ان بیش قرار رقموں

سے پاٹ رہی تھیں جن کا ماخذ ہر مسیحی قوم کا خوف یا اتفاق تھا بلکہ ان کی وجہ سے پاپائی طاقت خطرناک طور پر بڑھ گئی تھی۔ اس دو عملی حکومت میں جو یورپ میں ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی دینی حکومت کو پورا غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور دنیوی حکومت کی حیثیت اس کے خادم کی سی رہ گئی تھی۔

مسیحی دنیا کے اطراف و اکناف سے ہندسی رقیں روما میں چلی آ رہی تھیں کوئی ایسا حیلہ نہ تھا جو لوگوں سے روپیہ وصول کرنے کے لئے نہ تراشا جاتا ہو۔ چاندی سونے کا ایک مینہ تھا کہ موسلا دھار اٹلی پر برس رہا تھا۔ دنیوی فرمانرواؤں کے خزانے خالی ہو چلے حاصل کی مقدار قلیل اور غیر کفایتی رہ گئی۔ آمدنی کی کمی کے باعث انتظام چلانا دشوار ہو گیا۔ فلپ الملقب ”برفر“ (خوشرو) شاہ فرانس ۱۳۰۰ء نے جب دیکھا کہ اس کی مملکت سے بغیر اس کی اجازت کے لکھو کھا روپیہ یوں باہر کھینچا جاتا ہے تو اس نے دل کڑا کر کہ نہ صرف اس مضمون کے انتظامی احکام جاری کر دئے کہ اس کے فرمان کے بغیر چاندی اور سونا برآمد نہ کیا جائے بلکہ یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ مذہبی جاگیروں اور قمیسی چاندیوں سے محصول شامی وصول کیا جائے۔ اس فیصلہ کا صادر ہونا تھا کہ پاپائیت اور حکومت فرانس میں ایک ملک جنگ چھڑ گئی۔ پاپا نے شاہ فرانس کو کلیسا سے خارج کر دیا۔ بادشاہ نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ پاپائے بانیس ٹامن پر دہریت کا الزام لگا کر یہ خواہش ظاہر کی کہ پاپا کا چالان مجلس عمومی کے اجلاس میں کیا جائے۔ اسی اثنا میں اس نے چند معتبر اشخاص کو اٹلی بھیجا جنہوں نے بلیس کے محل واقع اٹلی میں داخل ہو کر اسے گرفتار کر لیا اور اس کے ساتھ ایسی سختی کی کہ وہ چند دن میں مر گیا۔ اس کا جانشین پاپائے پینڈکٹ یا زہم زہر دے کر مار ڈالا گیا۔

شاہ فرانس نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ پاپائیت کے زمام و مفاسد کی کامل اصلاح کی جائے اور یہ عمدہ چند اطالوی خاندانوں ہی کا ورثہ نہ ہو جائے جو اپنی چالاکي سے یورپ کی سرچ الاعتقادی کو سیم و زر کی شکل میں بدل رہے تھے بلکہ فرانس کے رسوخ کا عنصر اس میں غالب ہو۔ چنانچہ کونستانتون کے ساتھ اس بارہ میں اس کا سمجھوتا ہو گیا۔ ایک فرانسیسی صدر اسقف پاپائی مسند پر بٹھایا گیا اور اس نے کلیمنٹ خامس کا لقب اختیار کیا۔ دربار پاپا فرانس کے شہر اونیان میں اٹھ آیا اور روما جو اب تک مسیحیت کا پایہ تخت تھا اس شرف سے محروم ہو گیا۔

ستر سال گزرنے کے بعد پاپائیت کی قسمت نے پلٹا کھایا یعنی ۱۳۷۶ء میں ملینتہ البقا

(روما) کو پاپائے اعظم کے مستقر حکومت بننے کا شرف از سرنو حاصل ہوا۔ اس عرصہ میں بوجہ اس کے کہ پاپائیت کا رسوخ جزیرہ نمائے اٹلی میں گھٹ گیا تھا شمالی اٹلی کے بڑے تجارتی شہروں میں وہ عقلی تحریک جلد جلد پھیل گئی جو تاریخ میں یادگار رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی بعض اور بھی مبارک و سازگار حالتیں نمودار ہو چلیں۔ خوب سلیبیہ کے انجام نے تمام مسیحی دنیا کے عقائد میں خلل ڈال دیا۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ فح و فحشت کو عام طور سے حق و باطل کا ربانی معیار سمجھا جاتا تھا ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی رغم انف مسیحیت ارض مقدس پر مسلمان قابض ہو گئے۔ وہ ہزار ہا مسیحی سورا جو فحشت کھا کر اپنے گھروں کو لوٹے بلاتامل اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے پائے گئے کہ کلیسا نے ان کے حریفوں کی جو تصویر کھینچی تھی اس سے وہ بالکل مختلف تھے یعنی وہ بزدل وحشی اور ظالم نہیں تھے بلکہ شجاع خلیق اور عادل تھے۔ جنوبی فرانس کے خوش گزرا شہروں میں عشق و عاشقی کے افسانوں کا چرچا پھیلتا جاتا تھا۔ خانہ بدوش بھاٹ اور گوشت لوگوں کو اپنے نو تعصیف گیت اور اشعار سناتے پھرتے تھے۔ ان اشعار کے مضامین تغزل و تمغذ اور رزم و ہزم کی داستانوں ہی تک محدود نہ ہوتے تھے بلکہ اکثر ان میں ان وحشیانہ مظالم مثلاً ”لنگویڈک“ کے واقعہ قتل عام کا بھی ذکر ہوتا تھا جن کے ارتکاب کی ذمہ دار پاپائی حکومت تھی۔ علی ہذا القیاس ان نظموں میں پادریوں کی سیہ کاریوں اور بد چلنیوں کے واقعات بھی مذکور ہوتے تھے۔ مسلمانان اندلس سے عیسائیوں نے ”شولرٹی“ کا اولوالعزمانہ و کرممانہ خیال مستعار لیا اور اسی کے ساتھ خودداری و آبرو پروری کا وہ شریفانہ سبق بھی حاصل کیا جس نے آگے چل کر یورپ کی شرافت نفس کے دستور العمل کے وضع کرنے میں مدد دی۔

پاپائیت اگرچہ اپنے مرکز اصلی پر واپس آگئی لیکن وہ اقتدار جو پاپاؤں کو ستر سال پہلے جزیرہ نمائے اٹلی میں حاصل تھا زندہ نہ ہو سکا۔ روما سے گئے ہوئے انہیں دو نسلوں سے زیادہ کا زمانہ ہو چکا تھا اور اگر وہ اپنی پوری شان جلالت و جبروت کے ساتھ بھی واپس آتے تاہم اس عقلی ترقی کا رد عمل نہ کر سکتے جو ان کی غیبت میں بروئے کار آ چکی تھی۔ لیکن پاپائیت کی رجعت فرمان روائی کی غرض سے نہ تھی بلکہ انقراض و انقسام کی غرض سے اور اس اعتزال عظیم کا مقابلہ کرنے کے مقصد سے جس نے چودھویں صدی میں مسیحیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ ان اندرونی فسادات کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاپاؤں کی تعداد ایک سے دو اور دو سے تین ہو گئی جن میں سے ہر ایک مسیح کے نائب حقیقی ہونے کا مدعی تھا اور اپنے رقیب کو ملعون و کذاب قرار دیتا تھا۔ اس طوفان بے تیزی نے یورپ کی عقیدت و ارادت کو

مہبل بن نقرت و حقارت کر دیا اور اس نے مہم عزم کر لیا کہ اس شرمناک تو تو میں میں کا جلد خاتمہ ہو جانا چاہئے۔ یہ اعتقاد کہ خدا کا ایک نائب زمین پر موجود ہے اور وہ پایا ہے جس سے خطا کا سرزد ہونا ممکن نہیں اس تھا کا مضمتی کے مقابلہ میں بھلا کیوں کر صحیح ہو سکتا تھا؟ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے لائق پادریوں نے یہ تحریک کی کہ مجلس عمومی قائم کی جائے جو گویا یورپ کی دینی پارلیمنٹ ہو اور پایا کو اس مجلس کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا جائے۔ یورپ کے نصیب اچھے ہوتے اگر یہ تحریک منظور ہو جاتی۔ یہ جنگ جو سائنس اور مذہب میں چھڑی ہوئی ہے ہرگز ہپا نہ ہوتی۔ اصلاح کینہ کا بھونچال ہرگز نہ آتا۔ پرائسٹ فرقوں کی مخالفت کا علم ہرگز بلند نہ ہوتا۔ لیکن کائنات کی کوشلیں اطالوی جوے کو کندھے سے نہ اتار سکیں اور یہ دلپذیر نتیجہ ان سے مترتب نہ ہو سکا۔

اس طور پر کیتھولک مذہب کمزور ہو رہا تھا۔ اس کا کاہنسی بوجھ عقل و ادراک کے سینہ سے جوں جوں کم ہوتا گیا روح کی عقلی بوجھتی گئی۔ اور عقل انسانی ترقی کرتی گئی۔ مسلمانوں نے پرانے سوتی کپڑوں اور روئی سے کاغذ بنانے کا فن ایجاد کیا تھا اور اہل وغش چھاپے کا فن چین سے جا کر سیکھ آئے تھے۔ چھاپے اور کاغذ کی ایجادیں لازم و ملزوم تھیں۔ اب وہ وقت آ گیا کہ بلا خوف مزاحمت تمام دنیا کے انسان آپس میں تبادلہ خیالات کرنے لگیں۔

چھاپے کی ایجاد نے کیتھولک مذہب کے سینہ میں ایک خم جانتان لگایا کتاب و مخاطب کے بین العمرانی حق پر اس سے پہلے پاپائیت نے بلا مشارکت اعدے قبضہ کر رکھا تھا۔ پاپائی مرکز سے مختلف البدارج پادریوں کی وساطت سے احکام و فرامین جاری ہوتے تھے اور منبر سے پڑھ کر سنا دئے جاتے تھے۔ مطبوعات نے اس حق خاص اور ان غیر معمولی اقتدارات کو جو اس کا لازمہ تھے یک قلم مٹا دیا۔ زمانہ حال میں منبر کا اثر بہت ہی کم رہ گیا ہے۔ خطیب کے قائم مقام آج کل اخبار نویس ہیں۔

پھر بھی پاپائیت اپنے پرانے حق سے جدوجہد کئے بغیر دست بردار نہ ہوئی۔ نئے فن کے ان نتائج پر جو قضائے مہم کی طرح ٹل نہ سکتے تھے جب اسکی نظر پڑی تو ایک نظارتہ المطبوعات قائم کر دیا گیا جس کی تخریج کی تختی سے مکتوبات و جرائد کے روکنے کی کوشش کی گئی۔ کتاب چھاپنے کے لئے نفسی نظارت سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ اور اجازت نامہ اس وقت ملتا تھا جب پادری صاحب کتاب کو بالاستیعاب دیکھ کر اس کی نسبت اظہار پسندیدگی فرماتے تھے اور اس کے صحیح اعتقاد ہونے کی تصدیق کرتے تھے۔ ۱۵۰۱ء میں پاپائے انگریز

سادس ۛ ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے وہ اہل مطالع کلیسا سے خارج قرار دے گئے جو باطل عقائد شائع کریں۔

۱۵۱۵ء میں لیٹن کونسل نے حکم دیا کہ بجز اس کتاب کے جس کا تحریری معائنہ ناظرین کلیسا کر چکے ہوں اور کوئی کتاب شائع نہ کی جائے ورنہ شائع کرنے والے کو کلیسا سے خارج کیا جائے گا اور اس کو جرمانہ کی سزا بھی دے جائے گی۔ نظارت مطبوعات کے عہدہ داروں کو حکم تھا کہ اس بات کی نہایت احتیاط رکھیں کہ کوئی تحریر ایسی نہ چھپنے پائے جو عقائد راخذ و صحیحہ کے خلاف ہو۔ اس تنقید کی تہ میں یہ اندیشہ مضر تھا کہ ممکن ہے کہ مذہبی مناظر چھڑ جائے اور سچی بات جواب تک چھپی ہوئی تھی ظاہر ہو جائے۔

لیکن جمالت کی طاقتوں کی یہ جھوٹانہ جدوجہد بیکار ثابت ہوئی۔ لوگوں میں دماغی و عقلی راہ و رسم مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے۔ اسی راہ رسم نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے زمانہ حال کے اخبار کی صورت اختیار کر لی جو ہر روز دنیا کے ہر حصہ کی تازہ ترین خبریں شائع کرتا ہے۔ مطالعہ ایک عام شغل ہو گیا اور یہ وہ نعمت تھی جس سے قدیم الایام میں بہت کم لوگ بہرہ ور تھے۔ زمانہ حال کے تمدن کی بعض نہایت ہی نمایاں خصوصیات کا راز اسی شوق کتب بینی و مطالعہ اخبارات میں پوشیدہ ہے۔

غرض کانڈ کی ساخت اور چھاپے کے استعمال نے یورپ کے تمدن میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ علیٰ ہذا القیاس آلات جہاز رانی میں کمپاس یعنی قلب نما کا اضافہ بڑے بڑے مادی و اخلاقی نتائج کا باعث ہوا۔ ہندوستانی تجارت نے اہل وینس اور اہل جوا کو ایک دوسرے کا رقیب بنا کر امریکہ کی تحقیقات کرائی۔ ڈی گاما نے افریقہ کا چکر لگایا اور میگین نے زمین کے گرد گرد جہاز رانی کی۔ سفر موخر الذکر پر جو انسان کا سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامہ ہے نظر ڈالتے ہوئے ہمیں اس امر کی طرف سے خالی الذہن نہ ہونا چاہئے کہ کیتھولک مذہب نے قطعی طور پر بلاغتائش تردید یا عقیدہ اختیار کر لیا تھا کہ زمین چٹی ہے۔ آسمان بہشت کا صحن ہے اور دونوں دنیائے سافل میں ہے۔ بعض پادریوں نے جن کے اجتہاد میں بوجہ ان کی جلالت قدر کے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی شکل زمین کی کسویت کے ابطال میں فلسفیانہ اور مذہبی دلائل پیش کی تھیں۔ چنانچہ اس کا ذکر ہم پچھتر کر بھی چکے ہیں۔ اب یہ بحث دفعہ ختم ہو گئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کلیسا غلطی پر تھا۔ جن تین بڑی سیاحتوں کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے ان سے ایک فقط یہی اہم نتیجہ نہیں نکلا کہ اسطرح شکل زمین کی جس جغرافیائی غلطی میں کلیسا مبتلا تھا۔ اس کی اصلاح ہو گئی۔

کولبس ڈی گما اور میگیل کی روح مغربی یورپ کے تمام اولوالعزم اور باہت اشتہاس میں سرایت کر گئی۔ لوگوں کے معادو معاش کی غایت الغایات اب تک یہ عقیدہ تھا کہ بادشاہ کے ساتھ وفاداری برتی جائے اور کلیسا کی متابعت کی جائے گویا لوگوں کی زندگی کا مقصد اس وقت تک استفادہ نہ تھا بلکہ افادہ تھا۔ ان کی محنت کا ثمرہ اپنے لئے نہ تھا بلکہ دوسروں کے لئے تھا۔ اس عقیدہ کا سیاسی اثر ترقی پذیر ہو کر حروب ملیہ کی شکل میں نمودار ہوا۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ان لڑائیوں میں ہلاک ہو گئے جن سے انہیں خاک فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا اور جن کا نتیجہ بجز حسرت و ناکامی کے اور کچھ نہ نکلا تھا۔ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ان معرکہ آرائیوں کی وجہ سے نفع اگر کسی طبقہ کو ہوا تو پاپاؤں کو بتالون اور روما کے دوسرے پادریوں کو یا دغس کے مالکان جہاز کو لیکن جب اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھا کہ کمیکو پیرا اور ہندوستان کی دولت ہر اس شخص کے حصہ میں آسکتی ہے جو ہمت اور جرات رکھتا ہو تو وہ اغراض و مقاصد جنہوں نے یورپ کی بے چین اقوام میں بیداری کی روح پھونک رکھی تھی ہوا کے رخ کی طرف دفعت بدل گئے۔ کاریز اور پزارو کی داستان کو ہر شخص ذوق و شوق سے سننے لگا۔ مذہبی جوش کی جگہ بری مہمت نے لے لی۔

اگر ہم اس اصول کو الگ کر کے دیکھتا چاہیں جو اس زمانہ کے حیرت انگیز تمدنی انقلاب کی بے میں مضمر تھا تو اس کے پہچانے میں ہمیں ذرا وقت نہ ہو گی۔ اب تک ہر شخص نے اپنی خدمات اپنی دنیوی یا دینی آقا کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ لیکن اب سے اس نے قصد کر لیا کہ اپنی محنت کے ثمرہ سے خود تمتع حاصل کرے شخص جس سے مراد انفرادی حصیت ہے غلبہ پا رہا تھا اور ایثار مٹ کر خیال محض رہ چلا تھا۔ اس تمہید کے بعد ہم کو آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ کلیسا پر کیا بیت رہی تھی۔

شخص کا انحصار اس اصول پر ہے کہ ہر شخص اپنا آقا آپ ہے اور اس کو آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ جو رائے چاہے قائم کرے اور اپنے ارادہ کو جس وقت چاہے عمل میں لائے اس اصول کے لحاظ سے اسے ہر وقت اپنے ایٹائے جنس کے ساتھ سرگرم مسابقت رہنا پڑتا ہے گویا اس کی زندگی قوت عملی کا ذریعہ اظہار ہے۔

یورپ کے صدیوں کے جمود کو حرکت میں بدل دینا۔ اس جسم میں جو اب تک غیر متحرک تھا ایک بے یک بیداری کی شعل پھونکنا اور اصول شخص کو اس کی غایت الغایات بنانا ان اثرات و اقتدارات کی مخالف قوتوں کو اس کے مقابلہ میں لا کھڑا کرنا تھا جو اب تک اسے پامال کر رہی تھیں۔ چودھویں اور پندرہویں صدیوں میں وہ اضطراب آمیز کشش

برابر جاری رہی جو آنے والے معرکہ عظیم کا پتہ دیتی تھی۔ سولہویں صدی کے شروع ۱۵۱۷ء میں یہ معرکہ شروع ہو گیا۔ اصول تشخص مجسم ہو کر جرمنی کے ایک جنگ راہب کی صورت میں نمودار ہوا اور اس لحاظ سے لہجوائے کل انانیت شخ بمافیہ شاید ضرور تھا کہ وہ اپنی حقوق ظہری دینی شکل میں کرے۔ پہلے تو تذکرات الغفران اور بعض چھوٹے چھوٹے معاملات پر ایک آدھ پکڑ حریفوں میں ہوئی لیکن لڑائی کا اصلی سبب بہت جلد ظاہر ہو گیا۔ یعنی مارٹن لوتھر نے اپنے قسبی بالادستوں سے جو روم میں بیٹھے بیٹھے تمام مسیحی دنیا کے عقائد کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے اجتہاد کا پابند نہیں ہوں۔ بائبل کی تاویل و تفسیر کے مطلق مجھے بھی آزادی رائے کا وہ حق حاصل ہے جس میں کوئی شخص دست اندازی نہیں کر سکتا۔

اول اول روم نے مارٹن لوتھر کو ایک جاہل نافرمانیوار اور جھگڑا لوپادری سے زیادہ نہ سمجھا اور اگر ”اگوزیشن“ کا قابو چلتا تو اس کا کام چٹکی بجاتے میں تمام کر دیا گیا ہوتا۔ لیکن جنگ جوں جوں طول کھینچتی گئی یہ معلوم ہوتا چلا کہ لوتھر اکیلا نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر ہزار ہا مصیم العزم اشخاص موجود ہیں جو اس کے قلم کے حملوں کی تائید اپنی تلوار کی ضربوں سے کر رہے ہیں۔

لوتھر کو روم نے جس جس طرح سے کوسا ہے اور اس کے اعمال کی جس جس طرح سے تنقید کی گئی ہے وہ اس درجہ ترش و تلخ ہے کہ سن کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ مثلاً ”مقدس نکتہ چیتوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”لوتھر کا باپ اس کی ماں کا خاوند نہیں تھا بلکہ ایک خبیث جن تھا جو اس کی ماں کا آشنا تھا۔ لوتھر دس سال تک ایمان و کفر کی دو گونہ چوگان کی گیند بنا رہا اور آخر میں دہریہ ہو گیا۔ وہ بھائے روح کا مکر تھا۔ شراب اس کی گھٹی میں پڑی تھی اور اسی لئے اس نے شراب خواری کی تعریف میں نظمیں تصنیف کیں۔ وہ کتب مقدسہ کی توہین کرتا تھا۔ خصوصاً ”حضرت موسیٰ کی شان میں کلمات اہانت آمیز استعمال کرنے کا عادی تھا۔ جو وعظ کرتا تھا اس کے ایک لفظ کو بھی دل میں سچ نہ سمجھتا تھا۔ سینٹ جیمس کے خط کی نسبت اس کا یہ قول تھا کہ اس کی وقعت پر کاہ سے زیادہ نہیں۔ واقعہ اصلاح کیسہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کے ظہور کا باعث ستاروں کی نحوست ہے“ لیکن رومن کیتھولک پادریوں کی زبان پر باوجود اس کو کبھی نحوست کے جو اصلاح کی ذمہ دار قرار دی گئی ہے یہ نازا شیدہ اور سوتیانہ فقرہ چڑھا ہوا تھا کہ آرسس نے اصلاح کا ابتداء دیا اور لوتھر اسے سینے بیٹھ گیا۔

روا نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ واقعہ اصلاح بعض شوریدہ سرداروں کا ایک عارضی نمونہ تھا۔ اس نے یہ نہ دیکھا کہ یہ انقلاب اس اندرونی تحریک کی انتہائی شکل تھا جو دو صدیوں سے یورپ میں ہو رہی تھی اور جس کی طاقت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اس کو یہ نہ سوچا کہ اگر انقلاب کی اور کوئی وجہ تحریک نہ بھی ہوئی تاہم لوگوں کو ذاتی غور و فکر اور ذاتی اجتہاد پر مجبور کرنے کے لئے ایک اکیلا یہ واقعہ کیا کم تھا کہ تین پاپا ایک وقت میں موجود ہوں اور تینوں کی فرماں برداری لوگوں پر واجب ہو۔ کانسٹنس اور میل کی مجالس نے ثابت کر دیا کہ ایک قوت ایسی بھی موجود ہے جسے پاپاؤں کی قوت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ اس کے بعد جو دیرپا اور خوریز ہنگامے واقع ہوئے ان کا خاتمہ عہد نامہ وینسلیا نے کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی آشکارا ہو گئی کہ وسطی و شمالی یورپ نے روا کے عقلی جبر کا جو اپنے کندھے سے اتار پھینکا ہے اصول تشخص نے میدان مار لیا ہے اور ہر شخص کو یہ حق مسلم قرار پا چکا ہے کہ وہ اپنا مجتہد آپ ہے۔

لیکن ناممکن تھا کہ اجتہاد محض کے اس حق کے استقرار کا نتیجہ صرف اسی قدر نکل کر رہ جائے کہ لوگ کیتھولک مذہب کے منکر ہو جائیں۔ آغاز اصلاح کے وقت جب بعض ممتاز و سرآوردہ اشخاص مثلاً ارسس نے جس کا شمار بائبلان اصلاح میں ہے اسے ترک کیا تو انہیں مظلوم ہوا کہ اکثر پیشوایان اصلاح کو ظلم سے سخت نفرت ہے۔ ایسے پیشواؤں کے اقتدار کرنے کا مطلب یہ تھا کہ جمالت و تعصب کی گرم بازاری ہو۔ ایسی حالت میں ضرور تھا کہ پرائسٹنٹ مذہب میں تفرقہ و اعتزال کی ان قوتوں کا متحدہ مشق نہیں جو اس کے وجود میں آنے کی محرک ہوئی تھیں اس کا مختلف فرقوں میں تقسیم ہو جانا ایک لازمی بات تھی۔ ان فرقوں کو جب اپنے مہیب اطالوی حریف کی طرف سے کھٹکانہ رہا تو ان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی مختلف ممالک میں جب ایک پرائسٹنٹ فرقہ برسر اقتدار ہوا تو اس نے اپنے ساتھیوں کے خون میں بلاتال اپنے ہاتھ رنگ ڈالے۔ لیکن جب امتداد روزگار نے ستم رسیدوں کو ستم گاروں پر غالب کر دیا اور انہوں نے اپنی مظلومیت کی طعانی کینہ و انتقام سے کی تو فریقین نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ ایک فرقہ جو حقوق اپنے لئے طلب کرتا ہے ان ہی حقوق سے دوسروں کو بھی فائدہ اٹھانے دے۔ غرض ان خوریز ہنگاموں اور خرخشوں سے وہ اصول عظیم قائم ہوا جو مسالمت یا رواداری کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن مسالمت پھر بھی ایک درمیانی درجہ ہے جوں جوں پرائسٹنٹ مذہب کا عقلی انحلال و انفکاک ہوتا جائے گا یہ درمیانی درجہ ترقی پذیر ہو کر اس مترقہ حالت میں تبدیل ہوتا جائے گا جو دنیا میں ہمیشہ سے

فلسفہ کا نصب العین رہی ہے یعنی وہ تمدنی حالت جس میں ہر شخص کو خیال کی کامل آزادی حاصل ہو۔ بجز ان لوگوں کے جو اصول مسالمت پر خوف یا دباؤ کی وجہ سے کاربند ہوں اس اصول کے پابند وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو دوسروں کی آراء و عقائد کو وقعت کی نظر سے دیکھنے اور تسلیم کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ پس ظاہر ہے کہ اس اصول کا ماخذ صرف فلسفہ ہی ہو سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مذہب سے تعصب کو تقویت پہنچی ہے اور فلسفہ اس کا رد عمل یا استعمال کرتا ہے۔

اصلاح کینہ کا علانیہ مقصد یہ تھا کہ فلسطین اور اس کے جانشینوں نے مسیحیت اور سلطنت رومنہ الکبریٰ میں موافقت و مصالحت پیدا کرنے کی نیت سے بت پرستی کے جن خیالات و رسوم کو مسیحیت میں داخل کر دیا تھا۔ وہ اس سے خارج کر دئے جائیں۔ پرائسٹنٹ جماعت یہ چاہتی تھی کہ مذہب عیسوی میں قرون اولیٰ کی پاکیزگی اور نزاہت کی مثال از سر نو پیدا کر دی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم عقائد کی بحالی کے ساتھ ساتھ انہوں نے وہ تمام رسمیں ترک کر دیں جن میں بت پرستی کا شائبہ بھی پایا جاتا تھا۔ ”مریم عذرا کی پرستش موقوف ہو گئی۔ اولیا سے مرادیں مانگنے کا طریقہ جاتا رہا۔ انجیلین یعنی اصلاح یافتہ کلیسا کے پیشوا ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ مریم عذرا نے زواجی زندگی کے فرائض اختیار کر لئے تھے اور اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھیں چنانچہ ان کے بطن سے کئی ایک اولادیں بھی ہوئیں لیکن بت پرستی کی اشاعت کے ساتھ یہ خیال کہ آپ یوسف نجار کی بیوی تھیں۔ دلوں سے محو ہو گیا اور آپ ملکہ آسمان اور خدا کی ماں بن گئیں۔

عربوں کے ادب کی طرح جس نے مسیحی دنیا پر جنوبی فرانس اور سسلی کی راہ سے پیش قدمی کی تھی۔ ان کا سائنس بھی انہیں دونوں رستوں سے یورپ میں داخل ہوا۔ پاپاؤں کو تو دس نکال لایا چکا تھا اور وہ بجائے روم کے ادیان میں مقیم تھے۔ اس کے علاوہ اعتزال عظیم یعنی پاپائیت کی تفریق کا واقعہ بھی برسر تائید تھا لہذا اسلامی سائنس کے قدم شمالی اٹلی میں مضبوطی سے جم گئے۔ فلسفہ مشائیہ نے اس غفلت سے آراستہ ہو کر جو ابن رشد نے اس کے لئے تیار کیا تھا بہت سے خفیہ اور علانیہ پیرو پیدا کر لئے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی جو اس فلسفہ کا خیر مقدم نہایت تپاک سے کرنے اور اس کے مسائل کو بہ نظر امتحان دیکھنے کے لئے تیار تھے۔ لیونارڈو ڈاونی کا شمار اسی جماعت میں ہے۔ وہ اس اصول موضوعہ کا بانی ہے کہ سائنس میں استدلال بجز تجربہ اور مشاہدہ کے معتبر اور مفید یقین نہیں ہو سکتا۔ حقائق قدرت پر صحیح روشنی صرف تجربہ ہی ڈال سکتا ہے اور قوانین قدرت کی

دریافت کے لئے تجربہ کا ہونا لازمی ہے۔ ڈاؤنسی نے ثابت کیا کہ ایک ایک نقطے پر دو عمودی قوتوں کا عمل کسی مستطیل کے خط الزاویہ کے عمل کے مشابہ ہوتا ہے جس کے اضلاع ان قوتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس اصول کے معلوم ہونے کے بعد غیر مستقیم قوتوں کے مسئلہ کا حل ہونا بہت آسان ہو گیا۔ اس مسئلہ پر ایک صدی بعد اسپٹونیس نے ازسرنو روشنی ڈالی اور قوت جبرئیل کی تشریح کے متعلق اس سے کام لیا۔ ڈاؤنسی نے ہرم پر قوت کے بھخط غیر مستقیم صرف کئے جانے کے مسئلہ کی بخوبی توضیح کی۔ رگڑ کے قوانین جن کا عملی ثبوت آگے چل کر اماشس نے دیا اسی کے دریافت کئے ہوئے ہیں۔ اصول حقیقت سرعت رفتار کی مابیت سے وہ بخوبی واقف تھا۔ سطوح مائل اور قوس ہائے مدور پر اجسام کے نزول کی شرائط پر اس نے مفصل بحث کی ہے۔ عکسی تصویر کھینچنے کا کیرا اس کی ایجاد سے ہے۔ علم ترکیب اجسام حیوانات و نباتات کے متعدد مسائل کی نسبت اس نے صحیح خیالات ظاہر کئے ہیں۔ طبقات الارض کے جدید علم کے بعض سمات المسائل مثلاً ”آثار متحجرات کی نوعیت اور برہائے اعظم کے ارقاع کی نسبت جو امور اس نے بیان کئے ہیں ان کی تجربہ نے آج تصدیق کر دی ہے اس نے اس مسئلہ کی تشریح کی ہے کہ چاند کی روشنی زمین کے نور کا عکس ہے۔ یہ جامع حیثیات مخص جس کی قابلیتوں میں حیرت انگیز تنوع کی شان نظر آتی ہے۔ فنون سنگ تراشی و منامی و انجینئری میں بھی ید طولی رکھتا تھا اور اپنے زمانہ کے فن ہیت فن تشریح ابدان اور فن کیمیا میں بھی اسے دستگاہ کامل حاصل تھی، نقاشی میں وہ میکائیل انجیلو کا مقابل تھا اور جب ایک دفعہ ان میں مسابقت ہوئی تو تفوق کا سرا اسی کے سر رہا۔ شا میراڈل گریزی کی ڈائمنٹیکن خانقاہ کے نعمت خانہ کی دیوار پر اس کا جو مرقع موسوم بہ ”عشائے اخیر“ موجود ہے۔ اس نے بہت بڑی شہرت پائی ہے اور معصوروں نے اس کی پیسیوں نقلیں اتاری ہیں۔

شالی اٹلی میں جب ایک دفعہ سائنس کے قدم مضبوطی سے جم گئے تو بہت جلد کل جزیرہ نما میں اس کا اثر پھیل گیا اس کے پرستش کرنے والوں کی روز افزوں تعداد کا پتہ ان علمی مجلسوں سے چلتا ہے جو بہ کثرت قائم ہوتی جاتی ہیں اور جلد جلد ترقی کر رہی ہیں۔ یہ مجلسیں ان اسلامی مجالس کا چہرہ تھیں جو بزمانہ سابق غرناطہ و قرطبہ میں موجود رہ چکی تھیں۔ اسلامی تمدن نے جس رستہ پر اپنے نقش قدم چھوڑے تھے اس پر گویا مسافر کی یادگار قائم کرنے کی غرض سے ۱۳۳۵ھ میں ٹولوز کی اکاڈمی کی بنا ڈالی گئی۔ جو آج کے دن تک قائم ہے لیکن یہ اکاڈمی جنوبی فرانس کے دل خوش کن لہریچر ہی کا مرکز تھی اور اس کا نام اسی

مناسبت سے ”دی اکاڈمی آف فلورل گیز“ (چھستان) رکھا گیا تھا۔ علم طبیعیات کو ترقی دینے کی غرض سے پہلی علمی مجلس کی بنا نیپلز میں پشٹا پورٹا نے ڈالی۔ ترابوشی کا بیان ہے کہ حکام کلیسا نے اس مجلس کو بند کر دیا۔ اس کے بعد پرنس فریڈرک سیسی نے روما میں ایک مجلس بنام ”لنٹن“ (فندیہ) قائم کی۔ اس مجلس کا مقصد اس کے نشان ہی سے ظاہر تھا یعنی ایک سیاہ گوش آسمان کی طرف منہ اٹھائے اپنے بچوں سے ایک تین سروالے ”سربرس“ کو نوچ رہا ہے۔ فلارنس کی اکاڈمی ۱۸۵۷ء میں قائم ہوئی۔ اس کے ارکان کا اجلاس فرمانروائے فلارنس کے محل میں ہوا کرتا تھا۔ دس سال تک یہ مجلس قائم رہی اس کے بعد پاپائی حکومت کے ایما سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور اس علم کشی کے معاوضہ میں فرمانروائے فلارنس کا بھائی کورنٹال بنا دیا گیا۔ بڑے بڑے مشاہیر مثلاً ٹار-سیلی اور کیٹلی اس مجلس کے رکن تھے داخلہ کی شرط یہ تھی کہ ایمان و مذہب کو ترک کر دیا جائے اور تحقیق حق کا عزم کر لیا جائے ان مجالس نے حامیان علم کو اس کینج غلوت سے جس میں وہ اب تک رہتے چلے آئے تھے نکال کر آپس میں ملا دیا اور ان کو تبادلہ خیالات اور اتفاق باہمی کا موقع دے کر ترقی علوم و فنون میں بہت بڑا حصہ لیا۔

سائنس کا عقلی اثر

یہ تاریخی بحث کہ سائنس برعظم یورپ میں کیوں کر داخل ہوا بیچ میں بطور جملہ معترضہ آگئی تھی۔ اب ہم اس ذیلی بحث کو چھوڑ کر اصل مضمون یعنی سائنس کے طرز عمل اور نتائج کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

تمدن جدید بر سائنس نے دو پہلوؤں سے اثر ڈالا ہے۔ ۱۔ علمی و ۲۔ اقتصادی ان عنوانات کی ذیل میں اس اثر پر باسانی بحث کی جا سکتی ہے۔

سائنس کا عقلی اثر یہ ہوا کہ روایت کا اقتدار بالکل زائل ہو گیا۔ کسی استاد کے دعوے بلا دلیل کو خواہ اس کا نام کیسا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور کیسی ہی تعظیم کے ساتھ کیوں نہ لیا جاتا ہو اس نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ فلارنس کی علمی مجلس نے اپنے ارکان کے لئے داخلہ کی جو شرائط مقرر کی تھیں اور لندن کی شاہی سوسائٹی نے جو مقولہ اپنی علمی علامت کے طور پر اختیار کی اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ روایت کی سائنس کے نظروں میں کہاں تک وقعت ہے۔

طبعی مباحث میں سائنس نے فوق القدرت اور خارق عادت امور کو بطور شہادت

تسلیم کرنے سے ابا کیا۔ فگنوں یا آسمانی نشان کے ثبوت کو جس کا قدیم الایام میں یہودیوں کے ہاں رواج تھا اس نے ترک کر دیا اور ایک واقعہ کے ثبوت کو دوسرے واقعہ غیر متعلقہ کا ثبوت مان لینے سے انکار کر دیا۔ اس طور پر وہ منطقی جو صد ہا سال سے رائج چلی آتی تھی باطل ہو گئی۔

طبعی تحقیقات میں سائنس کا طرز عمل یہ تھا کہ کسی مفروضہ قیاس کی تنقید کی غرض سے اول کسی صورت خاص کو پیش نظر رکھ کر اس قیاس کی بنا پر اندازہ قائم کیا جاتا تھا اور اس کے بعد تجربہ یا مشاہدہ کر کے تحقیق کر لیا جاتا تھا کہ اس تجربہ یا مشاہدہ کا نتیجہ اندازہ قائم نمودہ کے نتیجہ سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں اگر مطابقت نہ پائی جاتی تھی تو وہ قیاس رد کر دیا جاتا تھا۔

اس طرز عمل کی ایک دو مثالیں ہم یہاں درج کرتے ہیں۔
 نیوٹن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے کہ کشش زمین یعنی کشش ثقل کی حد عمل چاند تک ہو اور یہی وہ قوت ہو جو اسے زمین کے گرد گھومنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس قیاس کی بنا پر جب اس نے حساب لگایا تو نتیجہ یہ نکلا کہ جرم قمر اپنے مدار پر حرکت کرتے ہوئے خط المماس سے ایک دقیقہ میں بقدر تیرہ فٹ کے منحرف ہوتا ہے۔ لیکن اس مسافت کا اندازہ لگانے سے جو اجسام سطح زمین پر گرتے وقت ایک دقیقہ میں طے کرتے ہیں اور اس مسافت کو مریخ مکوس کی نسبت سے گھٹا ہوا فرض کرنے سے معلوم ہوا کہ مدار قمر پر جو کشش ہو گی وہ اجسام کو پندرہ فٹ سے بھی زیادہ کھینچے گی۔ غرض اس وقت نیوٹن نے یہی سمجھا کہ اس کا قیاس صحیح نہیں ہے۔ لیکن اتفاق سے کچھ مدت کے بعد ایک درجہ ارضی کی پائنٹ زیادہ صحت کے ساتھ کی گئی۔ اس پائنٹ نے زمین کے اندازہ جسامت اور فاصلہ قمر کو جو کہ ارض کے نصف قطر کی بنا پر بتایا گیا تھا خفیر کر دیا۔ نیوٹن نے اب اپنا تخمینہ از سر نو شروع کیا اور جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں یہ تخمینہ جب قریب بہ اتمام ہوا تو یہ دیکھ کر حرقہ مطابقت ظاہر ہونے کے قریب ہے وہ ایسا گھبرایا کہ حسابی عمل ختم کرنے کے لئے اسے مجبوراً "اپنے ایک دوست سے فرمائش کرنی پڑی۔ اب وہی قیاس بدلائل قاطع ثابت ہو گیا۔

ایک اور مثال طریقہ زیر بحث کو کافی طور پر واضح کر دے گی۔ یہ مثال اس مسئلہ کیمیادی سے متعلق ہے جو فلو جسٹن (جو ہر حرارت) کے نام سے موسوم ہے۔ اسٹال نے جو اس مسئلہ کا موجد تھا یہ دعویٰ کیا کہ قابلیت اضطرام یا سو زندگی کا ایک ایسا عنصر کائنات میں

موجود ہے جس میں اجسام کے ساتھ اتصال پیدا کرنے کا خاصہ پایا جاتا ہے۔ اس عصر کا نام اس نے ”فلو جسٹن“ رکھا تھا۔ اشال کا قول تھا کہ وہ شے جسے قلوئی اکسید کہا جاتا ہے جب اس عصر کے ساتھ ملتی ہے تو فلز یعنی دہات پیدا ہوتی ہے لیکن اگر ”فلو جسٹن“ نکال لی جائے تو دہات اپنی اصلی خالی صورت یعنی اکسیدی حالت میں بدل جائے گی۔ اس اصول کی رو سے گویا قلوات اجسام مرکب یعنی مٹیان ہیں جن میں ”فلو جسٹن“ ملی ہوئی ہے۔

لیکن اٹھارہویں صدی میں کیمیادی تحقیقات کے آلات پر کانٹے کا اضافہ کیا گیا۔ اب کیمیا دان آسانی سے حکم لگانے کے قائل ہو گئے کہ ”فلو جسٹن“ والا اصول صحیح ہے یا نہیں اس لئے کہ اگر یہ اصول صحیح ہو تو دہات بمقابلہ اپنے اکسید کے ہماری ہونے چاہئے کیونکہ اول الذکر میں ایک جزو یعنی ”فلو جسٹن“ ایسا موجود ہے جو ثانی الذکر میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن جب کسی دہات کا کوئی حصہ وزن کیا جاتا ہے اور وہ اکسید بھی تولی جاتی ہے جو اس سے نکلتی ہے تو اکسید ہماری ثابت ہوتی ہے۔ اور یہاں آکر مسئلہ ”فلو جسٹن“ غلط ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس تحقیقات کو جاری رکھا جائے تو ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اکسید بالکل جو اس کا ابتدائی نام تھا ہوا کے ایک جزو کے شمول کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہماری ہو جاتی ہے۔

یہ تجربہ علی العموم لیوازیرو سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ واقعہ کی قلوات کا وزن ٹکس سے بڑھ جاتا ہے لیوازیرو کے زمانہ سے بہت پہلے بعض یورپین کیمیادانوں کے تجربہ سے پایہ تحقیق کو پہنچ چکا تھا بلکہ اس کی حقیقت مسلمان کیمیا دانوں کو پہلے ہی سے اچھی طرح معلوم تھی۔ البتہ لیوازیرو پہلا وہ شخص تھا جس نے اس مسئلہ کی اہمیت کا صحیح صحیح انداز کیا اور اس کے ہاتھوں اس نے علم کیمیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

”فلو جسٹن“ والے قیاس کا ترک کیا جانا اس حقیقت کی ایک بین مثال ہے کہ علمی مفروضات و قیاسات اگر واقعات سے مطابقت نہ ہوں تو وہ کسی آمادگی سے رد کر دیے جاتے ہیں۔ یہ وہ کچھ ہے جس میں سند و روایت کا گزر نہیں۔ یہاں ہر معاملہ میں استنباط و استنباط قدرت سے کیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ عملی استنباط کا جو جواب قدرت دے گی وہ ہمیشہ صحیح ہو گا۔

اب اگر ان فلسفیانہ اصولوں کا جن پر سائنس کی ترقی منحصر تھی ان اصولوں کے ساتھ مقابلہ کیا جائے جن پر قیاسیت کا دارومدار تھا تو معلوم ہو گا کہ سائنس درایت کا دامن گرفتہ تھا تو مذہب روایت کا سانس نے اندازہ و مشاہدہ کے توافق یا عقل اور واقعہ کے

تطابق پر زور دیا تو مذہب نے اسرارِ اودھام پر سائنس نے اپنے قیاسات کو جب مطابق حقائق فطرت نہ پایا تو بلا تامل رد کر دیا۔ لیکن مذہب نے کورا نہ تھیدا سے کام لے کر ان عقائد کی رکاب تمام لی جو ناقابلِ فہم اور برتر از عقل تھے۔ دونوں کا تفرقہ برابر بڑھتا چلا گیا۔ ایک طرف سے حقارت ظاہر ہونے لگی تو دوسری طرف سے نفرت۔ جن لوگوں نے چشمِ انصاف کھلی رکھ کر ان دونوں حریفوں کی زور آزمائی کا تماشا دیکھا انہیں معترف ہونا پڑا کہ سائنس جلد جلد قیست کی بیخ کنی کر رہا ہے۔

اس طور پر فنِ ریاضی تحقیقاتِ علمی کا بہت بڑا آلہ بن گیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ فنِ علمی استدلال کا آلہ بن گیا۔ ایک اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے دماغ کے عمل کو حرکتِ اضطرابی کی شکل میں بدل دیا اس لئے کہ اس کی علامات اکثر و بیشتر فکر و غور کی قائم مقام ہو گئیں۔ تحکم و تدقیق استدلال کی عادت جس نے اس کے فیض سے نشوونما پایا دوسرے علوم و فنون میں بھی داخل ہو گئی جس کی وجہ سے دنیا میں ایک عقلی انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب یہ ممکن نہ تھا کہ معجزات و کرامات کے ثبوت سے لوگوں کی تشفی ہو سکے یا وہ منطقِ ذریعہ تسکین ہو سکے۔ جس پر ازمندہ وسطی میں عقلِ انسانی بھروسا کرتی تھی۔ ریاضی نے نہ صرف طریقہ خیال بلکہ رجحان خیال میں بھی تبدیلی پیدا کر دی۔ چنانچہ ان مضامین کا جن پر مختلف علمی مجلسیں اور انجمنیں اس زمانہ میں بحث کرنے لگیں اگر ازمندہ وسطی کے مباحث سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

لیکن ریاضی کا فائدہ قیاسات و نظریات کی تصدیق و توثیق تک ہی محدود نہ تھا۔ جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے اس کے ذریعہ سے ان حقائق کی نسبت پیشین گوئی بھی ہونے لگی۔ جو ابھی تک نامعلوم تھیں۔ اس لحاظ سے گویا اسے قیست کی پیشین گوئیوں کا جواب سمجھنا چاہئے۔ فنِ ہیئت نے اسی طرح سے سیارہ نیچون کا اکتشاف کیا اور فنِ مناظر و مرایا کے مسئلہ ارتعاش نور کے مغربی و کبری سے وہ نتیجہ برآمد ہوا جو شعاع نور کے انعطاف مخروطی کے نام سے موسوم ہے۔

ادھر تو ریاضی کی بدولت علومِ لمبعی میں یہ حیرت انگیز ترقی ہو رہی تھی۔ ادھر خود یہ فنِ مدارج ارتقا طے کر رہا تھا۔ ہم ذیل میں اجمالی طور پر اس ارتقا کی کیفیت قلم بند کرتے ہیں۔

فنِ الجبرا کے ابتدائی جراثیم اسکندریہ کے مهندس ڈیوڈس کی تصانیف میں نظر آتے ہیں۔ اس کا زمانہ دوسری صدی عیسوی بیان کیا جاتا ہے سابق میں اقلیدس نے دارالعلم

اسکندریہ ہی میں علم ہندسہ کی عظیم الشان حقیقتیں منطقیانہ ترتیب کے ساتھ جمع کی تھیں۔ سائر اکیوزمین ارسیمیدس نے علم ہندسہ کے اعلیٰ مسائل کو امتیحا کے عمل کے ذریعہ سے حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ علی رجحان کی یہ کیفیت تھی کہ اگر علوم و فنون کی سرپرستی جاری رہتی تو الجبرا کبھی کا ایجاد ہو گیا ہوتا۔

مبادی فن الجبرا کی معلومات کے لئے ہم عربوں کے رہن منت ہیں۔ ریاضی کی اس شاخ کا نام تک انہیں کا رکھا ہوا ہے۔ دارالعلم اسکندریہ سے اس فن کے جو بچے کھجے اجزا ان تک پہنچے تھے ان میں انہوں نے اس معلومات کا اضافہ کیا جو ہندوستان سے حاصل کی گئی تھی اور تنقیح و ترتیب کے بعد اس اصلاح یافتہ مجموعہ کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے مدون کیا۔ عربوں سے یہ فن تیرہویں صدی کے شروع میں اٹلی پہنچا۔ لیکن اس پر اس قدر کم توجہ کی گئی کہ تین سو سال تک یورپ میں کوئی کتاب اس فن پر نہ لکھی گئی۔ ۱۴۹۶ء میں ہیشیلی نے پہلی مرتبہ ایک کتاب بنام ”فن الجبرا“ شائع کی۔ ۱۵۰۱ء میں کارڈن ساکن میلان نے مساوات کعبہ یعنی تیسرے درجے کی مساوات کے حل کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ ۱۵۰۸ء میں سیروفیرو اور اس کے بعد ٹارٹلیا اور وٹا نے مزید مفید اضافے کئے اب علمائے جرمنی نے اس فن پر اپنی توجہ مبذول کرنی شروع کی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ علامات نویسی ناقص حالت میں تھی۔

۱۶۳۷ء میں ڈیکارٹ کی تصنیف فن ہندسہ پر شائع ہوئی۔ یہ کتاب جس میں اصول الجبرا کا اطلاق خطوط مقوس کی تعریف و تحقیق پر کیا گیا ہے ریاضیات کی تاریخ میں بنیاد ایک نئے دور کی تمہید کے ہے۔ اس سے دو سال قبل کوہلیری کا رسالہ مقادیر لاتیجری پر شائع ہو چکا تھا۔ اس طریقہ کو ٹارٹلی اور بعض دوسرے ریاضی دانوں نے ترقی دی۔ اب حساب مقادیر لامتناہی اور نیوٹن کے طریقہ فعلی اور لائبٹز کے طریقہ حساب جزئیات و طریقہ حساب تمام کی ترقی کے لئے رستہ کھل گیا۔ اگرچہ اصول علم الفضل کے نکات کا سرمایہ نیوٹن کے پاس کئی سال سے جمع تھا لیکن اس نے اس موضوع پر ۱۷۰۳ء تک کوئی تصنیف شائع نہ کی۔ جن ناقص علامات کا استعمال نیوٹن کرتا تھا اس کی وجہ سے طریقہ فعلی کا عمل موثر و کارگر نہ ہوتا تھا۔ اس اثنا میں فن الجبرا کو یورپ میں بہت ترقی ہوئی۔ برنولی کے تجربے اس کے بعض اعلیٰ مسائل کو نہایت خوبصورتی سے حل کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لائبٹز کا طریقہ حساب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا جس میں بہت سے ریاضی دانوں نے بہت کچھ اضافے اور اصلاحیں کیں۔ یہ رفتار ترقی غیر معمولی سرعت کے ساتھ

اٹھارویں صدی میں برابر جاری رہی۔ شکل و عددین پر جس کا اکتشاف نیوٹن سابق میں کر چکا تھا ٹیلر نے ۱۷۱۵ء میں اپنے مشہور طریقہ اضافات کا اضافہ کیا جو آج تک اس کے نام سے موسوم ہے۔ مولر نے ۱۷۳۳ء میں حساب اختلافات جزئیہ کا طریقہ رائج کیا۔ ولبرٹ نے اس طریقہ کو اور زیادہ وسعت دی۔ اس کے بعد یولر اور لگرنج نے طریقہ تغیرات کی بنا ڈالی اور ۱۷۷۲ء میں لگرنج نے طریقہ اعمال استخراجی ایجاد کیا۔

لیکن اٹلی۔ جرمنی۔ انگلستان اور فرانس ہی تک ریاضیات کی یہ عظیم الشان تحریک محدود نہ تھی۔ ریاضی کے سر پر جو عقلی تاج رکھا ہوا ہے اس میں اسکاٹ لینڈ نے لوکارٹم کی ایجاد سے ایک نیا ہیرا جڑ دیا۔ اس عظیم الشان ایجاد کے لحاظ سے علمی دنیا نیپیر آف سرمرچسن کی ممنون احسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بے مثل ایجاد کی علمی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے سے فہم قاصر ہے۔ طبعی معین و ہیت دانان زمانہ موجودہ کریم کالج کے استاد ریاضی پروفیسر برکس کے اس قول پر بچے دل سے صاد کریں گے کہ ”آج تک اس درجہ دل پسند اور حیرت اثر کتاب میرے دیکھنے میں نہیں آئی“ کہلو جس کا نام علمی دنیا میں بیش زائد رہے گا کہتا ہے اور بجا کہتا ہے کہ ”علم کی جس شاخ پر نہیں نے اپنی قابلیتوں کو صرف کیا اس کے لحاظ سے وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شخص ہے“ نہیں کا اشتغال ۱۷۸۷ء میں ہوا۔ اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ لوکارٹم کی ایجاد نے علماء ہیت کی محنت گھٹا کر ان کی عمر دگنی کر دی ہے۔

قلت گنجائش مانع ہے کہ فن ریاضی کی ترقیات پر زیادہ مبسوط بحث کی جائے۔ اس کے علاوہ ہم ریاضی کی تاریخ نہیں لکھ رہے ہیں۔ بلکہ اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ سائنس نے انسانی تمدن کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس مقام پر بے اختیار یہ سوال پھر تازہ ہوتا ہے کہ اس کے کیا معنی ہیں کہ کلیسا نے اپنے بارہ سو برس کے خود مختارانہ عہد حکومت میں ایک بھی مندرس نہیں پیدا کیا؟

ریاضی ہیٹھا یا ریاضی مطلق کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تحصیل میں ان آلات کی ضرورت نہیں پڑتی جو اکثر لوگوں کو میسر نہ آسکیں۔ طبیعت کے لگاؤ اور چند کتابوں کی کے لئے مہمل کا ہونا ضرور ہے لیکن ریاضی دان کو صرف طبیعت کے لگاؤ اور چند کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس فن کا اکتساب نہ صرف کثیر کا متقاضی ہے نہ کسی مددگار خادم کی اعانت کا محتاج ایسی حالت میں خیال ہوتا ہے کہ رہبانیت کی غلط گزین زندگی کے لئے بھی اس سے زیادہ دل پسند اور اس سے بڑھ کر روح کو بالیدگی بخشنے والا مشغلہ اور کیا ہو سکتا

تھا۔

اس استفسار کے جواب میں کیا ہم بھی خداخواستہ جناب پادری ہوسبیس صاحب کے ہم سفر ہو کر یہ کہیں کہ ”یہ محنت لامحالہ چونکہ ہماری نظروں میں نہایت ہی ذلیل ہے اس لئے ہم اس کو قابل توجہ نہیں سمجھتے بلکہ اعلیٰ تر حقائق کے اکتساب کو زیادہ مفید خیال کرتے ہیں؟ اعلیٰ تر حقائق کی بھی ایک ہی کمی۔ یہ تو ارشاد ہو کہ وہ کوئی حقیقت ہے جو حق مطلق پر فضیلت رکھتی ہے؟ کیا جھوٹی روایتیں بے بنیاد کرامتیں اور باطل افترا پردازیاں ہی وہ حقیقتیں ہیں جنہیں حقائق ملیہ کے مقابلہ میں افضلیت کا ادعا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انہیں نے اتنی مدت تک سائنس کے رستہ میں رکاوٹیں ڈالے رکھیں۔

اس علمی حملہ کی پہلی ہی جھبھٹ میں حکام کلیسا کو مطوم ہو گیا تھا کہ جو اصول سائنس شائع کر رہا ہے وہ مروجہ مذہب کے عقائد سے مطلق لگا نہیں کھاتے۔ اسی لئے انہوں نے سائنس کی مخالفت میں ناخنوں تک کا زور لگایا اور جائز و ناجائز سبھی طرح کی کوششیں اس کی تخریب کے لئے کیں۔ علوم عملی سے جن کا دارومدار تجربہ اور مشاہدہ پر تھا۔ پادریوں کو اس قدر سخت عداوت تھی کہ جب فلائرس کی اکاڑی بند ہوئی تو ان کے گھر میں گھی کے چراغ جلے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم نے بہت بڑا میدان مار لیا۔ اور یہ معاندانہ جذبات کچھ رومن کیتھولک مذہب ہی کے سینہ میں جوش زن نہ تھے۔ پرائسٹ مذہب کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ چنانچہ جب لندن کی ”رائل سوسائٹی“ (شاهی مجلس) کی بنا ڈالی گئی تو پادریوں کی طرف سے اس پر ایسی سخت لے دے ہوئی کہ اگر شاہ چارلس ثانی اس کی علانیہ حمایت نہ کرتا تو اس کا اسی وقت خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ پادریوں نے اس سوسائٹی پر یہ الزام لگایا تھا کہ یہ چاہتی ہے کہ مذہب مروجہ کو مٹا دے۔ یونیورسٹیوں کو نقصان پہنچائے اور علوم قدیمہ کا ستیاں کر دے۔

اس علمی مجلس کی روئے اول پر نظر ڈالنے سے مطوم ہوتا ہے کہ اس نے انسان کی ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اس کا انعقاد ۱۶۶۳ء میں ہوا اور اس وقت سے لے کر اب تک جو جو علمی تحریکات و اکتشافات ہوئی ہیں۔ ان سب میں اس کی مستعدی شریک غالب رہی ہے۔ اس نے نیوٹن کی تصنیف ”ہونسیا“ اپنے اہتمام سے شائع کی۔ ہیلی کا بحری سفر جو پہلی وہ مہم تھی جس کا اہتمام کسی حکومت کی طرف سے سرکاری طور پر ہوا ہو اس کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے تخریب خون کے متعلق متعدد تجربے کئے اور ہاروی کی تحقیقات دوران خون کو تسلیم کر لیا۔ چمپک کے مرض میں مریض کو ٹپکا لگانے کی ترغیب اسی

نے دلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادی کیولائن نے بادشاہ سے چھ ایسے مجرموں کی جان بخشی بفرض تجربہ کرائی جن کی نسبت سزائے موت کی تجویز ہو چکی تھی اور اس کے بعد شہزادی نے خود اپنے بچوں کے ٹپکا لگوا دیا۔ اسی کی تائید سے بریڈلی نے اپنے عظیم الشان اکتشاف یعنی اختلاف منظر ثابت کو مکمل کیا اور اہتراز محور ارض کی کیفیت دریافت کی اور یہ وہ دو اکتشافات ہیں جن پر ڈالامبرگے قول کے مطابق ہیئت جدیدہ کی تدقیق و تحکیم منحصر ہے۔ اسی کی کوششوں سے معیاس الحرارت میں جو میزان مدارج حرارت ہے اور ہیسسن کی جیبی گھڑی میں جو میزان وقت ہے اصلاح ہوئی۔ اسی کی مساعی سے ۱۷۳۳ء میں تقویم گرگوری باوجود شدید مذہبی مخالفت کے انگلستان میں رائج ہوئی۔ عوام و جلا کا خیال تھا کہ ”رائل سوسائٹی نے ان کی عمر کے گیارہ دن گھٹا دئے ہیں اسی لئے وہ ایسے برفروختہ ہوئے کہ سوسائٹی کے بعض ”فیلولوز“ (اعضا) کو ان کے ہاتھوں جان کے لالے پڑ گئے اور ایک طیش آلودہ انہو کے غضب سے انہوں نے بھاگ کر بمشکل اپنا بچھا چھڑایا۔ پادری و معمولی نے جو جیسویٹ فرقہ کا ایک عالم تھا انقلاب تقویم کے مسئلہ میں بہت دلچسپی ظاہر کی تھی لہذا سوسائٹی کو مجبوراً اس کا نام خفی رکھنا پڑا بریڈلی کا انتقال اتفاق سے اسی بل چل میں ہو گیا لہذا جلا نے نہایت شدد کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ یہ مرگ مناجات خدا کا قہر تھا جو اس پر اپنے گناہ کی پاداش میں نازل ہوا۔

اگر ہم اس عالی شان مجلس کی خدمات کا موندوں طور پر اعتراف کرنا چاہیں تو اس کے کارناموں کی تفصیل کے لئے کئی اوراق مطلوب ہوں گے۔ ڈالینڈ کی دوربین بے رنگ راسٹن کا باخبرہ انقسام جس کی ایجاد اول اول مشاہدات فکلی کی تصحیح و تحکیم کا باعث ہوئی۔ مین اور ڈکن کی مساعی سے سطح زمین کے ایک درجہ کی پائنٹ۔ سیارہ زہرہ کے مرور کے ارتصاد کے لئے کپتان لگ کی سیاحت۔ زمین کے گرد اس کا بحری سفر۔ اس کا یہ ثبوت کہ مرضی احراق خون کی بلا جس سے طویل بحری سفر میں مسافر بچ نہیں سکتا میوہ اور ترکاری کے استعمال سے دفع ہو سکتی ہے۔ قطب شمالی و قطب جنوبی کی مہمات۔ مسکین کے تجربوں کے ذریعہ سے جو بمقام شالین عمل میں لائے گئے اور نیز کیوڈش کے تجربوں کی وساطت سے کثافت ارض کی محسوس۔ ہرشل کا اکتشاف سیارہ۔ یورینس۔ کیوڈش اور واٹ کی تحلیل اجزائے آب۔ لندن اور پیرس کے طول البلد کے فرق کی تعین۔ بطاریہ کربائیہ کی ایجاد۔ ہرائلہ کی پائنٹ فکلی۔ یک کا اصول مقارنت کو ترقی دینا اور مسئلہ ارتعاش نور کو قوی کرنے سے ثابت کرنا۔ جیل خانوں اور دوسری عمارات میں ہوا رسانی کا انتظام۔ شرکی

روشنی کا انتظام بذریعہ غار۔ رقاص ٹانویہ کے طول کی تحقیق اختلاف عرض البلد کے لحاظ سے کشش ثقل کے اختلافات کا اندازہ تقوس ارضی کی تحقیق کا عمل۔ اس کی مہم قطبی۔ ڈیوی کی ایجاد قانون سلامتی اور تحلیل حرضیات و ارضیات اور سٹل اور فیراڈے کے کربائی اور معنطیسی اکتشافات۔ سچ کا باخبرہ تحقیق۔ مہولٹ کی تحریک پر متعدد معنطیسی رصد گاہوں کے قیام کی تدابیر۔ سطح زمین پر ایک ہی وقت میں مختلف معنطیسی اختلافات کے حادث ہونے کی تحقیق و تصدیق۔ غرض کہاں تک بیان کیا جائے۔ ”رائل سوسائٹی“ کے علمی کارناموں کی کھل فہرست بھی بیخوف طوالت یہاں درج کرنے سے ہم قاصر ہیں۔ اس کے قالب میں بھی وہی روح کارفرما تھی جو فلازنس کی علمی مجلس کی زندگی کا باعث ہوئی تھی اور اسی لئے اس کا نشان امتیازی یہ قہر تھا۔ ”تعلید جامد سے پرہیز“ اس نے ادہام و روایات کو اپنی حدود سے خارج کر دیا اور صرف محاسبہ مشاہدہ اور تجربہ کو جائز رکھا۔

یہ ہرگز نہ خیال کرنا چاہئے کہ ان غیر معمولی کوششوں اور نمایاں کامیابیوں کے لحاظ سے رائل سوسائٹی یکہ و تما تھی۔ یورپ کے تمام دارالسلطنتوں میں مساوی الامتیاز اور مساوی الفوز دارالعلم مجالس اور انجمنیں قائم تھیں جو معلومات انسانی اور تمدن جدید کے ارتقا میں برابر حصہ لے رہی تھیں۔

سائنس کا اقتصادی اثر

علیٰ نظر سے اگر صحیفہ فطرت کی ورق گردانی کی جائے تو نہ صرف انسان کے عقلی قصورات کی رسائی معرفت اور حقیقت شناسی کے مقامات عالیہ تک ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی طبیعی و مادی حالت کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ انسان کے دل میں ہمیشہ یہ خواہش پیدا ہوتی رہتی ہے کہ واقعات حقیقہ کے اقتصادی استعمال کی کوئی ایسی شکل نکالے جس سے وہ اس کے معاش کی اغراض کی تکمیل کر سکیں۔

اصول علیٰ کی تحقیقات کے بعد بہت جلد ایجادات علمی کا ظہور ہوتا ہے۔ علم و عمل کا یہ باہمی تعلق ہمارے زمانہ کی خصوصیت مختصہ ہے۔ اس نے دنیا کے تمدن میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

زمانہ سابق میں جنگ استرۃؓ ہوا کرتی تھی۔ فاتح غلاموں کے کھپ کے کھپ اپنے ساتھ لے آتا تھا اور ان سے جبراً ممت لیتا تھا اس لئے کہ انسانی ممت میں انسانی ممت ہی کے ذریعہ سے تخفیف ہونی ممکن تھی۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ قدرت کی طبعی اور جر حتمی قوتوں سے کام لینے میں بدرجہا زیادہ فائدہ ہے تو اقوام کی حکمت عملی میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جب اس حقیقت کا علم ہوا کہ کسی نئے علمی اصول کا استعمال یا کسی نئی کل کی ایجاد ایک جدید غلام کے حصول کی بہ نسبت زیادہ نفع رساں ہے تو صلح کو جنگ پر ترجیح حاصل ہو گئی۔ ان جدید اکتشافات کا اثر یہاں تک ہوا کہ اہل امریکا و روس کی طرح ان قوموں نے جن کی آبادی کا بڑا حصہ غلاموں سے مرکب تھا یہ دیکھ کر ہمدردی انسانی اور اغراض معنی اب ایک دوسرے کی مغائر نہیں ہیں۔ اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا۔

غرض ہم ایک ایسے زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی ممت کا قائم مقام کلوں کو بنایا جائے۔ اس زمانہ کی جر حتمی ایجادات نے تمدن اور معاشرت میں ایک انقلاب پھا کر دیا ہے۔ ہم اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے قدرتی طاقتوں سے مدد مانگتے ہیں۔ فوق القدرت طاقتوں سے چارہ جوئی نہیں کرتے۔ کیسٹونک مذہب اسی جدید تمدن سے جو اس طور پر پیدا ہوا ہے۔ ابا کرتا ہے۔ پاپیت بہ ہانگ دل اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ اس کو موجودہ حالت سے ہرگز کوئی سوداگر نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس امر کی متقاضی ہے کہ ازمہ و سلی کے دور جاہلیت کی طرف رجعت فوری کی جائے۔

یہ حقیقت انسان کو حضرت مسیح سے چھ سو برس پیشتر معلوم تھی کہ اگر کھرا کے ایک کلرے کو رگڑا جائے تو اس میں جذب و دفع کی قوت پیدا ہو جائے گی۔ ظہور مسیح سے سولہ سو سال بعد تک یہ حقیقت محض بچوں کا کھیل بنی رہی اور اس سے کسی نے فائدہ نہ اٹھایا۔ لیکن جب اس پر علمی طریقہ سے بحث کی گئی اور ہندسانہ مناہو اور تجربہ کی کسوٹی پر کس کر اس کے نتائج کو عملی طور پر کام میں لایا گیا تو اسی ادنیٰ سی حقیقت کی بدولت انسان اس قابل ہو گیا کہ خشکی اور تری کے حائل ہونے کے باوجود ہزارہا میل کے فاصلہ پر بیٹھا ہوا ایک دوسرے سے طرفہ العین میں بات چیت کر سکے۔ اس حقیقت نے دنیا کی قوتوں کو ایک مرکز پر لا کر جمع کر دیا ہے۔ فرمان روائے وقت کو بلا لحاظ زمانہ مکان اجرائے احکام و فرامین پر قدرت عطا کرنے سے اس نے تدبیر میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور سیاسی قوت کے ساتھ تخیل کو نکاح سے بدل دیا ہے۔

عجائب خانہ اسکندریہ میں ایک کل تھی جسے جبر و ریاضی دان نے حضرت مسیح سے کوئی ایک سو سال قبل ایجاد کیا تھا۔ یہ کل دخانی قوت سے چلتی تھی اور اس کی شکل و سکی ہی تھی جیسی آج کل باخترہ استرجاعیہ یعنی رد عمل کرنے والے انجن کی ہوتی ہے۔ یہ انجن جو دنیا کی ایک نہایت عظیم الشان ایجاد کا ہیولی تھا سترہ سو سال تک محض ایک عجوبہ سمجھا جاتا رہا۔

زمانہ حال کے دخانی انجن کی ایجاد کو بخت و اتفاق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ اسے غور فکر اور تجربہ کا عقلی ماحصل سمجھنا چاہئے۔ سترہویں صدی کے وسط میں بعض ہندسوں نے جو علم الحركات و الجیل کے ماہر تھے دخانی قوت سے فائدہ اٹھانے کی کوششیں شروع کیں۔ ان کوششوں کو واٹ نے اٹھارہویں کے وسط میں مکمل کر دیا۔

دخانی انجن بہت جلد تمدن کا مزدور بن گیا۔ اس نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ان اشخاص کو جن کی عمر ڈلیا ڈھوتے ڈھوتے کٹ جاتی زیادہ مفید مشغلوں کا موقع دیا۔ جو لوگ پہلے محال تھے اب حکیم بننے کے قابل ہو گئے۔

اول اول اس سے بذریعہ تل پانی کھینچنے اور اسی قسم کا دوسرا کام لیا گیا جس میں محض طاقت صرف ہوتی تھی لیکن زیادہ مدت نہ گزرنے پانی تھی کہ سوت کا تھن اور کپڑا بننے کی لطیف صنعت میں حصہ لے کر اس نے ثابت کر دیا کہ اس میں ہاریک اور نازک کام کرنے کی قابلیت بھی موجود ہے۔ اس نے صنعت و حرفت کے عظیم الشان کارخانے قائم کر دیے اور دنیا کا ہزارہ اسی کے طفیل چلنے لگا۔ غرض اقوام عالم کے صنعت و حرفت کی اس نے

صورت ہی بدل دی۔

پہلے دریاؤں اور اس کے بعد سمندروں میں جب دغانی انجن سے جہازرانی کے حلق کام لیا گیا تو اس نے کشتیوں اور جہازوں کی سرعت رفتار کو دگنا چوگنا چمکنا کر دیا۔ امریکہ سے انگلستان پہنچنے میں پہلے چالیس دن صرف ہوئے تھے اب آٹھ گھنٹہ دن میں یہ سفر طے ہونے لگا۔ لیکن خشکی کے سفر میں دغانی انجن کی طاقت حیرت انگیز طور پر ظاہر ہوئی جو فاصلہ انسان پہلے ایک دن میں بھی طے نہ کر سکتا تھا۔ اب ایک گھنٹے سے بھی کم میں طے ہونے لگا۔

دغانی انجن سے نہ صرف انسانی مستعدی و کارگزاری کے میدان کو وسیع کر دیا ہے بلکہ فاصلہ کے اعتبارات کو گھٹا دینے سے انسانی زندگی کی قابلیتوں کو بڑھا دیا ہے۔ کدو خالوں کے تیار شدہ مال اور زراعتی پیداوار کے سرچ السیر نقل و حمل سے اس نے انسانی صنعت و حرفت کی تحریک میں ایک بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

گھڑی کی ایجاد نے دغانی جہازرانی کے فن کو درجہ کمال پر پہنچانے میں ایک بڑی حد تک تحریک کی اس لئے کہ اس ایجاد کی بدولت نہایت صحت کے ساتھ یہ معلوم ہونے لگ گیا کہ سمندر میں جہاز کس وقت کس موقع پر ہے۔ عجائب خانہ اسکندریہ میں سائنس کی ترقی اس وجہ سے ایک بڑی حد تک رکی ہوئی تھی کہ کوئی ایسا آلہ نہ تھا جس سے وقت یا حرارت کا اندازہ کیا جاسکے یعنی نہ اس زمانہ میں گھڑی موجود تھی نہ تھرماس الحرارت کا وجود تھا اور یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایجادیں لازم و ملزوم ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عجائب خانہ اسکندریہ میں آبی گھڑیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن ان کی ساعت نمائی صحیح اور قابل اعتماد نہ تھی۔ ان میں سے ایک گھڑی کو جو منفعت البہوج کی علامات سے مزین تھی قرون اولیٰ کے بعض جاہل عیسائیوں نے ضائع کر دیا اور ایک مقدس عالم سینٹ پالیکارپ نے اس کی نسبت نہایت ہی معنی خیز لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ ”ان تمام غبیث دیووں کی شکل میں ایک ایسے سٹلی علم کی صورت نظر آتی ہے جو دشمن ایمان ہے۔“ کہیں ۶۸۰ء میں جا کر گھڑی درجہ صحت کو پہنچی۔ ہوک نے جو نیوٹن کا محاصرہ تھا اس میں دو لاپ تعدیل اور پکر دار کمائی دو پرزے بڑھائے۔ اس کے اور مختلف پرزے مثلاً لنگر۔ کالہ۔ شئی اور رشتار یکے بعد دیگرے اضافہ کئے گئے درجات حرارت کے تغیرات کی دقایت بھی ملحوظ رکھی گئی اور اس کے لئے مزید ترمیمات کی گئیں۔ یہاں تک کہ ہیرسن اور آرنلڈ نے گھڑی کو وقت کا ایک نہایت ہی صحیح پیمانہ بنا دیا۔ گھڑی کی ایجاد پر گاؤ فری کامنولہ انکاسی یعنی سدس دانہ کی

شکل کا وہ آلہ مستزاد ہوا جس کی وجہ سے چلتے جہاز میں مشاہدات فلکی کا ارتصاد ممکن ہو گیا۔

فن جہازرانی میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں ان سے انقسام اقوام پر ایک قوی اثر پڑ رہا ہے۔ مستعمرات یعنی نو آبادیاں بڑھ رہی ہیں اور ان کی نوعیت تعمیر پذیر ہو رہی ہے۔

لیکن ان بڑے بڑے اکتشافات و ایجادات ہی نے جو تحقیقات علمی کا ماحصل ہیں انسان کی حالت کو نہیں بدلا ہے بہت سی چھوٹی چھوٹی ایجادات نے جو بجائے خود چنداں قابل لحاظ نہیں مجموعی حیثیت سے تمدن پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ چودھویں صدی میں سائنس نے قوت ایجاد کو ایک انگیز تحریک پہنچائی اور اس قوت نے اپنے آپ کو ان علمی نتائج کے استخراج پر وقف کر دیا جو سو مہدی کا پہلو لئے ہوئے تھے۔ قانون نے موجدوں کو اپنی ایجاد سے معقول نفع حاصل کرنے کا استحقاق بذریعہ سند ایجاد عطا کیا۔ جس سے لوگوں کو نئی نئی ایجادیں کرنے کی انگہ پیدا ہوئی۔ اس قسم کی ایجادات کا ذکر ہم اس مقام پر برہسبیل تذکرہ سرسری طور پر کریں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان سے تمدن کس قدر متاثر ہوا ہے۔ آدھ کشی کی کل کے جاری ہونے سے مکانات کے فرش چوبی ہو گئے اور اینٹ چوٹے پتھر کے فرش خواب و خیال ہو گئے۔ شیشہ سازی کے کارخانوں کے قائم ہونے سے آئینہ دار کھڑکیوں کا مکانوں میں اضافہ ہو گیا اور کمرے گرم رہنے لگے لیکن آئینہ بندی کا فن سولہویں صدی سے پہلے کمال کو نہ پہنچا۔ سولہویں صدی میں شیشہ ہیرے سے تراشا جانے لگا۔ دودکشوں کے اضافہ سے مکانوں کی ہوا صاف ہو گئی پہلے وہ وحشیوں کے جموہنڈوں کی طرح دھوئیں سے بھرے ہوئے ہوتے تھے اور ان کے اندر کی دیواریں کالک سے لسی ہوئی ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں دودکشوں کی وجہ سے منطقہ بارہ کے مکانوں میں وہ سامان راحت مہیا ہو گیا۔ جسے آتش دان سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب تک آگ تاپنے اور مکان کو گرم رکھنے کا ذریعہ صرف یہ تھا کہ دھواں نکلنے کے لئے چھت میں ایک سوراخ کر دیا جاتا تھا۔ الاؤ جلائے کے فرش کے پھوپھو ایک گڑھا کھود دیا جاتا تھا اور جب آگ جلنے کی سرکاری ٹھنٹی بجھتی تھی یا رات ہو جاتی تھی تو ایک سرپوش سے اسے گڑھے کو ڈھک دیا جاتا تھا۔

اگرچہ پادریوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی لیکن لوگوں کے ان خیالات کو کسی طرح روک قائم نہ ہو سکی کہ دہاؤں کو خدا کا قبر نہ سمجھنا چاہئے جو بندوں پر ان کی بد اعمالیوں کی پاداش میں نازل ہوتا ہے بلکہ غلاط اور تباہ حالی کا مادی نتیجہ تصور کرنا چاہئے

اور ان سے بچنے کا مناسب طریقہ یہ نہیں ہے کہ بیرونیوں اور اولیاءوں سے دعائیں مانگی جائیں۔ بلکہ یہ ہے کہ شہروں میں صفائی کا انتظام کیا جائے اور ہر شخص خود بھی جسمانی صفائی کا خیال رکھے۔ بارہویں صدی میں پیرس کی گلیاں مارے غلاطت اور مہلکیت کے سبب اس میں ہونی تھیں۔ حکومت نے مجبور ہو کر سڑکیں صاف کرائیں اور ان پر سنگ مرمر کھائے۔ گندگی کا دور ہونا تھا کہ بچپن اور وہابی بخار فوراً جاتا رہا۔ اس طور پر پندرہویں شہر کی صفائی کی قریب قریب وہی حالت ہو گئی جو اسپین کے اسلامی شہروں میں نظر آتی تھی جہاں سڑکیں صدیوں سے پختہ چلی آتی تھیں۔ غرض پیرس میں جس کا حسن اب روز بروز بدھتا چلا سوروں کے رکھنے کی ممانعت کر دی گئی لیکن اس حکم پر سینٹ انتونی کے ویز کے راہب بہت غلڑے اور متقاضی ہوئے کہ اس خانقاہ کے سوروں کو بے روک ٹوک ہر جگہ پھرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ کلیسا کے قصاب کی تاب کوئی نصرانی حکومت اس زمانہ میں نہ لاسکتی تھی۔ اس لئے مجبوراً فرانسیسی حکومت کو اپنے حکم میں کھربوٹ کرنی پڑی اور معاملہ اس طرح رفع دفع ہوا کہ اس خانقاہ کے سوروں کے گلے میں گھنٹیاں لٹکا دی جائیں۔ شاہ لوی الملقب بہ فریہ کا بیٹا شاہ قلب ایک دن گھوڑے پر سوار جا رہا تھا کہ ایک سورنی سامنے آگئی۔ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور بادشاہ کو لے کر گرا۔ جس کا گرتے ہی دم نکل گیا۔ بالاخانوں اور کھربوٹوں میں سے دھووں باہر پھینکنے کی لوگوں کی عام عادت تھی جس کی وجہ سے آئندہ دوسمٹلت پت ہو جایا کرتے تھے۔ حکومت کی طرف سے اس کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ ۱۸۷۷ء میں پاپائی حکومت کے اعتراض کے وقت جب مصنف کتاب ہذا کو روما کی سیر کا اتفاق ہوا تو گلیوں میں گھوڑے کے ڈھیروں گندے پانی کے ڈاہروں کی یہ کیفیت تھی کہ کپڑو کو نجاست کی آلودگی سے بچانے کے لئے ضرور تھا کہ گزرنے والے کی آنکھیں کبھی کبھی آسمان کی طرف اٹھ جانے کے بجائے زمین کی مسلسل و متصل درہانی کیا کریں۔ سترہویں صدی کے شروع میں برلن کی گلیوں کی یہ حالت تھی کہ ان کو کبھی صاف نہیں کیا جاتا تھا۔ اس شہر کا قانون یہ تھا کہ جو دیہاتی سودا سلف خریدنے کی غرض سے اپنا چھڑا لے کر بازار میں آئے وہ واپسی کے وقت چھڑے میں کوڑا کرکٹ بھر کر لے جایا کرے۔

سڑکوں کی کٹائی کے بعد ٹالیوں اور بدرووں کی تیاری کی کوشش کی گئی لیکن اول اول یہ کوشش ناقص اور ادھوری رہی۔ جو لوگ سوچ سمجھ رکھتے تھے ان کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوا کہ شہروں اور نیز ان مکانات میں جو الگ تھلک واقع ہیں جب تک ٹالیوں اور بدرووں کا انتظام نہ کیا جائے گا صحت درست نہ رہ سکے گی۔ اس کے بعد عام گزرگاہوں کی

روشنی کا انتظام ہوا۔ جن لوگوں کے گھرب راہ واقع تھے اول تو ان پر اس قاعدے کی پابندی لازم کی گئی کہ موسم بٹیاں یا چراغ اپنی کھڑکیوں میں روشن رکھیں تاکہ ان کی روشنی سڑک پر بھی پڑتی رہے اس کے بعد قرطبہ و غرناطہ کے اسلامی طریقہ کو پیش نظر رکھ کر سرکاری طور پر روشنی کا انتظام کیا گیا لیکن یہ انتظام اٹھارہویں صدی سے پہلے جگہ گاس کی روشنی ایجاد کی گئی تکمیل کو نہ پہنچا۔ سرکاری لائٹوں کے نصب کئے جانے کے ساتھ ساتھ رات کے پھرے اور پولیس کا انتظام بھی کیا گیا۔

سولہویں صدی کے آغاز پر کلون کی ایجاد اور دست کاریوں کی اصلاح نے تمدن اور معاشرے پر نمایاں اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ دیواروں پر صورت دیکھنے کے آئینے آویزاں نظر آنے لگے۔ طاقتوں پر وقت دیکھنے کی گھڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ آتش دانوں پر کاربیس بن گئیں۔ اگرچہ اکثر مقامات کے باورچی خانوں میں گھاس پھوس اور لکڑی ابھی تک ایندھن کا کام دیتی تھی لیکن کونسلہ کا استعمال عام ہو چلا۔ کھانا کھانے کے کمروں میں میز پر الوان نعت کے نئے خوان لگے ہوئے نظر آنے لگے۔ تجارت کا ہاتھ ممالک غیر کی نعمتیں اس پرچنے لگا۔ شمالی ممالک کی بدمزہ اور غیر مصفا شرابوں کی جگہ جنوب کی لطیف اور روح پرور اشیر نے لے لی۔ برف خانے تعمیر ہو گئے۔ ہوا کی چکیوں میں آٹے کے چھنے اور روٹی زیادہ سفید اور زیادہ نفیس تیار ہونے لگی۔ کئی۔ آلو۔ ٹیل مرغ کا گوشت اور تمباکو وہ نعمتیں تھیں جو پہلے بوجہ نادر اور کیاب ہونے کے خاص خاص لوگوں کو میسر آتی تھیں۔ اب ان کا ذائقہ کام و زبان کے لئے عام ہو گیا۔ پہلے لوگ ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے۔ کانٹے نے جو اٹلی میں ایجاد ہوا اس گھناؤنے طریقے کی اصلاح کر دی۔ غرض مذہب و شائستہ قوموں کے دسترخوان کی صورت ہی بدل گئی۔ چاء چین سے توبہ عرب سے اور شکر ہندوستان سے آنے لگی جن کا استعمال ایک بڑی حد تک مسکرات و منشیات کا قائم مقام ہو گیا۔ پرال کے فرش کی جگہ دریوں اور قالینوں نے لے لی۔ خوابگاہوں میں صاف ستھرے پٹنگ اور اچلے بچھونے موجود ہو گئے۔ توشہ خالوں میں صاف اور نفیس پوشاک کے متعدد جوڑے میا ہو گئے۔ بہت سے شہروں میں بجائے اس چشمہ آب کے جہاں سے ہر شخص بہتر اپنی ضرورت کے پانی بھر کر لے جاتا تھا یا پانی کے اس قیل کے جو گلی میں نصب ہوتا تھا گھر گھر پانی کا قیل جاری ہو گیا۔ وہ چھتیں جو بزمانہ سابق میل اور کلونس سے غلیظ ہو جاتی تھیں اب قیل بوٹے اور نقش و نگار سے مزین ہو گئیں۔ حمام کا استعمال عام ہو چلا۔ جسم کی بدبو کا رد عمل کرنے کے لئے عطریات کے استعمال کی ضرورت کم رہ گئی۔ حدیقہ آرائی و

چمن بندی کے دل پذیر مذاق کو روز بروز ترقی ہوتی چلی اور ممالک غیر سے بہت سے نئے نئے پھولوں کے پودے لاکر کشتوں میں لگائے گئے مثلاً ”گل شبو کرن پھول۔ گل اکلیل۔ گل نرگس۔ گل شفیق لقمائی۔ گل صد برگ۔ سواری کی قسم سے اول پالکیاں اور تام جھام رائج ہوئے اس کے بعد بند گاڑیاں استعمال ہونے لگیں اور آخر میں کرایہ کی گاڑیاں رائج ہو گئیں۔

گلوں کا گھر گھر چھا ہوا چلا۔ گنوار دہاتیوں تک بھی ان کی رسائی ہو گئی اور رفتہ رفتہ مل جوتے۔ بیج بونے گھاس کاٹنے۔ فصل کی لاؤنی کرنے اور دائیں چلانے کے آلات مکمل ہوتے گئے۔

باوجود ان پادریوں کے مواعظ و نصائح کے جو بھیک کا خمیرا لئے ہوئے یورپ کے ہر شہر میں در بدر پھرتے تھے لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہو چلا کہ فلاکت ام الجرائم اور حجاب العلم ہے اور تجارت کے ذرائع سے دولت کماتا بمقابلہ اس جاوہ کنت کے جو بذریعہ جنگ حاصل ہو بمراتب افضل ہے۔ مائیکیکو کا قول ہے کہ تجارت قوموں کو ملاتی ہے مگر لغزاد کو لڑائی اور جنس اخلاقی کا پیو پار کرتی ہے۔ یہ قول اگرچہ سچ ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تجارت ہی کی بدولت دنیا میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ تجارت کا نصب العین یہی ہے کہ عالم میں امن و صلح کا علم لہراتا ہوا نظر آئے۔

جب سے سائنس اپنا فیض رساں اثر دنیا پر ڈالنے لگا ہے اور قوت ایجاد صنعت و حرفت کا ہاتھ بٹانے لگی ہے انسان کے تمدن اور معاشرے کی حالت میں غیر معمولی اصلاح اور ترقی ہوئی ہے۔ ان اصلاحات و ترقیات کی تفصیل کے لئے بجائے کئی ضخیم جلدوں کے ان چند اوراق پر اکتفا کرنا اگرچہ مضمون کو تشنہ چھوڑتا ہے اور قلت گفتگو ہمیں مزید ایضاح کی اجازت بھی نہیں دیتی لیکن بعض امور پھر بھی ایسے ہیں جنہیں خوشی کے ساتھ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بارسلونا کی بندرگاہ خلفائے اندلس کی عظیم الشان بحری تجارت کا مرکز تھی۔ یہاں سے سینکڑوں جہاز قیمتی مال تجارت سے لدے ہوئے اطراف و اکناف عالم میں جاتے تھے۔ مسلمانوں نے یودی تاجروں کی اعانت سے فن تجارت میں بہت سے جدید اصول اختیار یا ایجاد کئے تھے اور یہ اصول علم کے نظری مسائل کے ساتھ ان کی فیض رسائی کی بدولت یورپ کی تجارتی جماعتوں تک پہنچ گئے تھے۔ اس طور پر حساب نویسی کا طریقہ ذواندراجین یا حساب فروج رائج ہو گیا جس میں آمدنی اور خرچ کا روزانہ حساب دو جداگانہ خالوں میں بالمقابل لکھا جاتا ہے۔ علی ہذا القیاس بیمہ کی مختلف قسمیں بھی رائج ہو

گئیں۔ اگرچہ پادری کڑکڑاتے اور بیڑاتے ہی رہے۔ بیرہ آتھوگی و بیرہ بحری کی مخالفت پادریوں کی طرف سے نہایت سختی کے ساتھ اس بناء پر ہوئی کہ یہ ایک فتنہ ہے جو گویا تضاد قدر کا امتحان لیتا ہے۔ زندگی کے بیرہ کے عدم جواز کے حعلق یہ فتویٰ صادر ہوا کہ اس فصل سے گویا خدائے تعالیٰ کی مشیت کے نتائج میں دخل دینا مقصود ہے۔ سود یا کفالت پر روپیہ قرض دینے کی جو کوٹھیاں یعنی بینک اور بندھک کے ساہوکاری قائم تھیں۔ ان کی سخت مخالفت کی گئی۔ خصوصاً زیادتی شرح سود کو رہا خواری کے ذیل نام کی آڑ میں قابل نفرت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور یہ وہ خیال ہے جو ابھی تک بعض نارتی یا نئے جماعتوں میں پایا جاتا ہے۔ موجودہ شکل کی ہنڈیاں جن میں دینی اصطلاحات مستعمل تھیں جو آج کل زیر استعمال ہیں رائج ہو گئیں۔ افسر تصدیق قبائلہ جات کا عہدہ قائم ہو گیا اور ہنڈیوں کا سکارنے سے پہلو تھی کرنے والے پر گرفت ہونے لگی۔ غرض بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ تجارت کی کل آج جن پرزوں کے زور سے چل رہی ہے وہ اس زمانہ میں تمام و کمال رائج ہو چکے تھے۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ امریکہ کی دریافت نے یورپ میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اٹلی کے بہت سے دولت مند تاجر اور باہت یہودی ہالینڈ انگلستان اور فرانس میں جا کر آباد ہو گئے اور ان ممالک میں ان کی وجہ سے تجارت کو مختلف تجارتی گر معلوم ہو گئے۔ پاپاؤں نے حد سے زیادہ سود کھانے والوں کو مردود و لمعون قرار دیا تھا۔ یہودی جنہیں ان ملاعن کی کچھ پروا نہ تھی بھاری سود پر روپیہ قرض دے دے کر خوب مالدار ہو گئے تھے۔ پاپائی پائس ٹائی نے یہ دیکھ کر کہ اس سے عیسائیوں ہی کا نقصان ہے فتوائے لعنت واپس لے لیا۔ بلاخر یہود ہم کی اجازت سے بندھک کے ساہوکاری قائم ہو گئے اور پاپا کی طرف سے اس مضمون کا ایک شدید آمیز فرمان جاری ہوا کہ جو شخص ان کو ٹھیکوں کے جواز کے خلاف قلم اٹھائے گا وہ کلیسا سے خارج کر دیا جائے گا۔ پرائسٹوں نے محض ضد کی وجہ سے ان سماجی کارخانوں کی مخالفت شروع کی۔ بھلا کیونکر ممکن تھا کہ جس چیز کو دوا جائز بتائے اسے پرائسٹ ناجائز سمجھیں۔ جب اس دینی عقیدے کو کہ زلزلہ کی طرح دیا بھی خدا کا تر ہے جو انسان پر اس کے اعمال سینہ کی پاداش میں نازل ہوتا ہے لوگ شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے تو دوا کے دفعیہ کی کوشش قرینوں کے قیام سے عمل میں لائی جانے لگی۔ تلقیح سختی انسانی بچک کے نیچے کا طریقہ مسلمانوں کا دریافت کیا ہوا تھا۔ ۱۷۷۱ء میں لیزلی میری وارٹلی ماسٹک جب قسطنطنیہ سے اس طریقہ کو اپنے ہمراہ لائیں تو پادریوں نے اس کی ترویج کی ایسی سخت مخالفت کی کہ اگر انگلستان کا شاہی خاندان اپنی مثال سے اس کے

استعمال کی ترغیب نہ دلاتا تو اس کا رواج پذیر ہونا محال تھا۔ علیٰ ہذا القیاس جب اس طریقہ میں اصلاح کر کے ملتج البقر یعنی گائے کی چھک کے ٹپکے کا طریقہ رائج کیا گیا تو اس وقت بھی پادریوں نے مخالفت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا حالانکہ ایک صدی پیشتر خال خال ہی کوئی چہرہ ایسا نظر آتا تھا جو چھک کے داغوں سے مسخ نہ ہو گیا ہو اور آج کل ایسا چہرہ شاذ و نادر دکھائی دیتا ہے جس پر چھک کے داغ ہوں۔ اسی طرح جب امریکہ میں ادویہ بے ہوشی کی اہم دریافت ہوئی اور یہ ادویہ زہنگی کی حالتوں میں استعمال کی جانے لگیں تو پادریوں نے حسب معمول اس استعمال کی مخالفت کی نہ اس لئے کہ از روئے اصول علم الابدان یہ استعمال قابل گرفت تھا بلکہ اس بنا پر کہ کتاب پیدائش کے تیسرے باب کی سولویں آیت نے جو لعنت کا طوق عورت ذات کے گلے میں ڈال دیا ہے وہ اس ٹھکانہ کو شش سے اترا جاتا ہے۔

ایجاد و ابداع نے مختصرات مفیدہ ہی تک اپنے آپ کو محدود نہیں کیا بلکہ سامان تفریح طبع بھی بہم پہنچانا شروع کر دیا۔ اٹلی میں سائنس نے قدم رکھا ہی تھا کہ عجوبہ پسند لوگوں کے مکانوں میں طرح طرح کے متحرک و محیل نو اور جنینیں جادو کا کھیل کھا جاتا تھا نظر آنے لگے۔ ان میں جادو کی لائین کا سب سے بڑا حصہ ہوتا تھا۔ پادریوں کو اگر حکمت عملی اور تجربہ آموز فلسفہ سے نفرت تھی تو وہ بلاوجہ نہ تھی اس فلسفہ سے ایک نہایت اہم نتیجہ پیدا ہوا یعنی بھان متی کا تماشا کرنے والے ان بزرگواروں کی مسابقت کا کامیابی کے ساتھ دم بھرنے لگے جو صاحب اعجاز و کرامت سمجھے جاتے تھے۔ وہ جعلی خوارق عادت اور جھوٹی کرامتیں جو مگر جاؤں میں پیش کی جاتی تھیں بازار میں تماشا کرنے والے مداریوں کے کرتبوں کے سامنے پھٹکی پڑ گئیں۔ جو بات مقدس پیشوایان کلیسا سے نہ ہو سکتی تھی وہ مداری نے کر کے دکھا دی۔ یعنی وہ منہ میں سے آگ کے شعلے نکالنے لگا۔ دھکتے انگاروں پر ننگے پاؤں چلنے لگا دانتوں میں سرخ چلتے ہوئے لوہے کی سلاخ پکڑنے لگا۔ منہ میں سے کوزیوں اندر سے نکالنے لگا اور کٹ چلیوں کے ذریعہ سے مجڑے دکھانے لگا۔ بائیں ہاتھ معجزات کا قدم خیال بڑی مشکل سے مٹنے میں آیا۔ ایک گھوڑے پر جسے اس کے مالک نے بت سے عجیب عجیب کرتب سکھا رکھے تھے ۱۶۶۶ء میں بمقام لندن مقدمہ چلا گیا اور اس جرم کی علت میں کہ اس پر بھوت سوار ہے پھارے بے زبان جانور کو آگ میں جلا دیا گیا۔ اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک سینکڑوں عورتیں اس الزام میں زندہ جلائی جاتی رہیں کہ وہ چڑیلیں ہیں۔

اکتشاف و ایجاد کا سلسلہ جب ایک دفعہ قائم ہو چکا تو اس کی ترقی نہایت سرعت کے

ساتھ علی اتسلل ہونے لگی۔ دونوں کا ایک دوسرے پر برابر عمل اور رد عمل ہوتا رہا اور ان کی وجہ سے خرق عادت کی جڑھ کھوکھلی ہوتی گئی۔ قوس قزح کی تشریح ڈی ڈائمنس نے شروع اور نیوٹن نے ختم کی۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ قوس قزح مظہر قہر خدا نہیں ہے جس سے وہ اپنے بندوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے بلکہ پانی کے قطروں میں نور کی شعاعوں کے عمل کا کرشمہ ہے۔ ڈی ڈائمنس کو صدر استقف کے عہدے اور کردیٹال کے منصب کی امید پر بھلا پھسلا کر روما میں بلایا گیا۔ جب وہ یہاں پہنچا تو اسے ایک عالی شان محل میں نظربند کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد اس الزام کی بنا پر کہ وہ روما اور انگلستان میں اتحاد و مراقات کا محرک ہے وہ سینٹ انجیلو میں قید کر دیا گیا جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا تابوت ایک قیسی عدالت کے سامنے لایا گیا اور زندقہ و اتحاد کے جرم کی علت میں لحدانہ کتابوں کے ایک ڈھیر کے ساتھ آگ کے ایک بہت بڑے الاؤ میں جھونک دیا گیا۔

لوہنکنن نے اس بات کا ثبوت دے کر کہ بجلی اور برقی قوت دراصل ایک ہیں جو پیٹر کو اس کے صواعق سے محروم کر دیا۔ ادہام باطلہ کے کرشموں کی جگہ حقائق کے عجائبات نے لے لی۔ دوربین عکس آکلن اور دوربین بے رنگ نے جو اٹھارہویں صدی کی ایجادات میں انسان کو اس قائل بنا دیا کہ وہ کائنات کی غیر محدود عظمت و شان کے چہرے سے پردہ اٹھا سکے۔ اور مکان لامتناہی و زمان بے پایاں کا اس حد تک جو انسان کے لئے ممکن ہے اندازہ کر سکے۔ کچھ مدت بعد خوردبین بے رنگ نے عالم مضار کی بے انتہا دقیق موجودات کو انسان کے پیش نظر کر دیا۔ غبارہ اسے بادلوں سے بھی اوپر لے گیا اور آلہ خواصی کے ذریعہ سے وہ سمندر کی تہ تک پہنچ گیا۔ مقیاس الحرات اور مقیاس الہوائے اسے مدارج حرارت کی محسین اور ہوا کے دباؤ کے اندازہ کی قابلیت عطا کی۔ کانٹے کے رواج سے فن کیمیا کی دقیقہ سنجی بڑھ گئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ مادہ غیر ممکن النفا ہے۔ آکسیجن ہائیڈروجن اور بہت سی دوسری غازوں کی دریافت الوینیم کلس اور دوسری فلزات کے تجرد سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ خاک و باد و آب عناصر نہیں ہیں۔ اس علمی عزیمت و مستعدی سے کام لے کر جس کی تعریف کے لئے ہمارے پاس کافی الفاظ موجود نہیں ہیں واقعہ مرور زہرہ سے فائدہ اٹھایا گیا اور مختلف حصص ارض میں علمی مہمات بھیج کر زمین اور سورج کا درمیانی فاصلہ دریافت کیا گیا۔ ۱۸۵۶ء سے لے کر ۱۸۵۹ء تک یورپ نے جو عقلی ترقی کی اس کا اندازہ سیلی کے مدار تارے سے ہوتا ہے۔ سال اول الذکر میں جب یہ تارہ نمودار ہوا تو اسے خدا کے قہر و غضب کی آسمانی علامت سے تعبیر کیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ اس کا ظہور جنگ

دیا اور گوناگوں بلاؤں کا پیش خیمہ ہے۔ پاپائے مقدس کے حکم سے یورپ بھر کے گرجاؤں کے گھنٹے ہلائے گئے تاکہ ان کی ٹن ٹن سے تارہ دم دیا کر بھاگ جائے۔ دیندار اور خوش عقیدہ نصرانیوں کو ایما ہوا کہ روزانہ نماز پر ایک جدید نماز کا اضافہ کریں۔ اس قسم کی نمازیں اور دعائیں پہلے بھی کسوف و خسوف اور خشک سالی و بارش کے موقع پر کارگر ثابت ہوئی تھیں چنانچہ اس موقع پر بھی جب تارہ غائب ہو گیا تو یہ اعلان کیا گیا کہ عالی جناب تقدس ماب حضرت پاپائے اعظم کو خدا نے مدار تارے پر فتح عطا فرمائی ہے۔ لیکن اس اثنا میں ہیلی کو کپل اور نیوٹن کے اکتشافات کی مدد سے یہ معلوم ہوا کہ اس مدار تارے کی حرکات پر مسیحی دنیا کے عجز و الحاح اور منت و زاری کو قابو نہیں ہے بلکہ مقدرات نے ایک اہلحی اشل مدار کا چکر اس کے پاؤں میں ڈال رکھا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ مقننات قدرت سے وہ اس بے باکانہ پیشین گوئی کو اپنی آنکھوں پورا ہوتا نہ دیکھ سکے گا۔ لہذا اس نے آئندہ نسل کے حیثیت دانوں کو وصیت کی کہ ۱۷۵۹ء میں اس کی واپسی کا انتظام کریں۔ اس پیشین گوئی کا حرف پورا ہوا اور اسی سال میں ستارہ مکرر نمودار ہوا۔

اگر کوئی شخص بجا طرفداری سے پاک ہو کر اس مسئلہ پر غور کرے گا کہ رومن کیتھولک نصرانیت نے اپنی طول طویل مدت حکومت میں یورپ کی عقل اور مادی ترقی میں کس قدر حصہ لیا اور اس کے مقابلہ میں سائنس نے اپنے مختصر عہد میں کیا کر دکھایا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ بجز اس کے اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچے گا کہ اس تقابل میں شان تضاد نظر آ رہی ہے۔ حالانکہ واقعات و حقائق کی جو فہرست ہم نے گذشتہ اور اوراق کے ذریعہ سے پیش کی ہے وہ نہایت ہی غیر مکمل اور ناقص ہے۔ ہم نے فنونِ نوشت و خواند کی ترویج کی بدولت مدارس عامہ کے ذریعہ سے تعلیم کی اشاعت اور کتب میں جماعت کے روز افزوں اضافہ۔ اخباروں اور تنقیدی رسالوں کے ذریعہ سے عام رائے کی تولید۔ اخبار نویسی کی بڑھتی طاقت، ڈاکخانہ اور سستے محصول ڈاک کے ذریعہ سے خانگی اور عام خبروں کی اشاعت اور اخباری اشعاروں کے مختصی اور عمرانی فوائد کا ذکر تک نہیں کیا۔ ہم نے یہ نہیں بتایا کہ پیرس کے ہسپتال کے بعد جو پہلا شفاخانہ تھا عام شفاخانے قائم ہو گئے۔ قید خانوں میں اصلاح کی گئی۔ مجرموں کے لئے دارالاصلاح اور میر مستطیع لوگوں کے لئے محتاج خانے کھولے گئے۔ نہرس تعمیر کی گئیں۔ حفظانِ صحت کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ مردم شماری کا انتظام کیا گیا۔ ہم نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ انبعاثِ حروفِ مسبوکہ یعنی پیسے کے حروف کو جما کر چھاپنے کی ایجاد کیونکر ہوئی۔ کلورائن سے کپڑا سفید کرنے کی ترکیب کب معلوم ہوئی۔

روٹی سے بنولے جدا کرنے کل اور پارچہ بانی کے پتلی گھروں کی وہ حیرت انگیز ایجادات جنہوں نے کپڑے کا نرخ بے حد سستا کر کے انسان کی جسمانی صفائی آسائش اور صحت پر اضافہ کر دیا ہے۔ کس طرح عمل میں آئیں۔ ہم نے طب و جراحی کی عظیم الشان ترقیات عالم الابدان کی جدید معلومات۔ فنون لطیفہ کی تحریک۔ فلاحات اور اقتصادیات دیکھی کی ترقی۔ کیمیائی کھادوں اور زراعتی کھوں کے رواج۔ لوہے کی ساخت اور اس کے وسیع کارخانوں اور نیز انواع و اقسام کے ریشمی اونٹنی اور سوئی کپڑوں کے کارخانوں کے قیام۔ عجائب خانجات متعلقہ علم حیوانات اور آثار قدیمہ میں نوادر و عجائبات کیف راہی پر ایک سطر تک نہیں لکھی۔ ہم نے اس اہم مضمون کو بالکل ہی قلم انداز کر دیا ہے کہ کلین کیونکر خود بخود تیار ہونے لگیں اور خیر اور اوپر چڑھانے اور زندہ پھیرنے کے ان آلات متحرکہ اور نیز دوسرے آلات کا مطلق حال نہیں لکھا جس کے ذریعہ سے انجنوں کی تیاری مندرسانہ صحت کے ساتھ عمل میں آنے لگے۔ ہم نے کافی طور پر نہ ریل سے بحث کی ہے نہ تار برقی سے نہ علم حساب سے۔ نہ پتھر کے چھاپے سے نہ ہوا کشی کے تل سے نہ برقی بطری سے نہ سیارہ یورینس یا نیپچون کے انکشاف سے۔ نہ سو سے بھی اوپر نمبروں کی تحقیقات سے۔ نہ شاہہ متوالیہ اور مدار تاروں کے باہمی تعلقات سے۔ ہم ان علمی مسمات کی توضیح کے حق سے عمدہ برا نہیں ہو سکے جو مختلف حکومتوں کی طرف سے براہ خشکی و تری ہیئت و جغرافیہ کے مختلف اہم مسائل کے حل کرنے کے لئے جا بجا بھیجی گئیں اور نہ ان پیش بہا و کامل العیار تجربوں کی طرح کیفیت ہی ہم نے قلمبند کی ہے جو ان حکومتوں کے ایما سے طبیعات کے اصول نکات کی تحقیق کے لئے عمل میں لائے گئے۔ ہم نے انیسویں صدی تک کی بعض عظیم الشان علمی فتوحات کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ علم الموجودات کے متعلق اس صدی کے محققین کے مہتم بالشان تصورات۔ منطاطیسی اور کھربائی حقائق کی دریافت فن فوٹوگرافی (عکاسی) کی دلکش ایجاد۔ فلکیات کے متعلق تجزیہ ایوان نور معکوس کا استعمال فن کیمیا کو ایوگڈروپائل و میریٹ اور چارلس کے قوانین اللہ کے تابع کرنے کی کوشش۔ غیر ذوی الاعضاء مادہ سے مصنوعی طور پر اجسام و ذوی الاعضاء کی تولید جس کے فلسفیانہ نتائج کی اہمیت میں کلام نہیں۔ علم ترکیب حیوانات و نباتات کی بنا فن کیمیا پر رکھنے سے اس علم کا استنباط۔ جغرافیائی پیمائش اور سطح زمین کی ہیئت کذائی کے صحیح نقشہ جات کی ترتیب۔ لوہکی التعمیب بندوقوں اور آہن پوش جہازوں کی تیاری۔ فن حرب کے انقلابات عورتوں کے حق میں اس آہ خیر و برکت یعنی سینے کی کل کی ایجاد۔ صنایع و بدائع کی کرشمہ ریزی۔

دنیا کے ہمہ گیر مصلوں کی رونق اور صنعت و دستکاری کی نمائشوں کا انعقاد۔ یہ وہ امور ہیں جن پر ہم نے قلم تک نہیں اٹھایا۔

ایجادات و اکتشافات ملیہ کی جو فہرست ہم نے اوپر درج کی ہے اگرچہ وہ بادی النظر میں طویل نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس طوالت پر بھی نہایت ہی موجز و مجمل بلکہ ناقص و غیر مکمل ہے۔ اس فہرست کو پیش نظر رکھنے سے ہماری نگاہ سرسری طور سے اس عقلی بل چل پر جا پڑتی ہے جس کی شورش میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا ایک قانون خیال ہے جس کے مثالی نقش نظر کے سامنے گذرتے جاتے ہیں۔ اس علمی و ادبی سرگرمی کا مقابلہ جب ازمہ و سلی کے سکون و جمود سے کیا جاتا ہے تو زمین آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے۔

اس ان تھک سرگرمی کے چاروں طرف جو عقلی نور پھیلا ہوا ہے اس نے بنی نوع انسان پر بے شمار برکتیں اور رحمتیں نازل کی ہیں روس میں اس کی وجہ سے کاشتکار طبقہ کے وہ لاکھوں نفوس آزاد ہو گئے جو مالکان اراضی کے پشتینی غلام تھے۔ امریکہ میں اس کی بدولت چالیس لاکھ حبشی غلام آزاد ہو گئے۔ بجائے اس نپی تلی خیرات کے جو خانقاہ یادیر کے پچانک پر چند بد نصیب فلاکت زدہ لوگوں کو مل جایا کرتی تھی۔ اس نے خیرات خانے محتاج خانے اور بیت المصدورین ایک وسیع پیمانہ پر قائم کر دئے اور محتاجین و غریب کے لئے قانون بنا دیا۔ اس نے طب کو سیدھے رستہ پر لگا دیا یعنی مرض کے ازالہ سے بدرجہا بہتر اس کا دفعیہ ہے۔ فن تدبیر مملکت میں اس نے صحیح علمی اصول قائم کر دئے اور بجائے اس قانون کے جس میں عطایانہ بے ترتیبی کی شان نظر آتی تھی ایسے قوانین وضع کئے جن میں یہ اصول مضمر تھا کہ قانونی چارہ جوئی سے پہلے تمدنی واقعات پر تخصص کے ساتھ تحقیق کی نظر ڈال لی جائے۔ انسان کے ارتقاء عقلی میں جو حصہ اس نے لیا ہے وہ اس درجہ نمایاں اور نکتہ آموز ہے کہ ایشیا کی دیرینہ سال اقوام بھی اس نعمت عقلی سے مستفیض ہونے کی آرزو مند ہیں۔ ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ مغرب کا جو عمل مشرق پر ہو گا جو اس کا رد عمل مغرب پر ہونا لازمی ہے۔ روما میں جب مختلف دیار و امصار کے دیوتا ایک جگہ لاکھ جمع کئے گئے تھے تو ان کے باہمی مقابلہ کی وجہ سے بت پرستی مٹ گئی تھی۔ اسی طرح آج وسائل نقل و حرکت کی آسانئوں نے متضاد و معارض مذاہب کو ایک دنگل میں لا اتارا ہے اور مسلمان بدھ برہمن ایک دوسرے کے مواجہ میں صف آرا نظر آتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ ان مختلف مذاہب میں ترقیات اور تبدیلیاں ہو جائیں۔ اس مذہبی تصادم کے اثر سے

مامون و مصون صرف سائنس ہی رہے گا اس کے ذریعہ سے کائنات اور آفر-تہ کون و مکان کا جو تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہوا ہے وہ زیادہ تر عظمت و جبروت اور زیادہ تربیت اور رعب کی شان لئے ہوئے ہے۔

جس اصول نے اس تحریک کو زندہ کیا ہے اور جو ان علمی اکتشافات و ایجادات کی روح و روال ہے وہ تشخص کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اصول بعض دلوں میں آرزوئے دولت بن کر ظاہر ہوتا ہے اور بعض دلوں میں جن کی طینت شرافت سے معمور کی گئی ہے۔ تمنائے عزت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پس مقام تعجب نہیں ہے کہ یہ اصول سیاسی قوت بن کر اٹھارہویں صدی میں دو موقعوں پر ان عظیم الشان تمدنی زلزلوں کا محرک ہوا جو نتائج میں انقلاب امریکہ و انقلاب فرانس کے نام سے مشہور ہیں۔ انقلاب اول الذکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پورا براعظم وقف تشخص ہو گیا اور کوئی دن جاتا ہے کہ وہاں بہ اتباع اصول جمہوریت دس کروڑ انسان ہر اس قید سے آزاد ہو کر جو قفل طلاح امن عامہ ہو کامل حیرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ انقلاب ثانی الذکر نے اگرچہ یورپ بھر کی سیاسی بساط الٹ دی ہے اور اگرچہ حیرت انگیز جنگی فتوحات اس کے ہرکاب رہی ہیں پھر بھی اپنے مقاصد کو کامل و مکمل نہیں کیا۔ بلکہ فرانس پر اس کی وجہ سے رہ رہ کر جہتی اور برباد آئی ہے۔ فرانس کی دو عملی حکومت نے جو دیوبی و دینی دو فرمانرواؤں کی اطاعت و ارادت کا جو اس کے کندھے پر رکھے ہوئے ہے اسے اگر موجودہ ترقیات کا ایک پہلو سے حلیف بنایا ہے تو دوسرے پہلو سے حریف کر دکھایا ہے۔ ایک ہاتھ سے اس نے عقل کے سر پر تاج رکھا دوسرے ہاتھ سے اس نے سنبھالا لیتے ہوئے پیپا کو نئے سرے سے سنبھالا۔ اس تناقض کا خاتمہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی تمام اولاد وطن یہاں تک کہ ادنیٰ منوار کو بھی سچی تعلیم نہ دے۔

انقلاب فرانس نے موجودہ آرا پر جو عقلی حملہ کیا اس میں سائنس کی طاقت صرف نہیں کی گئی تھی بلکہ ادب کی۔ اس میں انتقاد و مبادات کی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن سائنس پر البادی اظہم کی تعریف کبھی صادق نہیں آئی۔ اس نے ہمیشہ مدافعتی پہلو اختیار کیا ہے اور حریف کو بے روک ٹوک حملہ کرنے کا کمال فراخ حوصلگی موقع دیا ہے۔ پھر بھی ادب کا حملہ اس قدر خطرناک نہیں ہے جس قدر سائنس کا۔ اس لئے کہ انشاپردازی ایک مقامی شے ہے اور سائنس عالمگیر و ہمہ گیر ہے۔

اب اگر ہم یہ سوال کریں کہ سائنس کی ذات سے تمدن جدید کو کیا فائدہ پہنچا ہے اور

اس نے بنی نوع انسان کی راحت و آسائش اور فلاح و بہبود میں کس قدر حصہ لیا ہے تو اس کا جواب ہمیں اسی طرح ملے گا جس طرح اس سوال کا جواب ملا تھا کہ لاطینی نصرانیت نے انسان اور اس کے موجودہ تمدن کو کیا نفع پہنچایا ہے۔ جن ناظرین نے اوراق گذشتہ پر نظر امعان ڈالی ہے وہ اس نتیجہ پر لاعلمہ پہنچے ہوں گے کہ ضرور ہے کہ ہمارے اہلائے جنس کی حالت میں اصلاح واقع ہوئی ہو لیکن جب ہم اس نتیجہ کو شمار و اعداد کے معیار سے جانچتے ہیں تو اس میں شامل محسین و حکیم پیدا ہو جاتی ہے۔ فلسفہ کے مسالک اور مذاہب کی اشکال کا اثر اگر بنی نوع انسان پر دیکھنا مطلوب ہو تو مردم شماری کی رپورٹوں کی ورق گردانی کرنی چاہئے۔ لاطینی نصرانیت ہزار سال میں یورپ کی آبادی و گنی نہ کر سکی اور انفرادی زندگی میں بھی کوئی نمایاں اضافہ اس کے عہد میں نہ ہو سکا۔ لیکن ڈاکٹر جاروس کی رپورٹ سے جو اس نے سپوسٹس کی مجلس حفظ صحت کے ملاحظہ میں پیش کی معلوم ہوتا ہے کہ ”واقعہ اصلاح کینہ کے وقت جنوا میں انسان“ کی عمر کا اوسط ۲۱۷۲۱ سال تھا۔ ۱۸۸۳ء اور ۱۸۳۳ء کے درمیان ۴۶۲۱۸ ہو گیا۔ تین سو سال پہلے جتنے آدمی چالیس برس زندہ رہتے تھے اتنے آج کل ستر برس کی عمر کو پہنچتے ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں گورنمنٹ انگریزی کو روپیہ قرض لینے کی ضرورت پڑی۔ یہ ضرورت اس طرح پوری کی گئی کہ اوسط مدت عمر کے حسب سے ہر شخص کے لئے وظیفہ سالانہ مادام الحیات مقرر کیا گیا اور یہ وظائف سن شیرخوارگی سے لے کر اوسط سن عمر تک کے اشخاص کے ہاتھ بعض ایک خاص رقم کے بیج ڈالے گئے۔ اس انتظام میں قاعدہ گورنمنٹ ہی کو رہا۔ ستانوے سال بعد وظائف کا ایک جدید سلسلہ گزشتہ صدی کے اوسط معیار حیات کی توقع پر جاری کیا گیا۔ لیکن وظیفہ خواران دور ثانی نے اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں اتنی زیادہ عمر پائی کہ گورنمنٹ کو لینے کے دینے پڑ گئے اور یہ قرضہ بہت ہی گراں بہار ثابت ہوا۔ حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ وظیفہ خواران قرضہ اول میں سے مذکورہ اثاثہ دونوں جنسوں کے دس ہزار اشخاص اٹھائیس سال کو پہنچنے سے پہلے مر گئے لیکن ایک صدی بعد جب دوسرے قرضہ کے وظائف جاری کئے گئے تو اسی عمر کے صرف پانچ ہزار سات سو بہتر مردوں اور چھ ہزار چار سو سولہ عورتوں نے وفات پائی۔“

ہم روحانیت کا جسمانیات کے ساتھ اور قیاسات کا واقعات کے ساتھ مقابلہ کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ اقوال جن کا اتباع قرون اولیٰ و آخری میں کیا کیا رنگ لائے بغیر نہ رہے۔ زمانہ سابق میں جو مقولہ واجب الاتباع سمجھا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ ”جہالت زہد و اتقا کی ماں

ہے۔“ دور آخر میں جس مقولہ پر عمل ہوا اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ”علم اور طاقت مترادف ہیں۔“

۱۰ فرانس کا وہ خوش سواد صوبہ ہے جو ۱۷۲۵ء میں مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ ۱۸۳۶ء میں اس کا الحاق فرانس کی عملداری کے ساتھ ہوا۔ مترجم

۱۱ لفظ ”شوری“ میں سپاہیانہ جانبازی۔ جس لطیف یعنی طبقہ نسواں کا بدرجہ غایت ادب و احترام۔ جان جو کھوں میں ڈالنے کا شوق اور نام آوری کی خواہش کے وہ گوناگوں مفہوم شریک ہیں جو قرون متوسطہ میں شجاعت و شرافت کا لازمہ سمجھے جاتے تھے۔ مترجم

۱۲ کہہ کہہ کر نیافت۔ لوتھر نے ارسطو کو جو گالیاں دی تھیں یہ اس کا بدلہ ہے۔ مترجم
۱۳ اس اصول کا ماخذ مذہب بھی ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس مذہب کی تعلیم یہ ہو کہ ”لکم دینکم ولنی دین“ ”لا اکراہ فی الدین“۔ مترجم

لیکن ایک مذہب ایسا بھی ہے جس کے پیشوا نے تعصب سے ان تاریخی الفاظ میں بیزاری ظاہر کی ہے۔ لیس مناد عالمی عصبيتہ و لیس منقذات عصبيتہ و لیس منقذات علی عصبيتہ جبکہ الشیعی یعمی و یعمی لسان النہد مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی یادگار زمانہ مسدس میں حضور سرور کائنات صلی علیہ وسلم کے اس ارشاد پاک کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

ڈرایا تعصب سے ان کو یہ کہہ کر کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر
ہوا وہ ہماری جماعت سے باہر وہ ساتھی ہمارا نہ ہم اس کے یاد
نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرا
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا

تاریخ اسلام پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں نے عام طور سے اپنے ہادی برحق کے اس ارشاد مقدس کو اپنے سیاسی و عقلی دستور العمل کا اصل الاصول قرار دے رکھا ہے۔ مترجم
۱۴ اب یہ مسافت پانچ ہی دن میں طے ہونے لگی ہے۔ مترجم

خطرہ کی آمد آمد

مذہب کے جٹائے خطرہ ہونے کی قریب الوقوع علامات۔
 کلیسائے روم جو نصرانیت کا رکن رکین ہے ان علامات کو پہنچا کر
 آنے والے خطرہ سے مقابلہ کرنے کی تیاری کرتا ہے۔ پاپائے پائس
 ناسع مجلس عمومیہ مسیحی منعقد کرتا ہے۔ مختلف دہل یورپ کے
 تعلقات پاپائیت کے ساتھ۔ کلیسا کے تعلقات سائنس کے ساتھ
 حسب، تصریح مندرجہ مکتوب عمومی و تھنیں پاپائیہ۔
 وینیکن کونسل کے نئے صمت پاپا کے متعلق اور نیز دربارہ
 سائنس۔ کونسل کے فیصلہ کا خلاصہ۔

حکومت پروشیا اور پاپائیت کی مٹ بھڑ۔ یہ مقابلہ تقویٰ اور
 غلبہ کے حصول کے لئے دراصل سلطنت اور کلیسا کا مقابلہ ہے۔
 یورپ میں دو عملی حکومت کا اثر۔ وینیکن کونسل کا اعلان اس امر
 کے متعلق کہ پاپائیت سائنس کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ رومن
 کیتھولک مذہب کی حکمائانہ سائنس۔ خدا الہام ایمان اور عقل کے
 متعلق اس کی تعریفات۔ اس کا سبب و شہ۔ تمدن جدید پر اس کی
 لے دے۔ جماعت اتحاد انجیل فرقہ پرائسٹ اور اس کے فیصلہ
 جات۔

سابق الذکر فیصلہ جات و فتاویٰ پر ایک عام نظر۔ مسئلہ زیر بحث
 کی موجود و آنکھ صورت۔

جو شخص مسیحی دنیا کے موجود رجحان خیال سے آگاہ ہے وہ اس واقعہ کے اظہار پر قادر
 نہیں ہو سکتا کہ نصرانیت ایک عقلی و مذہبی بحر میں جٹا ہوا چاہتی ہے۔

ہر طرف مطلع تیرہ و تار نظر آ رہا ہے طوفان کی آمد آمد کا شور کانوں میں پڑ رہا ہے۔ جرمنی میں قومی جماعت عقائد ماوراء الجبال (یعنی پاپائی مذہب) کی مخالفت پر کمر باندھے کھڑی ہے۔ فرانس میں ترقی یافتہ طبقہ اپنائے جمود کے ساتھ دست و گریبان دکھائی دیتا ہے اور اس کشمکش میں اس دولت عظیم الشان کی سیاسی فوقیت بے اثر بلکہ زائل ہو چلی ہے۔ اٹلی میں روما پر ایک ایسا فرماں روا قابض ہے جو کلیسا سے خارج کیا جا چکا ہے۔ پاپائے مقدس اس حیلہ کی آڑ ڈھونڈ کر کہ آپ قید میں اپنے قہر و تیغ سے حریف پر طاعن و مطاعن کی بوچھاڑ کر رہے ہیں اور باوجودے کہ آپ کی غلطیاں اور خطائیں بدلائل قاطع و براہین ساطع ثابت ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی برابر یہ بڑ لگائے جاتے ہیں کہ آپ معصوم عن الخطا ہیں۔ ایک رومن کیتھولک اسقف جج کہتا ہے کہ اہل یورپ علانیہ طور پر نصرانیت سے قطع تعلق کر رہے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں اہل مذہب نہایت بدحواسی کے ساتھ یہ دیکھ رہے ہیں کہ زمانہ میں آج کل کچھ ایسی ہوا چل رہی ہے کہ مذہب کی عقلی بنیاد منہدم ہوئی جاتی ہے۔ آنے والی تباہی کا وہ جس طرح بن پڑے مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

ایک قوم پر وہ وقت بڑی آزمائش اور امتحان کا ہوتا ہے جب وہ مذہبی پابندیوں کی کیچلی جسم سے اتارتی ہے۔ یونان اور روما کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ وقت کیسا محرکہ کا ہوتا ہے اور اس میں کیسے کیسے خطرات عظیم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذاہب سدا ایک حالت میں نہیں رہتے۔ ان میں انسان کے عقلی نشوونما کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا میں ایسے کتنے ملک ہیں جن کا مذہب وہی ہے جو مسیح کی ولادت کے وقت تھا؟

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ یورپ کی کل آبادی تین کروڑ دس لاکھ کے قریب ہے۔ ان میں سے اٹھارہ کروڑ پچاس لاکھ رومن کیتھولک ہیں اور تین کروڑ تین لاکھ یونانی کیتھولک۔ پرائسٹس سات کروڑ دس لاکھ ہیں جو بہت سے فرقوں میں منقسم ہیں۔ یہودیوں کی آبادی پچاس لاکھ ہے اور مسلمانوں کی ستر لاکھ۔

امریکہ کی مذہبی تقسیم کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ تمام جنوبی امریکہ کی مسیحی آبادی کا مذہب رومن کیتھولک ہے۔ وسطی امریکہ۔ میکسیکو۔ اسپین اور فرانس کے غرب الہندی مقبوضات کی نسبت بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ اور کینیڈا میں پرائسٹس آبادی کی کثرت ہے۔ آسٹریلیا پر بھی یہی قول صادق آتا ہے۔ ہندوستان کے بیس کروڑ

مسلمانوں اور دوسری مشرقی قوموں کے مقابلہ میں مسیحی آبادی تعداد کے لحاظ سے بے حقیقت محض ہے۔ غرض کلیسائے رومن کیتھولک زمانہ حال کی تمام مذہبی جماعتوں کی بہ نسبت زیادہ زبردست زیادہ ترتیب یافتہ اور زیادہ وسیع الاثر ہے۔ بلکہ اسے مذہبی جماعت کہنا ہی غلطی ہے۔ اسے ایک پولیٹل جتھا سمجھنا چاہئے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ کل طاقت پادریوں کے ہاتھ میں آئے۔ دنیا داروں کو صرف عبودیت و متابعت کا حق حاصل ہے۔ مسیحیت کے قرن اولین میں کلیساؤں کی شکل جمہوری تھی۔ پھر جمہوریت بتدریج ایک متحد انظمام اور مطلق العنان حکومت کی شکل میں بدل گئی ہے اور ایک انسان نائب خدا ہونے کی حیثیت سے اس پر مسلط ہے۔ اس کلیسا کو اس امر کا ادعا ہے کہ اس کی ماموری من الہی کا اطلاق دینی اور دنیوی دونوں حکومتوں پر یکساں ہوتا ہے اسے یہ حق حاصل ہے کہ حکومت ملکی کو اپنی اغراض کی تکمیل کا آلہ بنائے لیکن حکومت ملکی کو اس کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور ان ممالک میں بھی جہاں پرائسٹنڈ مذہب جاری ہے۔ اس کو حق حکمرانی علی سبیل السادات ہی نہیں بلکہ پورا شاہی اقتدار پلاماساہت امدی و مشارکت غیرے حاصل ہے۔ کلیسائے مذکورہ کو اس دعوے کی حقیقت پر بھی اصرار ہے کہ حکومت ملکی کو اس کے حدود اراضی کے اندر کسی شے پر کسی طرح کا حق حاصل نہیں اور چونکہ پرائسٹنڈ مذہب کی حیثیت محض باغیانہ ہے لہذا اس کو کوئی حق حاصل ہو ہی نہیں سکتا بلکہ پرائسٹنڈ جماعتوں کا جائز اور حقیقی روحانی پیشوا کیتھولک اسقف ہی ہو سکتا ہے۔

پس ظاہر ہے کہ نصرانیت کے پیروں کا جزو غالب کیتھولک ہے اور پاپائیت کا یہ مطالبہ کہ اسے مسیحی دنیا کی اعلیٰ ترین طاقت تسلیم کیا جائے حکمانہ اصرار کی ایسی شان لئے ہوئے ہے کہ مسیحی دنیا کی موجودہ مذہبی حالت پر نظر انتقاد ڈالتے وقت اس کے فیصلہ جات و فتاویٰ کو پیش نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔ پاپائیت کے طرز عمل میں اعلیٰ درجہ کی دانشمندی اور تدبیر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ کیتھولک فرقہ ایک شخص کے احکام کی تعمیل کرتا ہے لہذا اس کو وہ اتحاد اکتناز اور اقتدار حاصل ہے جو پرائسٹنڈ جماعتوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں۔ اس کے علاوہ روما کا بڑا نام اپنی شان دار یادگاروں کے ساتھ اس کا پشتیبان ہے۔

پاپائیت نے تامل و تعذب سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر اس عقلی خطرہ کے ہر پہلو پر غور کیا ہے جو کوئی دم میں ظاہر ہوا چاہتا ہے اور جو فیصلہ اس نے اس بارہ میں صادر کیا ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بزم خود اپنے حریف پر پورا غلبہ حاصل ہے۔

ہے۔ یہ فیصلہ گزشتہ ”وینکن کونسل“ کے اجلاس کی روداد کے معائنہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔

پاپائے پائس ناسع نے بذریعہ فرمان مورخہ ۲۹ جون ۱۸۶۸ء روما میں ایک مجلس عمومیہ کے انعقاد کی تحریک کی۔ اس مجلس کا اجلاس ۸ دسمبر ۱۸۶۹ء کو شروع ہو کر جولائی ۱۸۷۰ء میں ختم ہوا۔ منجملہ دوسرے مسائل کے جو اس مجلس میں بغرض غور پیش ہوئے۔ دو امور نہایت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ پاپائے روما معصوم ہے دوسرا یہ کہ مذہب کا تعلق سائنس کے ساتھ کیا ہونا چاہئے۔

لیکن اس مجلس کا انعقاد عام رضامندی کے ساتھ نہ ہونے پایا۔ مشرقی کلیساؤں کی رائے زیادہ تر اس کے خلاف تھی۔ ان کی طرف سے یہ عذر پیش ہوا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پاپائے روما نصرانیت کی پیشوائی کا منصب اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہے حالانکہ ان کی رائے میں حضرت یسوع مسیح ہی کلیسا کے سردار ہیں۔ انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ مجلس کے انعقاد کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہو گا کہ نئے فساد اور نئی خرابیاں اٹھ کھڑی ہوں گی۔ ان محترم کلیساؤں کے خیالات کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب ۱۸۶۷ء میں کلدانی بطریق نے نظری بطریق سائین کو رومن کیتھولک اتحاد میں شامل ہونے کی دعوت دی تو اس نے یہ جواب دیا ”آپ چاہتے ہیں کہ میں اسقف روما کی پاپوش کو بعد عجز بوسہ دوں لیکن یہ تو فرمائیے کہ کیا وہ بھی آپ ہی کی طرح ایک انسان نہیں ہے؟ کیا وہ عزت و آبرو میں آپ سے بڑھ کر ہے؟ ہم اس بات کو کبھی جائز نہ رکھیں گے کہ ہمارے مقدس معابد میں مورتوں اور مجسموں کی پرستش ہو اس لئے کہ ان کی پرستش ناپاک اور ذلیل بت پرستی کی ہم معنی ہے۔ کیا آپ لوگوں کی طرح ہم بھی اس عقیدہ کے پیرو ہو جائیں کہ خدائے قدیر انسان کی طرح ماں کے بطن سے پیدا ہوا؟ حضرت یہ کفر آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہمیں تو اس سے معاف رکھا جائے۔ اس جواب نے ثابت کر دیا مشرق اور مغرب کا اتحاد محال ہے۔

بالآخر اطراف و اکناف عالم سے جو بطریق صدر اسقف اور اسقف آکر اس مجلس عمومیہ میں شریک ہوئے ان کی مجموعی تعداد سات سو چار تھی۔

روما کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ سائنس نہ صرف پاپائی عقائد کی جلد جلد جڑھ کاٹ رہا ہے۔ بلکہ سیاسی قوت بھی فراہم کر رہا ہے۔ یہ واقعہ اس سے چمپا ہوا نہ تھا کہ

یورپ بھر میں تعلیم یافتہ اشخاص مذہب سے قطع تعلق کر رہے ہیں اور اس اعتزال کا مرکز اصلی جرمنی کا شمالی علاقہ ہے۔ پس جب جرمنی اور آسٹریا میں جنگ چھڑ گئی تو اس نے اس جنگ سے نہایت دلچسپی ظاہر کی اور بقدر امکان آسٹریا کا حوصلہ بڑھایا۔ لیکن معرکہ ساڈووا کے نتیجے نے اس کی امید کو مبدل بہ مایوسی کر دیا۔

اس کے بعد جب فرانس اور جرمنی میں لڑائی ہوئی تو پاپائیت کو پھر تھوڑا سا اطمینان قلب نصیب ہوا۔ اس کو ذرا شک نہ تھا کہ فتح فرانس کو حاصل ہوگی جس کے یہ معنی ہوں گے کہ گویا خود اس کی فتح ہوئی۔ لیکن جنگ سیڈان نے دوبارہ اس کی امیدوں کا خون کر دیا۔

اب چونکہ کئی سال کے لئے اس کی امیدوں کے احیا کی کوئی صورت نہ تھی لہذا اس نے تہیہ کر لیا کہ جرمنی میں بغاوت کر دی جائے۔ چنانچہ آج کل اس سلطنت میں جو گل کھل رہے ہیں وہ حضرت پاپائے رومانی کی چمن آرائی کے کرشمے ہیں۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر آسٹریا یا فرانس کو کامیابی نصیب ہوتی تو پروشیا کے ساتھ پرائسٹنٹ مذہب کا بھی خاتمہ ہو گیا ہوتا۔

اس جنگی کشاکش کے ساتھ ساتھ ایک اور منصوبہ بھی بروئے کار لایا گیا جس کا تعلق زہنیات کے ساتھ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ازمندہ وسطی کے سانحہ و فرسودہ عقائد و مراسم کے احیا کی تدبیر کی جائے اور انہیں افراط کی حد تک پہنچایا جائے خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو چنانچہ نہ صرف اس ادعا کا علم بلند کیا گیا کہ پاپائیت کو تمام ممالک کی دیوبی حکومتوں میں علی السویہ شریک ہونے کا رہائی حق حاصل ہے بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ رومانی کی برتری اور فوقیت واجب الاعتراف ہے اور مسائل مابہ النزاع میں دیوبی حکومت کو اس کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ چونکہ پاپائیت کے خطرہ میں پڑنے کا باعث سائنس کی ترقی ہوئی تھی لہذا اس نے کمال شہ رخ چسپی و بے باکی کی راہ سے سائنس کی حد بندی کر دی اور اس کے اقتدارات کی حدود مقرر کر دیں اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ تمدن جدید کو بھی مردود و مسرود و قرار دینے کی خدمت اپنے ذمہ لی۔

جب پاپائے مقدس ۱۸۷۰ء میں گیشٹ سے مراجعت فرما ہوئے تو ان منصوبوں پر غور شروع ہوا اور جیسوئٹ فرقہ کے مشورہ پر انہیں عمل میں لانے کا ڈھنگ ڈالا گیا۔ یہ فرقہ اس خیال خام میں جھلا تھا کہ خدا ناممکن کو ممکن کر دے گا اور پاپائیت کی بڑھی ہڈیوں میں جوانی کا کس بل پیدا کیا جاسکے گا۔ غرض پاپائی گزٹ میں یہ اعلان کیا گیا کہ کلیسا بمقابلہ

حکومت آزاد و خود مختار مطلق ہے۔ اساقف پاپا کے مطیع ہیں۔ اساقف کی فرمان برداری ان کے ماتحتین پر واجب ہے۔ پرائسٹ بھیلوں کا فرض ہے کہ جاہ ارتداد و دہریت سے منحرف ہو کر اس گمہ میں شریک ہو جائیں جس سے جدا ہو کر وہ بھکتی پھرتی ہیں۔ مسالمت و رواداری کسی شکل میں کسی طرح جائز نہیں۔ ماہ دسمبر ۱۸۵۳ء میں اساقف کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں پاپا نے عقیدہ جبل بلاؤسن کا اعلان کیا۔ اس کے دس سال بعد وہ فرامین پاپا کی طرف سے جاری ہوئے جو مکتوب عمومی اور تلخیص کے نام سے مشہور ہیں۔

مکتوب عمومی کی تاریخ اجرا ۸ دسمبر ۱۸۶۳ء ہے۔ اس کا مسودہ بڑے بڑے عالم پادریوں نے مرتب کیا تھا اور ”ہولی آفس“ (دفتر مقدس) کی مجلس انتظامی نے اس پر بہت کچھ بحث کی تھی۔ اس کے بعد یہ اساقف کے پاس پہنچا گیا تھا اور سب سے آخر میں پاپا نے کردیتالون کے ساتھ مل کر اس پر نظر ثانی کی تھی۔

تمدن جدید پر اس مکتوب میں جو لے دے کی گئی تھی اس سے بعض پادریوں نے اختلاف کیا۔ اور بعض کردیتال بھی اس کے ساتھ رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جھجھکے کیتھولک اخباروں نے اس کی اشاعت کی تو سہی لیکن بہ تاسف و ارتباب۔ پرائسٹ حکومتوں نے اگرچہ اس کی مزاحمت نہ کی لیکن کیتھولک حکومتوں کو اس نے مضطرب و سراپد کر کے فغہ میں ڈال دیا۔ فرانس نے اس کے صرف اس حصہ کی اشاعت کو روا رکھا جو جو بیلی کے اعلان سے متعلق تھا۔ آسٹریا اور اٹلی نے اسے شائع ہو جانے دیا لیکن سرکاری طور پر منظور نہ کیا۔ کیتھولک ممالک کے اخبارات و رسالجات اور مجالس وضع آئین و قوانین کی طرف سے اس پر نکتہ چینی ہوئی۔ اکثر لوگوں نے بہ تاسف یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کی وجہ سے کلیسا اور موجودہ تمدن کا اختلاف بہت بڑھ جائے گا اور تو اور اپہین تک میں بعض اخبارات ایسے تھے جنہوں نے ان الفاظ میں اپنا افسوس ظاہر کیا کہ ”دربار پاپائے روم نے تمدن جدید کو بدنام کرنے اور اس پر نفیرن بھیجنے میں نہایت ہٹ دھرمی اور کورسوا دی کا ثبوت دیا ہے۔“

اس مکتوب نے آزادی ضمیر و آزادی ایمان پر ان الفاظ میں نکتہ چینی کی ہے:

”یہ عقیدہ نہایت ہی خطرناک بلکہ مجنونانہ ہے کہ آزادی ضمیر آزادی پرستش کا حق ہر شخص کو حاصل ہے اور ہر شائستہ سلطنت میں اس حق کے اعلان اور نگہداشت کا ذمہ دار قانون کو ہونا چاہئے اور نیز یہ کہ عامہ خلایق کا ارادہ جو اس طریقہ سے جسے عام رائے کہا جاتا ہے یا دوسرے ذرائع سے ظاہر ہو ایک اعلیٰ قانون ہے جو تمام رہائی یا انسانی حقوق کی قید سے

آزاد ہے۔“ والدین کے اس حق کی بھی اس مکتوب میں نفی کی گئی ہے کہ وہ کلیسائے رومن کی متولک کی حدود سے خارج ہو کر اپنی اولاد کو تعلیم دلا سکتے ہیں۔ ان ”گستاخ و بے ادب“ لوگوں پر اس مکتوب میں نفرین کی گئی ہے جو ازراہ جسارت کلیسا اور پاپائی منصب کے ان پیشوایانہ اقتدارات کو ”دیوی حکومت کے تابع کرنا چاہتے ہیں جو خداوند یسوع مسیح کا عطیہ ہیں۔“ تقدس ماب جناب پاپا نے مکتوب عمومی کے مکتوب الیم یعنی اپنے محترم برادران دینی کو ہر وقت عبادت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اور حسب ذیل تاسیسی الفاظ سے اس تاکید پر مزید اضافہ فرمایا ہے۔ ”اس غرض سے کہ خدائے تعالیٰ زیادہ آسانی سے ہماری اور آپ کی دعاؤں کو قبول فرمائے ہمیں چاہئے کہ کامل سچائی اور خلوص کے ساتھ خدا کی ماں مریم عذرا سے مدد مانگیں جو ہمارے اور اس کے درمیان بمنزلہ ایک وسیلہ کے ہیں اور جو اپنے اکلوتے بیٹے خداوند یسوع مسیح کے دہنے ہاتھ پر زریں روا اوڑھے ہے اور مختلف زیورات پہنے ہوئے بطور ملکہ کے جلوہ فرما ہیں۔ اس لئے کہ کوئی مراد ایسی نہیں جو آسمان کی ملکہ کے توسل سے پوری نہ ہو سکے۔“

صاف ظاہر ہے کہ پاپا کی طرف سے جس اصول کا اب اعلان ہوا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جن حکومتوں کے تعلقات پاپائیت کے ساتھ اب تک مرافقانہ و مصالحانہ تھے وہ بھی اس کے مخالف ہو جائیں۔ روس میں بہت بڑی ناراضی پھیل گئی اور جو واقعات اس کے بعد پیش آئے ان کے لحاظ سے جناب تقدس ماب نے ایک ترمیم آمیز فرمان نومبر ۱۸۶۱ء میں صادر فرمایا جس کا جواب گورنمنٹ روس نے یہ دیا کہ اس معاہدہ کو جو ۱۸۶۷ء میں دوبارہ روا اور ولت روس کے درمیان قرار پایا تھا فتح و کالعدم کر دیا۔

جنگ ساڈوا (جولائی ۱۸۶۱ء) کے نتیجہ کی طرف سے بالکل خالی الذہن ہو کر باوجودیکہ یہ ظاہر تھا کہ تمام یورپ کا سیاسی نقشہ بدل گیا ہے۔ خصوصاً وہ تعلقات جو پاپائیت کو دل یورپ کے ساتھ تھے اپنے حال پر قائم نہیں ہیں۔ پاپا نے بتاریخ ۲۷ جون ۱۸۶۷ء ایک فرمان جاری کیا جو مکتوب عمومی اور تھخیص کا مصدق و موثق تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک مجلس عمومیہ کے انعقاد کا بھی قصد ظاہر کیا جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ چنانچہ دوسرے سال یعنی بتاریخ ۲۹ جون ۱۸۶۸ء انعقاد مجلس کا اطلاع نامہ جاری کیا گیا۔ لیکن اب آسٹریا کے ساتھ چپقلش ہو پڑی۔ آسٹریا کی پارلیمنٹ نے جو قوانین جاری کئے تھے ان کی رو سے سلطنت کے تمام باشندوں کا درجہ ملکی حقوق کے لحاظ سے مساوی قرار دیا گیا تھا اور کلیسا کے اقتدارات محدود کر دئے گئے تھے اس پر پاپا کی گورنمنٹ کی طرف سے اعتراض ہوا اور آسٹریا کو بھی روس کی طرح مجبوراً وہ معاہدہ جو ۱۸۵۵ء میں حکومت آسٹریا و دربار روس کے مابین قرار پایا تھا منسوخ کرنا پڑا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے فرانس میں سالم تھخیص کی اشاعت کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن پروشیا چونکہ پاپائیت سے الگ تھا لہذا اس کا مزاحم نہ ہوا۔ پاپائیت تو بل من مزید کے مرض میں مبتلا تھی ہی۔ اس عدم مزاحمت نے مرض کو اور بڑھا دیا۔ یعنی علانیہ یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ اہل ایمان اپنے مال و جان بلکہ اپنے عقلی عقائد تک کلیسا کی نذر کر دیں۔ پرائسٹوں اور یونانیوں کو بھی کلیسائے رومن کی تہولک کی حلقہ بگوشی کی دعوت دی گئی۔

تاریخ مقررہ پر مجلس عمومیہ کا افتتاح ہوا۔ اس کے مقاصد یہ تھے کہ تھخیص کو قوت سے فعل میں لایا جائے۔ صمت پاپا کے عقیدہ کی ترمیم کی جائے اور مذہب اور سائنس کے تعلقات صاف صاف بتا دئے جائیں۔ اس بات کی ہر طرح سے تیاری کر لی گئی تھی کہ جو مقاصد ذہن میں پیشتر سے قائم ہیں ان کی تعمیل و تکمیل ہو کر رہے۔ استغناء کو پیش از پیش مطلع کر دیا گیا تھا کہ وہ روما میں بحث کرنے کے لئے نہیں آ رہے ہیں بلکہ ان فیصلوں پر صاف کرنے کی غرض سے بلائے جا رہے ہیں۔ جو ایک معصوم و غیر خاظمی پاپا صادر کر چکا ہے۔ آزادانہ بحث کا خیال تک بھی پیش نظر نہ تھا۔ مجلس کے کسی اجلاس کی روداد کے معائنہ کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ ان اساقف کو جن کا تعلق محض ایک رسمی ضابطہ کی تکمیل کے لئے فریق اختلاف سے تھا بات کرنے کا موقع تک نہ دیا گیا۔ بتاریخ ۲۲ جنوری ۱۸۷۰ء اس مضمون کی درخواست مجلس میں بغرض تصفیہ پیش ہوئی کہ صمت پاپا کی تعریف کی

جائے۔ اس کے مقابلہ میں جماعت اقلین کی اختلافی درخواست پیش ہوئی۔ اس پر اقلین کو مباحثہ کی ممانعت کر دی گئی اور ان کی آرا کی اشاعت کے متعلق بھی حکم امتناعی جاری کیا گیا۔ اگرچہ یہ انتظام کر لیا گیا تھا کہ جماعت اکثرین فریقین مباحثہ کا اس حد تک جزو غالب ہو کہ جماعت اقلین پر پوری طرح سے چھا جائے لیکن پھر بھی مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ ایک حکم اس مضمون کا جاری کیا جائے کہ کسی تحریک کی منظوری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ غلبہ آرا اتفاق کامل کے قریب قریب پہنچا ہوا ہو بلکہ محض کثرت رائے کافی ہوگی۔ جماعت اقلین کی آراء مخالف کی مطلق پروا نہ کی گئی۔

مجلس نے اپنے مقاصد کی تکمیل پر جب اس قدر زور دیا تو دول خارجہ کے حکام کو اس کی اس غیر مال اندیشانہ کارروائی نے ہایم و سراسیمہ کر دیا۔ دانتا پایہ تخت آسٹریا کے صدر اسقف نے پیپا کی خدمت میں ایک محضر روانہ کیا جس پر بہت سے کروتالوں اور صدر اسقفوں کے دستخط ثبت تھے۔ اس میں جناب تقدس ماب سے التجا کی گئی تھی کہ مسئلہ عصمت کو معرض بحث میں نہ لائیں۔ اس لئے کہ کلیسا آج کل ایسی کشمکش میں مبتلا ہے جس کا گزشتہ زمانے میں وجود نہ تھا اور اس کو ایسے حریفوں سے پالا پڑا ہے جو سرے سے مذہب ہی کے دشمن ہیں اور اسے فطرت انسانی کے لئے ہم قاتل سمجھتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں جب کہ کیتھولک اقوام کی نیت اعدا اور معاندین کی منصوبہ بازیوں سے ڈالو اوڈول ہو رہی ہو ان کو ایسے عقائد کے تسلیم کرنے پر مجبور کرنا جو ٹرنٹ کی کونسل کے مسئلہ عقائد پر مستزاد ہوں قرین مصلحت نہ ہو گا۔“ اس محضر میں یہ عبارت بھی درج تھی کہ ”مسئلہ عصمت پیپا عن الخطا کی تعریف جن الفاظ میں کرائی جاتی ہے وہ دشمنان مذہب کے ہاتھ میں ایک اور زبردست حربہ دے دیں گے۔ جس کا اثر یہ ہو گا کہ وہ لوگ بھی جو بلحاظ عقائد افضل الناس ہیں کلیسائے رومن کیتھولک کو ان مغویوں کے اغوا سے برا سمجھنے لگیں گے۔“ وزیر اعظم آسٹریا نے ایک انتہائی تحریر کے ذریعہ سے دربار پیپا کو اچھی طرح آگاہ کر دیا کہ ہر ایسی کارروائی کا خمیازہ دربار موصوف کو کھینچنا پڑے گا جو آسٹریا کے حقوق میں تصرف و دست اندازی کا موجب ہوگی۔ فرانسیسی گورنمنٹ نے بھی ایک یادداشت پیپا کی خدمت میں بھیجی جس میں یہ تحریک کی گئی تھی کہ ایک فرانسیسی اسقف کو مجلس کے اجلاس میں فرانس کے حالات پر بحث اور اس کے حقوق کی حمایت کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس کا جواب پیپا کی گورنمنٹ نے یہ دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسا اسقف سفارت کی خدمات بھی انجام دے اور مجلس کی رکنیت کے مقدس فرائض سے بھی سبکدوش ہو سکے۔

اس پر فرانسیسی گورنمنٹ نے ایک مودبانہ عریضہ کے ذریعہ سے گزارش کی کہ امید ہے کہ حضرات اساقف کسرو انکسار کے اصول کو پیش نظر رکھ کر اور جناب پاپائے مقدس احتیاط و عاقبت شناسی کو کام فرما کر غلو آمیز شخصی آرا کو مذہبی عقائد کی فہرست میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ توقع بھی ظاہر کر دی کہ دینی حکومت کی بیجا مداخلت اور دست اندازی سے اس کے مدنی و سیاسی قوانین کو کیتھولک فرانسیسیوں کی عقل سلیم اور حب وطن محفوظ رکھے گی۔ اس مخالفت میں شمالی جرمنی کی ”کانفیڈریشن“ (انجمن اتحاد) بھی شریک ہو گئی اور ہر طرف سے پاپا کی گورنمنٹ پر دباؤ ڈالا گیا۔

۲۳ اپریل کو دان آرئم سفیر پروشیا نے وارو سفیر فرانس کے ساتھ مل کر پاپا کی خدمت میں یہ تحریک پیش کی کہ قرون متوسط کے خیالات کا احیا بعید از مصلحت ہے۔ اساقف اقلین نے یہ شبہ پا کر مطالبہ کیا کہ مسئلہ عصمت پاپا کے تصفیہ سے پہلے دینی اور دیوی حکومتوں کے تعلقات کا تعین کر دیا جائے۔ اور اس مسئلہ کا بھی تصفیہ کر دیا جائے کہ آیا مسیح نے سینٹ پیٹر اور اس کے جانشینوں کو بادشاہوں اور شہنشاہوں پر اقتدار عطا فرمایا ہے یا نہیں۔

لیکن اس تحریک پر مطلق اتفاقات نہ کی گئی یہاں تک کہ بحث کے لئے مہلت تک نہ دی گئی۔ فرقہ جیسوئٹ کے اراکین جو اس تمام تحریک کے بانی مہانی تھے اپنی ہر ایک تجویز بجر منوا لیتے تھے۔ عام نکتہ چینی سے بچنے کا کوئی ایسا حیلہ نہ تھا جو مجلس نے اختیار نہ کیا ہو۔ تمام کارروائی راز میں رکھی گئی۔ جو لوگ اس کارروائی میں شریک تھے ان سے حلف لے لیا گیا تھا کہ خاموش رہیں گے۔

۱۳ جولائی کو وہ رائیں لی گئیں۔ ۶۱ آرا میں چار سو اکاون (۳۵۱) موافق تھیں کثرت آرا کے قاعدے کے مطابق تحریک منظور شدہ قرار پائی اور پانچویں دن پاپا نے اس عقیدہ کا اعلان کر دیا کہ وہ معصوم عن الخطا ہے۔ اکثر کہا گیا ہے کہ یہ وہ دن تھا جب کہ فرانس نے پروشیا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اس کے آٹھ دن بعد فرانسیسی فوج روما سے بلا لی گئی۔ شاید مدبر اور ظنی دونوں کو اس کا اعتراف ہو گا کہ اگر عقل سلیم پاپا کو غیر خاطر تسلیم کرتی تو اس کی عصمت اتحاد و اتفاق کا بہت بڑا عنصر ہو سکتی ہے مگر عقل کو یہ بات باور آئے تو کیونکر آئے۔

اس کے بعد شاہ اٹلی نے اپنی قلم سے ایک خط پاپا کو لکھا جس میں نہایت مودبانہ طور پر ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ امر ضروری ہے کہ شاہی فوجیں بڑھ کر ان مقامات پر قبضہ کر لیں جن

کا جناب تقدس ماب کی سلامتی اور ملک کو حریفوں کی دست برد سے بچانے کے لئے شاہی قوت کی حمایت میں آ جانا مصالحِ سیاسیہ کے مقتضیات سے ہے۔ اس خط میں یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ کیتھولک مذہب کا تقدس انتساب پیشوا اس ضرورت کو تسلیم کرنے سے نہ صرف قومی تنازوں کو پورا کرے گا بلکہ باشندگان اٹلی کی ارادت و عقیدت کا مرکز بن کر دریائے ٹائبر کے کنارے اگر چاہے تو ایک ایسی شاندار حکومت قائم رکھ سکے گا۔ جو انسانی حکومت کی اطاعت سے مطلقاً آزاد ہوگی۔

اس کا جواب جناب تقدس ماب نے ایک مختصر سے جملے کئے خط میں یوں دیا۔ ”میں خدا کا شکر کرتا ہوں جس نے حضور کو میری زندگی کے پیالہ کی تلچٹ میں تنخی کے ملانے کی توفیق عطا کی ہے باقی رہے آپ کے بعض مطالبات سو میں ان کے منظور کرنے سے قاصر ہوں اور ان اصول کی پابندی بھی میرے حیطہ امکان سے خارج ہے جو آپ کے خط میں درج ہیں میں پھر خدا سے استعانت چاہتا ہوں اور اپنا کام اس کے ہاتھ میں چھوڑتا ہوں کہ وہ خود اسی کا کام ہے۔ میری خدا سے دعا ہے کہ وہ حضور پر اپنی بہت سی برکتیں نازل کرے اور آپ کو خطرات سے بچائے اور آپ پر وہ رحم فرمائے جس کی آپ کو بہت ہی ضرورت ہے۔“

شاہی فوج کو بہت کم مزاحمت پیش آئی۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۷۰ء کو اس نے روما پر قبضہ کر لیا۔ اب ایک عام اعلان جاری کیا گیا کہ مسئلہ اتحاد دولت اٹلی کے متعلق کل باشندگان اٹلی کی رائے بذریعہ قرعہ اندازی لی جائے۔ اس عام قرعہ اندازی کے نتیجہ نے ثابت کر دیا کہ اٹلی میں لوگوں کا دماغ دینیات کی قیود سے کامل طور پر آزاد ہو چکا ہے ان صوبجات میں جو روما سے متعلق تھے آرائے قابل اندراج کی تعداد ۱۷۵۴۸۸ تھی ان میں سے بہ قدر ۱۳۵۲۹۱ آرا کے قرعہ اندازی ہوئی۔ الحاق صوبہ جات کی تائید میں ۱۳۳۶۸۱ آرا برآمد ہوئیں۔ آرائے مخالف کی تعداد ۱۵۰۷ تھی اور ۱۰۳ رائیں ایسی تھیں جو منسوخ کر دی گئیں۔ اٹلی کی پارلیمنٹ نے باشندگان روما کی اس متحدہ رائے کو کہ رومانی صوبجات کا دولت اٹلی کے ساتھ الحاق کر دیا جائے۔ مطلب آرا تسلیم کر لیا۔ ۲۳۹ رائیں اس اعتراف کی موید تھیں اور بیس مخالف۔ غرض ایک شاہی فرمان کے ذریعہ سے اس امر کا اعلان کر دیا گیا کہ پاپائی ریاستیں دولت اٹلی کے ساتھ ملحق کر دی گئیں اور ایک اشتہار اس الحاق کی جزیات کے متعلق جاری کیا گیا۔ اس اشتہار میں بتایا گیا تھا کہ ”ان رعایات سے گورنمنٹ اٹلی یورپ پر یہ بات ثابت کرنا چاہتی ہے کہ باتباع اس اصول کے کہ ایک خود مختار حکومت میں کلیسا کو

خود مختار ہونا چاہئے۔ اٹلی پاپا کی فرماں روائی کو تسلیم کرتی ہے۔

جب پروشیا اور آسٹریا کی جنگ ہوئی تو پاپائیت کو یہ امید تھی کہ سلطنت جرمنی پر آسٹریا کی نگرانی قائم ہو جائے گی اور اہل جرمنی کا مذہب کیتھولک ہو جائے گا۔ جب جرمنی اور فرانس میں لڑائی ہوئی تو فرانسیسیوں کو امید تھی کہ جرمنی میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں گے۔ جنہیں رومن کیتھولک مذہب کے ساتھ ہمدردی ہو گی۔ اسی لئے کیتھولکوں کو پرائسٹوں کے خلاف بھڑکانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ کوئی ایسی گالی نہ تھی جو ان کو نہ دی گئی ہو کبھی انہیں دہریہ کہا گیا کبھی ان کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ ان میں ایمانداری اور دیانت کی صفت ہو ہی نہیں سکتی۔ کبھی ان کے فرقوں کی نسبت یہ ظاہر کیا گیا کہ ان کا اعتزال روبہ زوال ہے کبھی ان پر یہ آواز کسا گیا کہ پیروان لوہر سے زیادہ فاسق و فاجر قوم یورپ بھر میں کوئی نہیں۔ خود جناب پاپا نے شاید یہ سمجھ کر کہ دنیا کو تاریخ نیا منسبا ہو گئی ہے بلاتامل یہ ارشاد فرمایا کہ ”اہل جرمنی کو سمجھ جانا چاہئے کہ بجز کلیسائے روم کے اور کوئی کلیسا آزادی اور ترقی کا سرچشمہ نہیں ہو سکتا۔“

اس اثنا میں جرمنی کے پادریوں نے ایک جماعت اس غرض سے قائم کی کہ پاپا کی غاصبانہ دست برد کے خلاف اپنی آواز بلند کرے بلکہ عملی طور پر اس کی مزاحمت کرے۔ اس جماعت نے صاف کہہ دیا کہ ہم ہرگز اس امر کے روادار نہیں ہو سکتے کہ انسان خدا کے تخت پر بٹھا دیا جائے بلکہ ہم کسی شکل میں بھی کسی کو نائب خدا بنا ہوا دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے علمی عقائد کو قیست کی قربان گاہ پر بھیٹ چڑھا سکتے ہیں۔ بعض تو یہاں تک بے دھڑک نکلے کہ انہوں نے خود پاپا ہی پر زندہ و الحاد کا الزام لگا دیا۔ ان مترو اور سرکش اشخاص کو خارج از کلیسا کئے جانے کی دھمکیاں دی گئیں اور بالآخر یہ مطالبہ کیا گیا کہ بعض پروفیسروں اور معلموں کو خدمت سے سبکدوش کر کے بجائے ان کے ایسے اساتذہ مقرر کئے جائیں جو عصمت پاپا کے قائل ہوں۔ اس مطالبہ کی تعمیل سے گورنمنٹ جرمنی نے انکار کر دیا۔

گورنمنٹ جرمنی کی دلی تمنا تھی کہ پاپائیت کے ساتھ صلح صفائی کے تعلقات قائم رکھے وہ مذہبی جھگڑوں میں ہرگز نہ پڑنا چاہتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہو کر رہا کہ امرابہ البحث مذہبی نہ تھا بلکہ پولیٹکل یعنی حکومت کی طاقت آیا۔ حکومت ہی کے خلاف صرف کی جائے یا نہیں۔ ایک دفعہ ایک استاد جو کسی مدرسہ میں درزش کی تعلیم دینے پر مامور تھا کلیسا سے خارج کیا گیا اور جب کلیسا کی طرف سے اس کی برطرفی کی تحریک

ہوئی تو گورنمنٹ نے اس تحریک کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ حکام کلیسا نے اس انکار کو کلیسا کے حقوق کی ہاتھی پر محمول کر کے ظاہر کیا کہ گورنمنٹ نے مذہب پر حملہ کیا ہے۔ شہنشاہ جرمنی نے اپنے وزیر کی اس کارروائی کو جو کلیسا کے مقابلہ میں کی گئی تھی بنظر استہسان دیکھ کر اس کی حمایت کی۔ اس پر پاپائی اخباروں نے شہنشاہ کو ہر ایماندار کیتھولک کی مخالفت کی دھمکی دے کر بتایا کہ پاپا کے ساتھ مقابلہ کرنا کچھ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس میں حکومتیں نہ دھمکی ہو سکتی ہیں اور ہو کر رہیں گی۔ ہر شخص جو ذرا بھی سمجھ رکھتا تھا اچھی طرح جان گیا کہ امرابہ النزاع نے اب اس سوال کی شکل اختیار کر لی ہے کہ سلطنت کا اصلی مالک کون ہے گورنمنٹ یا کلیسائے روما؟ دو بادشاہ دراصل ایک نہ گنبد۔ والی مثل ثابت ہو رہی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ لوگ دو حکومتوں کے ماتحت رہ سکیں جن میں سے دونوں ایک دوسرے کا تعلق کرتی ہوں۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر گورنمنٹ کلیسائے روما کے احکام کی متابعت کرنے سے پہلوتھی کرے گی تو دونوں گویا ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ اس طور پر روما نے جرمنی کو لڑائی پر مجبور کیا اور یہ وہ لڑائی تھی جس میں روما کی بوجہ تمدن جدید کے حریف ہونے کے صاف زیادتی پائی جاتی ہے۔

گورنمنٹ جرمنی نے اب اپنے حریف کو پہچان کر یہ مدافعتیہ چال چلی کہ محکمہ وزارت عبادات عامہ کے کیتھولک میسنہ کو یک قلم تخفیف کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۸۷۱ء کے موسم گرما میں پیش آیا۔ نومبر آئندہ میں شہنشاہ نے پارلیمنٹ میں ایک قانون اس مضمون کا نافذ کیا کہ جو پادری اپنے عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر موجب نقص امن ہوں گے وہ مستوجب سزا بیسہ فوجداری ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس اصول کو پیش نظر رکھ کر کہ کامیاب وہی جماعت ہو گی جس کے ہاتھ میں مدارس ہوں گے ایک منصوبہ وسیع بیانہ پر اس غرض سے قائم کیا گیا کہ مدارس کو کلیسا سے علیحدہ کر لیا جائے۔“

”جیسوٹ“ فرقہ تمام جرمنی میں اس سازش کا جال پھیلا رہا تھا کہ ایسے مذہبی قانون کی تعمیل رعایا پر فرض نہیں ہے جو حکومت کا بنایا ہوا ہو۔ یہ گویا کھلم کھلا بغاوت تھی گورنمنٹ اگر ان باغیوں کی دھمکی میں آجاتی تو اس کی خیر نہ تھی۔ ارطمان کے اسقف نے صاف کہ دیا کہ حکومت کے ان قوانین کی وہ ہرگز متابعت نہ کرے گا۔ چو موثر کلیسا ہوں گے اس پر گورنمنٹ نے اس کی تنخواہ روک دی اور یہ دیکھ کر کہ جب تک جیسوٹ فرقہ کا ملک میں قدم رہے گا۔ امن قائم نہ ہو سکے گا ان کے اخراج کا قصد کر لیا اور جتنے جیسوٹ تھے سب ملک بدر کر دیے گئے۔ ۱۸۷۲ء کے خاتمہ پر جناب تقدس ماب نے ایک

خطبہ شائع کیا جس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہ سلطنت جرمنی میں کلیسا جو ر و جفا کا تختہ مشق بنا ہوا ہے۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ کلیسا اور حکومت کی حدود ارضی کے معین کرنے کا حق صرف کلیسا ہی کو حاصل ہے۔ یہ اصول جس درجہ خطرناک اور ناقابل تسلیم ہے ظاہر ہے اس لئے کہ لفظ اخلاق کلیسا کی اصلاح میں انسان کے جملہ تعلقات باہمی پر حاوی ہے اور کلیسا نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ ہر وہ قوت جو اس کی معین نہیں ہے اس پر جبر کرتی ہے۔ اس خطبہ کی اشاعت کے چند روز بعد یعنی ۹ جنوری ۱۸۷۳ء کو گورنمنٹ نے چار قوانین نافذ کئے۔

(۱) ان وساکن کے انضباط و تعین کے متعلق جن کو اختیار کر کے انسان اپنا تعلق کلیسا سے منقطع کر سکے۔

(۲) کلیسا کے اقتدارات تعزیری کی تقلید و تحدید کے متعلق۔

(۳) قانون تنبیہات و تادیبات مذہبی دربارہ ممانعت سزائے جسمانی اور انضباط سزائے جرمانہ و جلائے وطن و عطائے حق اہل بہ ناراضی فیصلہ عدالت ہائے ماتحت بعدالذات العالیہ امور مذہبی جس کا فیصلہ قطعی اور نامطلق متصور ہو گا۔

(۴) قانون تعلیم ابتدائی و تقرر پادریان۔ اس چوتھے قانون کی رو سے لازمی قرار دیا گیا کہ پادریوں نے خاطر خواہ تعلیم پائی ہو اور سرکاری امتحان پاس کیا ہو اور فلسفہ و تاریخ و جرمن علم ادب میں مہارت رکھتے ہوں یہ بھی قرار پایا کہ جو مذہبی مدارس سلطنت کی نگرانی میں قائم رہنے سے انکار کریں وہ بند کر دئے جائیں۔

یہ قوانین حکومت جرمنی کے اس معمم قصد کو ثابت کرتے ہیں کہ وہ ہرگز اس بات کی روادار نہ ہو گی کہ اٹلی کے چند اونچے گھرانے جرمنی میں من مانی کارروائیاں کریں اور اسے کٹ پتلی کی طرح تار پر نہچائیں۔ بلکہ وہ اپنے گھر کا انتظام اب خود اپنے ہاتھ سے کرنا چاہتی ہے۔ اس مقابلہ کو وہ مذہب اور ایمان کا معاملہ نہیں سمجھتی بلکہ قانون سلطنت اور قانون کلیسا کی فرمانروایانہ صولتوں کا تصادم تصور کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ پاپائیت کو مذہب نہیں بلکہ پویشل طاقت سمجھتی ہے اور اس نے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ جرمنی کی دستوری حکومت کا یہ اعلان لفظاً و معناً "علماء و عملاً" برقرار رہے گا کہ "مذہبی آزادی کو ہرگز ان فرائض میں خلل نہ ہونا چاہئے جو ہر فرد رعایا کے ذمہ دوسرے افراد رعایا اور حکومت کی طرف سے واجب الادا ہیں۔"

یہ قول بالکل درست ہے کہ پاپائی حکومت میں شان عمومیت نظر نہیں آتی یعنی وہ ایک

ہمہ گیر کلیسا نہیں ہے جس کی برکات سے کل مسیحی دنیا مستفیض ہوتی ہو بلکہ اس کا مقصد محض چند اطالوی خاندانوں کو نفع پہنچانا ہے۔ اس کی ہیئت ترکیبی پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پایا کرسٹال اسقف اور کرسٹال شاس سب کے سب اطالوی ہیں۔ کرسٹال قمیص تقریباً سب کے سب اطالوی ہیں۔ روما کی مجلس مقدسہ کے اعضاء و اعمال سب کے سب اطالوی ہیں۔ قرون متوسطہ سے لے کر آج تک فرانس کا ایک بھی پادری پایا نہیں ہوا۔ یہی حال آسٹریا، پرنگال اور اسپین کا ہے۔ باوجود ان کوششوں کے جو اس اختصاص کے خلاف وقتاً فوقتاً عمل میں لائی گئی ہیں اور باوجودیکہ بھی طرح کے جتن کئے گئے ہیں کہ کلیسا کے مناصب جلیلہ کا دروازہ تمام کیتھولک دنیا کے لئے بلا امتیاز کھول دیا جائے لیکن ممکن نہیں کہ کوئی غیر ملکی کرسی مقدس تک پہنچ سکے۔ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کلیسا ایک سلطنت ہے جو خدا نے مخصوص طور سے اٹلی ہی کے امرا کو عطا فرمائی ہے۔ موجودہ مجلس کرسٹالان کے بچپن ارکان میں سے چالیس اطالوی ہیں حالانکہ انصافاً ان کی تعداد آٹھ سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے تھی۔

ترقی یورپ کی چلتی گاڑی کی راہ میں حکومت کی دو عملی نے روڑا اٹکائے رکھا ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ ہر قوم کے دو بادشاہوں ایک دیہی یعنی داخلیہ اور ایک دینی یعنی خارجیہ جب کہ مختلف ممالک جد امجد فرمان رواؤں کے ماتحت ہوں اور ان سب کا ایک فرمان روا پایائے روا ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ تاریخ میں ہم کو بجز ان متخالف و متعارض طاقتوں کی رقیبانہ جدوجہد کی داستان کے اور کوئی سبق آموز حقیقت نظر آئے؟ جو محض ان واقعات کا بنظر غور مطالعہ کرے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ قومیں جنہوں نے مشییت کے عنصر کو اپنی حکومت سے خارج کر دیا ہے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اس پر اس فالج کی حقیقت منکشف ہو جائے گی جس نے فرانس کو عضو معطل بنا رکھا ہے۔ ایک طرف تو فرانس یورپ کا مقتدا و پیشوا بننا چاہتا ہے اور دوسری طرف عہد ماضی کی اس لاش سے ہم آغوشی ہے۔ جس کی ہڈیاں بھی گل کر چوہ ہو گئی ہیں یعنی طبقہ جلا و غوام کے خوش رکھنے کی غرض سے وہ طرز عمل اختیار کرتا ہے جس کی وقعت اس کی عقل سلیم کی نظروں میں خاک نہیں ہو سکتی۔ جن دو حکومتوں کا فرانس میں دور دورہ ہے وہ یہاں تک مساوی القوت ہیں کہ کبھی ایک کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ کبھی دوسرے کو اور بار بار ایسا بھی اتفاق پیش آتا ہے کہ ایک قوت دوسری قوت کو اپنے اغراض کی تکمیل کا آلہ بنا لیتی ہے۔ لیکن اس دو عملی کے خاتمہ کا وقت اب قریب آتا جاتا ہے۔ شمالی اقوام کو جو تیغیات

بارود و توہمات باطلہ میں اس درجہ جھٹانہ تھیں یہ مشنیت مدت سے ناقابل برداشت ہو گئی تھی اور انہوں نے علی رغم انف روم اس کا جو اپنے کندھے سے اتار پھینکا تھا۔ روس جس کی قسمت دوسری قوموں سے اچھی تھی۔ کبھی بھی کسی غیر قوت کا روحانی حلقہ بگوش نہ بنا۔ وہ قدیم کلیسائے یونان کی رسموں ہی کو اپنا سرمایہ نجات تصور کرتا تھا اور پاپائیت کو نصرانیت قرون اولیٰ میں مفسدانہ رخنہ اندازی سے تعبیر کرتا تھا۔ امریکہ میں امور دنیا و دین بالکل الگ الگ کر دئے گئے ہیں۔ مذہب کو حکومت میں دست اندازی کرنے کی مطلق اجازت نہیں۔ اگرچہ باقی ہر اعتبار سے اسے پوری آزادی حاصل ہے۔ نئی دنیا کی حالت دیکھ کر ہمیں یہ اطمینان بھی ہوتا ہے کہ نصرانیت کے دونوں فرقوں یعنی کیتھولک اور پرائسٹنٹ کی قوت بالیدگی و انفرار سلب ہو چکی ہے۔ ان کی جو حدود ایک عرصہ سے معین ہو چکی ہیں ان سے یہ دونوں تجاوز ہونے کے قابل نہیں رہے۔ کیتھولک اقوام کیتھولک ہیں اور پرائسٹنٹ پرائسٹنٹ۔ پرائسٹنٹوں کے دل سے فرقہ بندی کا خیال دور ہو رہا ہے۔ ان کے اختلافات ملتے جاتے ہیں۔ مختلف فرقوں کے افراد کا میل جول بڑھتا جاتا ہے۔ ان کی آراء و عقائد مروجہ کا ماخذ کلیسا نہیں ہے بلکہ اخبارات و رسائل ہیں۔

جس جدوجہد کا ذکر ہم نے کیا ہے اس کے لحاظ سے پاپائے پائس تاسع کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ اول یہ کہ پاپائیت کی قومیں ایک مرکز پر لا کر جمع کر دی جائیں اور یہ مرکز ایک مطلق العنان روحانی مقتدا ہو جسے ربانی اقتدارات حاصل ہوں۔ دوسرے یہ کہ جو اقوام مسیحی المذہب ہیں ان کے عقلی نشوونما کی باگ پاپا کے ہاتھ میں آ جائے۔ مقصد اول الذکر کا کوئی اور نتیجہ بجز سیاسی مداخلت کے ہو ہی نہیں سکتا۔ پاپائے موصوف کو اصرار تھا کہ دیوی طاقت ہر حال میں دینی طاقت کے تابع ہو اور ہر وہ قانون جو کلیسا کی اغراض کا حامی نہ ہو منسوخ کر دیا جائے۔ اس لئے کہ ایسا قانون اہل ایمان کے لئے واجب الاتباع نہیں ہے۔ گزشتہ اوراق میں ہم مجمل طور پر محض ان پیچیدگیوں کا ذکر کر آئے ہیں جو اس اصول کو برقرار رکھنے کی کوشش کے باعث واقع ہو چکی ہیں۔

اب ہم اس طریقہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو پاپائیت نے اپنی عقلی حکومت کے قیام کے لئے تجویز کیا ہے۔ یعنی ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس نے اپنے اور اپنے حریف سائنس کے باہمی تعلقات کی تعریف و تحسین کن الفاظ میں کی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کی حالت کے احیا کی کوشش میں اس نے تھن جدید کی کیوں کر مخالفت کی ہے اور اپنائے زمانہ حال کو کس کس طرح سے کوسا ہے۔

مکتوب عمومی و تخلص میں جو اصول مندرج ہیں انہیں ویکن کونسل قوت سے فعل میں لانے کی آرزو مند تھی۔ ”تخلص“ میں ان لوگوں کی تکفیر کی گئی ہے جو عقیدہ ہمہ اوست کے قائل ہوں یا نیچری ہوں یا مطلقاً ”استدلالی و معقولی ہوں اور اس قسم کے عقائد کو مورد نظرین قرار دیا گیا ہے کہ خدا کائنات ہے۔ خدا اور قوت مترادفات ہیں۔ امور دین پر بھی اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہئے جس حیثیت سے مسائل فلسفہ پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ وہ طریقے اور اصول جنہیں متکلمین زمانہ قدیم نے دینیات کی حمایت کے لئے اختیار کیا تھا متقنیات زمانہ حال و ترقی سائنس کے لحاظ سے موزوں و مناسب نہیں رہے۔ ہر شخص آزاد ہے کہ جس مذہب کو ازروئے عقل سچا سمجھے قبول کر لے۔ کلیسا کے اقتدارات کی تحسین و تحدید کا حق حکومت کو حاصل ہے۔ کلیسا کو جبر یا بالواسطہ و بلاواسطہ قوت سے کام لینے کا حق حاصل نہیں۔ کلیسا کو حکومت اور حکومت کو کلیسا سے الگ کر دینا چاہئے۔ اب یہ امر قرن مصلحت نہیں رہا کہ حکومت کا مذہب عبادت کے باقی تمام طریقوں کی نفی کر کے کیتھولک مذہب ہی قائم رہنے دیا جائے۔ جو لوگ کیتھولک ممالک میں آکر سکونت پذیر ہوں انہیں اپنا طریقہ عبادت علانیہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ پاپائے روما کو تمدن جدید کی ترقی کے ساتھ اتفاق و وفاق ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے بھی۔ تخلص میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ کلیسا کو مدارس عامہ کی نگرانی کا کمال اختیار حاصل ہے اور حکومت کو ایسا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ نکاح اور طلاق کے معاملات بھی کلیسا کے زیر اقتدار میں داخل ہیں۔

ان میں سے وہ اصول جنہیں کونسل نے بالفعل شکل ضابطہ مرتب کرنا قرن مصلحت سمجھا ایک رسالہ میں جس کا نام ”کیتھولک مذہب کا دستور عقائد“ ہے درج کر دئے گئے ہیں اب ان عقائد کے سمات الامور خصوصاً ”مذہب اور سائنس کے تعلقات باہمی پر غور کرنا ہے۔ غلطی نہ رہے کہ سطور ذیل اس رسالہ کا مکمل اقتباس پیش نہیں کرتیں بلکہ ان کے ذریعہ سے صرف ان اجزاء کا خلاصہ درج کیا گیا ہے جو ضروری الاخطار ہیں۔

رسالہ کی تمہید ایک متاخرانہ تقریر پر مشتمل ہے جس میں واقعہ اصلاح کینرہ کے اصول و نتائج پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے:

”اس ربانی اقتدار کی نفی کرنے کے باعث جو کلیسا کو دین برحق کے حقائق کی تعلیم کے حلق حاصل ہے اور جملہ امور متعلقہ مذہب کو ہر شخص کے اجتہاد ذاتی کے حوالے کر دینے کی بدولت متعدد فرقے پیدا ہو گئے ہیں اور ان فرقوں کے باہمی اختلاف و نزاع سے نہ

صرف بت سے لوگوں کے دل سے یسوع مسیح کا ایمان زائل ہو گیا بلکہ کتب مقدسہ کا شمار افسانوں اور فرضی روایتوں میں ہونے لگا۔ لوگ مسیحیت کے منکر ہو گئے اور اس کے بجائے محض عقل یا بقول خود نیچر کی تعلیم کی پیروی کرنے لگے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے جو ہمہ اوست ماریت اور دھرمیت کے قعر میں جا گرے ہیں۔ اور فطرت انسانی کے استدلالی پہلو کو نظر انداز کر کے اور نیکی و بدی کے ہر قاعدہ کو پس پشت ڈال کر جماعت انسانی کا اخلاقی شیرازہ بکھیرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ متعقدات فاسدہ و بدعات سہشہ کی چونکہ ہر جگہ اشاعت ہو رہی ہے لہذا بت سے کیتھولک بھی ان کے دام تذریر میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے سائنس کو جس کا ماخذ انسان ہے مذہب کے ساتھ جو ربانی الاصل ہے ملا کر غلط بحث کر دیا ہے۔

لیکن کلیسا جو ابوالاام اور سید الاقوام ہے کمزوروں کی قوت اور ناتواں کا سہارا ہے جو راہ گم کردہ اس کے آغوش محافظت میں آکر عافیت مگزین ہونا چاہیں انہیں پناہ دینے کے لئے تیار ہے اور جس رستہ سے وہ بھٹک گئے تھے اس پر انہیں نئے سرے سے ڈالنے کے لئے آمادہ ہے۔ اسی لئے کل دنیا کے اساقف اس مجلس عمومیہ میں آکر جمع ہوئے ہیں اور چونکہ روح القدس بھی اس جلسہ میں نزول اجلال فرما کر ہمارے اجتماعات میں شریک ہے لہذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پطرس کی کرسی سے مسیحی نجات کے عقیدہ کا اعلان کریں اور ان بدعات کو جو اس عقیدہ کی مخالف ہیں سر زمین اعتقاد سے قابت "خارج کر دیں۔

"خدا کی حقیقت جو افریقندہ کون و مکال ہے: مقدس رومن کیتھولک کلیسا جو مرسلین کی یادگار ہے یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ خدائے حی و برحق ایک ہے جو آسمان و زمین کا خالق و مالک، قادر مطلق، ازلی و ابدی، لاتحد ولا تحصر۔ برتر از فہم و قیاس۔ غیر متناہی العقل و الارادہ اور من کل الوجوہ کامل ہے۔ وہ کائنات سے جدا اور متمایز ہے وہ اپنی مشیت مطلقہ کی تحریک پر دو مخلوق ہستوں کو عدم سے وجود میں لایا جن میں سے ایک روحانی ہے دوسری جسمانی، ایک لاہوتی ہے دوسری ماسوتی۔ اس کے بعد اس نے فطرت انسانی کو بنایا جو ان دونوں سے مرکب ہے۔ اس کے علاوہ خدا اپنی تائید سے تمام چیزوں کی حفاظت اور انتظام کرتا ہے اور اس کا جلال و جہوت اقصائے کائنات پر محیط ہے اس کے نظم و نسق میں موزونی و ترتیب پائی جاتی ہے۔ وہ ہمہ دان و ہمہ بین ہے۔ اور وہ باتیں بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہیں جو اس کی مخلوقات کے آزادانہ افعال سے وقوع میں آتی ہیں۔

"الہام کی حقیقت: کلیسائے مقدس کا عقیدہ ہے کہ اگرچہ خدا کی ذات عقل انسانی

کہ قدرتی نور کی روشنی میں صاف صاف نظر آ سکتی ہے لیکن اس کی یہ بھی مرضی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے مقدرات کو فوق العادت طور پر ظاہر کرے۔ یہ فوق العادت الہام ٹرنٹ کی مقدس کونسل کے اجتہاد کے مطابق مود عتیق و جدید کے ان شخصوں میں مندرج ہے جن کی توضیح کونسل نے کی ہے اور نیز کتب مقدسہ کے لاطینی نسخہ میں موجود ہے۔ یہ کتابیں اس وجہ سے مقدس ہیں کہ ان کے اٹلا میں روح القدس کا تصرف شامل تھا۔ ان کا مصنف خدا ہے اور ربانی تصانیف ہونے کی حیثیت سے وہ کلیسا کے حوالے کی گئی ہیں۔

”اس غرض سے کہ بے چمن اور چلبلی طبیعت کے لوگ آیات آسمانی کی غلط تفسیر و تاویل نہ کرنے پائیں بہ تجدید اجتہاد مجلس ٹرنٹ یہ فرمان صادر کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کتب مقدسہ کے معانی ان معانی سے مختلف نہ بیان کرے جو کلیسائے مقدس نے بیان کئے ہیں کہ اسی کو اس قسم کی مفسری سزاوار ہے۔

”ایمان کی حقیقت : چونکہ انسان بندہ ہے اور خدا اس کا آقا ہے اور چونکہ عقل حادث حقیقت ازل کی کامل طور پر مطیع و منقاد ہے لہذا انسان کا فرض ہے کہ جب کوئی الہام مجانب اللہ صادر ہو تو اس پر ایمان لائے۔ ایمان ایک سعادت ہے جو بزور بازو نہیں حاصل ہوتی بلکہ یہ ایک جوہر ماوراء العادت ہے جسے خدا کی دین سمجھنا چاہئے۔ جو شخص آیات آسمانی کو برحق سمجھتا ہے نہ اس لئے کہ ان میں وہ فطری حقائق پوشیدہ ہیں جن کے سمجھنے پر عقل انسانی قادر ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ان آیات کی تزیل کا ماخذ جناب باری ہے اس کے لئے ایمان ذریعہ نجات ہے پھر بھی اس خیال سے کہ عقل اور ایمان میں توافق قائم ہو سکے خدا نے الہام پر معجزوں اور پیشین گوئیوں کا اضافہ فرما دیا جو اس کی قدرت کاملہ و حکمت بالغہ کے مظاہر ہونے کے لحاظ سے ایسی جہتیں ہیں جن کو عوام و خواص یکساں سمجھ سکتے ہیں۔ ان محبتوں کا اظہار حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیاء کے ذریعہ سے عموماً اور جناب مسیح کے ذریعہ سے خصوصاً ہوا۔

کوئی شخص ایمان لائے بغیر اپنی فطرت کے حق سے عمدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کوئی شخص تاویل کے مرتے دم تک اس کا ایمان سلامت نہ رہا ہو ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کے ذریعہ سے کلیسا کو اپنی الہامی آیات کا محافظ و معلم قرار دیا۔ کیونکہ صرف کلیسائے کیتھولک ہی ان نشانات آسمانی کا مورد و مہبط ہے جن سے دین سبکی کا مفید یقین ہونا ظاہر ہو سکتا ہے۔ اور یہی نہیں خود کلیسا اپنی حیرت انگیز تبلیغ۔ اپنے نبی الشان مقدس۔ اپنی بے پایاں خیر و برکت، اپنے ہمہ گیر اتحاد اور اپنی

غیر متزلزل استقامت سے اس دعویٰ کی تائید کر رہا ہے کہ وہ ایمان و ایقا کا حقیقی و اصلی مرکز ہے اور بلا خوف تردید اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ اس کی ماوریت مغایب اللہ ہے۔ اس طور پر کلیسا اپنے بچوں کو بتاتا ہے کہ ان کا ایمان ایک نہایت معکم بنیاد پر قائم ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت میں جنہوں نے ایمان کی تائید آسمانی کی بدولت کیتھولک مذہب قبول کر لیا ہے اور ان لوگوں کی حالت میں جنہوں نے عقل انسانی کو اپنا پیشوا قرار دے کر ایک جموٹا مذہب اختیار کر لیا زمین آسمان کا فرق ہے۔

”عقل اور ایمان کی حقیقت: اس کے علاوہ کلیسائے کیتھولک کا ہمیشہ سے عقیدہ ہے اور اب بھی ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں اور ہر قسم باعتبار اپنی اصل اور غایت کے ایک دوسری سے مختلف ہے۔ اختلاف اصلی تو اس لحاظ سے ہے کہ ایک بذریعہ عقل فطری معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا بذریعہ ایمان اور اختلاف غایت اس اعتبار سے ہے کہ علاوہ ان حقیقتوں کے جن کا انکشاف عقل فطری کی وساطت سے ہو سکتا ہے۔ ہمارے ایمان کے ساتھ ان اسرار و غوامض کو پیش نظر کیا جاتا ہے جن کا راز سربستہ خدا ہی کو معلوم ہے اور تاوقتیکہ وہی ان کو بذریعہ الہام ظاہر نہ کرے ان کی حقیقت کا علم ہم کو نہیں ہو سکتا۔

”اس میں شک نہیں کہ اگر عقل ایمان کی روشنی سے منور ہو اور اپنی تلاش و جستجو میں استقامت و رزانت سے کام لے تو وہ خدا کی عنایت سے جو وسط ان اشیاء کے تمثیل کے جو قدرتی طور پر معلوم ہیں اور جو اس تعلق کے جو اسرار و غوامض متذکرہ کو ایک دوسرے کے ساتھ اور انسان کی عاقبت کے ساتھ ہے ان اسرار و غوامض کی کنہ تک ایک محدود مگر بدرجہ غایت مفید پیرایہ میں پہنچ سکتی ہے۔ لیکن محال ہے کہ عقل کبھی بھی ان اسرار و غوامض کو کامل طور پر ان حقائق کی طرح سمجھ سکے جو اس کا موضوع اصلی ہیں اس لئے کہ خدا کے بعید اپنی نوعیت کے اعتبار سے عقل حادث و مخلوق کی رسائی سے اس قدر دور ہیں کہ الہام کی تلقین اور ایمان کی تصدیق کے بعد بھی ان پر ایمان ہی کی نقاب پڑی رہتی ہے جو اس وقت تک نہیں اٹھتی جب تک کہ مرغ روح نفس عصری سے آزاد نہیں ہو لیتا۔

لیکن اگرچہ ایمان برتر از عقل ہے تاہم ان دونوں میں حقیقی تقاض کبھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جو خدا انکشاف اسرار اور سرچشمہ ایمان ہے وہی روح انسانی کو عقل کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ خدا اپنی تردید آپ نہیں کر سکتا اور ایک حقیقت دوسری حقیقت کی ضد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر عقل و ایمان میں ظاہر بینوں کو تقاض نظر آئے تو اس کی مثال

بالکل سراب کی سی ہے جو فریب نظر کا کرشمہ ہے۔ ایسے تناقض کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یا تو ایمان کی حقیقت اس طور پر نہیں سمجھی اور سمجھائی گئی جس طرح کلیسا دراصل اسے سمجھتا ہے اور یا بعض لوگوں کے یہودہ راہوں اور جیلوں کو لفظی سے متقنیات عقل کا مترادف خیال کر لیا جاتا ہے۔ پس ہم ہر اس ادعا کی نسبت باطل ہونے کا فتویٰ صادر کرتے ہیں جوہ ایمان کی روشن حقیقت کی ضد ہے۔ مزید برآں کلیسا کو جو تبلیغ کے رسولی منصب کے علاوہ ایمان کی حفاظت و صیانت کی خدمت پر بھی مامور ہے یہ اقتدار بھی منجانب اللہ حاصل ہے بلکہ یہ بات منجملہ اس کے ربانی فرائض کے ہے کہ علم باطل کو حرام قرار دیا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ فلسفہ اور تزویر کے دام میں گرفتار ہو جائیں۔ اسی لئے تمام ایمان والے مسیحیوں کو بہ تنقید فہمائش کی جاتی ہے کہ نہ صرف ان آرا کی حمایت سے مطلقاً "اباکریش" جو سائنس کے جائز مسلمات سمجھے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں عفاۃ الایمان ہیں اور کلیسا نے خصوصیت کے ساتھ انہیں عقائد فاسدہ کی فہرست میں داخل کر دیا ہے بلکہ ان کا یہ فرض ہے کہ ایسی آرا کو منجملہ ان غلطیوں کے تصور کریں جنہوں نے سچائی کی فریب وہ شکل اختیار کر رکھی ہے۔

”نہ صرف یہ بات ناممکن ہے کہ عقل اور ایمان میں متخالف واقع ہو بلکہ وہ اور الٹا ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ یعنی ادھر تو عقل سلیم ایمان کی بنیاد قائم کرتی ہے اور ایمان کی مشعل ہاتھ میں لے کر حقائق آسمانی پر روشنی ڈالتی ہے اور ادھر ایمان عقل کو غلطیوں میں مبتلا ہونے سے بچاتا ہے اور انواع و اقسام کے معارف و حقائق سے اس کے سرمایہ ادراک میں اضافہ کرتا ہے۔ پس کلیسا انسانی علوم و فنون کا مخالف نہیں ہے بلکہ ان کا حامی و موید ہے۔ وہ ان فوائد سے بے خبر نہیں ہے جو علوم و فنون کی بدولت انسان کو حاصل ہیں اور نہ وہ ان فوائد کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بخلاف اس کے اس کو اس امر کا اعتراف ہے کہ چونکہ ان علوم و فنون کا ماخذ خدا ہے جو مالک علم ہے لہذا اگر ان سے صحیح صحیح طور پر فائدہ اٹھایا جائے تو ان کا اکتساب تائید ایزدی سے موجب یزداں شناسی ہو گا۔ کلیسا اس بات کی بھی ممانعت نہیں کرتا کہ یہ علوم اپنے اصول اور طریقوں سے اپنی اپنی جائز حدود کے اندر کام نہ لیں لیکن اس واجبی آزادی کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی کلیسا اس احتیاط کو بھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا کہ کہیں یہ علوم تعلیم ربانی کی نفی کرنے سے غلطیوں میں نہ پڑ جائیں اور اپنی جائز حدود سے متجاوز ہو کر ایمان کا شیرازہ نہ بکھیر دیں۔

”ایمان کی ملم من الہی کسی فلسفیانہ اکتشاف کی طرح انسانی عقل کے ذریعہ سے حد کمال کو پہنچنے کی محتاج نہیں ہے بلکہ ایمان کو کامل و مکمل شکل میں ودیعت مسیح یعنی کلیسا کے حوالے کر دیا گیا ہے تاکہ جان سپاری کے ساتھ اس کی حفاظت کی جائے اور پاک اور بے لوث صورت میں اس کی اشاعت کی جائے۔ اسی لئے دین مقدس کے کل مسائل کے معانی کلیسا کے مفہوم کے لحاظ سے بیان کئے جانے چاہئیں اور یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ مفسرانہ وضاحت کے بہانہ سے ان معانی میں کوئی ترمیم یا تصرف روا رکھا جائے۔ پس صدیوں کی بباط کے اٹھنے اور انسان کی متواتر نسلوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ عقل و فہم اور علم و دانش کی سریلج السیر ترقی اشخاص کے لئے منفوا“ اور کلیسا کے لئے مجتمعا“ جائز قرار دی جاتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ ترقی اعتبار قسم اپنی حد سے متجاوز نہ ہو یعنی مسائل ایمان کے مفہوم و معانی و عقیدہ میں کسی قسم کی خارجی آمیزش نہ ہونے پائے۔“

منجملہ دیگر ادا مروتواہی کے حسب ذیل امور بھی منہیات میں داخل کئے گئے۔

”لعنت ہو اس پر:

”جس کا یہ ایمان نہیں ہے کہ خدائے برحق ایک ہے جو تمام دیکھی اور ان دیکھی چیزوں کا خالق اور مالک ہے۔

”جو شوخ چٹھی کی راہ سے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ بجز ماہ کے اور کسی شے کا وجود نہیں

ہے۔

”جو یہ کہتا ہے کہ ذات باری اور باقی تمام اشیا لمجاظ جوہر ترکیبی واحد العنصر و

مشترک الاصل ہیں۔“

”جو یہ کہتا ہے کہ موجودات جسمانی و روحانی جن کی ہستی محدود ہے یا کم از کم

موجودات روحانی کا مخرج جو ہر ذات باری ہے یا یہ کہ جوہر ربانی اپنے ہی مظاہر یا اپنی ہی

ترقی یافتہ شکل کے ذریعہ سے کائنات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔“

”جس کو اس حقیقت کا اعتراف نہیں ہے کہ خدا نے کون و مکان کو نیست سے

ہست کیا۔“

”جس کا یہ قول ہے کہ انسان اپنی ذاتی کوششوں سے بذریعہ ارتقاء جاری بالاخر حق

و خیر کو دریافت کر سکتا ہے اور اسے ایسا کرنا چاہئے۔“

”جو کتب مقدسہ کو مٹرنٹ کی مقدس کونسل کی توفیح کے مطابق کلا“ یا جزا“ مقدس

اور مدارِ حجتِ شرمیہ ماننے سے انکار کرتا ہے یا ان کے الہامی ہونے سے منکر ہے۔
 ”جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ عقل انسانی اس درجہ آزاد و مطلق العنان ہے کہ خدا اس سے پابندی ایمان کا خواہاں نہیں ہو سکتا۔“

”جس کا یہ قول ہے کہ الہام ربانی خارجی شادتوں کی بنا پر قرین اعتبار و مفید یقین نہیں ہو سکتا۔“

”جو یہ کہتا ہے کہ معجزے نہیں ظاہر کئے جاسکتے یا یقین کے ساتھ ان کا کبھی علم نہیں ہو سکتا اور مسیحیت کا سادی الاصل ہونا ان کے ذریعہ سے کبھی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔“
 ”جو یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ الہام ربانی غرض اسرار سے عاری ہے اور جملہ مقدمات تربیت یافتہ عقل کی مدد سے سمجھ میں آسکتے اور ثابت کئے جاسکتے ہیں۔“

”جس کا یہ اعتقاد ہے کہ علوم انسانی کی تحصیل میں اس درجہ آزادی سے کام لینا چاہئے کہ ہر شخص ان کے ادعا کو صحیح باور کرنے کا مجاز ہو خواہ ایسے ادعا الہامی تعلیم کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو۔“

”جو اس بات کا قائل ہے کہ ممکن ہے کہ ترقی سائنس کے دور میں ایک زمانہ ایسا آئے جب کہ کلیسا کے مقدمات کا مفہوم اس مفہوم سے بالکل ہی بدل جائے جس کے لحاظ سے کلیسا نے آج تک ان مقدمات کی تاویل کی ہے۔“

یہ فیصلہ جات و فتاویٰ جن عجیب و غریب بلکہ جن بے باکانہ و شوق چشمانہ دعاوی پر متضمن ہیں انہیں تعلیم یافتہ اور روشن خیال کیتھولک جماعت استحقاق و اطمینان کی نظر سے نہ دیکھ سکی۔ جرمن یونیورسٹیوں کی طرف سے تو ان دعاوی کی دل کھول کر مخالفت کی گئی اور جب ختم سال پر ”وینٹیکن کونسل“ کے احکام عام طور پر تسلیم کر لئے گئے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ احکام مبنی بر صحت و صداقت ہیں بلکہ محض مودبانہ متابعت کے اقتضا سے۔

بست سے متقی و پرہیزگار کیتھولک علما کو اس تمام کارروائی اور اس کے نتائج پر کمال رنج و الوسوس ہوا چنانچہ ایک فرانسیسی پادری بیاسٹم اپنے طبقہ کے مقتدا کو ایک خط ان الفاظ میں لکھتا ہے: ”کلیسا کا جو ہمارا مبداء ایمان ہے انیسویں صدی کے تمدن سے جس کی ہم دنیوی اولاد ہیں اور جس کے بست سے فرائض و حقوق ہمارے ذمہ واجب الادا ہیں اس طور پر جدا کر دیا جانا ایک ایسا فعل ہے جس میں معصیت اور حماقت کی مسادی آمیزش پائی جاتی ہے اور میں اس افتراق کو بست ہی قابل ملامت سمجھتا ہوں۔ مجھے یقینِ دائم ہے کہ اگر لاطینی قوم میں عموماً اور فرانس کی آبادی میں خصوصاً ”تمدنی اخلاقی اور مذہبی بغاوت کی

اگل بھڑک اٹھی تو اس کی وجہ کیتھولک مذہب نہ ہو گا بلکہ کیتھولک مذہب کا طریقہ تاویل و طرز عمل ہو گا جس نے ایک مدت سے اس دین کی صورت مسخ کر رکھی ہے۔

باوجودیکہ جناب پاپائے مقدس کو معصوم ہونے کا ادعا تھا جس کے الفاظ دیگر یہ معنی تھے کہ آپ ہمہ واں و علام الغیوب ہیں پھر بھی آپ کی روح القدسی بصیرت جنگ فرانس و جرمنی کے نتیجہ کے متعلق پیش بینی نہ کر سکی۔ اگر آپ کو ملکہ نبوت عطا ہوا ہوتا اور غیب شناسی کی قابلیت آپ کے حصہ میں آئی ہوتی تو آپ پر اپنی کونسل کے اجتہادات کی غیر موزونی و موقع ناشناسی کی حقیقت کھل گئی ہوتی لیکن کہاں کی عصمت اور کہاں کی نبوت۔ یہاں تو مطلب سعدی کچھ اور ہی تھا۔ پاپا کی اس درخواست کو کہ اس کے دیوبی اقتدار کے برقرار رکھنے کے لئے کچھ فوج بطور کمک بھیجی جائے شاہ جرمنی نے رد کر دیا۔ خارج الکیسا شاہ اٹلی نے روما پر قبضہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ پاپا نے جھنجھلا کر یکم نومبر ۱۸۷۰ء کو ایک مکتوب عمومی صادر کیا جس کی تہنی اور ترشی آج کل کی بین الاقوامی مراسلت کے مذہب اور شائستہ لہجہ کے ساتھ نسبت تضاد رکھتی ہے۔ اس مکتوب میں جناب تقدس ماب نے دربار پینڈانٹ کی کارروائی کو ہدف سام مطاعن و طاعن بتاتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کارروائی کے بانی مہانی اس فریق کے مشورہ پر کاربند ہوئے ہیں جس کے لئے سران اخروی مقدر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے کہ مابدولت حالت قید میں ہیں اور گروہ اشرار و شیاطین کے ساتھ کسی باب میں اتفاق نہیں کر سکتے۔ پھر اپنی مخالفین پر اخراج اکبر یعنی عدم شرکت کینسہ کی حد اخیر جاری کرتے ہوئے سب و شتم اور تادان و سزا کا انتہائی فتویٰ بھی صادر کیا ہے اور دوشیزہ مریم مادر خدا اور مرسلین مقدس پطرس و پاولس کی شفاعت کے خواستگار ہوئے ہیں۔

مختلف پرائسٹ فرقوں میں سے بعض نے مجلس اتحاد انجیلی کے نام سے ایک انجمن بغرض صلاح و مشورہ قائم کر لی تھی۔ اس مجلس کا آخری اجلاس ۱۸۷۳ء کے موسم خزاں میں بمقام نیویارک ہوا۔ اگرچہ اس موقع پر یورپ اور امریکہ کے پرائسٹ کلیساؤں کے بہت سے زاہد و متقی و کلا جمع ہوئے تھے لیکن وقت و سطوت کے اعتبار سے اس مجلس کو اس عظیم الشان مجلس سے کوئی نسبت نہ تھی جس کا اجلاس کلیسائے سینٹ پیٹر واقع روما میں اس سے کچھ ہی دن پہلے منعقد ہو چکا تھا۔ مجلس اتحاد انجیلی اپنے ہزار سالہ شجرہ نسب کے مقدس تسلسل کا حوالہ نہ دے سکتی تھی اور اس حیثیت سے اپنے دعادی نہ پیش کر سکتی تھی کہ گویا وہ تاجداروں اور تخت نشینوں کی سیم و عدیل بلکہ ان سے بھی بالا و برتر ہے۔

و-ٹیکن کونسل کی کارروائی کے ہر پہلو میں دانشمندانہ تدبیر اور دعویٰ حکمت عملی کی شان نظر آتی تھی لیکن مجلس اتحاد انجیلی کے پیش نظر جو مقاصد تھے وہ وضاحت اور تعین سے معرا تھے اور کوئی خاص غایت اس کے انعقاد کا نصب العین نہ تھی۔ اگرچہ اس مجلس کی خواہش یہ تو ضرور تھی کہ مختلف پرائسٹنٹ کلیساؤں کا اتحاد زیادہ کامل و مکمل ہو جائے لیکن اسے قوی امید نہ تھی کہ یہ دل پذیر خواہش پوری ہو سکے گی۔ پرائسٹنٹ کلیساؤں کے وجود میں آنے کا باعث نا اتفاقی اور ان کے قیام کا مدار اختراق پر تھا۔ اس مجلس نے اسی اصول کو عملی طور پر ثابت کر کے دکھا دیا۔

پھر بھی مجلس اتحاد انجیلی کی کارروائی میں بعض نکتہ آموز و معنی خیز واقعات شامل ہیں یعنی اس نے اپنے اس دیرینہ حریف کو جس نے ابھی حال ہی میں واقعہ اصلاح کو مورد مطالعہ ناروا و ملامت نامزایا تھا نظر انداز کر کے و-ٹیکن کونسل کی طرح اپنی نگاہ سائنس پر جمادی۔ سائنس کے ہیبت ناک نام کی آڑ میں اس کے سامنے گویا ایک ایسا مجملہ الہیت دیو کھڑا تھا جو ہر ساعت بڑھ رہا تھا اور جس کی شکل نہایت ہی ڈراؤنی تھی۔ اس عظیم الجثہ و قوی پیکل دیو سے خطاب کرتے وقت مجلس اتحاد انجیلی نے بعض دفعہ تو ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے تعلق و رواداری کی بو آتی تھی اور بعض دفعہ ایسا لہجہ اختیار کیا جو سرپا تریض و تشنہ تھا۔

مجلس اتحاد کو یہ نظر نہ آیا کہ موجودہ سائنس اور اصلاح کسبہ حقیقی ہی نہیں بلکہ توام بہنیں ہیں۔ بہن ارتقا میں ان کا ظہور ایک ہی وقت میں ہوا اور ان کی پیدائش کی ساعت بھی ایک ہی ہے۔ مجلس اتحاد نے یہ نہ دیکھا کہ اگرچہ متعارض و متخالف فرقوں کا حمہ ہونا محال ہے لیکن سائنس ایک ایسا نقطہ اتصال ہے جہاں یہ سب جمع ہو سکتے ہیں اور ان کا اصلی و حقیقی فائدہ اسی میں ہے کہ سائنس کو بے اعتباری کی نظر سے نہ دیکھیں بلکہ اس کے ساتھ مخلصانہ اتحاد قائم کریں۔

اب ہم کیتھولک مسیحیت کے دستور العقائد پر جس حیثیت سے کہ و-ٹیکن کونسل نے ان عقائد کی تعریف و توثیح کی ہے کچھ خیالات ظاہر کرتے ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک شے مختلف اشخاص کو ایک ہی حیثیت سے دکھائی دے تو ضرور ہے کہ اس پر ایک ہی پہلو سے نظر ڈالی جائے۔ جو مثال اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اہل مذہب اور اہل سائنس کے مقامات مشاہدہ بالکل الگ الگ ہیں۔ ایسی حالت میں دونوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ فریق

ثانی سے یہ خواہش ظاہر کرے کہ واقعات کی جو قطاریں صف بستہ اسے نظر آ رہی ہیں دوسرا فرق بھی ان کو دیا ہی تسلیم کرے۔

دستور العقائد کو اس اصول موضوعہ کے اعتراف پر اصرار ہے کہ کلیسائے روم مامور من اللہ ہے اور مامور من الہی کا یہ غلط بلا مساہمت و مشارکت امدے خاص طور پر اسی کو عطا ہوا ہے۔ اس ربانی اقتدار کی بنا پر اس کی یہ خواہش ہے کہ تمام لوگ معقولات میں اس کی متابعت اختیار کر لیں اور تمام اقوام اپنی ملکی حکومت کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دیں۔

لیکن ایسے زبردست اور پر شکوہ دعوے کے لئے دلیل بھی ایسی ہی زبردست اور پر شکوہ ہونی چاہئے اور ثبوت ایسا ہونا چاہئے جس کے ماخذ کی صحت پر کسی کو اعتراض کی مجال نہ ہو سکے اور یہ ثبوت ضمنی و بالواسطہ و غیر متعلق نہ ہو بلکہ صریحی و موجب و قاطع ہو۔ غرض یہ ثبوت ایسا ہو جس کی تردید ناممکن ہو اور جس کا توڑ نہ ہو سکے۔

لیکن کلیسا کا قول ہے کہ وہ اس بات کو جائز نہیں رکھ سکتا کہ اس کا دعویٰ عقل انسانی کی کسوٹی پر پرکھا جائے بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ دعوے بلاچوں و چرا و بے حیلہ و حجت فوراً بطور اصول ایمان تسلیم کر لیا جائے۔

اگر یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے تو اس کے باقی کے مطالبات بھی خواہ وہ کیسے ہی بے اندازہ کیوں نہ ہوں لامحالہ ماننے پڑیں گے۔

دستور العقائد نے عقل کا تحجید اور منتقصت کرنے میں عجب خود فراموشی سے کام لیا ہے یعنی اول تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ عقل امور ماہ البعث کا تعفیہ کرنے سے قاصر ہے اور اس کے بعد خود ہی ان امور کی تائید میں براہین و دلائل پیش کر کے عقل سے فیصلہ طلب کیا ہے۔ غرض دستور العقائد کیا ہے۔ ایک التجا نامہ ہے جس میں عقل سے بہ لجاہت یہ تمنا کی گئی ہے کہ اپنی تخلیط و تخمین کر کے کسی طرح رومانی نصرانیت کو سچا ثابت کر دے۔ جب مذہب اور سائنس کے اختلافی پہلو اس درجہ متباہن و متضاد ہیں تو ناممکن ہے کہ دونوں میں حقیقت اشیا کے اظہار کے متعلق تقابلی و توافق پیدا ہو سکے اور نہ اس وقت تک کوئی مشترک نتیجہ مترتب ہو سکتا ہے جب تک کہ ان دونوں کا حکم عقل کو نہ قرار دیا جائے اور اس کا قول فیصلہ نہ سمجھا جائے۔

دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں جن میں سے بعض رومانی نصرانیت سے زیادہ قدیم ہیں اور بعض کے پیروں کی تعداد اس کے پیروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں

بجز اس کے کہ عقل سے استصواب کیا جائے ان میں سے ایک کو دوسرے پر کس طرح ترجیح دی جا سکتی ہے۔ پس ضرور ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں اپنا اپنا دعوے عقل کے دربار میں پیش کریں اور جو کچھ عقل فیصلہ کرے اسے صحیح تسلیم کریں۔

لیکن پاپا کی کونسل کو اس سے سخت اختلاف ہے۔ وہ ایمان بالغیب کو عقل پر ترجیح دیتی ہے اور کہتی ہے کہ عقل و ایمان علم کی دو علیحدہ علیحدہ شاخیں ہیں۔ ایمان کا موضوع اسرار و غوامض ہیں اور عقل کا واقعات و حقائق۔ اس کا دعوے ہے کہ ایمان کو عقل پر فضیلت حاصل ہے اور جو طبیعتیں متذبذب متشکی ہیں ان کی تسکین وہ معجزوں اور پیشین گوئیوں کے ذریعہ سے کرنا چاہتی ہے۔

مخلاف اس کے سائنس ناقابل فہم امور سے روگردانی کر کے وکلف کے اس قول پر ٹکیہ کرتا ہے کہ ”خدا انسان کو ان باتوں پر ایمان لانے کے لئے مجبور نہیں کرتا جنہیں وہ سمجھ نہ سکے۔“ اور چونکہ اس کا حریف کوئی قابل اطمینان صداقت نامہ جس سے اس کا اعتبار قائم ہو سکے نہیں پیش کر سکا لہذا سائنس یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آیا پاپائیت کی تاریخ یا پاپاؤں کے حالات زندگی سے کوئی ایسی کیفیت مترشح ہوتی ہے جس سے معقول طور پر اس امر کی تصدیق ہو سکے کہ پاپا مامور من اللہ ہیں یا معصوم ہیں یا آنکھیں بند کر کے ان کے کہے پر اس حیثیت سے عمل کرنا واجب ہے کہ وہ نائب خدا ہیں۔

دستور العقائد میں ایک نہایت ہی نمایاں لیکن ساتھ ہی متناقض خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ اس نے عقل انسانی کے آگے طوعاً و کرہاً ”سر تسلیم خم کیا ہے۔ اس میں کیتھولک مذہب پر جہاں من حیث الاعتقالت نظر ڈال کر اس کا مبنی بر عقل ہونا ظاہر کیا گیا ہے وہاں عام متبذل مذہب کی کمرہ شکل پر پردہ بھی ڈال دیا گیا ہے۔ اس پر ائمہ کون و مکان جناب باری کی صفات ان الفاظ میں بیان کی گئی ہیں جن سے خدا کی شان جلال و جمالی موزوں طور پر آشکارا ہوتی ہے لیکن اس قول کے اعادہ سے احتراز کیا گیا ہے کہ یہ خدائے قہار و قہوم جس کا رعب کائنات پر چھایا ہوا ہے ایک مادر خاکی کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو ایک یہودی نجار کی بیامتا بی بی تھی اور اس کے بعد آسمان کی ملک ہو گئی۔ جس خدا کی تصویر اس میں کھینچی گئی ہے وہ قرون متوسط کا خدا نہیں ہے جو ملائکہ کے ایک گروہ سے گھرا ہوا اپنے سونے کے تخت پر جلوہ گستر ہے بلکہ قلعہ کا خدا ہے۔ دستور العقائد میں نہ اقاہیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ نہ مریم عذرا کے اس استحقاق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسے معبود ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے بلکہ نمنا ”و کنا۔۔۔ اس استحقاق کی سختی سے نفی

کی گئی ہے۔ نہ عشاءِ ربانی یعنی پادری کے کیمیائی عمل سے شراب اور روٹی کو خدا کے خون اور گوشت کی شکل میں بدلنے کا حوالہ دیا گیا ہے اور نہ اولیاءوں سے مرادیں مانگنے کے وجوب و حقیقت پر زور دیا گیا ہے۔ غرض اس کے ماتھے پر زمانہ موجودہ کے تخیل کی تقلید اور عقل انسانی کی ترقی کے آثار کا عیاں لگا ہوا ہے۔

ذات و صفات باری کی اس تشریح کے بعد دستور العقائد نے اس مسئلہ کی تلقین کی ہے کہ انتظام کائنات کیونکر چل رہا ہے۔ کلیسا کا دعویٰ ہے کہ اسے تمام مادی و اخلاقی حوادث پر ماوراء الطبیعی دسترس حاصل ہے۔ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے پادری یا تو اس قسمی قوت کے زور سے جو ان کی جبلت میں ودیعت کی گئی ہے اور یا آسمانی طاقتوں کو دعاؤں کے ذریعہ سے اپنا مددگار بنا کر واقعات آئندہ کو اپنی خواہش اور ارادہ کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ پاپائے اعظم کا ارادہ مصدر بست و کشاد ہے اور اسے حل و عقد کی پوری قدرت حاصل ہے۔ اس کا فیصلہ ناطق اور اس کا فرمان قضا تو اماں ہے۔ اس فیصلہ کی ناراضی سے کسی مجلس عمومیہ میں اہل دائرہ کرتا اور اس طور پر گویا یہ ظاہر کرنا کہ کوئی دنیوی طاقت پاپا سے بھی اعلیٰ و ارفع ہو سکتی ہے بالکل ناجائز ہے۔ اس قسم کے اقتدارات پر ایک مطلق العنان اور غیر آئینی حکومت میں تو شاید اعتراض نہ ہو لیکن جس حکومت کا نظم و نسق قانون غیر حقیر پر مبنی ہو اس میں ان کو مطلق دخل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دستور العقائد نہایت زور سے یہ دعویٰ پیش کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے نظم عالم میں مسلسل دست اندازیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کو ہرگز اس حقیقت کا اعتراف نہیں ہے کہ واقعات قدرت میں ایک غیر ممکن الاندفاع توازن اور محاطات انسانی میں ایک ناقابل تغیر تسلسل پایا جاتا ہے۔

لیکن ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا دنیا کے ہر حصہ میں نظام تمدن کی ترتیب یکساں نہیں پائی جاتی رہی؟ کیا انسانی جماعتوں کا نشوونما افراد کے نشوونما کے مشابہ نہیں ہے؟ کیا دونوں کو شباب بلوغ اور انحطاط کے مدارج نہیں طے کرنے پڑتے؟ کیا وہ شخص جس نے دنیا کے مختلف ممالک کی آبادیوں کی رفتار تمدن پر غور کیا ہے اور ان ایک سی حالتوں کو مشاہدہ کیا ہے جو اس تمدن کی ترقی کا باعث ہوئی ہیں صاف نہیں معلوم کر سکتا کہ یہ ارتقا پابند قانون ہے؟ بیرو کی قوم اٹکا اور فرماں روایان میکسیکو کے مذہبی خیالات اور ان فرماں رواؤں کے آداب و مراسم دوبارہ دہی تھے جو ایک زمانہ میں یورپ میں پائے گئے۔ وہی تھے جو ایشیا میں پائے گئے۔ یعنی ان سب کا رجحان خیال ایک ہی طرف تھا۔ اور ان سب کی ترقی کے

دہارے کا رخ ایک ہی جانب تھا۔ شہد کی مکھیوں کے ایک انبوہ کو اگر ان کے وطن سے کسی دور دراز سرزمین میں منتقل کیا جائے تو ان کے چھتے کی ساخت اور ان کا طرز معاشرت اسی ایک طریقے کا پابند ہو گا جس کو مکھیوں کے دوسرے نامعلوم انبوہ اختیار کریں گے۔ یہی حال بے تعلق اور دور افتادہ انسانی جماعتوں کا ہے۔ خیال اور فعل کا یہ تعلق و توازن اس درجہ غیر متغیر ہے کہ بعض فلاسفہ تاریخ ایشیا کی مثالوں کو یورپ پر منطبق کر کے بلاتامل یہ دعویٰ پیش کرنے کو تیار ہوں گے کہ اگر اسقف روما ہو اور چند صدیاں ہوں تو ایک غیر خاظمی پایا خود بخود پیدا ہو جائے گا اور اگر ایک غیر خاظمی پایا پر کچھ اور مدت مستزاد کی جائے تو لامائیت نمودار ہو گی وہ لامائیت جسے ایشیا کبھی کا حاصل کر چکا ہے۔

موجودات روحانی و جسمانی کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے دستور العقائد نے اپنے اقوال کو ان لوگوں پر تہرا کرنے سے شان تاکید و تائیس عطا کی ہے جو مسئلہ انفصال کے قائل ہوں یعنی یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ مظاہر قدرت محض ذات باری کے ہیں۔ دستور العقائد کا مسودہ مرتب کرنے والوں نے ان عقائد کی تکفیر کرنے کو تو کر دی لیکن جو مشکل اس مرحلہ میں انہیں درپیش تھی وہ ایسی نہ تھی جس کا باسانی مقابلہ کیا جاسکے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ ان پرانے یا نئے زبردست خیالات کی صفیں ان کے مقابل معرکہ آرا نہ ہوتیں جو موجودہ زمانہ میں ارباب فکر و دانش پر اپنا قوی اثر ڈال رہے ہیں۔ اصول بقا و تناسب قوت کا منطقی نتیجہ مشرق کے فرسودہ و پیش پا افتادہ مسئلہ انفصال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور مسئلہ ارتقا و مسئلہ نشوونما علی سبیل التدرج اس عقیدے کی بیخ کنی کر رہے ہیں کہ موالید کی پیدائش وقتاً فوقتاً عمل میں آئی۔ مسئلہ اول الذکر اس اصولی نکتہ پر مبنی ہے کہ کائنات میں قوت کی مقدار غیر متغیر ہے۔ اگرچہ یہ مقدار گھٹ بڑھ نہیں سکتی لیکن ان اشکال کا جن کے ذریعہ سے یہ قوت اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے ایک دوسری میں استحالہ ہو سکتا ہے۔ ابھی تک اس نظریہ کو سائنس نے کامل اور بدیہی طور پر ثابت نہیں کیا لیکن جو دلائل اس کی تائید میں پیش کئے گئے ہیں وہ کثیر التعداد ہونے کے علاوہ اس درجہ قوی ہیں کہ اس کے معکم و متحد ہونے کا خواہی خواہی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اب اگر ایشیائی مسئلہ انفصال و انجذاب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو اس متمم بالشان نظریہ کے ساتھ توافق ہے۔ اس مسئلہ کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ جب انسانی ہستی ملب سے بدن میں منتقل ہوتی ہے تو خدا ایک نئی روح کو عدم سے وجود میں لا کر اس میں پھونک دیتا ہے بلکہ وہ اس بات کے متفق ہیں کہ عقل ربانی یا عقل کل پہلے سے موجود ہے اس کا ایک حصہ انسان کے جسم میں ڈال دیا جاتا ہے اور جب اس کی زندگی کے دن

پورے ہو جاتے ہیں تو یہ حصہ اسی سرچشمہ حیات میں واپس جا کر مل جاتا ہے جس سے نکلا تھا۔ دستور اعتقاد کے مصنفین کے نزدیک یہ عقائد فاسد ہیں اور وہ ان کی پیروی کی یہ کہہ کر ممانعت کرتے ہیں کہ ایسے عقائد رکھنے والا شخص جتلائے عذاب ابدی ہو گا۔

علیٰ ہذا القیاس انہوں نے ارتقا اور نشوونمائے جاری کے مسائل کی بہ یک کشش قلم یہ کہہ کر تردید کر دی ہے کہ کلیسا کا عقیدہ یہ ہے کہ موالید کی پیدائش وقتاً فوقتاً ہوتی۔ یہ مسئلہ کہ ہر جاندار شکل کسی شکل سابقہ کا حاصل ہے سائنس کی رو سے قوت واپس مسئلہ کی بہ نسبت زیادہ مدلل و مبرہن ہے اور جو اضافے حال میں اس پر ہوئے ہیں ان کا خواہ کچھ ہی حشر کیوں نہ ہو لیکن غالباً اصولی طور پر اس کی صحت اور درستی میں کوئی کلام نہیں۔

واقعہ اصلاح پر سب دشمن کی بوچھاڑ کرنے سے کلیسا نے اپنے ان خیالات کو گویا عملی لباس پہنا دیا ہے کہ عقل تابع ایمان ہے۔ اس کی نظروں میں اصلاح ایک طہرانہ بدعت ہے جس نے لوگوں کے لئے ہمہ اوست دہریت اور مانت کا دام خسران بچھا رکھا ہے اور جو اس بنیاد ہی کو ڈھا رہی ہے جس پر تمدن کا دارومدار ہے۔ اسی لئے اس نے ان شوخ اور بے چین طبیعت کے لوگوں کی بے راہ روی کا سدباب کرنا چاہا جنہوں نے بہ تقلید و تخریر یہ رائے قائم کی ہے کہ ”ہر شخص کو کتب مقدسہ کی تفسیر و تاویل کا ذاتی حق حاصل ہے۔“ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ پرائسٹوں کو کیتھولکوں کے برابر پولیٹیکل حقوق نہ ملنے چاہئیں اور جو شخص اس مساوات کا ادعا کرتا ہے وہ خبیث اور گمراہ ہے۔ اس کا یہ قول ہے کہ پرائسٹوں سے بہ جبر و تشدد پیش آنا اور ان کا استیصال کرنا ایک مقدس فرض ہے اور انہیں مدارس قائم کرنے کی اجازت دینا ایک قابل نفرت فعل ہے۔ پیپائے گرگوری شانزدہم نے آزادی ایمان کو ایک مجتہدانہ حماقت سے تعبیر کیا اور اخبارات کی آزادی کے متعلق یہ رائے ظاہر کی کہ اس سے بڑھ کر نابکار اور ناشدنی حرکت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

لیکن دریائے ٹائبر کے کنارے جو تقدس ماب بزرگوار غیب دانی کی کرسی پر جلوہ افروز ہیں ان کی ملم من اللہی و صحت عن الخطا کا قائل وہ شخص ہو تو کیوں کر ہو جس کو معلوم ہے کہ پیپاؤں نے ہمیشہ ایک دوسرے کی تقلید و تکذیب کی ہے اور پیپا اگر مجالس عمومیہ کے منہ آئے ہیں تو مجالس عمومیہ نے پیپاؤں کی خبر لی ہے اور جس سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے پیپائے سکسٹس خامس کی بائبل میں اتنی مسلمہ غلطیاں تھیں (کوئی دہ ہزار کے قریب ہوں گی) کہ اس نسخہ کے مرتب کرنے والوں کو اس کی اشاعت خود روک دینی پڑی؟ کس طرح ممکن ہے کہ ارباب کلیسا ان حقائق کو ”فریب وہ غلطیاں“ قرار دیں کہ زمین

کردی اٹھل ہے۔ نظام شمسی کا ایک رکن ہے اپنے محور پر گھومتی ہے اور آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے؟ وہ اس واقعہ سے کیوں کر انکار کر سکتے ہیں کہ زمین کے حصہ مقابل پر بھی انسان آباد ہیں اور ہماری دنیا کے علاوہ اور بھی دنیاں موجود ہیں؟ ان دعاوی کو وہ کن دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں کہ دنیا عدم سے وجود میں لائی گئی اور ایک ہفتہ کی مدت میں اس کھل شکل میں جو ہمارے پیش نظر ہے بنائی گئی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اس کے اجزا ایسے ناقص اصل ہیں کہ خدا کو ان نقائص کی تلافی و اصلاح کے لئے مسلسل دست اندازی و مداخلت کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔

جب پادری سائنس کو حکم دیتے ہیں کہ اپنے عقلی معتقدات کی سپر پیچیک دے تو کیا سائنس کو ان سے ان الفاظ میں مخاطب ہونے کا حق نہیں ہے کہ ذرا اپنے تاریخی گریبان میں حافظہ کا منہ ڈال کر تو دیکھیں؟ جب زمین کی شکل اور ہشت و دونخ کے مواقع کی بحث چھڑی تو پادریوں ہی کو نیچا دیکھنا پڑا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ زمین ایک سطح میدان ہے اور آسمان ہشت کا صحن ہے جس کی راہ سے انسان ہشت میں داخل ہوتے ہوئے بکرات و مرآت دیکھے گئے ہیں لیکن دعویٰ غلط اور باطل ثابت ہوا۔ زمین کا کردی اٹھل ہونا علم ہیئت کے واقعات اور میکینک کے جہاز کے سفر سے بہ دلائل قاطع ثابت ہو گیا۔ اس کے بعد پادریوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ زمین کائنات کا مرکزی جسم ہے۔ تمام اجرام سماوی اس کے تابع ہیں اور یہ خدا کی عنایات و افضال کی مورد خاص ہے۔ جب اس خیال کی بھی عقلی کھل گئی تو انہوں نے اس ادعا کی آڑ میں جا پناہ لی کی زمین غیر متحرک ہے اور آفتاب و ثوابت جو بظاہر اس کے گرد حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں حقیقت میں بھی گردش کرتے ہیں۔ لیکن جب دور بین کی ایجاد نے اس بوسیدہ طلسم کو بھی توڑ دیا تو پادریوں نے یہ کتنا شروع کیا کہ نظام شمسی کی حرکات کا دار و مدار مداخلت ربانی پر ہے اس قول کو نیوٹن کی کتاب ”پرنسپا“ نے یہ ثبوت دے کر جھٹلایا کہ نظام شمسی کے ارکان کی حرکتیں قانون غیر ممکن التعمیر کی تابع ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے یہ دعویٰ پیش کیا کہ زمین اور تمام اجرام سماوی آج سے کوئی چھ ہزار سال پہلے پیدا کئے گئے اور چھ دن میں نظام قدرت مرتب کر دیا گیا اور نباتات و حیوانات اور ان کی مختلف نوعیں روئے زمین پر آباد کر دی گئیں۔ جب شہادت مخالف کی گھنٹی کا وزن اس قدر بڑھ گیا کہ پادریوں کی منطق کی کمر دہری ہو گئی تو انہوں نے بدرجہ مجبوری تاویل کا پہلو اختیار کیا اور دنوں کو قرون میں تحویل کر دیا لیکن یہ حیلہ بھی کارگر نہ ہوا۔ چھ قرون اور چھ خاص پیدائشوں کا خیال اس اکتشاف کے سامنے نہ ٹھہر سکا کہ حیوانات کی نوعیں بتدریج ایک دور میں نمودار ہوئے اور دوسرے دور میں

مستہائے بلوغ کو پنچیس اور تیسرے دور میں رفتہ رفتہ فنا ہو گئیں۔ اس انطباق قرونِ داود اور کاوا تر نہ صرف پیدائش بلکہ پیدائش مکرر کا متقاضی ہے۔ پادریوں کو اس قول پر اصرار تھا کہ دنیا میں ایک ہمہ گیر طوفان آیا تھا جس کی موجیں اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چھا گئی تھیں اور یہ پانی ایک تند ہوا کے چلنے سے خشک ہوا تھا۔ جب کہ ہوا اور سمندر کے عمق کے صحیح حالات معلوم ہوئے اور عملِ تنجیر کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو گیا تو طوفان والا بیان بھی دھوکسلا ثابت ہوا۔ نسلِ انسانی کے اولین موروثوں کے متعلق پادریوں کا یہ بیان تھا کہ خدا نے انہیں جسمانی و دماغی ہر اعتبار سے کامل بنایا لیکن بعد میں وہ اس ذوقِ کمال سے بچنے لگے۔ اس بیان کا بھی وہی حشر ہوا جو دوسرے بیانات کا ہوا تھا۔ چنانچہ اب پادریوں کو یہ فکر پڑی ہوئی ہے کہ زمانہ قبل تاریخ کے انسان کی وحشیانہ حالت کے ثبوت میں شہادت کا جو روزافزون انبار جمع ہو رہا ہے اس سے عمدہ برا ہونے کی کیا سبیل اختیار کی جائے۔

جب حالت یہ ہو تو اس میں کوئی تعجب کی بات ہے کہ ان لوگوں کی تعداد جو کلیسا کے معتقدات کو ہزلیات و شططیات سمجھنے لگے ہیں روز بروز بڑھتی جائے؟ کیوں کر ممکن ہے کہ اس مذہب کو جو دیکھی اور بوجھی ہوئی چیزوں کے متعلق ایسی فاش غلطیوں میں مبتلا ہے ان دیکھی اور ان بوجھی حقیقتوں کا کتہ آموز تسلیم کر لیا جائے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ مذہب جو جسمانیات میں ناکامیاب ہوا ہے اخلاقیات اور روحانیات میں کامیابی کے ساتھ مقتدا و پیشوا ہو سکے؟ کلیسا نے سائنس اور مذہب کے ان اختلافات کا تخلیہ ازراہ استحقار یہ کہہ کر کرنا چاہا ہے کہ ”انہیں فریبِ نظر سمجھنا چاہئے۔“ ”یہ بیہودہ چلے ہیں۔“ ”یہ جہل علم نما کے مصنوعی کرشمے ہیں۔“ (یہ غلطیاں ہیں جنہوں نے اپنے چہرے پر حقیقت کا نظر فریبِ غاڑہ مل رکھا ہے۔“ لیکن کہیں اس قسم کے جملے فہم و اس سے بھی کام چلا ہے۔ سائنس کے حقائق وہ غرر اور عادل گواہ ہیں جو قیست کے لئے صحت کا بلاخوف تردید ابطال کر رہے ہیں اور پادریوں کی آنکھوں کے سامنے ان کی جہالت اور کو رسواوی کا مجسمہ پیش کر رہے ہیں۔

اتنی بہت سی خطاؤں اور لغزشوں کے ارتکاب کی قصوروار ٹھہر کر اب پاپائیت میں اتنا دم نہیں کہ بیانِ صفائی پیش کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے اب یہ رویہ اختیار کر لیا ہے کہ جہاں سائنس کا نام آیا اور وہ ایسی انجان بنی کہ گویا اس سے کبھی کی جان پہچان ہی نہ تھی اور طرہ یہ ہے کہ اس پر بھی دیدہ دلیری کی شان اسی آن بان کے ساتھ قائم ہے۔ باوجودیکہ واقعات کی قطاریں اس کی تملیط۔ تسفید۔ تھذیب و تعمیق کرنے کے لئے مقابل

میں صف بستہ کھڑی ہیں پھر بھی وہ برابر اپنی ضد پر قائم ہے اور معصوم ہونے کی وہی ایک بڑھانے جاتی ہے۔

لیکن پیپا کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسے بجز ان حقوق کے جنہیں وہ از روئے عقل ثابت کر سکے اور کوئی حقوق نہیں عطا کئے جاسکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مذہبی معاملات میں تو معصوم ہونے کا دعویٰ کرے اور علمی امور میں جب عصمت کا ذکر آئے تو ہاتھ کالوں پر دھرے۔ عصمت عن الخلق جملہ امور پر حاوی ہے۔ اس سے مراد ہمہ دانی و ہمہ شناسی ہے۔ اگر دینیات و الہیات پر اس کا اطلاق صحت کے ساتھ ہو سکتا ہے تو سائنس پر بھی ہونا چاہئے۔ مگر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ پیپائیت کی مسلمہ اجتہادی خطاؤں کو اس کے دعوائے عصمت کے ساتھ تطبیق دی جاسکے۔

جب پیپا کا معصوم اور خطا سے مبرا ہونا ایک دعوئے بلا دلیل و قیاس بے بنیاد ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کے اس مطالبہ کو رد نہ کر دیا جائے کہ پیپائی عقائد کی اشاعت و نفاذ میں جبر کا استعمال روا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اس قول کی سختی کے ساتھ تردید نہ کی جائے کہ بوجہ بد اعتقادی کے جس کی زمانہ میں عام ہوا چل رہی ہے محکمہ احتساب عقائد کا قیام لازمی و ضروری ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ فطرت انسانی کی دہائی دے کر اس محکمہ کی وحشیانہ سفاکی اور جابرانہ تحریف سے علی روس الاشاد بیزاری کا اظہار نہ کیا جائے؟ کیا ایمان یا ضمیر یا معیئرہ کو تمام دنیا کے مقابلہ میں ناقابل اعتدال حقوق حاصل نہیں ہیں؟

کیتھولک مذہب اور زمانہ کے رجحان خیال کے درمیان ایک ایسا ناقابل عبور دریا حائل ہو گیا ہے جس کا پائ لکھ بلعطلہ زیادہ چوڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اس مذہب کو اس امر پر اصرار ہے کہ کورا نہ ایمان عقل پر ترجیح رکھتا ہے اور واقعات کے مقابلہ میں اسرار و ادہام زیادہ وقعت کے قابل ہیں۔ اس کو یہ دعویٰ ہے کہ حقائق فطرت کے کشاف اور حقائق الہامی کے مستحضر ہونے کا حق بجز اس کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ وہ کتب مقدسہ کے متعلق اس رائے کے تسلیم کرنے سے اعراض کرتا ہے جو موجودہ فن تنقید کے اصول کی رو سے ظاہر کی گئی ہو اور حکم دیتا ہے کہ بائبل کی آیات کے وہی معانی صحیح سمجھے جائیں جو مفسرین برٹش نے بیان کئے ہیں۔ وہ آزادی و حریت اور دستور و آئین کی نسبت اپنی فطرت کا اظہار علانیہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان مضمون کی خطا ناقابل درگزر ہے جو پیپا اور تمدن جدید کی باہمی مصالحت کو قرین امکان یا قرین صواب تصور کرتے ہیں۔

لیکن عقل جو آج کل کے تمدن کی علم بردار ہے پوچھتی ہے کہ اسے دنیوی پادریوں کی متبدیانہ خامہ فرسائی کا پابند کیوں بنایا جاتا ہے اور ان جاہل اور نکتہ ناشناس لوگوں کی

بادخوانی کے صحیح تسلیم کرنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے جن کے انجیلی کارنامے کلیسا کے قرون اولیٰ سے تعلق رکھتے ہیں؟ عقل کتنی ہے کہ اسے تھلید جامد اور اندھا دھند ایمان میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی بلکہ وہ ایسے ایمان کو بنظر اشتباہ دیکھتی ہے وہ چاہتی ہے کہ سچ اور جھوٹ کے امتیاز کے لئے قرین وثوق ہونے کا جو عام قاعدہ اس وقت مروج ہے اس میں اور زیادہ اصلاح ہو جائے۔ وہ ان مصنوعی روایتوں اور فرضی حکایتوں کو صحیح مان لینا اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتی جو محض پادریوں کی مقصد برآری کے لئے تصنیف کر لی گئی ہیں۔ وہ اس دلیل کو کہ چونکہ یہ قصص و روایات زمانہ قدیم سے چلے آتے ہیں لہذا ضرور صحیح ہیں پاور کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں پاتی اس لئے کہ اگر قدامت ہی معیار صحت ہو تو کلیسا کی روایات کے مقابلہ میں بت پرستی کی روایات بہت زیادہ قدیم ہیں۔ خود کلیسا کی درازی عمر کی وجہ رہائی حفاظت یا سادہ یا تائید نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے موم کی ناک بن کر اپنے آپ کو زمانہ کے ہاتھ کے حوالے کر دیا اور جدھر کی ہوا چلتی دیکھی ادھر کا رخ اختیار کر لیا۔ بدھ مذہب نصرانیت سے بھی بقدر کئی صدیوں کے زیادہ قائم ہے۔ تو کیا اس قدامت سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ اس کی روایات بمقابلہ نصرانیت کی روایات کے زیادہ صحیح اور زیادہ معتبر ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ کلیسا اس الزام سے اپنے آپ کو کسی طرح بری نہیں کر سکتا کہ اس نے اکثر موقعوں پر تاریخ میں دیدہ و دانستہ تدقین و تصرف سے کام لیا اور تاریخی واقعات کا اخفا عدا روا رکھا۔ اگرچہ کلیسا کا اخلاق اس جملہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقصد اگر مقدس ہو تو اس کی تکمیل کے ذرائع بھی خواہ وہ فی الحقیقت کیسے ہی نادر ہوں پاک ہو جاتے ہیں لیکن جو صورت یہاں بیان کی گئی ہے اس پر یہ اخلاقی مقولہ صادق نہیں آتا۔

غرض نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ رومانی نصرانیت اور سائنس کے پھر دان دونوں کے اجتماع کو اجتماع ضدین سمجھنے لگے ہیں۔ دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں یہ ضرور ہے کہ ایک کی جگہ دوسرا لے لے۔ بنی نوع انسان کو چاہئے کہ دونوں میں سے جس کو چاہیں پسند کر لیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی وقت میں دونوں اس پر متولی ہوں۔

کیتھولک نصرانیت اور سائنس کو اس جانفرسا زور آزمائی میں مصروف چھوڑ کر جب ہم پرائسٹنٹ نصرانیت اور سائنس کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مصالحت نہ صرف ممکن ہے بلکہ آسانی سے ہو سکتی ہے بشرطیکہ پرائسٹنٹ کلیساؤں کو اس اصول پر عمل کرنے کی توفیق ہو جو ان کو لوٹھر سے ترکہ میں ملا ہے اور جسے کئی سال کی جنگ و جدل نے موس و مرموص کر دیا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ

ہر شخص کتب مقدسہ کے مفسر ہونے کے اعتبار سے اپنا مجتہد آپ ہے۔ یہ اصول حجت عقلی کا سنگ بنیاد تھا۔ لیکن اگر آیات الہامی میں اجتہاد عقلی کو دخل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ محیفہ فطرت کے معانی سمجھنے میں اس حق سے کام نہ لیا جاسکے۔ جو غلط فہمیاں اب تک واقع ہوئی ہیں ان میں فطرت انسانی کی کمزوری کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ واقعہ اصلاح کینسہ کے بعد سالہا سال تک اگر لوگوں نے اس علت غائی کو جو محرک اصلاح ہوئی تھی پوری طرح نہ سمجھا اور ہمیشہ اس پر عمل نہیں کیا تو وہ قائل درگزر ہیں۔ کیلون نے جب سرویش کو زندہ آگ میں جلوا دیا تو وہ اصول جنہوں نے اس وحیانیہ کارروائی پر اسے آمادہ کیا اصلاح کے سکھائے ہوئے نہ تھے بلکہ کیتھولک نصرانیت سے اسے ترکہ میں پہنچے تھے اور وہ ان کی قید سے اپنے آپ کو پوری طرح آزاد نہ کر سکا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس ان ذی اثر پرائسٹ پادریوں پر بھی یہی قول صادق آتا ہے جنہوں نے علمائے طبعین کو کافر و زندیق ٹھہرایا۔ کیتھولک نصرانیت اگر سائنس کے ساتھ صلح کرنی چاہے تو اس کے رستہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں موجود ہیں جو شاید رفع نہیں ہو سکتیں۔ لیکن پرائسٹ نصرانیت کا ملاپ سائنس کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ایک کو منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کینہ و عناد اور دشمنی و عداوت کی منازل ہفت خواں طے کرنی پڑیں گی۔ دوسرے کو صرف وہ دوستی تازہ کرنی پڑے گی جس میں غلط فہمی کی وجہ سے فرق آگیا ہے۔

لیکن وہ عقلی خطرہ جو مسیحی دنیا میں بہت جلد نمودار ہوا چاہتا ہے خواہ ابتدا میں کیسے ہی نتائج کیوں نہ پیدا کرے لیکن اس میں تو شک نہیں کہ موجودہ نسل کا اس خطرناک طور پر چپکے چپکے مذہب سے قطع تعلق کرتے جانا ایک دن پولیٹیکل رنگ لا کر رہے گا۔ فرانس اپنی رعایا کے طبقہ سافل کے رومانی عقائد میں زیارات کی سرپرستی معجزات و کرامات کے صدور اور آسمانی نشانات کی نمائش کے ذریعہ سے ازسرنو جان ڈل رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ طرز عمل بے معنی نہیں ہے۔ اس کے مقدر کا لکھا ان مہملات میں حصہ لینے پر اسے مجبور کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کی جبین عقل عرق انفعال سے تر ہو ہو جاتی ہے۔ جرمنی نے قصہ کر لیا ہے کہ اطالوی عنصر کو خارج کر کے دو عملی حکومت کی قید سے آزاد ہو جائے اور اس اصلاح کو جسے تین سو سال قبل اس نے ناتمام چھوڑا تھا تکمیل کے درجہ کو پہنچائے۔ یہ قصہ بھی ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ وہ وقت قریب آگیا ہے کہ انسان جلد و غیر متحرک مذہب اور متحرک و متوازن سائنس میں سے جس کو چاہے اختیار کرے۔ یا تو مذہب کا دامن پکڑ لے جو سرمایہ تسکین ہونے کے اعتبار سے محض قرون متوسطہ کے ادہام کا مجموعہ رہ گیا ہے اور یا سائنس کے پیچھے ہو لے جو راہ زندگی کے قدم قدم پر برکتیں اور رحمتوں کے

موتی برساتا جاتا ہے انسان کو معاش کی معراج پر پہنچا رہا ہے اور بنی نوع انسان میں احماد کی روح پھونک رہا ہے اس کی فتوحات محکم و دیرپا ہیں۔ لیکن اس کامیابی کا نور جو کیتھولک نصرانیت کے ماتھے پر فلسفہ کے کھرانے کے بعد چمک سکتا ہے زیادہ سے زیادہ اس شباب طاقب کے آبی و عارضی اور بے سود دیے مصرف نور کے مشابہ ہے جو آسمان سے زمین پر آ کرتا ہے۔

اگرچہ گائیڈ کا یہ قول کہ کلیسا نے ہمیشہ جبر اور مطلق العنانی کا ساتھ دیا ہے بالکل سچ ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی حکمت عملی کی باگ سیاسی ضرورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ کلیسا جو کچھ کرتا ہے انیس صدیوں کے متفقہ دباؤ سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔ اس کے افعال میں تو شان مجبوری نظر آتی ہے ہی لیکن اس کی زندگی میں بھی اس قانون کی جھلک دکھائی دے رہی ہے جس کا عمل آج تک نہ ٹلا ہے نہ ٹلے گا یعنی پاپائیت کا بھی وہی حشر ہو رہا ہے جو ہر تنفس کا ہوتا ہے۔ اس نے اول شیر خوارگی و طفولیت کا مرحلہ طے کیا۔ اس کے بعد سن رشد و بلوغ کی منزل میں قدم رکھا اور جب جوش شباب کے ساتھ اس کی زندگی کا مقصد بھی ختم ہو چکا تو ضرور ہوا کہ یہ بدھاپے کی سرحد میں داخل ہو اور سال خوردہ و ناواں بڑھوں کی طرح اس کا مزاج چڑچڑا ہو جائے۔ اس کی جوانی تو پلٹ کر آنے سے رہی۔ باقی رہا اس کی یادگاروں کا اثر سو وہ البتہ قائم رہے گا۔ جس طرح بت پرست روم نے اپنا رخصتی سایہ سلطنت روم پر ڈال کر اس کی تعمیل کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا اسی طرح مسیحی روم اپنا آخری سایہ یورپ پر ڈال کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

کیا تمدن جدید اس ترقی کے عہد سے دست بردار اور کنارہ کش ہونے کے لئے رضامند ہو گا جس نے اس کی قوتوں اور خوشیوں میں اتنا بڑا اضافہ کیا ہے؟ کیا تمدن جدید رجعت قہقری کر کے قرون متوسطہ کی نیم وحیانہ جہالت و ادھام پرستی کے دور کی طرف عود کرنے پر آمادہ ہو گا؟ کیا تمدن جدید اس طاقت کا حلقہ بگوش بننا پسند کرے گا جو اگرچہ نعم من اللہ ہونے کی مدعی ہے لیکن کوئی صداقت نامہ ایسا نہیں پیش کر سکتی جس سے اس کا دعویٰ لائق اعتبار سمجھا جاسکے۔ وہ طاقت جس نے صدہا سال تک یورپ کو جمود کی زنجیروں میں جکڑے رکھا ہے اور ہر اس کوشش کو جو ترقی کے لئے کی گئی ہے یا تو آب آہن آہن میں ڈبو دیا ہے یا شعلہ آتش میں جلا دیا ہے۔ وہ طاقت جو عقل و تمیز اور فہم و شعور سے اپنا مرتبہ اونچا سمجھتی ہے وہ طاقت جو حریت خیال اور آزادی تمدن سے خطر ہونے کا اعلان علی روس الاشہاد کرتی ہے۔ وہ طاقت جو اپنے اس ارادہ کو نہیں چھپاتی کہ موقع پاتے ہی ان میں سے

ایک کا گلا گھونٹ ڈالے گی اور دوسرے کو سولی پر لٹکا دے گی۔ وہ طاقت جس کے نزدیک یہ عقیدہ ملک اور مجتہدانہ ہے کہ آزادی ایمان و آزادی عبادت کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ وہ طاقت جو مذہب و متمدن سلطنتوں میں قانون کے ذریعہ سے اس حق کے نافذ کئے جانے کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہے۔ وہ طاقت جو ازراہ غایت استحقار اس اصول کی نفی کرتی ہے کہ زبان خلق کو جو نقارہ خدا ہے ضرور ہے کہ قانون کی شکل اختیار کرے۔ وہ طاقت جو مذہبی معاملات میں ذاتی رائے کا حق ہر شخص سے چھیننے پر تلی ہوئی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ لوگوں کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ جو کچھ کلیسا کہے دے اس پر ایمان لے آئیں اور جو حکم دے اس کی تعمیل بلا چون و چرا کریں۔ وہ طاقت جو کسی دنیوی حکومت کو کلیسا کے اقتدار کی تجدید اور اس کے حقوق کی تحسین کا مجاز نہیں سمجھتی۔ وہ طاقت جو صاف الفاظ میں کہتی ہے کہ نافرمانیہ داروں کو قہیل حکم پر طوعاً و کرہاً مجبور کرنا اس کے لئے نہ صرف جائز ہے بلکہ وہ ایسا ضرور کرے گی۔ وہ طاقت جو گھر کی پاک چار دیواری کا بھی ادب نہیں کرتی اور جو شخص اس کی نظروں میں مشتبہ ہو اس کی بی بی بیٹوں اور لوگوں کو چاکروں کو بذریعہ اعتراف سری اس کا جاسوس و مخبر بناتی ہے۔ وہ طاقت جو بلا الزام لگانے والے کے مواجہ کے اس پر مقدمہ چلاتی ہے اور اسے کنبہ میں کھینچ کر خود اپنے ہی خلاف شہادت دینے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ طاقت جو والدین کے اس حق کو غصب کرتی ہے کہ وہ اس کے کلیسا سے باہر اپنی اولاد کو تعلیم دلا سکتے ہیں اور بر سبیل اصرار کہتی ہے کہ لوگوں کی خانگی زندگی کی نگرانی اور معاملات نکاح و طلاق کا انضباط اسی سے متعلق ہے۔ وہ طاقت جو ان لوگوں کو ڈیوٹی اور دیدہ دلیر کہہ کر پکارتی ہے جو کلیسا کے اقتدار کو حکومت کے اقتدار کے تابع کرنا چاہیں یا جو کلیسا کو حکومت سے علیحدہ کرنے کی خواہشمند ہوں۔ وہ طاقت جس کو رواداری و مسالمت کے نام سے چڑ ہے اور جس کا یہ دعویٰ ہے کہ ہر ملک میں عبادت کے دوسرے طریقوں کو موقوف کر کے صرف کیتھولک مذہب ہی کو ملکی مذہب ہونے کا حق حاصل ہے۔ وہ طاقت جو یہ مطالبہ کرتی ہے کہ تمام وہ قوانین جو اس کے اغراض و مقاصد کی راہ میں حائل ہوں منسوخ کر دئے جائیں اور جب یہ مطالبہ منظور نہیں ہوتا تو تمام اپنے پیروں کو ان قوانین کی خلاف ورزی کا حکم دیتی ہے؟

چونکہ اس طاقت کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ کوئی کرامت یا معجزہ جس سے اس کی مطلب بر آری ہو سکے اس سے صادر نہیں ہو سکتا لہذا وہ بلا تامل حکومتوں کے خلاف سازشیں کر کے محرک نقص امن ہوتی ہے اور اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے جبر و تشدد کی

قوتوں کے ساتھ اتحاد قائم کرتی ہے۔

اس قسم کے دعویٰ اور اس طرح کے مطالبات کے معنی یہ ہیں کہ تمدن جدید کے غرض میں سرکشی و بغاوت کی چنگاری ڈال دی جائے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ تہذیب و شائستگی کا قصر منہدم کر دیا جائے خواہ اس کے نیچے کتنی ہی قومیں کیوں نہ دب جائیں اور کیسا ہی بڑا نقصان دنیا کو کیوں نہ پہنچ جائے۔ اگر لوگ ان مطالبات کو بلاچون و چرا تسلیم کر لیں تو ہم سمجھیں گے کہ وہ حقیقت میں غلام ہیں۔

جو معرکہ پیش آنے والا ہے اس کا نتیجہ ارباب عقل سلیم سے مخفی نہیں۔ ہر وہ قوت جس کا دارومدار جھوٹ اور دھوکے پر ہے مغلوب ہو جائے گی۔ ہر اس نظام کو جو تیلیس کا مرکز اور فریب دی کا مصدر ہے جواب دہ ہونا پڑے گا کہ اسے قائم رہنے کا کیا حق حاصل ہے۔ ایمان کو عقل کے دربار میں حاضر ہو کر جوابدہی کرنی پڑی گی۔ ادھام و اسرار کو اپنی مسند واقعات و حقائق کے لئے خالی کرنی ہو گی۔ مذہب کو اس خود مختارانہ و حکمرانہ حیثیت سے دست کش ہونا پڑے گا جو اس نے ایک مدت مدید سے بمقابلہ سائنس اختیار کئے رکھی ہے۔ آزادی خیال کا علم بلند ہو کر رہے گا۔ پادریوں کو ان حدود کے اندر رہنے کا سبق سیکھنا ہو گا جو انہوں نے اپنے لئے اختیار کی ہیں اور فلاسفہ پر ظلم و تعدی کرنے سے باز آنا ہو گا اس لئے کہ فلاسفہ اپنی روز افزوں قوت کے بھروسے اور اپنی ٹیک بختی کے بل پر آئندہ اپنے حریفوں کی مزاحمت اور دست اندازی کے روادار نہ ہوں گے۔ آج سے دو ہزار تین سو سال پہلے عزرا نے بابل کی بید مجنوں سے چھائی ہوئی ندیوں کے کنارے بیٹھ کر جو جملہ لکھا تھا اس کی صداقت میں آج بھی کلام نہیں: ”حق ہمیشہ برقرار رہتا ہے اور اس کی قوت قائم رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور فتح اس کا ساتھ دیتی ہے۔“

۱۸۷۳ء غالباً ”مصنف کی مباد ہندوؤں سے ہے مسلمان بھڑے تو سات ہی کروڑ ہیں یا شاید ۱۸۷۳ء میں جب کہ یہ کتاب اول اول شائع ہوئی ہندوستان کی مردم شماری کا اس درجہ ناقص ہو کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد میں کروڑ کبھی جاتی ہو۔ مگر یہ بھی نہیں ہو سکا۔ اس لئے کہ ۱۸۷۲ء میں گورنمنٹ ہندوستان کی طرف سے جو رپورٹ مردم شماری شائع ہوئی تھی اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل آبادی ہندوستان کی اس وقت ۲۳۰۷۳۷۳۳ تھی جس میں ۱۸۷۳ء فیصد ہندو تھے ۲۱۱/۲ فی صدی مسلمان اور پانچ فی صدی باقی تمام قومیں۔ اس پانچ فیصدی میں ۳۱۸۳۳۳۳ پرائسٹ اور ۵۸۷۳۷۳۷ رومن کیتھولک یعنی کل نو لاکھ پچاس ہائی شامل تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو مسلمان ہندوستان کی تعداد کے متعلق دھوکا ہوا۔ مترجم

لہ جنوبی اٹلی کا ایک شہر ہے جو لب ساحل روما سے ۷۶ میل جانب جنوب و شرق اور نیپلز سے بیٹالیس میل جانب شمال مغرب واقع ہے۔ یہ شہر نہایت قدیم ہے اور رومن سلطنت کے زمانہ سے لے کر آج تک اس نے بہت سے تاریخی انقلاب دیکھے ہیں۔ مسلمانوں نے نویں صدی میں اس کا محاصرہ کیا تھا۔ ۱۷۳۴ء میں اس پر اسپین کا قبضہ ہوا۔ ان سے ۱۷۹۹ء میں فرانسیسیوں نے چھین لیا۔ پاپائے پائس تاسع جن کا ذکر متن میں ہے روما سے نکال دئے گئے تھے اور گیتا میں انہوں نے پناہ لی تھی۔ ۱۸۴۸ء میں فرانسیسیوں کی مدد سے انہوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کیا اور مراجعت فرمائے روا ہوئے۔ مترجم

تک دو سال ہوئے کہ فرانس بھی اس دو عملی حکومت کی قید سے آزاد ہو گیا۔ مذہب حکومت سے بالکل بے دخل کر دیا گیا اور اب فرانسیسی گورنمنٹ کا شانی مذہب نام کو نہرانیہ لیکن فی الحقیقت ہمت ہے۔ مترجم

لہ اٹلی کا شمالی صوبہ جس کے شمال کی طرف سویٹزرلینڈ اور مغرب کی طرف فرانس واقع ہے۔ رقبہ ۳۹۸ مربع میل اور آبادی ۱۹۹۱ء میں ۳۳۲۳۳۱ نفوس تھی۔ مترجم

شہ یعنی قرآن مجید کا خدا ہے۔ مترجم
لہ دوستی ہوئی ہی کب تھی جو تازہ ہو۔ کیا مصنف کو وہ جامع و مانع گالیاں یاد نہیں ہیں جو تحریک "اصلاح کتبہ" کے بانی مہلانی مارٹن لوٹمر نے فلاسفہ و اہل علم کی شان میں عموماً اور ارسطو کی شان میں خصوصاً تعریف کی تھیں؟ کیا ڈیپر کو خود اپنا ہی فقرہ بھول گیا ہے کہ "حقیقت یہ ہے کہ واقعہ "اصلاح" کا سائنس کے سر پر ذرا سا بھی احسان نہیں ہے؟" کیا ڈیپر کو اپنی یہ عبارت فراموش ہو گئی ہے کہ "کلیسائے مسیحی کی دو حریف جماعتیں یعنی پرائسٹ و کیتھولک باوجود باہمی رقابت کے اس امر میں متفق و متحد تھیں کہ بجز ان علوم کے جو ان کی رائے میں کتب مقدسہ کے نقیض نہ ہوں اور کسی علم کو مسالمت اور رواداری کی نظر سے نہ دیکھا جائے؟"

ہمارے جن ناظرین نے اس کتب کو ہامان نظر پڑھا ہے وہ ہاسانی اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہوں گے کہ نہرانیہ اور سائنس کا اجتماع ضدین کا اجتماع ہے۔ یورپ نے علوم و فنون اور تمدن میں جو ترقی کی ہے وہ مذہب سے آزاد ہو کر کی ہے اور جوں جوں یہ ترقی بڑھتی جائے گی مغرب میں بے دینی، بد اعتقادی اور دہریت کا زور بھی بڑھتا جائے گا۔ یورپین اہل سائنس میں سے آج دو فیصدی بھی ایسے نہ ملیں گے جو مسیحیت کی تعلیم کی صحت کے تو درکنار خدا کی ہستی کے بھی قائل ہوں۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ایمان کے قوسین میں عقل کو جگہ دی ہے۔ جس نے روایت میں شان درایت پیدا کر دی ہے جس نے سائنس کی شروع ہی سے سرپرستی کی ہے۔ اسلام کو المامون غزالی اور ابن رشد پر غرور و ناز ہو سکتا ہے لیکن مسیحیت کے لئے فریڈرک ہٹلر و اٹلر اور کپلے باعث تک و عار ہیں۔ مترجم

لہ ایک بہت بڑا فرانسیسی مدیر اور مورخ (۱۸۷۴-۱۹۸۷) مترجم



سیرت النبی ﷺ موضوع پر چھاری دیگر کتب

| | |
|--|--|
| سیرت النبی | سبیل نعمانی |
| رحمۃ اللعالمین | قاضی عیسیٰ منصور پوری |
| محبوب خدا | چودھری افضل حق |
| حیات شرف کائنات | مارٹن فگس / سید معین الدین احمد قادری |
| سیرت طیبہ محمد رسول اللہ | مولانا عبدالمقصد |
| طیب نبوی اور جدید سائنس | ڈاکٹر خالد عسکری |
| نبی اکرم بطور ماہر نفسیات | سیدہ سعیدہ عسکری |
| اسوۂ حسنہ اور علم نفسیات | " " " |
| حدیث نبوی اور علم النفس | ڈاکٹر محمد عثمان نعمانی / فہیمہ خرمشاہ |
| ناموس رسول اور قانون توہین رسالت | محمد اسماعیل قریشی |
| رسول اکرم ﷺ فی قرآن عظیم | پیسر زادہ شمس الدین |
| میان دو مکرم | ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی |
| پتھن کے رسول | آفا اشرف |
| معراج اور سائنس | " " " |
| رسول اکرم کی جنگی حکمت | عبد الباری |
| سیرت النبی ﷺ زبان امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضیٰ | مشرقیہ ابن عبد الشکور |
| تعلیمات نبوی | مولانا محمد سلیمان فروغ |

ناشرانِ تابراں کتب
عزیز نسرتیٹ اردو کوئٹہ لاہور
الفجاء